

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

# سُورَةُ الْبَقَرَةِ

جلد ۲

لفاد لائبریری

حضرت مولانا صفوی عبدالحمید صاحب سواتی

خطیب جامع مسجد نور گوہر صاحب الزوالہ

## طبع سولہ

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

معارف اعرافان فی دروس القرآن (سورۃ البقرہ و آیت ۱۴۱ تا ۱۴۲)	نام کتاب
حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سہاگی خطیب جامع مسجد نور کوہ جرائوالہ	افادات
الحاج لعل دین - ایم اے علوم اسلامیہ	مرتب
۴۹۹ صفحات	تعداد صفحات
پانچ سو (۵۰۰)	تعداد اشاعت
سید المظاہرین حضرت شاہ نقیص الحسنی مدظلہ	مردق
محمد امین اللہ قادری کوہ جرائوالہ	تألیف
مکتبہ دروس القرآن فاروقی پنج کوہ جرائوالہ	ناشر
۱۵۵ روپے	قیمت

دسمبر ۲۰۰۷ء بمطابق ذیقعد ۱۴۲۸ھ

ملنے کے پتے

- (۱) مکتبہ دروس القرآن مجلہ فاروقی پنج کوہ جرائوالہ (۵) کتب خانہ رشیدیہ درلہ پانڈراہ پٹنہ
- (۲) دارالافتاء دارالعلوم جرائوالہ (۶) کتب خانہ حمیدیہ بیرون پور ٹیکسٹ مکتبہ
- (۳) مکتبہ قادیانہ دارالافتاء دارالعلوم جرائوالہ (۷) مکتبہ طبعیہ نزد جامعہ دارالافتاء دارالعلوم جرائوالہ
- (۴) مکتبہ سید احمد شہید دارالافتاء دارالعلوم جرائوالہ (۸) دارالافتاء دارالعلوم جرائوالہ
- (۹) مکتبہ رشیدیہ درلہ پٹنہ

# فہرست مضامین

دروس القرآن پارہ ۱ جلد ۱

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۲	استقامت کی ضرورت	۱۵	پیش لفظ (واللہ اعلم بالصواب) ایم اے علوم اسلامیہ لاہور
۳۳	مجاہد	۱۹	سخناتِ یحییٰ دہ نمبر شریف فاضل مدرسہ نعیمیہ العلوم دارال
۳۴	سجاد	۳۳	درس اوراق (آیت ۲۱)
۳۵	درس دوم (آیت ۲۱)	۳۴	سورۃ اور آیت
۳۶	محکمات: متش: بہات: مقطعات	۳۵	آیت کے مختلف معانی
۳۷	۱۰۰۰۰۰۰ اور ان کی تفسیریں	۳۶	سورتوں اور آیتوں کی ترتیب
۳۸	حدیث: مقطعات: پڑھنے کے بارے میں	۳۷	صحیحوں کی اقسام: حفاظ: طوائف
۳۹	حضرت صدیق اکبرؓ	۳۸	ذبح: تسمیہ
۴۰	حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ	۳۹	مکی اور مدنی حرمین
۴۱	حضرت ام شمسؓ	۴۰	ترتیب: قاف: ک: ثمت
۴۲	حضرت ابن مسعودؓ	۴۱	فصل: حرم
۴۳	حضرت ام رومانؓ	۴۲	مضامین سورۃ
۴۴	مقطعات: اسمائہ النبیہ	۴۳	نام اور کوائف
۴۵	مقطعات: اسمائہ قرآنیہ	۴۴	سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ میں ربط
۴۶	مقطعات: بحیثیت: جلیغ	۴۵	صالحات: دین
۴۷	اہم: اخلاقی: ک: رائے	۴۶	معرفت: الہی
۴۸	عبد اللہ بن عباسؓ کا قول	۴۷	ثبوت: نبوت

۵۵	انسانوں سے تین گروہ	۴۰	ابو ہریرہؓ کی تحقیق
۵۶	کفر و کفر	۴۱	شیخ ابن عربی کا قول
۵۷	کفر کی مختلف اقسام	۴۲	نزول مقطعات معجزہ سرور کائنات
۵۸	کفر و کفر	۴۳	ابو ہریرہؓ کا قول
۵۹	کفر و کفر	۴۴	امام شافعیؒ کا قول
۶۰	کفر و کفر	۴۵	امام شافعیؒ کا قول
۶۱	کفر و کفر	۴۶	امام شافعیؒ کا قول
۶۲	کفر و کفر	۴۷	امام شافعیؒ کا قول
۶۳	کفر و کفر	۴۸	امام شافعیؒ کا قول
۶۴	کفر و کفر	۴۹	امام شافعیؒ کا قول
۶۵	کفر و کفر	۵۰	امام شافعیؒ کا قول
۶۶	کفر و کفر	۵۱	امام شافعیؒ کا قول
۶۷	کفر و کفر	۵۲	امام شافعیؒ کا قول
۶۸	کفر و کفر	۵۳	امام شافعیؒ کا قول
۶۹	کفر و کفر	۵۴	امام شافعیؒ کا قول
۷۰	کفر و کفر	۵۵	امام شافعیؒ کا قول
۷۱	کفر و کفر	۵۶	امام شافعیؒ کا قول
۷۲	کفر و کفر	۵۷	امام شافعیؒ کا قول
۷۳	کفر و کفر	۵۸	امام شافعیؒ کا قول
۷۴	کفر و کفر	۵۹	امام شافعیؒ کا قول
۷۵	کفر و کفر	۶۰	امام شافعیؒ کا قول
۷۶	کفر و کفر	۶۱	امام شافعیؒ کا قول
۷۷	کفر و کفر	۶۲	امام شافعیؒ کا قول
۷۸	کفر و کفر	۶۳	امام شافعیؒ کا قول
۷۹	کفر و کفر	۶۴	امام شافعیؒ کا قول
۸۰	کفر و کفر	۶۵	امام شافعیؒ کا قول
۸۱	کفر و کفر	۶۶	امام شافعیؒ کا قول
۸۲	کفر و کفر	۶۷	امام شافعیؒ کا قول
۸۳	کفر و کفر	۶۸	امام شافعیؒ کا قول
۸۴	کفر و کفر	۶۹	امام شافعیؒ کا قول
۸۵	کفر و کفر	۷۰	امام شافعیؒ کا قول
۸۶	کفر و کفر	۷۱	امام شافعیؒ کا قول
۸۷	کفر و کفر	۷۲	امام شافعیؒ کا قول
۸۸	کفر و کفر	۷۳	امام شافعیؒ کا قول
۸۹	کفر و کفر	۷۴	امام شافعیؒ کا قول
۹۰	کفر و کفر	۷۵	امام شافعیؒ کا قول
۹۱	کفر و کفر	۷۶	امام شافعیؒ کا قول
۹۲	کفر و کفر	۷۷	امام شافعیؒ کا قول
۹۳	کفر و کفر	۷۸	امام شافعیؒ کا قول
۹۴	کفر و کفر	۷۹	امام شافعیؒ کا قول
۹۵	کفر و کفر	۸۰	امام شافعیؒ کا قول
۹۶	کفر و کفر	۸۱	امام شافعیؒ کا قول
۹۷	کفر و کفر	۸۲	امام شافعیؒ کا قول
۹۸	کفر و کفر	۸۳	امام شافعیؒ کا قول
۹۹	کفر و کفر	۸۴	امام شافعیؒ کا قول
۱۰۰	کفر و کفر	۸۵	امام شافعیؒ کا قول



۹۰	منافقین کی مثال	۷۱	گزشتہ سے پیوستہ
۹۱	انذہبوں کی مختلف قسمیں	۷۲	منافقین کا گروہ
۹۳	منافقین کی بدعتی	۷۳	منافقین کی قسمیں
۹۵	درس ششم : (آیت ۱۲۰-۱۱۹)	۷۴	نفاق دینی باری ہے
"	گزشتہ سے پیوستہ	۷۵	فدائی اور رض
۹۶	منافقوں کی دوسری مثال	۷۶	منافقین کی دھوکہ دہی
"	اعتقادی اور عملی منافق	۷۷	حکومتی سطح پر نفاق
"	دل کی چار قسمیں	۷۸	عذاب عظیم اور عذاب الیم میں فرق
۹۷	ایمان اور نفاق کی مثال	۷۹	درس ہفتم : (آیت ۱۱۷-۱۱۶)
"	قلب کی چھ حالتیں	۸۰	گزشتہ سے پیوستہ
۹۸	بارش کی مثال	۸۱	حقیقی ایمان
۹۹	منافقین کی بے بسی	۸۲	مبار حق
۱۰۰	درس و ہکم : (آیت ۱۲۲-۱۲۱)	۸۳	انسان اور اس کا دل
"	گزشتہ سے پیوستہ	۸۴	حقیقی انسان کون ہیں
"	مخاطبہ قرآن	۸۵	بیوقوف کون ہیں
۱۰۲	چار جہم ضامین	۸۶	منافقوں کی دوسری پالیسی
"	ترجید	۸۷	استنزار من اللہ کا مفہوم
۱۰۳	صفات النبی	۸۸	ہدایت کے بدلے گمراہی
"	معرفت النبی	۸۹	درس ہشتم : (آیت ۱۸۷-۱۸۶)
۱۰۵	عبادت النبی	۹۰	گزشتہ سے پیوستہ
۱۰۶	وجود النبی پر دلائل		کتب آسمانی اور ارشاد
۱۰۹	درس یازدہم : (آیت ۱۲۲-۱۲۱)		تفسیر انعام القرآن
"	ترجید عبادت کے لیے شرط ہے		مثال کی حکمت

۱۳۰	۱۱۰	گزشتہ سے پیوستہ	۱۱۰	لائق توجہ
۱۳۱	۱۱۱	حقیر چیزوں کی مثالیں	۱۱۱	کب سوال اور اس کا جواب
۱۳۲	۱۱۲	حیا کی مختلف قسمیں	۱۱۲	عبادت کیوں ضروری ہے
۱۳۳	۱۱۳	ہدایت اور گمراہی	۱۱۳	عبادت کے لائق صرف ذاتِ باری ہے
۱۳۴	۱۱۴	فاسق کا معنی	۱۱۴	زمین کے فوائد
۲۵	۱۱۵	بہودہ و منافقین کی عہد شکنی	۱۱۵	آسمان اور پانی کی نعمت
۱۳۶	۱۱۶	قطع رحمی	۱۱۶	لفظ نہ کا معنی
"	۱۱۷	صلہ رحمی	۱۱۷	نہ ٹھہرانے کی مختلف صورتیں
"	۱۱۸	فساد فی الارض	۱۱۸	شرک فی المشیت
۱۳۷	۱۱۹	نافعین کی ناکامی	۱۱۹	شرک فی العادت
۱۳۸	۱۲۰	درس چہار و ہم ۱۴ (آیت ۲۸ تا ۲۹)	۱۲۰	شرک کی دوسری قسمیں
"	۱۲۱	گزشتہ سے پیوستہ	۱۲۱	شرکِ خفی
۱۳۹	۱۲۲	اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر	۱۲۲	اطاعتِ بغیر اللہ
۱۴۰	۱۲۳	سوت و حیاتِ تعریفِ الہی میں ہے	۱۲۳	درس دواز و ہم ۱۵ (آیت ۲۲ تا ۲۵)
۱۴۱	۱۲۴	محاسبے کا عمل	۱۲۴	گزشتہ سے پیوستہ
۱۴۲	۱۲۵	میت و فنِ کرنے کے آداب	۱۲۵	قرآن پاک خاص معجزہ ہے
"	۱۲۶	تمام چیزیں انسان کے لیے ہیں	۱۲۶	عبدِ باعزت لفظ ہے
۱۴۳	۱۲۷	سوت سامانِ عبرت ہے	۱۲۷	قرآن بطریقِ صحیح
"	۱۲۸	اشیاء میں اصلِ اباحت ہے	۱۲۸	سُنکین قرآن کی سزا
۱۴۴	۱۲۹	آمانوں کی تخلیق	۱۲۹	ایمانداروں کے لیے بشارت
۱۴۵	۱۳۰	علیم کل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے	۱۳۰	بچپن میں ثابت
"	۱۳۱	عبادتِ الہی لازم ہے	۱۳۱	بائتہ دیویاں
۱۴۷	۱۳۲	درس پانز و ہم ۱۵ (آیت ۳۰)	۱۳۲	درس سیز و ہم ۱۶ (آیت ۲۶ تا ۲۷)

۱۴۰	جنت سے خروج	۱۴۷	گزشتہ سے بیروت
۱۴۱	زمین ہی اصل ٹھکانا ہے	۱۴۸	موضوع
۱۴۲	درس ہشودھم (آیت ۲۹-۲۷)	۱۴۹	ہر جنی بادشاہ ہوگا
۱۴۳	گزشتہ سے بیروت	۱۵۰	خلق ان فی سے قبل کے اور
۱۴۴	حضرت آدم علیہ السلام کی قربہ	۱۵۱	قرشتوں کا مادہ تخلیق
۱۴۵	حضرت آدم علیہ السلام کی حضرت آدم علیہ السلام پر فیصلت	۱۵۲	بیانات اور شیاطین
۱۴۶	زمین پر اترنے کا حکم	۱۵۳	ان کا مادہ تخلیق
۱۴۷	حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کی مباحثات	۱۵۴	حضرت آدم علیہ السلام خلیفۃ اللہ ہیں
۱۴۸	جنت کے تحفے	۱۵۵	مسد خلافت
۱۴۹	حضرت آدم علیہ السلام کا مقام نزول	۱۵۶	درس شانزدہم (آیت ۲۲-۲۱)
۱۵۰	بعض اہلہ جسم السلام کے پیٹے	۱۵۷	گزشتہ سے بیروت
۱۵۱	آبہ کا قبولیت	۱۵۸	آدم علیہ السلام کو کن چیزوں کے نام سکھائے گئے
۱۵۲	آبہ کی نثر اٹھ	۱۵۹	الانکھ کا امتحان
۱۵۳	نہیں یہ آسنے کی حکمت	۱۶۰	آدم علیہ السلام کی کامیابی
۱۵۴	آبہ کی حقیقت	۱۶۱	درس ہفدہم (آیت ۲۴-۲۳)
۱۵۵	آبہ کے متبعین	۱۶۲	قرشتوں کی سجدہ ریزی
۱۵۶	کفار و مکذبین	۱۶۳	اللہ تعالیٰ کے لوگوں پر سجدہ حرام ہے
۱۵۷	درس نوزدہم (آیت ۳۰-۲۹)	۱۶۴	قرشتوں کے سجدہ کی بعض ترکیبات
۱۵۸	تہ تیغ بنی اسرائیل	۱۶۵	ابیس کا انکار
۱۵۹	بنی اسرائیل پر انعامات	۱۶۶	محمد اولین گناہ ہے
۱۶۰	بنی اسرائیل کی تہ تیغ	۱۶۷	حضرت آدم علیہ السلام اور حوا جنت میں
۱۶۱	ایمان بالقرآن	۱۶۸	شجر ممنوعہ
۱۶۲		۱۶۹	شیطان و سور

۲۱۲	۱۸۹	دنیا کی محبت	خجست خاص نعمت ہے
۲۱۳	۱۹۰	تیس ارکان حق	مرد چالیس کی اہمیت
۲۱۳	۱۹۱	درس بستہ (آیت ۴۳ تا ۴۶)	بنی اسرائیل کی کوسال پرستی
۲۱۴	۱۹۲	گنہگار سے پیوستہ	مختلف قوموں کے ایک دوسرے پر اثرات
۲۱۵	۱۹۳	قبول حق سے انکار کی وجوہات	مسئلہ طول
۲۱۶	۱۹۴	حب مال و جاہ کی بیماریاں	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی
۲۱۷	۱۹۵	بیماریوں کا علاج	پچھڑے کے پیچاریوں کا قتل عام
۲۱۸	۱۹۶	نماز جامع عبادات ہے	درس بستہ (آیت ۵۵ تا ۵۷)
۲۱۹	۱۹۷	نماز باجماعت	ربط آیات
۲۲۰	۱۹۸	قرل و فعل میں تضاد	رویت النبی کی خواہش
۲۲۱	۱۹۹	صبر و صلوٰۃ کی برکات	بنی اسرائیل کو نذر
۲۲۲	۲۰۰	رجوع الی اللہ	رویت النبی اس جہان میں ممکن نہیں
۲۲۳	۲۰۱	درس بستہ ویکٹ (آیت ۴۴ تا ۵۰)	بنی اسرائیل کو جگہ کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا
۲۲۴	۲۰۲	ربط آیات	جہاد سے فرار
۲۲۵	۲۰۳	بنی اسرائیل کی فحشیت	بادل کا سایہ
۲۲۶	۲۰۴	اسلامی تاریخ کی حفاظت	من اور سلوی
۲۲۷	۲۰۵	امت مسلمہ کی برتری	پنہ آپ پر ظلم
۲۲۸	۲۰۶	برتری کا معیار تعوی ہے	درس بستہ و چہار (آیت ۵۸ تا ۵۹)
۲۲۹	۲۰۷	مسند شاعت	ربط آیات
۲۳۰	۲۰۸	فرعون سے نجات	بستی میں داخلہ
۲۳۱	۲۰۹	فرعون کی نجات	کچھ دشمن
۲۳۲	۲۱۰	درس بستہ و دو (آیت ۵۴ تا ۵۵)	استغفار کی برکات
۲۳۳	۲۱۱	نزول توراۃ	

۲۵۰	آیات النی کا انکار	۲۳۱	حکم خداوندی میں تبدیلی
"	نبیاء عیسم السلام کا قتل	۲۳۲	عائلی قرینین اور حق شفعہ
۲۵۱	نافرمانی اور حد سے تجاوز	۲۳۳	وراثت میں شکی کا حصہ
۲۵۲	درس بست و ہفت (آیت ۶۲)	"	ظہر کا حشر
"	قانون نجات	۲۳۴	زمین کی آبادی اور بربادی
"	ذہبِ مہم	۲۳۵	درس بست و پینچ (آیت ۶۰)
۲۵۳	اہل ایمان	"	رابطہ آیات
"	ہکادوا کا معنوم	"	بنی اسرائیل کا طلب آب
۲۵۵	یہود کی وجہ تسمیہ	۲۳۶	استسقا کی حقیقت
"	یہودی عقائد	"	استسقا کا طریقہ
۲۵۶	نصاری کی وجہ تسمیہ	۲۳۷	ضربِ بھمی
۲۵۸	نصاری کے عقائد باطلہ	۲۳۹	پانی کی تقسیم
۲۵۹	صابی کون ہیں	۲۴۰	ایک اعتراض اور اس کا جواب
"	صابیوں کے عقائد	۲۴۱	معجزہ اور کرامت
۲۶۱	ضبطی بقتہ بصری	۲۴۲	ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر
"	ایمان باللہ	۲۴۳	فاد فی الارض
۲۶۲	ایمان بالآخرت	۲۴۵	درس بست و شش (آیت ۶۱)
"	اعمالِ صالحہ	"	رابطہ آیات
۲۶۴	درس بست و ہشت (آیت ۶۳ تا ۶۴)	۲۴۶	غلامی کے اثرات
"	بنی اسرائیل کا معذہ	"	طعام کی تبدیلی
۲۶۵	ارتقاء طوطہ	۲۴۷	کاشتکاری و مشقت طلب کام ہے
۲۶۶	دین میں جبر نہیں	۲۴۸	پیشے بجاظہ فنیلیت
۲۶۷	اسماکِ بائکتاب	"	یہودیوں کی ذلت و رسوائی



۲۶۸	مصلحت النی	قانون کی پابندی
۲۶۹	آ کی کتابیاں	بنی اسرائیل کی عہد شکنی
۲۷۱	باؤخر مجبور ہو گئے	درس بست و نہ (آیت ۶۵-۶۶)
۲۷۲	غفلت و کمالات کا شاندار	یہود کا مقدس دن ہفتہ
۲۷۳	واقعہ قتل	مجدد کی فنیست
۲۷۴	احیائے موتی بعد مجزہ	یہود کی قانون شکنی
۲۷۵	قتل و زانیہ سے جوہر	یہود کے تین گروہ
۲۷۶	درس کی وڈو (آیت ۶۷)	انسان بدترین گئے
۲۷۷	قادت قبی	عید سازی بڑی خصلت ہے
۲۷۸	پتھروں سے زیادہ سخت دل	جائز عید سازی
۲۷۹	پتھروں کے زمانہ	تبدیلی اشکال کی توجیہ
۲۸۰	سجدہ تقرب الی اللہ کی علامت ہے	نشان عبرت
۲۸۱	بعض اکابر دیں	درس سکی (آیات ۶۸)
۲۸۲	مسلمانوں کی ناکامی کی وجہ	رابط آیات
۲۸۳	درس کی وڈو (آیت ۶۹ تا ۷۰)	واقعہ قتل
۲۸۴	رابط آیات	قانون قیامت
۲۸۵	یہود کی طرف سے نا اہلی	کثرت سوال سے جو
۲۸۶	احکام میں تحریر	نبی کے قطع تعلقی
۲۸۷	یہود کی بہت دھرمی	نظام ہست
۲۸۸	یہود کے ساتھ موافقت اور ان کی مخالفت	خوش بختی باؤ ہے
۲۸۹	منتخبین کی چاہکیں	درس سی ویکٹ (آیت ۷۱ تا ۷۲)
۲۹۰	یہود کی موجودہ روز دینی	رابط آیات
۲۹۱	تورہ میں تحریر	



۳۰۹	تحریر اور مسلمان	درس سی و ہفت <sup>۲۹</sup> (آیت ۸۲ تا ۸۹)	۳۰۹
۳۱۱	تحریر کرنے والوں کو رعیت	گزشتہ سے بیوستہ	۳۱۱
۳۱۲	درس سی و چہارم <sup>۳۰</sup> (آیت ۸۰ تا ۸۶)	نمونہ نافع در جہاد دینی	۳۱۲
۳۱۳	یہودیوں کے باطل عقائد	بنی اسرائیل کی عہد شکنی	۳۱۳
۳۱۴	عہدہ اندہی	یہودیوں کی باہمی لڑائیاں	۳۱۴
۳۱۵	باطل عقائد کی بنیاد	مسلمانوں کی حالت زار	۳۱۵
۳۱۶	مسلمانوں کے باطل عقائد	تہذیبی عالم الغیب ہے	۳۱۶
۳۱۷	قانون نجات	درس سی و ہشت <sup>۳۱</sup> (آیت ۸۴ تا ۹۰)	۳۱۷
۳۱۸	کافر اور مشرک دائمی جہنمی ہیں	کتاب نور رسول	۳۱۸
۳۱۹	جنت کا چال	حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور معجزات	۳۱۹
۳۲۰	درس سی و پنج <sup>۳۲</sup> (آیت ۸۳)	روح القدس	۳۲۰
۳۲۱	ربط آیات	انبیاء عظیم السلام کے ساتھ سلوک	۳۲۱
۳۲۲	ترجمہ کے درپلو	یہودیوں کا زعم باطل	۳۲۲
۳۲۳	بنی اسرائیل کے مختلف عہد	یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت	۳۲۳
۳۲۴	معرفت الہی	زود اور نزول قرآن	۳۲۴
۳۲۵	الدین سے حسن سلوک	انگریز قتل	۳۲۵
۳۲۶	قرابتہ داروں کے حقوق	بنی نجران والوں طبعیہ السلام سے حسد	۳۲۶
۳۲۷	یتیم، یتیمیں اور یتیم	غضب پر غضب	۳۲۷
۳۲۸	درس سی و شش <sup>۳۳</sup> (آیت ۸۴)	درس سی و نہ <sup>۳۴</sup> (آیت ۹۱ تا ۹۶)	۳۲۸
۳۲۹	گزشتہ سے بیوستہ	گزشتہ سے بیوستہ	۳۲۹
۳۳۰	تہذیب اخلاق	دعوت ایمان	۳۳۰
۳۳۱	حسن سکون	نبیاء عظیم السلام کو قتل	۳۳۱
۳۳۲	نماز اور زکوٰۃ	کرم و پرستی	۳۳۲

۲۵۰	موت کی آرزو	۲۵۰	میاں بیوی میں صدائی	۲۵۱
۲۵۱	علمیاء محمدی کی خوشی	۲۵۱	نافع اور مضار علم	۲۵۱
۲۵۲	موت و حیات کی طلب	۲۵۲	بیوروہوں کے مرفعت	۲۵۲
۲۵۳	درس چیل (آیت ۱۰۹ تا ۱۱۰)	۲۵۳	درس چیل (آیت ۱۰۳ تا ۱۰۴)	۲۵۳
۲۵۴	شانِ نزول	۲۵۴	رابطہ آیات	۲۵۴
۲۵۵	نزول وحی کی مختلف صورتیں	۲۵۵	بنی اسرائیل کی انفرادی ہستی	۲۵۵
۲۵۶	مقرب فرشتے	۲۵۶	سورہ ہود کی نظریات	۲۵۶
۲۵۷	جبرائیل علیہ السلام کے دشمن	۲۵۷	اہل ایمان کو خط	۲۵۷
۲۵۸	اہل ایمان کے لیے بشارت	۲۵۸	مشقہ صلوٰۃ استعمال کی ممانعت	۲۵۸
۲۵۹	فرشتوں سے دشمنی اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے	۲۵۹	پیغمبر کے لیے عطا شدہ کمال استعمال درست نہیں	۲۵۹
۲۶۰	مقربین کا عبادی معنی ہے	۲۶۰	نورانی عمل سے حسد	۲۶۰
۲۶۱	واضح نشانیاں	۲۶۱	تفسیر آیات کی وجوہات	۲۶۱
۲۶۲	کتاب اللہ سے روگردانی	۲۶۲	بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے	۲۶۲
۲۶۳	درس چیل ویکٹ (آیت ۱۰۶ تا ۱۰۷)	۲۶۳	درس چیل ویکٹ (آیت ۱۰۸ تا ۱۰۹)	۲۶۳
۲۶۴	شیطان کا اتباع	۲۶۴	رابطہ آیات	۲۶۴
۲۶۵	حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادو گر جو بیجا الزام	۲۶۵	بیوروہوں کے سواوات	۲۶۵
۲۶۶	جادو کے ذرائع	۲۶۶	مشقہ لین کے حالات	۲۶۶
۲۶۷	ہاروت اور ماروت کے معنی شہادت	۲۶۷	نہرین گہری	۲۶۷
۲۶۸	ہاروت اور ماروت کے واقعے سے	۲۶۸	کثرت حالات کی ممانعت	۲۶۸
۲۶۹	سحر کیا ہے ؟	۲۶۹	اہل بیت کے باطنی ارادے	۲۶۹
۲۷۰	کیا ہاروت اور ماروت انسان تھے ؟	۲۷۰	حسد بدترین بیماری سے	۲۷۰
۲۷۱	کیا سارا جادو کفر ہے ؟	۲۷۱	غیر مسلم ماحول اقوام	۲۷۱
۲۷۲	جادو گر کی سزا	۲۷۲	حسد و غیبت پر اعتراضات	۲۷۲

۴۱۱	شروع و منوع	۲۹۰	قرآن پاک کے عادت ساز
۴۱۲	استقبال قبلہ	۲۹۲	نماز اور مذکورۃ
۴۱۳	درس چہل و شش <sup>۱</sup> (آیت ۱۱۹ تا ۱۲۰)	۲۹۳	نئی کاہ لہری
"	اللہ تعالیٰ اور اللہ سے پال سے	۲۹۴	درس چہل و پچاس <sup>۲</sup> (آیت ۱۱۲ تا ۱۱۳)
۴۱۵	تشبیہ اور شرک	"	ابطال آیات
"	مُسکمانہ کا حق	"	یسود و نضادی
"	اک کعبہ مملوک	۲۹۶	نجات کا دار و مدار
۴۱۶	سفتہ ابداع	۲۹۷	اتباع خداوندی
"	اللہ تعالیٰ کی طرف غلط نسبت	۲۹۸	نیک بینی
۴۱۷	اللہ تعالیٰ سے کلام کی خواہش	۲۹۹	اعمال صالحہ
۴۱۸	حضور علیہ السلام کے معجزات	"	فرقہ بندی ذریعہ نجات نہیں ہے
"	حضور علیہ السلام کے لیے تسلی	۳۰۰	قانون نجات
۴۲۰	درس چہل و ہفت <sup>۳</sup> (آیت ۱۲۰ تا ۱۲۳)	"	اجر عظیم
۴۲۱	گزشتہ سے پیوستہ	۳۰۱	درس چہل و پچاس <sup>۴</sup> (آیت ۱۱۵ تا ۱۱۶)
"	رضائندی کے لیے اہل کتاب کی شرط	"	یسود اور نضادی آئینے سامنے
"	ہدایت الہی ہی اصل ہدایت ہے	۳۰۲	کتب کا دیہ بڑی میں
۴۲۳	اہل کتاب میں سے اہل ایمان	"	حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام تراشی
"	حق و قیامت	"	مشرکین کا نظریہ
۴۲۴	مشرکین کے لیے خار و	۳۰۵	آخری فیصلہ ملت الہی میں ہوگا
"	حق و باطل کی پہچان	"	تحویل قبلہ
۴۲۵	بہن اسرائیل پر انعام	۳۰۷	جہاد میں رکاوٹ
۴۲۶	قیامت کا نقشہ	"	تمام چیزیں نے قابل تعلیم ہیں
۴۲۷	درس چہل و ہشت <sup>۵</sup> (آیت ۱۲۴ تا ۱۲۷)	۳۰۹	سجہ کے آداب
"	ان کے تیرے برس پر ایک تہ	۳۱۰	



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

## پیش لفظ

الْحَمْدُ لِلَّهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى

اما بعد

الْرَّحْمَنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ○ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○

یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ قرآن پاک ہی دو ضابطہ حیات ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان اس دنیا میں بھی اس دھن کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور آخرت میں بھی جنت کی بے پایاں نعمتوں سے انال بہرہ مند ہے۔ یہی وہ لاکھ عمل ہیں جس سے عرب کے صحرائیوں کو قعر ذلت سے نکال کر ہم عروج تک پہنچا۔ تاریخ اٹھ کر دیکھنے زندہ نزول قرآن میں پورا عرب کس قسم کے، حول میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ دیکھ کر ہر انسان کی برائی بہت بوقرائی ہو جاتی تھی، وہ کونسا غیر فطری امتیاز ہے، جس میں غریب، غلام، آزاد، غلام، عربی و عجمی کی صورت میں موجود نہ تھا۔ منڈیوں میں عورتوں اور بچوں کی ذبیحہ و ذبح نہت ہوتی تھی۔ بچہ کیوں کہ زندہ کر دیا جاتا تھا، وہ لوگ سیاسی نظم و نسق کے نام سے، آتش تھے، وہاں نہ کوئی باقاعدہ حکومت تھی، نہ کوئی ضابطہ اور قانون تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا کسی کی جان وں محفوظ نہ تھے، جنگل کا قانون راج تھا اور جس کی لامٹی اس کی بھینس والا معاملہ تھا۔

خانیہ بنہ یب نام کی کوئی چیز ان کے ہاں نہ تھی، وہ لوگ جائز ناجائز، پاک، ناپاک اور طلال و حلال سے، شائے، زنا، چرا، چرن، قتل و غارتگری کے دلدلہ تھے۔ ایک دلدلہ سے کوئی پردہ نہ تھا، ان کے طواف ہوتے، اخلاقی گویوٹ کا یہ حال تھا کہ باپ کی موت کے بعد اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کر سکتے تھے بہت پستی و ذلیل پنہ تھی، توحید نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہ تھی، طرح طرح کے توہمات

کاشکاستے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیرونی کے دعویدار اُن کی تعلیمات سے کوسوں دور تھے۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب حضور نبی کریم ﷺ رحمہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک ہوئی، نزول قرآن کا سلسلہ شروع ہوا، اور جب اسی حوالہ کی پروردگار جابل اور: خواندہ قوم نے قرآن پاک کو سینے سے لگایا تو دیکھتے ہی دیکھتے یہ بے لگام قوم دنیا کی مذہب ترین قوم بن گئی، قیصر و کسریٰ اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے، اراکین رہنما بن گئے۔ ————— پھر اہل ذاکر امین بن گئے، حسب و نسب پر فخر کرنے والے کالے کلوٹے جیٹھی غلام کو سنیہ ناکتے لگے، سیاست سے نابلد قوم، مذہب ترین قوموں کی سبق سکھانے لگی، حزب و حرب کے وہ معرکے دکھائے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک اسلام کا پرچم بائیس لاکھ مربع میل پر لہرانے لگا۔ اور پھر اُسے ہی عرصہ میں قرآنی تعلیمات کے ثمرات دنیا کے گوشے گوشے میں نظر آنے لگے، مگر مقام افسوس ہے، کہ گذشتہ چند صدیوں سے مسلمان پوری دنیا میں ذلیل و سست کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ قومیں جو ان کے نام سے کانپا کرتی تھیں، آج ان پر سلاطین مہمان پیر بادہ زکے دستِ نچر ہو کر رہ گئے ہیں، حتیٰ کہ اسرائیل جیسا بڑا بھڑا جب چاہتا ہے ان کے گلے میں گھس کر انہیں شکار بنالیا ہے۔ وجہ ظہر ہے۔ بقول علامہ اقبال:

دو معزز تھے زمانے میں مسلمان ہر کر      اللہ ہم خوار میں تاملِ قرآن ہر کر

جب سے مسلمانوں نے قرآن پاک کا دامن چھڑا ہے، ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں، مسلسل ناکامیوں کا شکار ہیں۔ بلاشبہ تمام غیر مسلم اقوام ملتِ واحدہ میں، ان کی پیشہ سے یہ کوشش رہی ہے، کہ مسلمان قوم مخلوقِ اورتی دستِ نچر بن کر رہے، اس مقصد کے حصول کے لیے ان کے پاس ایک ہی نسخہ ہے کہ کسی طرح مسلمان قرآنِ کریم سے دستِ نچر ہو جائیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مسلمان قرآنِ کریم پر کھم چل کر کبھی غائب نہ ہوتے تھے اور اس پر درگرم کے محسن جاننے سے ہی مغلوب ہیں۔ نزول قرآن کے وقت بھی وہ یہ کہتے تھے وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْفِ بِهِ أَعْتَكُم تَقْبَلُونَ ۝ دیکھتے تھے کہ انوں میں قرآن کی آواز نہ پہنچے پائے۔ بلکہ خوب شرمچا، تاکہ کوئی دوسرا بھی سن کر اس کا گرویدہ نہ ہو جائے۔ تمہاری کامیابی کا یہی راز ہے۔ آج جی وہ لوگ یہ نسخہ آزماتا ہے۔ مگر ہم خوابِ غفلت میں پڑے ہیں، قرآن پاک کی تعلیمات سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ یہ کلامِ مقدس بانیِ صورت میں ترجمہ سے دور نہیں، ہم اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ



کر اپنے طاغوتوں میں سجاتے ہیں، کبھی کبھی خودت بھی کریتے، حسن قرأت کی انہیں بھی جرات ہے، مگر کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ قرآن پاک سے دریافت کریں کہ تیرے ذہل کا مقصد کیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری ذمہ داری قرآن پاک کے ادب و احترام تک ہی محدود ہے۔ اس کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا کسی اور قوم کا کام ہے۔ یاد رکھئے، اگر آج ہم نے قرآن پاک کو سینے سے نہ لگایا تو بارگاہ رب العزت میں کتنی ذلت و رسوائی اٹھانا پڑے گی جب خود رسول شکایت کریں گے۔ یَسْرِبُ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا یعنی اے مولا کریم! میری قوم نے قرآن پاک کو نظر انداز کر دیا تھا۔

قرآن پاک کو بیجا مگر مگر پہچاننے کے لیے مفسرین کرام نے ہر زمانے میں اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔ اللہ ربانی اور تحریری صورت میں قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہیگا۔ ضرورت صرف ان لوگوں کی ہے جو قرآنی پروگرام کو سنے کر انہیں اللہ دنیا میں ایک دفعہ پھر اسلامی انقلاب برپا کر دیں۔

دوسرا قرآنی کا یہ سلسلہ بھی اپنی بساط کے مطابق قرآن پاک کے علوم و معارف کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔ آئیے ہم قرآن پاک کی آواز کو کانوں کے ذریعے دل میں جگہ دیں، اس پر غور فکر کر کے اس سے رہنمائی حاصل کریں اور پھر عمل پیرا ہو کر اپنا کھریا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیں، نہ صرف دنیا کو امن کا نواؤں بنادیں بلکہ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو ہو جائیں۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ۔

الحمد للہ سلسلہ دوسرا قرآن کی دوسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر جلد اول جو کہ سورۃ فاتحہ پر مشتمل ہے شائع ہو چکی ہے۔ جلد دوم پارہ اول مکمل پر مشتمل ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس منصوبے کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ ایسے کام کے لیے پوری زندگی وقف ہوئی ہے۔ کام وسیع اور کمشن ضرور ہے، مگر ناممکن نہیں۔ اس کام کے لیے آج جس طرح وسائل میا ہیں اور کارکنان کی پوری ٹیم جس طرح قرآن پاک کے ساتھ والہانہ محبت اور دلی لگاؤ کے ساتھ مصروف کار ہے، ہم اُمید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مہربانی سے یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچے گا۔

اس جلد پر کام شروع کرتے وقت اس کی ضخامت کے متعلق تردد تھا کہ آیا یہ جلد پوری سورۃ بقرہ

پر مشتمل ہوگی یا اسے پارہ اول تک محدود کرنا پڑے گا۔

پارہ اول کے مسودے کی ضخامت اور اس پر صرف ہونے والے وقت کے پیش نظر آخری فیصلہ ہوا کہ سورۃ بقرہ کو دو حصوں میں شائع کیا جائے، پہلا حصہ مکمل پارہ اول پر مشتمل ہو اور دوسرے حصہ میں پارہ دوم اور سورۃ کا بقیہ حصہ از پارہ سوم آجائے۔ یہیں پورا پورا احساس ہے کہ اس جلد کی اشاعت میں ایک سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا ہے اور قارئین کو اندازے سے کچھ زیادہ ہی انتظار کرنا پڑا جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

دوسرے پاسے پر کام جاری ہے۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ سورۃ بقرہ کے ہر دو حصے تقریباً برابر ضخامت کے ہوں گے۔ اور اس کے بعد ہر جلد ایک یا ایک سے زائد مکمل سورتوں پر مشتمل ہو کر گی اس طریقے سے ہر جلد مکمل پارہ جات پر مشتمل تو نہیں ہوگی، تاہم مکمل سورتیں اس میں آئیں گی سلف صالحین نے اسی طریقہ کو اپنایا ہے۔

اگرچہ وقت کے لحاظ سے قرآن مجید کی تکمیل کی فوری ضرورت کے اعتبار سے ہمیں ترقی سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔ کام جس قدر وسیع اور کٹھن ہے، اس کے لیے اسی قدر مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ہمارے کوشش ہوگی کہ کام کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے بڑے مزید وقت دیا جائے تاکہ ہر آئندہ جلد کے لیے انتظار کی گھڑیاں کم سے کم ہو سکیں، قارئین کرام سے التماس ہے کہ اس سلسلہ اشاعت کے ذمہ جملہ کارکنان خصوصاً صوفی صاحب مکتبہ کی درازی عمر اور صحت اور اس عظیم کام پر استقامت کی دعا کریں۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ

احقر العباد

دعائی، نعل دین، ایم اے (علوم اسلامیہ)  
شالامار ٹاؤن، لاہور

# سخن ہائے گفتنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ  
خَاتَمِ الْاَنْبِیَاۡہِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهِ وَاصْحَابِهِ وَازْوَاجِهِ وَاتْبَاعِهِ  
اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ

• خیر امتیہ کا خطاب پانے والی قوم آن جس قدر دیگر گروں حالات ہستی اور  
تہ تنزل کے جس خطرناک دور سے گزر رہی ہے۔ وہ کسی گروش شنوا اور چشم بینا سے مخفی نہیں۔ اعمال و  
اخلاق اسلام کی قید سے تقریباً آزاد ہو چکے ہیں۔ ایسا دہمزدی، مشترک اجتماعی مقاصد اور ملی ترقی کی  
کوشش کے بجائے، نفس پرستی، خود غرضی، اور ذاتی حقوق مقصد حیات بن چکا ہے، دفتروں میں  
عزت کی غمیت اور استیصال اس قدر عام ہو کر پناہ بخدا ہر دولت والا شخص جس کی عزت پر چاہے اتنا ڈال دے  
اور کمزور آدمی کے لیے جائز حقوق کا حصول بھی تقریباً ناممکن ہے اور حصول انصاف حقا ہے۔ دوسروں کو  
پہچال کا سبق دینے والی قوم نے آج خود جھوٹ کر روزی کھانے کا ذریعہ بنالیا ہے، عربانی و فحاشی عربوں پر  
ہے، فرقدارانہ کشمکش، فوجی استبداد، مارشل لا کی طاغوتی حکومتیں، جدید آلات و انخفاطات کا غلط استعمال  
تصویری فتنہ، حد سے زیادہ آرام طلبی اور رفاہیت، بانڈ کا فساد، کھیل و تماشا کی کثرت، اسلام کو اپنے  
غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنا، مکریت کی عشرت پنہاں، اسراف اور بہت طرازیوں، اللہ تعالیٰ  
کی کتاب کی غلط تفسیریں اور باطل تاویلیں، رسمت و بہاعت کی فراوانی، اور دھوکا بازی اور فریب دہی  
میں دوسری تمام قوموں کو مات کر دیا ہے۔ اور ان کے ماضی کا تمام ریکارڈ توڑ دیا ہے، قوم کی دیانت،

شرافت، صداقت اور امانت کا مال کسی سے مخفی نہیں، **وَأَتَمَّ الْمُؤْمِنُونَ** (تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کی تعلیم پانے والی قوم کے مالک اور فرد آپس میں نبرد آزما ہیں، آئے دن قتل میں اضافہ، گھر کے اندر عزت اور باہر جان محفوظ نہیں، اشتراکیت، سرمایہ داری کی لعنت کے عروج، جماعتیت، ایسوی ازم کی تباہ کاریوں، مبنی و ازم کی تنگ نظری سے متاثرہ قوم، زبان پر اسلام اسلام اور عمل اس کے برعکس اور اسلام کی پیٹی میں ایک ذہر آلود خنجر ہے۔

ہاں ہمہ مسلم معاشرہ میں ایسے افراد بھی موجود ہیں۔ جو کہ صحیح معنوں میں قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ اور اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تمنا رکھتے ہیں، ان حالات میں مسلمانوں کے ساتھ دلی ہمدردی اور ان کی اس حالتِ زار پر دردِ دل رکھنے والے حضرات کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ کردہ ان کو صحیح قرآنی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔

بھگوانہ تعالیٰ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب دہم مجاہد کا انداز بیان سادہ اور دلپند ہے۔ تیس، بناوٹ اور تکلف سے دور، لیکن پُر مغز، جامع اور مسلک سلف کے مطابق منشاء قرآن کا صحیح منظر ہے۔ اور داعی الی اللہ برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے قرآن کریم کا ترجمہ فارسی زبان میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے کیا۔ اس کے بعد شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر نے اردو میں بے حد مفید ترجمے کیے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے حکیمانہ تفسیر لکھی۔ اور دیگر بزرگانِ دین نے بھی اپنی اپنی طاقت کے مطابق اس میں حصہ لیا۔ مآخیزین میں حضرت تھالری، کامیان القرآن، حضرت شیخ الحداد کا ترجمہ اور تفسیر عثمانی اور حضرت لاہوری کا ترجمہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن اور اس قسم کے دیگر تراجم اور تفسیر مستند اور ہر اعتبار سے سے خلقِ خدا کے لیے نافع ہیں۔ اور دل میں کلامِ الہی پر عمل کا سچا جذبہ پیدا کرنے والے ہیں۔

معالم العرفان فی صدس القرآن بھی اسی پاکیزہ سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور چند وجوہ کے اعتبار سے ممتاز بھی ہے۔ عام فہم طرز، انداز بیان میں مخاطبین کے ذہنوں کا لحاظ، واقعات کا سلسلہ انسانی مربوط اور دورِ حاضر کی دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کی رعایت، مسلمانوں کی بنیادی خامیوں کی واضح نشاندہی، تفسیری سلسلہ کے شبہات اور جدید دور میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے شبہات کا بڑے لطیف انداز میں حل تحقیق کے نام پر تحریر کرنے والوں اور جدت پسند حضرات کی ٹھوکروں کی نشاندہی، سیاسی، اقتصادی، معاشی، فقہی، سائل اور جدید دور کے مسائل کی انجھی سہولی گتھیوں کا قرآن و سنت اور سلف صالحین کے

مسک کے مطابق لکھا، تاریخی واقعات اور کہیں کہیں مفترین صفت اور ان کی کتب کا تعارف، فقہ و فتنہ اور تصوف کا افادی پہلو۔ ویسے بھی حضرت صوفی صاحب دہم مجید بھگوان نامی ہی کسی کتاب کے مستند ہونے کے لیے کافی ہے۔

آج کل مسلمانوں کے باہمی اتفاق کے لیے بڑی پر زور کوششیں ہو رہی ہیں۔ تقاریر، جلسے، اخباریں، لٹریچر، مباحثے، پیچھے اور تصنیفات کے ذریعے باہمی اتفاق پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن اصل میں جو چیز اتفاق کی جڑ ہے، اور کوئی ترجمہ نہیں کرتا، یعنی مخالفت پر تنقید میں حد اعتدال سے تجاوز، آپس کے اختلافات کی شدت اور ایک درس سے بعد کا ایک بست بڑا سبب زبان کی ورثی اور تیزی ہے۔ بھگوان تعالیٰ دروس القرآن میں باطل مذہب کی پوری پوری تردید اور گمراہ فرقوں کے غلط عقائد و مسائل اور نظریات پر نئے ششہ اذہان میں تنقید ہے۔ ایسی اعتدال کو کسی حالت میں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور عام آدمی پر بھی حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔ اور قرآن و سنت کا صحیح مشاہدہ سامنے آ جاتا ہے اور حق کا تلاشی حق کو پہنچتا ہے۔

سلسلہ دروس القرآن کی دوسری جلد آپ کے باقرائیں ہیں۔ اس سے پیشتر سورۃ فاتحہ پر مشتمل جلد اول شائع ہو چکی ہے۔ یہ جلد سورۃ بقرہ کے سولہ رکعات یعنی پورا الشہ پر مشتمل ہے۔ سورۃ بقرہ میں سینکڑوں منسائیں بیان کرنے میں لیکن اس کا مرکزی مضمون یوں کے غلط عقائد کو بیان اور ان کی تردید، ان کی خباثت اور تنزیل کے اسباب، ان کی سیاسی غلطیاں اور روحانی بیماریاں اور ان کی اصلاح ہے۔ امت مسلمہ میں آج انہیں حالات سے دوچار ہے جس میں بنی اسرائیل تھے۔ مجر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حالات کی پیشین گوئی آج سے چودہ سو سال پہلے فرمائی تھی۔ لَیْسَتِیْنَ عَلٰی اُمَّتِیْ کَمَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اِلَّا مِثْلَ مَا مَزِدَ مِنْہُمْ اَمَّا اَمْرٌ یَّحْذُوْنَ الشَّقْلَ وَالنَّعْلَ بِالنَّعْلِ وَتَرْفَعُ لَکُم

جس طعن بنی اسرائیل پر آیا جیسا کہ جوتے کے ساتھ جوتا ملے۔ تو اس طعن آن کے بعد مسائل کا حل بھی صرف اور صرف قرآن پاک میں ہی ہے۔ قرآن پاک کا مشاہدہ و سرادیکھنے اور اذہان کو کتاب الہی کے قریب تر کرنے کے لیے دروس القرآن یقیناً بہترین رہنما ہو چکی ہے۔ علماء، طلباء، خطباء اور خواہم بلکہ ہر طبقے کے لیے یکساں مفید ہے۔ تفسیر کے ساتھ ساتھ عام فہم، سلیس اور دلچسپ نیز ترجمہ بھی سامنے آ رہا ہے۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب دروس حضرت صوفی صاحب دہم مجید بھگوان اور ان کے مجلس اراکین جو کہ دروس القرآن کی طباعت اور ان دروس کو کمیشنوں

کے ذریعے ہر خاص و عام تک پہنچانے کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ خصوصاً جناب الحاج لعل دین صاحب  
ایم اے علوم اسلامیہ اور اس میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی بخشش کا ذریعہ بنائے ان کی اس سعی کو قبول  
فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

فقط

محمد شرف (فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم)

۵ صفحہ ۱۴۰۵ھ مطابق ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء





سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَكِّيَّةٌ مَدَنِيَّةٌ هِيَ مَائَتَانِ وَصِشْتٌ وَفَاتُونَ يَتَأَوَّلُونَ رَبُّوهُمَا  
سورة بقرہ مدنی ہے اور یہ دو سو چھپاسی آیتیں اور چالیس رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَىٰ لَلْهُدَىٰ ۚ ذِي الْكِتَابِ لَا رَيْبَ ۚ فِيهِ يَهْدِي اللَّهُ لَلْهُدَىٰ ۚ

ترجمہ۔ ۱۔ ۱۔ یہ کتاب، انہیں شک اس میں یہ رہنمائی کرتی ہے مقبول کی ۲

سورۃ کے موضوع اور نام سے پہلے قرآن کریم کی سورۃوں سے متعلق چند بنیادی باتوں کا ذکر ضروری ہے، اس کے بعد سورۃ بقرہ کے نام کے بارے میں کچھ بیان ہوگا۔

لفظ سورۃ اس کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے قِطْعَةٌ مِّنْ اٰیٰتٍ یعنی آیتوں پر مشتمل ایک ٹکڑا یا حصہ۔ مگر یا چند یا زیادہ آیتیں مل کر ایک ٹکڑا بن جائے تو اسے سورۃ کہا جاتا ہے۔ کسی سورۃ کے لیے کم از کم تین آیات کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ سورۃ عصر، سورۃ کوثر اور سورۃ نصر تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ سورۃ لقہ سب سے لمبی سورۃ ہے۔ اور اس کی دو سو چھپاسی آیت ہیں۔

سورۃ اور آیت

سورۃ کے ہر ٹکڑے کو آیت کہتے ہیں۔ جس طرح سورتیں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں، اسی طرح آیتیں بھی چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی آیت ایک لفظ کی بھی ہو سکتی ہے جیسے اَللّٰهُ یَا حَسْبُ اور ایک حرف بھی ایک آیت ہو سکتا ہے جیسا کہ ق۔ ن وغیرہ اور بعض آیات تہی لمبی ہوتی ہیں کہ پورے ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جیسے سورۃ منزل کے دو سو رکوع والی آیت ہے۔

آیت کا معنی علامت اور اس کا دوسرا معنی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں آیت کا لفظ

آیت کے مختلف معانی

ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں زمین و آسمان کی پیدائش، دن رات کے اختلاف، پانی میں چلنے والی کشتی، بارش اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے پھلوں وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: **لَاٰیٰتٍ لِّہٖمْ یَعْلَمُوْنَ** اس میں غمنہوں کے لیے قدرت کی نشانیاں یا علامات ہیں۔ سورۃ روم میں فرمایا: **وَمِنْ اٰیٰتِہٖ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا** یہ بات اللہ تعالیٰ کے دلائل قدرت میں سے ہے کہ میں نے تمہارے نفسوں میں سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے۔

قرآن میں آیت کا لفظ عبرت کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ میں فرمایا: **کَیۡۤاٰیۡہٗ بَآتِ لُوۡکُوۡنَ کُوۡہِۡمَیۡتَۃٍۭۤ اٰیۡتَۃٍۭۤ لِّیۡۤسَ لَکُمۡ مِّنۡ قَبْلِہُمۡ مِّنَ الْقُرُوۡنِ** ہم نے اس سے پہلے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا، **یَعْمُرُوۡنَ فِیۡ مَسٰکِنِہُمۡ** جو اپنے مکانوں میں چلتے پھرتے تھے، **اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَآٰیٰتٍ** اس میں درس عبرت ہے۔ اسی طرح آیت کو معجزے کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے انبیاء علیہم السلام نے معجزات پیش کئے۔ جن کا مطالبہ قوم کے لوگ کرتے تھے۔ سورۃ مدہ میں دو مقامات پر آیات **وَلِیَعْمَلَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا** **اَلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِۭ یٰۤاٰیۡہٗ مِّنۡ رَّبِّہٖ** کفار کہتے ہیں کہ اس کے رب کی طرف سے اس پر کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل ہوتا گویا آیت کا معنی معجزہ بھی ہوتا ہے۔

آیت کا معنی حکم بھی آتا ہے۔ جیسے **یَسۡتَلُوۡا عَلَیۡہِہٖۤ اٰیٰتِہٖ** پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے احکام پڑھ کر سناتا ہے۔ یا جیسا کہ سورۃ عنکبوت میں فرمایا: **وَمَا یَنۡجِیۡکُمۡ بِاٰیٰتِنَا اِلَّا الْکٰفِرُوۡنَ** اور ہمارے احکام سے کافر ہی نجات کرتے ہیں۔

تاہم ان تمام تر معانی کے باوجود جب آیت کا لفظ سورۃ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی سورۃ کا ایک حصہ یا جزو ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت سی آیات مل کر سورۃ ترتیب پاتی ہے جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا تھا۔ قرآن پاک کی کل ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ سب سے پہلی سورۃ فاتحہ ہے۔ دوسرے نمبر پر سورۃ بقرہ ہے۔ پھر اہل علم اہل اور سورۃ نساء ہے۔ یہ ترتیب اجتہادی نہیں بلکہ توفیقی ہے۔ یعنی یہ ترتیب صحابہ کرامؓ کی دی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ یہ

سورتوں اور آیتوں  
کی ترتیب

حضور علیہ السلام کی مقرر کردہ ترتیب ہے۔ اسی طرح ہر سورۃ میں آیات کی جو ترتیب ہے مثلاً  
 پہلے الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اس کے بعد الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور  
 مَلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ یہ ترتیب بھی قرعنی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **ضَعُوا هَذِهِ  
 الْآیَةَ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُدْكَرُ فِيهَا كَذًا وَكَذًا** یعنی اس آیت کو فلاں مقام پر  
 رکھ دو، تو صحابہ کرامؓ نے آپ کے فرمان کے مطابق آیات کی ترتیب دے لیا۔ انہوں نے اپنی  
 طرف سے آگے پیچھے نہیں کیا۔ بلکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل کی۔ اس آیت  
 میں صاف طور پر آتا ہے کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو حضور علیہ السلام ارشاد فرماتے، اسے  
 فلاں مقام پر رکھ دو۔ تو صحابہ کرامؓ ویسے ہی کرتے۔ البتہ سورتوں کی ترتیب کے متعلق کچھ اختلاف  
 پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین محققین فرماتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا  
 قطعی فرمان نہیں ہے تاہم تبہور کہتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب بھی حضور علیہ السلام کے ارشاد کے  
 مطابق ہی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہی موجودہ ترتیب  
 کو قائم کیا۔

سورتوں کے اقسام  
 بطاۃ طوالت

قرآن پاک کی پہلی سات سورتوں یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر سورۃ یونس تک کو  
 سبع طوالت یعنی سات لمبی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چودھویں پائے میں سورۃ نحل تک  
 کو ثانی یعنی طوالت کے بعد دس گز مبر والی سورتیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد حجرات تک کی سورتوں  
 کو تیسری کہا جاتا ہے۔ مثنیٰ سے مراد وہ سورتیں ہیں جو کم و بیش ایک سو آیات پر مشتمل ہوں  
 اس کے بعد والناس تک سورتیں مفصلات کہلاتی ہیں۔ آگے مفصلات کے بھی تین گروپ  
 ہیں۔ حجرات سے لیکر سورۃ بروج تک کو طوالت مفصل بروج سے لے کر سورۃ جینہ تک وساد

۱۔ تفسیر اتقان فی علوم القرآن للسیوطی ص ۲۱۲ مطبوعہ بیس اکیڈمی لاہور۔

۲۔ تفسیر اتقان ص ۲۱۲ ۳۔ ترمذی ص ۲۱۲۔

۴۔ ترمذی ص ۲۱۲، تفسیر اتقان ص ۲۱۲، مسند احمد ص ۱۰۰، متذکر مالک ص ۲۳۲۔

۵۔ روح المعانی ص ۲۱۲ ۶۔ روح المعانی ص ۲۱۲۔

مفصل اور پھر آخر تک کو قصار مفصل کہا جاتا ہے۔ تمسار کا معنی چھوٹی سورتیں ہے۔

قرآن کریم کی مختلف سورتوں کے ناموں کی مختلف وجوہات ہیں۔ بعض سورتوں کے نام ان کے ابتدائی حروف ہیں ق۔ ص۔ ط۔ یٰس وغیرہ بعض سورتوں کے اسماء ان کے پہلی آیت کے کسی لفظ پر رکھے گئے ہیں۔ جیسے سورۃ کوثر کا نام اس کی پہلی آیت اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكُوثُرَ سے لیا گیا ہے۔ کسی سورۃ کا نام اس سورۃ میں مذکور مشہور واقعہ سے ماخوذ ہے۔ جیسے بقرہ کہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اسی طرح اسراء میں معراج کا واقعہ آیا ہے۔ سورۃ اعراف میں اعراف کا واقعہ ہے۔ جو کہ ایک جگہ کا نام ہے۔ سورۃ الزمران کا نام بھی واقعہ الزمران کی وجہ سے ہے۔ سورۃ یونس کا نام یونس اس لیے ہے کہ اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔

زمانہ نزول کے لحاظ سے سورتوں کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی مکی اور مدنی سورتیں جو سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں وہ مکی کہلاتی ہیں۔ خواہ وہ مکہ معظمہ میں قیام کے دوران نازل ہوئیں یا کوفہ میں یا کسی اور سفر کے دوران۔ مدنی سورتیں وہ ہیں، جو ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد جو بھی سورتیں نازل ہوئیں۔ خواہ وہ قیام مدینہ کے دوران یا تبوک یا خیبر یا کسی اور مقام پر وہ سب مدنی سورتیں کہلاتی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے زمان و مکان کے لحاظ سے کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ مثلاً جو سورۃ حفصہ یعنی اقامت کی حالت میں نازل ہوئی۔ وہ حفصہ کہلاتی ہے۔ اور جو سفر کی حالت میں اتری اس کو سفری سورۃ کہتے ہیں۔ اسی طرح رات کے وقت نازل ہونے والی سورۃ یسلی اور دن کے وقت اترنے والی نہاری کہلاتی ہے۔

بعض سورتیں دفعۃً یعنی یکدم نازل ہوئی ہیں۔ ان کو دفعی سورتیں کہتے ہیں اور بعض سورتیں تدریجی کہلاتی ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ تدریجاً نازل ہوئی ہیں۔ کبھی چند آیتیں نازل ہو گئیں۔ پھر درمیان میں وقفہ آگیا پھر کچھ نازل ہو گئیں۔ یہ تدریجی سورتیں ہیں۔ بعض سورتیں ایسی ہیں جو کہلاتی تو مدنی ہیں مگر ان کے کچھ حصے مکی دور میں نازل ہوئے مثلاً

یہی سورۃ بقرہ مدنی سورۃ ہے۔ مگر اَمَّا الرَّسُولُ فَمِنْ لَدُنْكَ فَخَرَّمَا کی آیتیں مکی زندگی کا حصہ ہیں۔ مشہور روایت میں آتا ہے کہ معراج کے دوران حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تین ٹھنڈے دیے گئے۔ یعنی پانچ نمازیں۔ سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں۔ اور ان لوگوں کے لیے خوشخبری جو شرک میں طرقت نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا معراج مکی زندگی میں ہو۔ لہذا یہ آخری آیتیں مکی زندگی کی ہیں۔ اگرچہ سورۃ بقرہ مدنی سورۃ ہے۔

ترتیب تلاوت  
کی حکمت

مفسرین کرم فرماتے ہیں کہ ترتیب نزول کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے مکی سورتیں آئیں اور اس کے بعد مدنی سورتوں کا بیان ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم تمام نوع انسانی کے لیے نازل ہوا ہے۔ اور مختلف انسانوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسانی مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے وہ سورتیں رکھی ہیں جو جامع اور مانع ہیں اور ان میں ہر قسم کے حکم پائے جاتے ہیں۔ اور یہ معاملہ پر مدنی سورتیں ہیں۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر فیضانِ عقائد کا ذکر ہے۔ ان میں ہر قسم کے احکام نہیں پائے جاتے۔ تو گویا پہلے مدنی سورۃ لینی سورتوں کو لانے میں حکمت یہ ہے کہ لوگ ہر قسم کے احکام سے مانوس ہو جائیں۔

فضیلت سورۃ

حدیث پاک میں سورۃ بقرہ کے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ ترمذی شریف کی روایت میں نبی علیہ السلام کا فرمان ہے۔ لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِلَ مَعْبَدَتِي یعنی اپنے گھروں کو قبروں کی طرح سنان نہ بناؤ۔ بلکہ وہاں نمازیں بھی پڑھا کرو۔ نیز یہ بھی فرمایا وَارْتَأِ الْبَيْتَ الَّذِي تَقْرَأُ الْبَقْرَةَ فِيهِ لَا يَدْخُلُهُ الشَّيْطَانُ مَعْنَى تِسْ عَشْرِينَ سورۃ بقرہ کی تلاوت ہوتی ہو۔ وہاں شیطان داخل نہیں ہوتا، مسلم شریف کی روایت میں اس طرح آتا ہے يُؤْتَى بِالْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَأَهْلِيهِ الَّذِينَ كَانُوا يَعْمَلُونَ بِهَا تَقْدِمُهُ سُورَةُ الْبَقْرَةِ وَأَرْعَمُرَانِ عِنْدَ قِيَامَتِ كَيْ رُوزِ الْقُرْآنِ پاك اور اس کے اہل کو لایا جائے گا۔ ان کے آگے سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران ہوگی۔



یہاں پر یہ بات یاد رہے کہ اہل قرآن سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن پاک پر عمل کرتے ہیں۔  
 آج کل تو چکڑا لوی اور پر دیزی وغیرہ اہل قرآن کہلاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ گمراہ اور منکرینِ قرآن ہیں۔  
 ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں تَقْلَمُوا سُورَةَ الْبَقَرَةِ فَإِنَّ أَخَاهُ  
 بَرَكَاتٍ یعنی سورۃ بقرہ سیکھو۔ کیونکہ اس کا سیکھنا باعثِ برکت ہے۔ وَتَرْكُهَا حَسْرَةٌ  
 اور اس کا ترک کرنا باعثِ حسرت ہوگا۔ نیز فرمایا لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامٌ وَسَنَامُ الْقُرْآنِ  
 سُورَةٌ، اَلْبَقَرَةُ ہر چیز کی ایک کوہان یا بندی ہوتی ہے۔ اہل قرآن کی کوہان سورۃ بقرہ ہے  
 یعنی یہ سورۃ قرآن پاک میں اس طرح نمایاں ہے جس طرح اونٹ کی پشت پر کوہان نمایاں ہوتی ہے۔  
 فرمایا سورۃ بقرہ میں ایک ایسی آیت ہے جی سَيِّدَةُ اَيُّ الْقُرْآنِ اَيُّهُ  
 الْكُرْسِيِّ یہ قرآن پاک کی تمام آیتوں کی سردار ہے۔ یعنی آیت الکرسی۔ گویا سب بڑی اور سب سے  
 فضیلت والی آیت اسی سورۃ میں ہے۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ سورۃ بقرہ فَطْلُطُ  
 الْقُرْآنِ یعنی قرآن کا خیمہ ہے جس میں ہر چیز آباد ہے۔ فرمایا اِقْرَؤْ وَالزَّهْرَ اَوْ مِنْ  
 الْبَقَرَةِ وَالْعَمْرَانَ دو روشن سورتیں پڑھو۔ یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران۔ یہ قیامت  
 کے روز اس طرح آئیں گی جس طرح دو بادلی ہوتے ہیں۔ اور ان کے درمیان بڑی چمک برگی  
 یہ سائبان کی طرح اُوپر آئیں گی۔

مسند احمد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ اَلْبَقَرَةُ سَنَامُ الْقُرْآنِ  
 سورۃ بقرہ قرآن کریم کی کوہان ہے۔ اس کی ہر آیت کے ساتھ اسی۔ اسی فرشتے اترتے ہیں  
 ہیں۔ یعنی ہر آیت کے نزول کے وقت ملائکہ کا نزول ہوتا تھا۔ فرمایا اس کی اہمیت اللہ مَوَالِہُ  
 اَزَّهْوَةً الْحَيِّ الْقَيُّومُ ؕ کو اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے سے نکال کر سورۃ میں شامل کیا ہے  
 اسی آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم بھی ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں مختصر طور پر بہت سے مضامین آجاتے ہیں مثلاً اس میں اللہ تعالیٰ نے مضامین سورۃ

۱۔ مزہبہ ۲۔ ذریعہ ۳۔ مصلحت ۴۔ ترمذی ۵۔ متذکرۃ منہ کے نام ہیں

۶۔ تغیر ۷۔ مزہبہ ۸۔ ذریعہ ۹۔ مصلحت ۱۰۔ متذکرۃ منہ کے نام ہیں

نے منعم علیہم لوگوں کے بجز اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اور ان کے نتائج سے آگاہ کیا ہے اسی طرح کھراہ لوگوں کے اوصاف اور ان کی نشانیاں بیان کی ہیں۔ جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں اس سورۃ مبارکہ میں توحید باری تعالیٰ اور رسالت کا ذکر دلائل عقلیہ اور نقلیہ کے ساتھ آیا ہے ختم نبوت کا بیان ہے۔ اور وحی کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔ انسان کے مکلف ہونے کا بیان ہے۔ اور پھر وحی الہی کی احتیاج کا ذکر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر انسان اپنے تمام تر مسائل کو حل نہیں کر سکتے۔ انہیں زندگی کے ہر موڑ پر وحی الہی کی دستگیری کی ضرورت ہے۔

اس سورۃ میں عبرت حاصل کرنے کے لیے مختلف ذرائع کو بیان کیا گیا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ان کے فتنائی کا ذکر ہے۔ بنی اسرائیل کے اسلاف پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا بیان ہے۔ اور موجودہ بنی اسرائیل کی جانتوں، شرارتوں، ان کے غدار اور ضد کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں قت ابراہیم کا ذکر ہے۔ بیت اللہ شریف کے کعبہ ہونے کا ذکر ہے۔ تہذیب، حلق اور تعلیم کے ارکان اتمیر منزل اور سیاست دن کا ذکر ہے۔ غیر اللہ کی نذر و نیاز کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس میں قوانین مملکت اور خلافت کبریٰ کے اصول بیان کیے گئے ہیں کہ امیر کیسا ہونا چاہیے۔ اور قوج کے لیے کیا قوانین ضروری ہیں۔

اس سورۃ مبارکہ میں اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کی پہچان کرائی گئی ہے۔ سخاوت کی ترغیب دی گئی ہے۔ بخل کی مذمت بیان ہوئی ہے۔ سود کی حرمت اور تجارت کے قوانین کا بیان ہے۔ عبادت نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل ہیں۔ معاشرتی امور سے متعلق نکاح، طلاق، قسح، ایلا وغیرہ کے احکام ہیں۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کا بیان ہے۔ عقوبات میں قصاص اور دیت کے احکام ہیں۔ اصلاح معاشرہ، عباد اللہ، فی سبیل اللہ، غرض اس سورۃ مبارکہ میں سینکڑوں ہزاروں مضامین بیان ہوئے ہیں

اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔ بقرہ عام طور پر گائے کے لیے بولا جاتا ہے تاہم عربی زبان میں یہ لفظ گائے اور بیل دونوں کے لیے مشترک ہے۔ اگر وضاحت کرنی ضروری ہو تو بیل کے لیے ثور کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ بہر حال اس سورۃ مبارکہ میں جس بقرہ کا ذکر ہے کہ وہ نہر ہر یا مادہ ہو۔

نام اور کوائف

قرآن پاک کے الفاظ و حروف کے اعداد و شمار جمع کرنے والے لوگوں کے مطابق اس سورۃ کی دو سو چھیاسی یا دو سو ستاسی آیتیں اور چالیس رکعات ہیں۔ اس میں چھ ہزار دو سو اکیس علامات اور پچیس ہزار پچیس حروف ہیں۔

سورۃ فاتحہ کے پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء ہے۔ دوسرے حصے میں بندے کی طرف سے اس بات کا اقرار ہے کہ وہ نہ تو اسی کا عبادت گزار ہے۔ اور اسی کی اعانت کا طالب ہے۔ تیسرے حصے میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اَعِدْنَا الْقِيَامَ الْمُنْتَقِمَ اے پروردگار! ہمیں یہ سزا سستے کی طرف راہنمائی فرما۔ چنانچہ اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس ہدایت اور راہنمائی کی تمہیں ضرورت ہے، ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ مِنْهُ فِیْهِ نَبَأٌ بِیْهِ كِتَابٌ ہے جو مکرر و منہج ہدایت ہے۔ اس کو منہجِ طری کے ساتھ پکڑو سورۃ فتح اور سورۃ بقرہ میں پڑھا ہے۔

قرآن پاک میں بیان کردہ واقعات عام طور پر کئی سورتوں میں آئے ہیں مثلاً فرعون کا واقعہ قرآن پاک میں تقریباً پچاس مرتبہ بیان ہوا ہے اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات مختلف مقامات پر بیان ہوئے ہیں۔ تاہم یہ گھسے کا واقعہ صرف سورۃ بقرہ ہی میں بیان ہوا ہے۔ قرآن پاک کے کسی دوسرے مقام پر اس واقعہ کا کوئی حصہ نہیں آیا۔ شاید عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس واقعہ میں دین کے تمام مہمات یعنی اہم باتیں سمجھا دی گئیں ہیں۔

اس واقعہ کی اہم ترین بات اللہ وحدہ لا شریک کی پہچان اور شناخت ہے۔ جب بنی اسرائیل کو ایک آدمی قتل ہو گیا، تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سلسلہ میں دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ گائے ذبح کر دو۔ اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا مرے کے جسم پر مار دو۔ وہ خود بخود جاتے گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔ بنی اسرائیل نے ایسا ہی کیا تو مردہ زندہ ہو گیا۔ اور اس نے اپنے قاتل کی نشاندہی کر دی۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مردہ گشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہو گیا تھا یا خود بخود ہی بکھڑا ہو گیا تھا۔ اگر خود بخود زندہ ہو گیا تو دوسرے سینکڑوں ہزاروں مرٹے خود بخود کیوں نہیں زندہ ہو جاتے۔ اور اگر وہ مردہ گائے کا گشت لگانے کی وجہ سے زندہ ہوا، تو گائیں بھی بشمار ذبح ہوتی ہیں۔ مردوں کو زندہ کرنے کا یہ آسان نسخہ ہے۔ ہر مرٹے کو زندہ کر کے لیے اسے کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کا وہ مردہ نہ تو خود بخود زندہ ہو گیا۔ اور نہ ہی گائے کا گشت لگانے سے۔ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہوا۔ جو صانع اور قہر مطلق ہے۔ لہذا اللہ رب العزت کی سب سے بڑی چھان بسی ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت مجید میں آتی ہے۔ اور یہ سورۃ مبارکہ کی سب سے اہم بات ہے۔

ثبوت نبوت  
اس سورۃ میں دوسری اہم بات نبوت کا ثبوت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قاتل کا پتا لگانے کے لیے جو طریقہ بتایا، وہ کامیاب ہوا۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ثابت ہو گئی جب ایک نبی کی نبوت ثابت ہو گئی۔ تو علم انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا یقین ہو گیا۔ نیز یہاں پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ نبی کی بات کو بغیر تفتیش کے تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس میں حیل و حجت نہیں کرنی چاہیے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے بتائے گئے طریقے میں چھان بین شروع کر دی۔ کہ جس گائے کو ذبح کھڑے کے لیے کہا گیا ہے وہ کیسی ہونی چاہیے اور اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔ اگر وہ لوگ اپنے نبی کے حکم کے مطابق فوراً عمل کرتے ہوئے گائے ذبح کر دیتے، تو مسئلہ فزاعل ہو جاتا۔ انہوں نے اپنے اوپر جس قدر سختی کی، اُسی قدر قیدیں بڑھتی چلی گئیں۔

استقامت  
کی ضرورت  
اس واقعہ میں تیسری اہم چیز استقامت ہے۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے عقیدے عمل اور اخلاق پر قائم رہے۔ اگر استقامت میں لغزش آجائے گی۔ تو کئی قسم کے فساد پیدا ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے آدمی کے قاتل نے اس جرم کا ارتکاب اس لیے کیا تھا۔ تاکہ مقتول کو راستے سے ہٹ کر چچا کا سارا مال حاصل کر لے۔ گویا اُس نے استقامت کو چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذلّت و سرائے معلوم ہوا کہ استقامت بڑی چیز ہے اس کو چھوڑنے سے ذلت و سوائی کا منہ کرنا پڑتا ہے۔

اس واقعہ کی پوری بات مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ دین اور ایمان کے راستے میں کوشش

اور جدوجہد کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ جوانی کے عالم میں انسان کی عقل مغلوب ہوتی ہے۔ انسان پر خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس عمر میں اکثر لوگ مجاہدہ میں ناکام ہوتے ہیں۔ جب انسان پر بڑھاپا آجاتا ہے۔ تو ظاہری قوتیں کمزور ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف حیات انسان کے قلب و ذہن میں سخت سوچنی ہوتی ہے لہذا اس عمر میں بھی انسان مجاہدہ سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہذا اس کی بڑی اہمیت اور بہت زیادہ ضرورت ہے۔

اس واقعہ کی پانچویں اہم چیز معاد یعنی حیات بعد الممات کا ثابت ہونا ہے۔ یہ پورا واقعہ معاد ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کَذٰلِكَ يُخَيِّطُ اللّٰهُ الْمَوْتٰی یعنی جس طرح اس مرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا، اسی طرح معاد میں سب کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

یہ تمام دین کے بنیادی اور اہم اصول ہیں۔ باقی چیزیں ان کے ضمن میں آتی ہیں اس ایک واقعہ میں خدا تعالیٰ نے دین کے بنیادی مسائل اور معارف سمجھائے ہیں۔ اس لیے اس سورۃ کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا ہے۔

اس درس میں سورۃ بقرہ کے فضائل اور اس کے مجموعی مضامین کا مختصر بیان ہوا۔ اللہ و درس میں انشاء اللہ آلہ کے تعلق بیان کیا جائے گا۔

الْقَا

درس دوم

البقرة

(آیت ۲۱)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الْقَا ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ②

تو عجب ہے۔ الْقَا ① یہ کتاب میں شک اس میں۔ یہ رہنمائی کرتی ہے متقیوں کی ②

محکمات، متشابہ  
مقطعات

گزشتہ درس میں سورۃ بقرہ کی فضیلت، اس کے نام اور اس کے موضوعات کا اجمالی تذکرہ ہوا تھا۔ اس درس میں حروف مقطعات میں سے الف، لام، میم کے متعلق بیان ہوگا۔ اصولی طور پر یہ بات معلوم کر لینی چاہیے کہ قرآن کریم میں تین قسم کی آیات ہیں۔ پہلی قسم کی آیات محکمات ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی آیات کے الفاظ بھی معلوم ہیں اور ان کا مطلب اور مراد بھی معلوم ہے۔ گویا یہ آیات بالکل واضح ہیں۔ قرآن پاک کی اکثر آیتیں محکمات ہیں۔ آیات کی دوسری قسم متشابہات ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے الفاظ کا معنی تو معلوم ہے۔ مگر ان کی حقیقت پر شبہ ہے۔ مثلاً آیت کریمہ الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی میں رَحْمٰن عَرْشِ اللہ استوائی کے معانی معلوم ہیں۔ مگر اس کی حقیقت انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔ وہ غامض اور دقیق ہے۔ گویا معنی تو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر جلوہ گر ہے۔ مگر جلوہ گر ہونے کی کیفیت ذہن انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ایسی آیات متشابہات کہلاتی ہیں۔

تیسری قسم کی آیات مقطعات کہلاتی ہیں۔ یہ مفرد حروف ہیں۔ جو قرآن پاک کی انیس سورتوں کے ابتداء میں آتے ہیں۔ سورۃ بقرہ بھی انہیں میں سے ہے۔ جو الْقَا سے شروع ہوتی ہے۔ دوسرے مقامات پر ق، ص، ی، ا، ک، ر، ی، س، ط، ش، و غیرہ کے حروف آتے ہیں۔ مقطعات کا مطلب یہ ہے کہ ان کا معنی واضح ہے۔ اور نہ ان کی مراد معلوم ہے۔

احکام تہذیبی  
اور ان کی حکمتیں

تاہم ہر قسم کی آیات کے احکام پر ایمان لانا ضروری ہے۔ خواہ ان احکام کی حکمتیں واضح ہوں یا غیر واضح۔ مثلاً نماز پڑھنے میں حکمت یہ ہے کہ انسان اپنے معبود کے سامنے تواضع کرے۔ اور اپنے منعم کا شکر ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ جو کہ عبادت کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور جناباات پیش کرنے کی حکمت بالکل واضح ہے۔ اسی طرح روزہ کا مقصد نفس کو دہانا شہوت کو مغلوب کرنا ہے۔ تاکہ انسان میں تقویٰ کی روح پیدا ہو سکے۔ بھوک اور پیاس سے خواہشات نفسانی پر غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بھی واضح حکمت ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس میں دو بڑی حکمتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مساکین کی حاجت سہارنی کی جاتی ہے تاکہ کوئی غریب بھوکا پیاسا نہ رہے۔ اور دوسری یہ کہ انسان بخل کے مارے سے پاک ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے مال سے زکوٰۃ نکالتا ہے گا اس میں بخل کی بجائے سخاوت کا روپ پیدا ہوگا۔ لہذا زکوٰۃ کی حکمت بھی واضح ہے۔

اب بعض احکام ایسے ہیں جن کی حکمتیں بڑی گہری ہیں۔ اور ہر آدمی انہیں نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً حج کے ارکان منجملہ ان کے بیت اللہ شریف کا طواف۔ منیٰ اور عرفات کا وقت ہے۔ جہالت کی رہی ہے۔ ان احکام کی حکمتیں غامض اور دقیق ہیں۔ مگر ان پر ایمان لانا اور اس کے مطابق عمل کرنا ہر ملک کے لیے لازم ہے۔ اور جن احکام کی حکمت واضح نہیں۔ ان کے متعلق زیادہ کہہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ان احکام کی بر حالت میں تعمیل کرنی چاہیئے۔ خواہ وہ احکام آیات محکمات کے ہوں یا آیات متشابہات کے ہوں۔

فہرست  
مذہب کی کتاب

اسی طرح حدود مقطعات کے بارے میں بھی زیادہ کہہ کر یہ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں سے کوئی بھی ایسا معلوم نہیں ہوا۔ جس نے حدود مقطعات کی کریمہ کی ہو جس طرح حضور علیہ السلام نے فرمایا صیغے تسلیم کر لیا مگر بعض فرماں تحقیق پسند ہوتے ہیں۔ وہ معاملہ کی نہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن حدود کے معانی ہی معلوم نہیں۔ ان کے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ چنانچہ



صحابہ کرامؓ کے دور میں بھی بعض لمبی ذہن کے لوگ تھے۔ جو ان کے متعلق سوال کرتے تھے۔  
حضرت علیؓ کے دور خلافت میں بھی بعض لوگوں نے ان الفاظ کے معانی پر مجھے۔ بعض نے  
حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس کا مطلب دریافت کیا۔ تو انہوں نے تقریب ذہن  
یعنی ذہن کو قرآن کریم کے قریب کرنے کے لیے کچھ معانی بتائیے۔ اس کے بعد دوسرے  
مفسرین کرامؓ نے بھی اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان الفاظ کے معانی بیان فرمائے مگر ان میں  
سے کوئی بھی معنی اقلیٰ نہیں ہے۔ محض احتمال اور ظن غائب سے کچھ معانی بیان کر دیے ہیں تاکہ  
ذہن قرآن پاک سے مانوس رہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض صحابہ کرامؓ اور مفسرین صالحین کے  
اقوال ملتے ہیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ

حضرت ابو جرحہؓ نے کہا کہ شَبَّ لِكُلِّ كِتَابٍ رِسْوَةٌ یعنی ہر کتاب میں کوئی نہ کوئی  
رازد کی بات ہوتی ہے۔ یعنی ہر کتاب کی ہر چیز واضح نہیں ہوتی بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی چیز  
پوشیدہ بھی ہوتی ہے۔ جو عام انسانوں کی سمجھ سے بالا ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں  
وَرِسْوَةُ الْقُرْآنِ أَوَّلُ السُّورِ یعنی قرآن پاک کے اسرار اس کی ابتدا میں حروف مقطعات ہیں  
حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ لِكُلِّ كِتَابٍ صَفْوَةٌ یعنی ہر کتاب  
میں کوئی نہ کوئی چھائی ہوئی یا منتخب بات ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم میں ایسی بات حروف  
تبی السّٰوۃ وغیرہ ہیں۔ جنہیں ہر آدمی کا سمجھنا ضروری نہیں۔

حضرت علیؓ

حضرت ام شجیہؓ

امام عمار بن تریحیل المعروف شعیبؓ نے پانچ سو صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہے۔ اور ان سے  
علم حاصل کیا ہے۔ آپ امام ابو حنیفہؒ کے استاذ ہیں۔ جب آپ سے حروف مقطعات کا مطلب  
پوچھا گیا تو فرمایا رِسْوَةُ اللَّهِ فَلَا تَطْلُبُوا بِهِ اللہ کے راز ہیں۔ ان کے پیچھے مت پڑو۔ ہر  
کتاب ہے تم انہیں سمجھنے میں ناکام رہو اور کسی غلط چیز میں مبتلا ہو جاؤ۔ لہٰذا تم انہیں صرف پڑھ  
لیا کرو۔

حضرت ابن مسعودؓ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کے ہر حرف کی تلاوت پر

۱۰۰ تغیر عزیزی ۲۰۰ تغیر کبریٰ ۳۰۰ تغیر عزیزی ۴۰۰

۵۰۰ تغیر عزیزی ۶۰۰ تغیر کبریٰ ۷۰۰ تغیر عزیزی ۸۰۰

۹۰۰ تغیر کبریٰ ۱۰۰۰

۱۱۰۰ تغیر عزیزی ۱۲۰۰ تغیر کبریٰ ۱۳۰۰

دس نیکیاں عطا فرماتے ہیں۔ جو مومن ان حدود کو پڑھے گا۔ سب سے نیکیاں حاصل ہوں گی  
یہی بہت بڑی غنیمت ہے۔ لہذا ان کے معانی تلاش کرنے میں کوشش نہ کرو۔

امام رازی پچھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے بڑے عظیم مفسر قرآن گزے ہیں۔ جس قرن تیسری  
صدی میں امام ابن جریر طبری اور چوتھی صدی میں ابو جرحصاص برائے ہیں اسی طرح آپ کا مقام  
تھا ابو جرحصاص معنی تھے۔ اور امام رازی شافعی تھے۔ امام ابن جریر خود مجتہد صاحب مذہب تھے۔  
اور کسی کے متقلد نہیں تھے۔ ابو جرحصاص نے صرف احکام کی تفسیر کی ہے۔ یعنی قرآن پاک کی صرف  
ان آیات کی تفسیر لکھی ہے جن میں احکام بیان ہوئے ہیں۔ البتہ امام رازی نے پچیسویں پارے  
تک مکمل تفسیر کی ہے۔ اس کے بعد آپ وفات پا گئے۔ چنانچہ بقیہ تفسیر آپ کے نہایت قابل  
شگردوں نے کی۔ اس تفسیر کی آخری دو جلدیں امام رازی کی اپنی ماییت نہیں۔ بلکہ آپ کے تلامذہ  
کی ہے۔ ان آخری جلدوں کا مقابلہ پہلی جلدوں کے ساتھ کرتے ہیں، تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا  
اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ شرف عطا فرمایا۔

حدوث مقطعات کے متعلق امام رازی کا قول یہ ہے کہ السّہ سورۃ بقرہ کا دوسرا  
نام ہے۔ ایک نام بقرہ ہے۔ اور دوسرا السّہ ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ السّہ اور دیگر حدوث مقطعات کا بعض حصہ  
عشق وغیرہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک ہیں۔ امام رازی نے ایک ہدایت ذکر کی ہے۔  
کہ اللہ تعالیٰ کے چھ ہزار نام ہیں۔ اس نے اپنے تمام اسماء آسمانی کتابوں میں نازل فرمائے ہیں۔  
سوائے ایک کے جو اس نے مخصوص کر لیا ہے۔ اور کسی کو نہیں بتایا۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ السّہ  
یعنی اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جیسا کہ حصہ کے متعلق امام ابن کثیر نے  
لکھا ہے تَذَكُّرُكَ فِي خَمْسٍ وَالزَّمَجُّ شَلْجُوبٌ وَوَحْشٌ كَاوِاسُطٌ كَرُكَاوِاسٌ  
مُورٌ وَوَحْشٌ مَلَاخٌ قَبْلَ التَّقْدِيرِ۔

مقطعات  
اسم اللہ ہیں

تفسیر کبیرہ

تفسیر ابن کثیر

تفسیر کبیرہ

تفسیر کبیرہ

اس کے جواب میں کہتا ہے۔ کہ اب جب کہ نیزے کھٹک رہے ہیں۔ اب واسطہ پیش کرتا  
ہے۔ ختم کا واسطہ پہلے کیوں نہ دیا تاکہ ہم لڑائی شروع نہ کرتے۔ اب ہم لڑائی نہیں چاہتے  
اس مقولہ سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ختم جو حروف مقطعات میں سے ہے  
یہ اللہ کا نام ہے۔

بعض اس کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ حروف مقطعات اللہ کا پورا نام نہیں بلکہ بعض اسماء  
کی طرف اشارات ہیں مثلاً الف کا اشارہ اس کے ذال نام اللہ کی طرف ہے۔ ل سے مراد  
رحمن ہے۔ اور اسی طرح ک کا اشارہ کافی کی طرف ہے ل کا اشارہ اکم لطیف کی طرف  
ہے۔ اور ہ سے مراد ملک اور اکم مجید ہے۔

بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات قرآن پاک کے نام ہیں جیسے ختم  
یس۔ الہ وغیرہ۔ حضرت ام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتب الفوز البکیر، خیر کثیر،  
اور ہوامع میں حروف مقطعات پر بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کشفی طہ  
پر یہ فہم دیا ہے۔ کہ جس سورۃ کی ابتداء میں یہ حروف آتے ہیں اس سورۃ کا خلاصہ اور عنوان  
ان حروف میں مذکور ہے۔ ان حروف سے سورۃ کے مضامین کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ الفاظ  
ایسے ہی ہیں۔ جیسے کسی شخص کے لیے مفتی، قاضی، امیر سلطان یا حاکم وغیرہ کے الفاظ استعمال  
ہوتے ہیں۔ یا اس طرح سمجھ لیں۔ جیسے تعلیمی ڈگری بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی، ڈاکٹر  
(ڈاکٹر آف لٹریچر) وغیرہ کے الفاظ ہوتے ہیں۔ انہی سے کسی کی شخصیت کی علمی قابلیت کا پتہ  
چلتا ہے۔ بالکل اسی طرح حروف مقطعات کے ذریعے کسی سورۃ کا خلاصہ یا اسس کی سرفی  
بیان کی جاتی ہے۔

مقطعات  
اسم ذال میں

امام مہر ڈیسری صدی کے بڑے صوفی، نحوی اور لغت و ادب کے امام تھے اپنی  
مشہور کتاب کمال ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ان فصیح و بلیغ حروف مقطعات میں چیلنج ہے

مقطعات  
بیشیت چیلنج

۱۔ تفسیر طبری ص ۱۱۲ تفسیر کبیر ص ۱۲

۲۔ تفسیر طبری ص ۱۱۲ تفسیر کبیر ص ۱۲

۳۔ تفسیر کبیر ص ۱۲

۴۔ الفوز البکیر ص ۱۱۲ مطبوعہ لاہور

کہ اے دنیا والو! یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے تم بھی اس جیسا کلام بنا کر لاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے انہی حروف میں قرآن پاک نازل کیا ہے۔ اگر تم اس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے: **فَاَنذَرُكُمْ سُورَةٌ مِّنْ مَّشَاطِلِهِ** تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ اگر تم بھی ایسا کر سکو تو مان لیں گے کہ قرآن بھی خدا تعالیٰ کا نازل کیا ہوا نہیں ہے۔

عربی زبان بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ نازل قرآن سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے عربی زبان کی ترقی شروع ہوئی اور اس غرصہ میں وہ اپنے کمال تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ عرب لوگ اس زبان کے مہر سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے وہ غیر عربوں کو بھی یعنی گونگے کتے تھے عربی زبان کا شعر و ادب کا ذخیرہ کمال درجے کا ہے۔ ہمارے دروسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ تو اسی ترقی یافتہ زبان میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرمایا ہے **قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ** عربوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا اہم اور استاد بنایا تھا۔ انہی اہل زبان کے سامنے آکر کھینچنے کا چیلنج پیش کیا گیا۔ کہ اگر کوئی ہے تو اس جیسا کلام بنا کر لائے۔ مگر کوئی بھی اہل زبان اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔

اہم انخسٹ اور مضمر تغیر خازن کہتے ہیں کہ جو سکتا ہے کہ حروف مقطعات قسم کے معنوں میں استعمال ہوتے ہوں۔

اہم انخسٹ رو کی دے

بعض فرماتے ہیں کہ ان حروف کو قرآن کے انقطاع کے لیے لایا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ **غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ** پر ختم ہوئی۔ تو دوسرا کلام شروع کرنے کے لیے آکر لایا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے زمانے میں ہی بحث و تمحیص کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے تھے۔ جو اس قسم کے معاملات میں تحقیق کرتے تھے۔ چنانچہ آپ سے آکر کامعنی دریافت کیا گیا۔ تو فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اِنَّا اللّٰهُ نَعْلَمُ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول

یعنی میں تمہارا اللہ سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ گویا آسمے مراد اَنَا آسمے مراد اللہ اور م سے مراد اَفَلَمْ ہے۔ اسی طرح التَّعَصُّص سے مراد اَنَا اللہ اَفْتَصِل ہے یعنی میں تمہارا اللہ ہوں، جو تمہارے لیے ہر چیز تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔ اَلْاَل کا مطلب ہے اَنَا اللہ اَرٰی میں تمہارا اللہ ہوں جو تمہاری ہر بات کو دیکھتا ہوں۔

امام باوردی  
کی تفسیر

امام باوردی صاحب احکام السلاطین: پہنچنے والے کے بہت بڑے محقق ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اَلْعَم کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اَلْعَم بَکُمْ اور اس کی تفصیل ہے نَزَّلَ عَلَیْکُمُ الْکِتَابَ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب نازل کی ہے۔

بعض علماء کرام فرماتے ہیں: اَلْعَم کا معنی اَقْلُ لَزِیْمٌ لِلْمُؤْمِنِیْنَ فَذٰلِكَ الْکِتَابُ یعنی ایمان مندوں کے لیے اولین ضروری چیز یہ کتاب ہے۔ اس کے اندر غور و فکر کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہدایت کا منبع و مرکز یہی کتاب ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ آسمے مراد اللہ ہے۔ ل سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہے اور م سے مراد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی۔

شیخ ابن عربی  
کا قول

شیخ ابن عربی اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ کل وجود خداوند تعالیٰ ہے۔ جبرائیل علیہ السلام وہاں میں ایک واسطہ ہے۔ جو اللہ سے فیض لے کر اُدھر پہنچاتا ہے۔ اور آخر الوجود حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان تک فیض پہنچانے کا واسطہ جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

بعض فرماتے ہیں کہ اَلْعَم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے انسانیت کی تکمیل کے لیے ذٰلِكَ الْکِتَابُ لَزِیْمٌ فِیْہِ اس عظیم کتاب کو نازل فرمایا۔

۱۔ تفسیر کبیر ص ۱۱

۲۔

۳۔ اعلام القرآن شیخ ابن عربی ص ۱۱

۴۔ تفسیر کبیر ص ۱۲

بعض فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ہر ہر لفظ کی تلاوت کی جانی چاہیے تاکہ برکت اور ثواب حاصل ہو۔ خواہ اس کا مطلب سمجھیں آئے یا نہ آئے۔ تاہم ثواب تو ہر ایسا ذکر کو حاصل ہوگا بعض فرماتے ہیں کہ حدود مقطعات کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کا ایک معجزہ ظاہر فرمایا ہے۔ حضور علیہ السلام تو اُمی ہیں۔ آپ نے کوئی نوشتہ و خوانہ نہیں کی جب تک کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ایک اُمی حدود تہجی کیسے پڑھ سکتا ہے۔ مگر پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام کے اُمی ہونے کے باوجود ان الفاظ کا پڑھنا ایک غیر معمولی معجزہ تھا۔ حالانکہ نہ آپ نے کسی مکتب میں داخلہ لیا۔ اور نہ کسی استاد سے پڑھا۔ لہذا اس معجزے کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حدود مقطعات نازل فرمائے۔

امام بیضاوی ساؤلیمہ دینی کے عظیم مفسر ہوئے ہیں۔ مختصر تفسیروں میں امام صاحب کی تفسیر سب سے اہم ہے۔ آپ کا زمانہ مسلمانوں کی ترقی کا دور تھا۔ آپ اللہ کی تائید اس طرح کرتے ہیں کہ حرف الف حلق کے انتہائی آخری حصے سے نکلتا ہے۔ لام درمیان سے مچھوٹوں سے نکلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ حدود۔ آخر۔ اوسط اور ابتداء کی حصے سے ادا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے کلام کی ابتداء اوسط اور آخری حصہ تھالی کے ذکر سے ہونی چاہیے گویا امام بیضاوی نے حدود اللہ کو اللہ کے ذکر کے ساتھ مربوط کیا ہے۔

حضرت امین  
دل اللہ کا قول

حضرت امین شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے کشفی اور ذوقی طور پر معلوم ہوا ہے کہ اللہ کا مطلب وہ غیر مادی فیض مجرب ہے۔ جو اس مادی اور متغیر مکان واسطے عالم میں آکر مقید ہو گیا ہے اور لوگوں کے ادب اور علوم وغیرہ کے مطابق ان کی شکل سے متصادم ہے۔ یہ فیض محسوس اعمال فاسدہ، اقوال کاسدہ کی تذکیر کرتا ہے۔ اور بہ عادت اور اخلاق ردیہ کا رد کرتا ہے۔ یہ اللہ تشریح اور تحقیق قدسی پیش کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ساری سورۃ بقرہ میں اللہ کا یہی اجمالی معنی نظر آتا ہے۔ اس سورۃ میں

۱۔ تفسیر و خورشید بیضاوی ص ۹

۲۔ تفسیر نظری ص ۱۱۱

۳۔ الفہم البکر ص ۱۲

۴۔ تفسیر بیضاوی ص ۱۱

نزد اللہ مقرب  
سورۃ کائنات کی تعلیم



لوگوں کی نگاہ دل کا مقابلہ، قوانین کی تشریح اور تحقیق اور بڑے اقوال و عقائد اور بڑے اخلاق کی اصلاح کے متعلق ہی مضامین پائے جاتے ہیں۔

بعض محققین فرماتے ہیں کہ الف کا اشارہ استقامت علی الشریعہ کی طرف ہے۔ اِنَّ  
الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَفَعُوا لِعِيسَىٰ ثَرْيَعَتِهَا بِرِيسَتِهَا اِذَا هِيَ كَاغِبَةٌ  
فِي السَّمَاءِ اُولَٰئِكَ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرًا  
بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ فرماتے ہیں کہ لام کا اشارہ مجاہدہ کی طرف ہے۔ یعنی وہ چیز جو ریاضت اور مجاہدہ کرنے  
سے حاصل ہو۔ جیسے وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فَاٰتَيْنَا لَهُمْ جَزَاءً مِنْهُمْ حَسْبًا۔  
یعنی جو لوگ ہماری طرف مجاہدہ کریں گے۔ ہم ضرور ان کو راہ بتلائیں گے۔ اسی طرح حرف میم میں  
یہ اشارہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت اور عزت ہونی چاہیے۔

مولانا مودودی صاحب  
کا تفسیر

مودودی صاحب نے اپنی کتاب تفسیر تفسیر القرآن میں ایک نہایت ہی غلط بات لکھی  
ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ الف کا معنی پیٹ نہ لسنے میں معلوم تھا۔ مگر بعد میں ملے لوگ بھول  
گئے۔ اسکا مطلب کہ کچھ لوگ ایسے معانی جانتے تھے بعد میں ایسے کچھ لوگ بھول گئے۔ یہ تو بالکل ہی غلط بات ذکر کر دی  
کہ کسی کو بھی اسکا معنی نہ آتا ہو۔ مفسرین کو کہنے جو معانی بیان کیے ہیں وہ میں نے عرض کر دیے۔

مفسر قرآن  
کا قول

مفسر قرآن فرمائی کہتے ہیں کہ قدیم مصری زبان میں الف کو سر کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔  
بعض زبانوں میں حروف جائز یا درخت کی شکل میں لکھے جاتے تھے۔ ایسے الف کے دو معنی استعمال  
ہوتے تھے۔ ایک معنی لگائے ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس سورۃ کو گائے کے ساتھ مناسبت ہے  
کیونکہ اس میں گائے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ الف کا دوسرا معنی اللہ وحدہ لا شریک ہے۔  
تو قرآن ہی لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ حروف اس محاورے کے مطابق استعمال کیے  
گئے ہوں۔

حرف آخر

امام جلال الدین سیوطی اور بہت سے مفسرین آخری بات یہ فرماتے ہیں گئے۔ اَللّٰهُ  
اَعْلَمُ بِمُرَادِهِ کہ اللہ اور دیگر حروف مقطعات کی مراد اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔



اُمّت بِذٰلِكَ وَصَدَقْنَا بِہِم اِس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں  
 ہماری عقل ناقص ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کے معافی ضروری معلوم کر سکیں۔ اس کا  
 احسن طریقہ یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دینا چاہیے۔ کہ ان حدود سے  
 اللہ تعالیٰ کی جو بھی مراد ہے، وہ برحق ہے۔ اور ہمارا اس پر ایمان ہے۔

اُمّتًا وَصَدَقْنَا

---

الْعَمَّ  
دوسرے سو م

بفسقہ  
رأیت ۵۱

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

الحزب الاول

مع  
عند الخیرین

الْعَمَّ ① ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ②  
الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُ  
يُنْفِقُونَ ③ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِمَّا  
أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ④ أُولَٰئِكَ  
عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑤

ترجمہ: الْعَمَّ ① یہ کتاب۔ نہیں شک اس میں۔ یہ رہنمائی کرتی  
ہے متقینوں کی ② جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر اور قائم کرتے ہیں نماز کو۔ اور  
جو روزی ہم نے ان کو دے رکھی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ③ اور  
وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اُس چیز پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور اُس چیز  
پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہے اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں ④ یہی  
لوگ ہیں ہدایت پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے اور یہی لوگ مراد کر پہنچنے  
والے ہیں۔ ⑤

مفہم ذہن  
کی حکمت

عربی میں ذلک اشارہ بعید کے لیے اور هذا اشارہ قریب کے لیے استعمال ہوتا ہے  
یہاں پر گفتگو اس کتاب یعنی قرآن پاک کے لیے ہو رہی ہے۔ لہذا اسم اشارہ هذا  
استعمال ہونا چاہیے تھا یعنی یہ کتاب۔ نہ کہ ذلک یعنی وہ کتاب۔ اس اشکال کے متعلق مفسرین  
کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر اشارہ بعید استعمال کرنے کا مقصد اس کتاب کی عظمت اور شان

لے تفسیر معن المعالی ص ۱۱۱۔ تفسیر عزیزی ندوی ص ۱۱۱۔ پارہ ۱

کا اظہار ہے۔ لہذا ذٰلِكَ الْكِتَابُ کا معنی یہ ہو گا۔ کہ یہ وہ کتاب ہے۔ جو اپنے کمال حقائق۔  
 وقایق۔ اسرار اور درست کی بندی کی وجہ سے مخاطبین کے فہم سے غائب اور انسانی افکار کی جورنگاہ  
 سے بہت بلند ہے لہذا اس کے لیے ذٰلِكَ کا اشارہ استعمال کیا گیا ہے۔

مفسرین کرام ایک دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ پہلی کتابوں میں قرآن پاک کے متعلق  
 پیش گوئیاں موجود تھیں۔ چنانچہ قرأت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا کہ  
 میں تیرے بھائیوں میں سے تیرے جیسا ایک بنی برپا کروں گا۔ اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں  
 گا۔ اور وہ کلام ہی وہی قرآن پاک ہے۔ تو یہاں پر ذٰلِكَ الْكِتَابُ کا معنی ہے کہ یہ وہی  
 کتاب ہے۔ جس کی پیش گوئی پہلی کتابوں میں کی گئی تھی۔

یا اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جسے پہلے لوح محفوظ سے بیت العزت  
 میں نقل کیا گیا۔ اور پھر وہاں سے تیس سال کے عرصہ میں بتدریج بنی علیہ السلام پر نازل کیا گیا  
 یا وہ ہے کہ بیت العزت آسمانوں میں ایک مقام ہے۔ جہاں پر قرآن پاک اودبیک وقت منتقل  
 کیا گیا تھا۔

لفظ ذٰلِكَ  
 کا مضمون

ذٰرِیْبَ فِیْہِ کلام فہم معنی یہی ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ نہیں  
 یعنی چاہیے کہ کوئی دوسرا شخص اس کلام میں شک و شبہ نہیں رکھتا۔ بلکہ بلاشبہ کفار و مشرکین  
 قرآن پاک کی صداقت پر شک کرتے تھے۔ اسی لیے تو تیسرے رکوع میں ان لوگوں کی جیسلیج  
 کیا۔ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یعنی اگر تمہیں اس چیز میں  
 کوئی شک ہے۔ جو ہم نے اپنے بند پر اتاری ہے۔ فَاتَّوَابُوا بِسُورَةِ مِّنْ قَبْلِہِمْ  
 تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ تمہارا حقایت کا پتہ چل جائے گا۔ مطلب یہ کہ مشرکین کو لازم  
 اس کلام میں شک کرتے تھے۔ تو یہاں پر ذٰرِیْبَ کا معنی یہ ہے کہ واقعہ اور نفس الامر میں اس  
 کلام میں شک و شبہ والی کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی شک کرتا ہے۔ تو یہ اس کی اپنی غلطی اور  
 دماغ کی خامی ہے۔ وہ شخص تعصب اور عناد کی وجہ سے شک کرتا ہے۔ وہ نہ اس کتاب

میں تو کوئی خامی نہیں۔

حضرت شیخ الحدیث  
کی تفسیر

شیخ الحدیث مولانا محمود الحسن فرماتے ہیں کہ کسی چیز کے بارے میں شک و شبہ کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس چیز میں واقعی کوئی نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے شک پیدا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس چیز میں تو کوئی شک و شبہ یا نقص نہیں ہوتا مگر شک کرنے والے کے اپنے دماغ کی خرابی اور خلل کی وجہ سے اسے وہ چیز مشکوک نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت اس کا ایک ایک لفظ شک و شبہ سے پاک ہے اس میں نہ کوئی کذب بیانی ہے اور نہ ہی کوئی خلاف واقعہ چیز ہے۔ یہ تو محض شک کرنے والے کے اپنے ذہن کا فتور ہے۔ جو اس کلام پاک میں شک کرتا ہے۔ مشرکوں اور منافقوں کے دماغ خراب تھے جو قرآن پاک پر اعتراض کرتے تھے، آج کل کے علماء کے ذہن بھی پرانہ ہیں جو قرآن پاک کے احکام پر اعتراض کرتے ہیں۔ ورنہ قرآن پاک کی کوئی بات مشکوک نہیں۔ بلکہ یہ تو منبع رشد و ہدایت ہے۔

حضرت مولانا شیخ الحدیث برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت ہیں یہ میرٹھ کے پاس انیس کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ آپسے، شاکی جیل میں اسیری کے دوران کیا تھا۔ تقریباً دو سو توں کا مائشہ بھی لکھا تھا متیز زندگی کے یاد چوت ہو گئے۔ مائشہ کا باقی بھر آپ کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے آپ ہی کی سبب فضا انجام دیا۔ آپ کا کیا برا ترجمہ قرآن بالمحاورہ ہے۔ اور جہ تہذیب تراجم میں سے ہے۔

قرآن پاک کے اردو ترجمے بہت سے بزرگوں نے کیے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی لکھے۔ یہ سب آسان لفظی ترجمہ ہے۔ اس کے ذریعے الفاظ کے معانی سمجھنا نہایت آسان ہے۔

آپ کے بعد دوسرا محاورہ اردو ترجمہ شاہ عبد القادر دہلوی کا ہے۔ یہ بہترین بالمحاورہ ترجمہ ہے آج تک علماء اہل ترجمہ پیش نہیں کر سکے۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ شیخ الحدیث

سہ ترجمہ قرآن ص ۱۰ مطبوعہ دارالتبلیغ دہلی

مے صاحب درس حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب سواتی کے پاس دوران درس

کا ترجمہ پھر حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کا ترجمہ اور تفسیر ہے۔ آپ نے قرآن پاک کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ فن تجوید کے متعلق اور پھر ربط کے بارے میں اور اصول کے بارے میں ایک کی کتب موجود ہیں۔ آپ کی تفسیر علمی ہونے کی بنا پر ذرا مشکل ہے۔ تاہم یہ بلند پایہ اور دو تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے علماء کرام نے ترجمہ کیے ہیں یہ آپ کے پاس جو ترجمہ ہے۔ یہ مولانا احمد علی لاہوری کا ہے۔ انہوں نے نہایت آسان اور عام فہم ترجمہ کیا ہے اور اس پر ملاحظہ فرمائیے۔

فرمایا یہ وہ کتاب مقدس ہے۔ جو شک و شبہ سے بالابے اذہادی للمتقین قرآن پاک متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ یہاں پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے۔ کہ ہدایت تو کون سے لوگوں کے لیے ہونی چاہیے مگر متقی تو پہلے ہی ہدایت یافتہ ہیں، ان کے لیے ہدایت ہونے کا کیا معنی؟

اس ضمن میں شاہ عبدالقادر اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ متقین سے مراد ہیں، بچکنے والے اور ڈرنے والے لوگ اور تقویٰ کی طرف جانے والے لوگ۔ یعنی جن میں منہ اور دماغ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ وہ تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ اس قرآن کو پڑھیں گے، کراں میں تقویٰ پیدا ہوگا، یہ متقی بن جائیں گے، مقصد یہ کہ اگرچہ آج یہ لوگ ممتحن نہیں ہیں مگر اس قرآن پاک کی برکت سے آئندہ زندگی میں تقویٰ اختیار کر لیں گے۔ شاہ عبدالعزیزؒ اس کا معنی سمجھانے کے لیے ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ اگر کوئی بڑا عاقلانہ، نوجوان، بڑے مضبوط جسم والا شخص ہو۔ کہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نوجوان نے فلاں ماں کا درد چھپایا ہے۔ دیکھو کتنا طاقتور ہے۔ گویا اس کی ماں کے درد میں وہ طاقت اور تاثیر ہے۔ جس سے اس قسم کے کڑیل جوان پیدا ہوتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اذہادی للمتقین کا مطلب یہی ہے کہ اس قرآن پاک میں ایسی تاثیر ہے کہ جو اس سے

قریب ہوں گے۔ اس پر عمل کریں گے وہ متقی بن جائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتاب صرف متقیوں کو ہدایت دیتی ہے۔ کیونکہ خود اسی میں دوسری جگہ **هٰذَا هُدًى لِلْعٰلَمِیْنَ** بھی آیا ہے۔ کہ یہ تمام جہاں والوں کو ہدایت کا راستہ دکھاتی ہے۔

تقویٰ کی  
تعریف

حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں حضرت ابی بن کعبؓ بڑے قاری تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے پوچھا۔ حضرت تقویٰ کا کیا معنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا **اَعَا سَلَكْتَ طَرِيقًا ذَا شَوَاطِئَ** کیا آپ کو کبھی ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں ہر طرف کانٹے دار جھاڑ ہوں۔ تو انہوں نے جواب دیا ہاں! بہت دفعہ ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا ہے تو حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا۔ پھر آپ نے وہاں کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے کہا **شَمَوْتُ دَا جَهَنَّمَ** میں نے دامن سمیٹ لیا اور پوری کوشش کی کہ کانٹے میرے جسم کے کپڑوں میں نہ الجھن جائیں اور میں سلامتی سے ایسے راستے سے نکل گیا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا **فَذَلِكَ التَّقْوٰی** تقویٰ اسی کو کہتے ہیں کہ دنیا میں پیسے ہوتے کفر، شرک، گمراہی، بدعت اور دیگر خرابیوں سے انسان بچ کر نکل جائے۔ جو شخص ان چیزوں سے دامن بچ کر نکل گیا۔ وہی متقی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے تقویٰ کا مطلب پوچھا گیا تو فرمایا اللہ کے حکم کے سامنے کسی اور کا حکم نہ مانے اور یقین رکھے کہ تمام کام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ لہذا جس شخص کا اعتقاد اور عمل یہ ہو، وہ متقی ہے۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے دریافت کیا کہ تقویٰ کس کو کہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا **اَلَا تَسَدٰی نَفْسًا خَيْرًا مِنْ اَحَدٍ**۔ یعنی تم اپنے نفس کو کسی دوسرے سے بہتر نہ سمجھو۔ نہ یہی سمجھو کہ میں ہی کمزور ہوں اور میرا ہی قصور ہے جب تمہارے اندر یہ چیز پیدا ہو جائے تو متقی بن جاؤ گے۔ حضرت مجتہد العارف ثانی کا قول ہے جگہ

برائے کس معرفت خدا حرام است کہ خود را از کافر خرمگ بہتر دانہ

یعنی جو شخص اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر سمجھتا ہے۔ اس پر خدا کی معرفت حرام ہے آپ نے بہت بڑی بات کہی ہے۔ کہ اپنے آپ کو انگریز کافر سے بھی بہتر نہ سمجھے۔ کیونکہ ہو

۱۔ تعمیر کبریا

۲۔ تعمیر ابن کثیر

۳۔

۴۔ تعمیر منہری

بیجھے، مگر آپ نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کہتے تھے یہ رقم ان کو دو جن کا حق چھین رکھا ہے۔  
 مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کے تقویٰ کی بات تھی۔  
 خلیفہ عبدالملک بن مروان کے حکیم سے پوچھا کہ بھائی، بتائی کہ ان سے تیس حکیم نے جواب دیا مسمیٰ وہ ہوتا ہے  
 جو خدا کو مخلوق پر اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔ وہ مسمیٰ ہوتا ہے۔

ایمان بالغیب

کتاب الہی کا ابتدائی تعارف کرنے کے بعد کریم متقین کے لیے ذریعہ ہدایت ہے  
 ارشادِ ربانی ہے کہ متقین وہ لوگ ہیں۔ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ جو غیب پر ایمان  
 رکھتے ہیں۔ غیب وہ چیز ہوتی ہے۔ جو اور اک، حواسِ ظاہرہ و باطنہ، عقل و فہم اور خیال کی دوسری  
 سے باہر ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ فرشتے ہیں۔ برزخ اور آخرت  
 کا دن ہے۔ اس میں آخرت کے تمام معاملات شامل ہیں۔ یہ سب غیب ہیں۔ اس کی تشریح  
 سورۃ بقرہ کی آخری آیات اَمَّا التَّرْصُوتُ بِمَا اُنْزِلَ اَيْسَهُ مِنْ دُبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ  
 كُلٌّ اَمَّا بِاللّٰهِ وَهَلْ يَكْتَبُ رَكْتَبَهُ وَدُسُولُهُمْ اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا اَمَّا a  
 چیزوں پر ایمان ہونا چاہیے۔ ابتداء غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ بندوں کے لیے  
 سوائے وحی۔ الام یا کشف وغیرہ کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کسی پر  
 الام نہ کرے۔ تب تک کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ جب تک کسی نبی یا رسول پر وحی نہ کرے یا کشف  
 کے ذریعے کسی پر کوئی بات منکشف نہ کرے، اس وقت تک کوئی نہیں جان سکتا۔ اور جب کسی  
 کو کسی بات کی اطلاع دے رکھا جائے، یا کوئی چیز ظاہر کر دی جائے۔ تو وہ غیب نہیں رہتا۔ غیب  
 وہ ہوتا ہے۔ جو عقل و حواس یا کسی اور ذریعے سے منکشف نہ ہو۔ علم غیب اللہ تعالیٰ کی ذات کے  
 ساتھ مختص ہے۔ اسی کو علم الغیب و الشہادۃ کہا گیا ہے۔ جو بغیر کسی حواس، قوت یا اسے  
 کے جانتا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ علم کا معنی ہوتا ہے۔ جاننا اور معرفت کا معنی ہے پہچانا اور ایمان  
 کا معنی ہے ماننا۔ یہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہودی حق کو جانتے بھی ہیں اور پہچانتے بھی ہیں



حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق منقول ہے کہ کسی نے ان سے دریافت کیا کہ انسان  
مستی کس طرح ہو سکتا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ مستی وہ شخص ہو سکتا ہے جو  
اولاً اپنے دلی جذبات کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا ہو۔  
ثانیاً اپنی پوری طاقت کے ساتھ اللہ کے لیے عمل کرنے والا ہو۔

ثالثاً یہ کہ اپنے ابتداء جنس پر اسی طرح رحم کرنے والا ہو۔ جس طرح اپنے آپ پر رحم کرتا ہے۔  
گویا جس طرح خود اپنے آپ کو ہر تکلیف سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی جذبہ جو مرد  
کے لیے بھی موجود ہو۔ جس شخص میں یہ تین علامتیں پائی جائیں گی وہ مستی بن جائے گا۔

محمد بن یوسف فریابی ایک بزرگ ہوئے میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سفیان ثوری  
سے پوچھا کہ کیا بات ہے جہاں جائیں آپ ہی کا چہرہ ہوتا ہے۔ لوگ آپ کے اس قدر  
مدح ہیں۔ حالانکہ میں نے تو آپ کو رات کے وقت سوتے ہوئے دیکھا ہے۔ یعنی آپ  
کو ساری رات عبادت کرتے ہوئے نہیں پایا ہے۔ آپ نے فرمایا: چپ رہو۔ یہ بات تقویٰ  
پر مبنی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ تقویٰ عطا کرے، اُسے قبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔

امام سفیان ثوریؒ نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی طرح حکمت کے  
معتوب ہے حتیٰ کہ منصور نے آپ کے لیے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا کہ سفیان جہاں سے  
اُسے سول پر شکا دو۔ وجہ یہ تھی کہ آپ حکومت کے غلط احکام پر تنقید کرتے تھے۔ انہیں ظلم  
سے منع کرتے تھے۔ ایک موقع پر ساتھیوں نے عرض کیا: حضرت! منصور برا ہے آپ  
کو گرفتار کر لے گا۔ وہ آپ کے لیے سزائے موت کا حکم پہلے ہی جاری کر چکا ہے۔ لہذا  
آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ نے خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا کی کہ اے پروردگار! اگر  
منصور مجھے میں آجائے تو میں کعبہ سے بری ہو جاؤں گا۔ آپ نے ایسی سخت دعا کی کہ منصور  
راستے میں ہی ہلاک ہو گیا۔ آپ کو بادشاہ نے بڑا لالچ دیا۔ پچاس ہزار روپے بطور عطیہ

اسی طرح مسجدیں بنانا اور ان میں ضروریات فراہم کرنا، اور دینی مدارس کا قیام بھی  
 مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ میں آتا ہے۔ کسی نالے پر پل تعمیر کرنا پانی کے لیے کنواں  
 یا تل لگوانا، مسافر خانہ تعمیر کرنا۔ حج اور عمرہ خود کرنا یا کسی دوست کو کروانا۔ اللہ تعالیٰ کے  
 راستے میں جہاد پر مال صرف کرنا، یہ سب بذات ہیں۔ جن پر خرچ کرنا اتفاق فی سبیل اللہ  
 میں آتا ہے۔ اور باعث اجر و ثواب ہے۔ نیک کام کے لیے اخلاص کے ساتھ ایک پیسہ  
 خرچ کرنے کا اجر دس گنا ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جہاد میں خرچ کرنا جہاں  
 دشمن اور کافر دین کو توڑنا چاہتے ہوں۔ ان کے مقابلے کے لیے جو مال خرچ کیا جائے۔  
 اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ سات سو گنا ہے۔ نفقات واجبہ یعنی گھر کے ضروری اخراجات  
 وہ بچوں کے لیے ہوں یا بیوی کے لیے، نوکر چاکر یا رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے یہ  
 سب اتفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے اور مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ کا صدق  
 بنتا ہے۔

کتب سہادی  
 پر ایمان

اس کے بعد فرمایا متعین وہ لوگ ہیں وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا نَزَّلَ إِلَيْكَ  
 یعنی آپ پر جو کتاب ہدایت اور جو احکام نازل ہوئے ہیں ان پر ایمان رکھتے ہیں وَمَا  
 أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور جو پہلے پیغمبروں پر وحی نازل ہوئی ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں  
 یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہلی کتابوں پر صرف ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ان پر عمل کرنا  
 ضروری نہیں، عمل ان احکام پر ہوگا۔ جو آخری کتاب قرآن پاک میں نازل ہوئے ہیں۔ قرآن  
 پاک کے نزول اور حضور علیہ السلام کی شریعت کے نفاذ پر پہلے تمام احکام منسوخ ہو چکے  
 ہیں۔ ان کا ترک کرنا ضروری ہے۔ ان پر عمل ضروری نہیں تاہم ان پر ایمان ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے  
 پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے جو کچھ نازل فرمایا وہ برحق ہے۔ یہ اجزائے ایمان میں سے ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام آسمانی  
 کتابیں برحق ہیں۔ تاہم قابل عمل احکام صرف قرآن پاک کے ہیں۔

ایمان بالآخرت

متعین کی آخری صفت یہ بیان فرمائی وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ وہ آخرت

مگر مانتے نہیں۔ وہ ایمان نہیں لاتے تھے۔ قرآن پاک کہتا ہے کہ یہودی نبی آخر الزماں کو  
 "يَعْرِضُونَكَ بِمَا يَكْفُرُونَ ابْنًا دُهْنًا" اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی  
 اولاد کو پہچانتے ہیں۔ مگر ایمان نہیں لاتے۔ ہاں! ایماندار اور پھر متقی وہ ہیں جو غیب پر ایمان  
 رکھتے ہیں۔ ملائکہ، بندگان، آخرت وغیرہ تمام چیزیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ  
 چیزیں نبی علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتلائی ہیں۔ لہذا امتی وہ ہیں جو ان سب پر ایمان رکھتے ہیں  
 کہ یہ چیزیں برحق ہیں۔ اَمَنَّا وَحَكَّقْنَا

امامت صلوٰۃ متقین کی دوسری صفت ہے۔ اقامت صلوٰۃ فرمایا متقین وہ ہیں وَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ

جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔ یہاں پر یُقِيمُونَ الصَّلَاةَ یعنی نماز ادا کرتے ہیں۔ نہیں فرمایا۔  
 بلکہ اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو کہ بڑا گہرا لفظ ہے۔ اقامت کا مطلب یہ ہے کہ قیام  
 رکوع، سجود، تلاوت، فرائض، سنن، واجبات اور مستحبات وغیرہ کو احسن طریقے سے ادا کیا  
 جائے۔ جو لوگ ان تمام چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز  
 ادا کرتے ہیں، اقامت صلوٰۃ کہنے والوں سے وہی لوگ مراد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ  
 نے اقامت صلوٰۃ کا معنی یہی کیا ہے کہ نماز کے تمام ارکان کو ٹھیک طور پر ادا کیا جائے۔

ایمان بالغیب اور اقامت صلوٰۃ کے بعد متقین کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی وَمِمَّا  
 رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ یعنی متقین دو لوگ ہیں جو ہماری دی ہوئی روزی سے خرچ کرتے ہیں

خرچ کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے اور خرچ کی مختلف حالت میں سے پہلے نمبر  
 پر زکوٰۃ ہے۔ دوسرا صدقہ فطر تیسرا قربانی چوتھا عام خیرات۔ اس کے بعد سائیں۔ محتاجوں۔  
 یتیموں۔ کمزوروں۔ یتیمی اور یتیم خانوں کی حاجت برداری ہے۔ اس کے بعد وقف کی حالت  
 ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو وہ اس کے نام پر وقف کر جائے تاکہ اس کے  
 آخرت میں فائدہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بہترین زمین کے متعلق حضور علیہ السلام سے عرض کیا  
 کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کا فائدہ مجھے آخرت میں پہنچے۔ اپنے فرمایا وقف کر دو۔ چنانچہ وہ وقف  
 کر دی گئی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأْمَرُكُمْ أَوْ نَهَوْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥ خَسِمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦

ترجمہ:۔ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے برابر ہے کہ آپ انکو

ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥ اللہ تعالیٰ نے ہر گاہی ہے

ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے

لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ ⑦

ہدایت (اور گمراہی) کے اعتبار سے نہ تین گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں پہلا

مناظر کے  
تین گروہ

گروہ مؤمنین کا ہے۔ جو ہدایت کو ظاہر اور باطن قبول کرتے ہیں اور اسے اپنا لے ہیں یہ مومن متقی کہلاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال، ان کے اوصاف اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ انسانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے، جو ہدایت الہی کا ظاہر بھی انکار کرتے ہیں اور باطناً بھی انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی طور پر ہدایت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، لہذا کافر کہلاتے ہیں۔ ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کا حال اور ان کا انجام بیان فرمایا ہے۔ ان کا تیسرا گروہ زبان سے تو ہدایت، ہانی کا قرا کرتا ہے، مگر دل سے تسلیم نہیں کرتا۔ یہ لوگ منافق ہوتے ہیں۔ آئندہ تیسرے آیات میں انہی لوگوں کا حال بیان ہوا ہے۔

ان میں سے پہلا گروہ جو متقین اور مومنین کا گروہ ہے، اور قلوب پائے والا گروہ ہے

البتہ دوسرے دونوں گروہ ناکام ہیں، پھر ان میں سے کافروں کا حال مختصر طور پر بیان ہوا ہے۔

کیونکہ انہوں نے علی الاعلان ہدایت کو قبول نہیں کیا۔ اور کفر پر ڈھے ہوئے ہیں۔ البتہ منافقین

کا گروہ چونکہ زیادہ خطرناک ہے اس لیے اس گروہ کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا

ہے۔ ان کی مثالیں بھی دی ہیں تشبیہات کے ساتھ بھی سمجھایا ہے، کیونکہ منافقین کا یہ گروہ

کے دن پر یقین رکھتے ہیں آخرت کے دن سے مراد قیامت کا دن یا دنیا کا آخری دن  
 (LAST DAY OF THE WORLD) ہے۔ اسی لیے اس کو آخرت کہتے ہیں۔ اسے  
 دارالآخرت یا آخرت کا گھر بھی کہتے ہیں۔ گویا یہ بھی ایمان کے اجزاء میں سے ہے۔ اسی  
 طرح فرشتے، آسمانی کتابیں، اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور توحید یہ سب ایمان  
 کے اجزاء ہیں۔ تقدیر بھی ایمان ہی کا حصہ ہے۔ کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا  
 اللہ تعالیٰ کے علم ارادے اور مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔  
 فرمایا جو لوگ مذکورہ صفات کے حاملین ہوں گے اُولَئِكَ عَلٰی هُدٰی  
 مِّنْ رَبِّهِمْ وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدیت پر ہیں۔ وَاُولَئِكَ هُمُ  
 الْمُفْلِحُونَ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ فلاح کے معنی مراد کو پہنچنے والے ہیں  
 تو مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کے جس پر دگرام کو لوگ نماز میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ  
 کہہ کر مانگتے ہیں وہ سارا پر دگرام ہیاں تک بنا دیا گیا ہے۔ جو لوگ اس پر دگرام کو تسلیم کر کے اس  
 پر عمل کریں گے۔ فلاح پائیں گے۔ اور جو قوم اس سے روگردانی کرے گی۔ وہ فلاح حاصل نہیں  
 کر سکے گی۔ اگرچہ وہ دنیوی لحاظ سے جس قدر بھائی سودہ حال ہو جائے۔ پر دگرام کو واضح کر دیا گیا ہے  
 یعنی ایمان، تقویٰ، انفاق فی سبیل اللہ۔ پھر اس کے بعد سابقہ کتابوں اور آخرت پر ایمان،  
 اور پھر ان اصولوں پر استقامت ہی فلاح کا دار و مدار ہے۔ اسی کی وجہ سے دائمی مذاب  
 سے نجات حاصل ہوگی اور آخرت میں اعلیٰ درجات نصیب ہوں گے۔

ہدیت یافتہ  
لوگ

سکتے ہیں کہ انگریز کا کسی وقت ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہو جائے۔  
اور کفار النفس موٹا موٹا ہوتے ہوتے شیطان جی بی جگے لہذا جب تک پہنچے آپ کو اس سے  
حضرت زکریاؑ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوگی۔ اگر یہ عامل نہ ہوتی تو متقی کیسے بن سکتے ہو  
(محمد الاسلام) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شجرہ مبارکہ میں ایک شعر آتا ہے۔

زمین دار دسگے نصرانیاں عار کہ اور بے گناہ وہ گنہگار  
یعنی مجھ سے تو نصرانیوں کا کتا اچھا ہے۔ کیونکہ وہ گنہگار نہیں اور میں گنہگار ہوں عاری  
لہذا انکار ہی کا یہ معیار ہے۔ اور اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان شرک کی تمام  
انکساری سے پاک ہو۔ اگر ایسا ہوگا تو عذاب سے خلاصی پائے گا۔ ”وَلَنَزَعْنَهُمْ كَلِمَةَ  
التَّقْوٰی“ کا یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر تقویٰ کا کلمہ لازم کر دیا ہے۔

تقویٰ کے  
تین درجے

تقویٰ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے اور چھوٹے گناہوں  
پر صبر نہ کرے۔ اور تیسرا درجہ تقویٰ کا یہ ہے کہ انسان مشکوک اور شبہات والی باتوں سے  
بچتا ہے۔ جو شخص تقویٰ کے ان تینوں درجات پر پورا اترے گا وہی کامل درجے کا متقی ہوگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حسرت کے دن یعنی قیامت کے روز آواز آئے گی  
کہ متقی لوگ کہاں ہیں متقی لوگ اٹھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی تعجبی کے صیغے میں چلے جائیں گے۔

متقی کون ہیں؟

و تعجبی ان پر ہر وقت سایہ فگن ہوگی اور کسی وقت ان سے علیحدہ نہیں ہوگی کسی نے حضرت معاذ بن جبلؓ  
سے دریافت کیا کہ حضرت! متقی کون ہیں۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ متقی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے  
اپنے کو انواع شرک سے محفوظ رکھا اور اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرتے رہے۔ متقیوں کی علامت  
یہ ہے کہ اگر انہیں مصیبت آئے تو صبر کریں۔ اور خدا کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اگر رحمت  
آئے تو خدا کی نعمت کا شکر ادا کریں قرآن پاک کے احکام کے سامنے ہمیشہ مطیع و فرمانبردار رہیں  
یہی لوگ متقی ہیں۔

بڑا خطرناک گروہ ہے۔

کفر کا معنی

عربی زبان میں کفر کا معنی کسی چیز کو چھپا دینا یعنی مخفی اور پوشیدہ کر دینا ہے۔ اسی لیے اہم بیضاوی کہتے ہیں کہ جس ڈوڑی کے اندر پھل بند ہوتا ہے۔ اُسے کافر کہتے ہیں۔ اودکان جو بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اُسے کافر کہتے ہیں۔ جیسے سورۃ الحجۃ میں آیت ہے کَعْبَلُ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاٌ ثُمَّ كُوِيَ كَافِرًا لِّغَلْطِ كَانٍ بِهِيَ بُولَاغٌ هِيَ بَادِلٌ وَرَافِدٌ حِوَارِ جُورِجٍ كُوِيْنِ اَنْدَرِ حِمْيَالِ تَا هِيَ۔ اس کو بھی کافر کہتے ہیں ۵

فِي لَيْلَةٍ كَفَرَ النَّجْوَى عَمَامَهَا

یعنی بادل اور اندھیرا ستاروں کو چھپاتا ہے۔ تو لغوی اعتبار سے اس کا معنی یہ ہوگا۔ جیسا کہ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِيْنَ سَكَنُوا الْحَوْثَ اَدْبَسَ لَشْكٍ وَهِيَ لُوكُ جنموں نے غنہ کی وجہ سے حق کو چھپا دیا۔ مارک دالے اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں یعنی حق کو چھپا دیا۔ ظاہر ہی نہیں کیا۔

جب کفر کا اطلاق شریعت کی اصطلاح میں کیا جاتا ہے تو اس کا خاص معنوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جو چیز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو۔ شک و شبہ والی بات نہ ہو، اُس چیز کا منکر کافر کہلاتا ہے۔ اور یہ انکار کفر کہلاتا ہے۔ لہذا خود کسی ایک چیز کا انکار ہو یا تمام چیزوں کا۔

کفر کی مختلف اقسام

جس طرح شرک تفاق، الحاد، ارتداد، زندقہ، فسق، ایمان، توحید وغیرہ قرآن کی مختلف اصطلاحات ہیں۔ اور ان سب کا الگ الگ معنوم ہے اسی طرح کفر بھی ایک اصطلاح ہے اور اس کی مختلف اقسام ہیں۔ جو کہ مضہ بن، محمد بن، فقہاء اور علما نے بیان کی ہیں۔

کفر انکار

بمختل ان کے کفر انکار ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی شخص دل اور زبان دونوں سے شریعت کی قطعی چیز کا انکار کرے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ دُلٍّ وَزَبَانٍ دونوں سے انکار ہے۔ ایسا شخص حق کی بات کو بلند کرنے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ لہذا یہ کفر انکار ہے



قرآن پاک میں کفر کی جس دوسری قسم کا ذکر آتا ہے۔ وہ کفر جہود ہے۔ یحٰیہ کا معنی انکار ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ وَبِحَدِّ ذٰلِہٖ شَیْءٌ ظاہر ہے۔ کفر جہود کی تعریف یہ ہے کہ آدمی دل سے پہچانتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ بات سچی ہے۔ مگر وہ اس کا زبان سے اقرار نہیں کرتا۔ جیسا کہ فرعونوں کے متعلق فرمایا: وَبِحَدِّ ذٰلِہٖکَ وَاسْتِیْقَنَہٗمَآ اَنفُسُہُمْ ظُلُمًا فَاُکَلِّمُوْا ذٰلَکَ فِی الدُّنْیَا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کا دین سچا ہے۔ مگر وہ اس کا انکار کرتے تھے یہ انکار ظلم اور تعدی کی بناء پر تھا۔ اس کو کفر جہود کہا جاتا ہے۔ ابلیس کا کفر سی ہے۔ کیونکہ وہ دل میں حق بات کو سمجھتا ہے۔ مگر اقرار کی بجائے انکار کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص بلعم بن باعور کہتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے مر دود ہوا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ الاعراف میں موجود ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ایک بڑا حکیم شاعر امیہ بن ابی الصلت ہوتا ہے۔ اس کا کفر بھی ایسا ہی تھا۔ اُنہی نے حق کو جانتے پہچانتے ہوئے قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں وحی نازل کی۔ مجھ پر کیوں نہیں کی۔ عربی زبان میں اس کا کلام موجود ہے۔ وہ شخص نبی ابدی اور قیامت تک کا تصور رکھتا تھا۔ وہ قرآن اور انجیل کا قاری اور ہدایت کا طلب گار تھا۔ مگر جب حضور علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو وہ حسد میں مبتلا ہو گیا۔ اور آپ کی رسالت کا انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ دل سے برحق سمجھتا تھا۔ وہ اتنا قابل آدمی تھا کہ اس کے اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ یہ کوئی بڑا امر من آدمی ہو گا۔ حضور علیہ السلام نے اس کے متعلق فرمایا: اَنْتَ مُقَمَّنٌ مِّنْ رِّسَالِہٖ وَ لَعَنَیْوْا مِّنْ قَبْلِ ذٰلِکَ لَعْنَةُ رَبِّکَ وَ لَعْنَةُ رِجْلِکَ وَ لَعْنَةُ رِجْلِکَ وَ لَعْنَةُ رِجْلِکَ وَ لَعْنَةُ رِجْلِکَ جیسی ہے مکر دل کا زہ ہے۔

پھر کے زمانہ میں ایک افانہ نویس انگریز برٹش گڈز ہے۔ بڑا صاحب علم تھا، اسلام کو وہ بھی سچا سمجھتا تھا۔ مگر کہ سخت سے اقرار نہیں کیا۔ یہی حال مسٹر گاندھی کا تھا۔ وہ اسلام کو سچا مذہب کہتا تھا۔ مگر دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ عیسائیت اور ہندو مت کو بھی سچے مذاہب ہی

سمجھتا تھا۔ ملائکہ سچا مذہب تو صرف اسلام ہی ہے۔ اِنَّ الْمَدِينَةَ لِلّٰهِ الرَّسُولِ  
 باقی سب ادیان باطل ہیں۔ یہی کفر مجرب ہے۔ کہ کسی چیز کو دل سے صحیح سمجھ کر پھر زبان سے  
 اس کا اقرار نہ کیا جائے۔

کفر عناد

کفر کی تیسری قسم کفر عناد ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دل سے پہچانتا بھی ہے زبان  
 سے اقرار بھی کرتا ہے کہ یہ دین درست ہے۔ مگر قبول نہیں کرتا۔ اس کی مثال ابو طالب کا  
 کفر ہے۔ وہ حضرت علیؑ کے والد اور حضور علیہ السلام کے چچا تھے۔ وہ یہ تھا کہ میرا عہد سچا ہے  
 صادق اور امین ہے۔ جو کہتا ہے۔ سچ ہے مگر اس نے ایمان اور توحید کو قبول نہیں کیا۔

کفر نفاق

اس کا خاتمہ کفر پر ہی ہوا۔ وہ عجیب قسم کے دہم کا شکار تھا۔ محض اس ڈر سے اسلام قبول  
 نہیں کیا۔ کہ عورتیں حرامت کریں گی کہ موت کے ڈر سے باپ و مادرین چھوڑ دیا۔ یہ کفر عناد ہے  
 کفر کی چوتھی قسم کفر نفاق ہے۔ اس کا ذکر اگلی باتوں میں آ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے  
 کہ انسان زبان سے اسلام کی سچائی کا اقرار کرتا ہے۔ کلمہ بھی پڑھتا ہے۔ نمازیں بھی ادا کرتا ہے  
 زکوٰۃ دیتا ہے۔ بسا اوقات جہاد میں بھی شریک ہوتا ہے۔ مہروروں سے تکذیب کرتا ہے۔ یہ  
 کفر نفاق ہے۔ اور پھر نفاق بھی دو قسم سے ہے یعنی اعتقادی نفاق اور عملی نفاق۔ یہاں پر  
 جس نفاق کا ذکر ہوا ہے۔ یہ اعتقادی نفاق ہے کہ اعتقاد اول سے تسلیم نہ کرتا عملی نفاق  
 کا ذکر بعد میں آئے گا۔ وہ اور چیز ہے۔

محدثین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہ چاروں کفر خطرناک ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی مبتلا ہو  
 گیا۔ وہ اللہ کے ہاں کبھی نجات نہیں پاسکتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ یہ قطعی  
 بات ہے۔

کفر شک

اس کے علاوہ بھی کفر کی کئی قسمیں ہیں۔ منجملہ ان کے کفر شک ہے۔ قرآن پاک میں  
 بعض مافقوں کے بارے میں آتا ہے۔ فَهَمْ فِيْ ذٰلِكَ يَكْتُمُوْنَ دُونَ دُورِ  
 جَكَوْا يَبْلُغُوْنَ فِيْ شَيْءٍ يَلْبِسُوْنَ یعنی ایسے لوگ شک میں ہی کھیل رہے ہیں۔

یہ کفر شک کہلاتا ہے۔

اسی طرح کفر کی ایک قسم کفر جہالت ہے۔ علم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے ساری عمر جہالت میں گزر جاتی ہے۔ نہ علم ہوتا ہے اور نہ وہ راہِ راست پر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی جگہ جگہ پر مذمت بیان کی ہے: اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ "ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے یعنی علم نہیں رکھتے۔ دوسری جگہ فرمایا: هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ "کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ مطلب یہ کہ برابر نہیں ہوتے۔ اس قسم کا کفر کفر جہالت ہے۔ جس میں اکثر لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔

کفر تاویل کو الحاد و مہوِ مذہب بھی کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شئی کو غلط مطلب پہنا دیا جائے۔ اصل مقصد کچھ اور ہو مگر تاویل کے ذریعے کچھ سے کچھ بنا دیا جائے مثلاً غلام احمد پروردگار کی آیت اطِيعُوا اللَّهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ کا مطلب مرکزِ ملت یا سنٹرل گورنمنٹ مراد لیتا ہے۔ کہ مرکزی حکومت کا حکم ماننا لازمی ہے۔ اسی طرح حج کا معنی اس نے عالمی کانفرنس کیا ہے۔ حالانکہ حج ایک نجدت کا نام ہے۔ اس کے ارکان ہیں جن کو پرکارنا ضروری ہے اس لیے محض عالمی کانگریس یا عالمی کانفرنس کا نام دینا باطل غلط ہے۔ پروردگار نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ خدا کے حکوم ہونے کا مطلب اپنی فطرت کا محکوم ہونا ہے۔ یہ بھی کفر والا معنی ہے۔ اس نے ترجمہ القرآن میں لکھا ہے کہ اللہ کا معنی قانون ہے۔ جہاں بھی اللہ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد قانون ہے۔ گویا خدا تعالیٰ کی ذات یا ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے حُورٍ عِينٍ کا معنی پاکیزہ فکر کیا ہے۔ گویا جنتیوں سے مراد پاکیزہ فزولے لوگ ہیں۔ حالانکہ حُورٍ عِينٍ کی اصطلاح کو تمام مسلمان سمجھتے ہیں کہ وہ عورتوں کی ایک پاکیزہ مخلوق ہے۔

غلام احمد قادیانی نے اپنی کتاب ازالہ اودھام میں مُتَمِّدٌ رُسُولِ اللَّهِ کے متعلق لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن میں میرا نام محمد بھی رکھا ہے اور رسول بھی۔ العیاذ باللہ۔ یہ کفر والا معنی ہے۔ اس سے پہلی آیت وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ کا معنی قادیانی یوں کرتے ہیں۔

بِالشَّيْبَةِ الْآخِرَةِ یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو آخری نبوت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور آخری نبوت مرزا غلام احمد مرتد کی سیلتے ہیں حالانکہ آخرت سے مراد دارالآخرت یا یومِ آخرت ہے نہ مرزا کیوں کی تاویل کی مثال ہے۔ اسی طرح انہوں نے "وَلَكِنْ رَسُولُ اللَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ" کا معنی یہ کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے سرنگھنے واسطے ہیں۔ یعنی اب جو نبی آتے ہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سر سے آتے ہیں۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سرنگھانگا کر دوسروں کو نبی بنائے ہیں (یعنی بالذات)۔  
 الغرض کفر تاویل سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا معنی کرنا جو نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو نہ صحابہ کرام سے نہ ائمہ سلف صالحین سے ثابت ہو، وہ کفر تاویل، مذکور بالا احادیث میں شمار ہوگا۔

سرستہ احمد خاں نے بہشت کا معنی مسرت اور خوشی کیا ہے۔ دوزخ کو غم اور پریشانی سے تعبیر کیا ہے۔ خوشی اور مسرت اچھے اعمال کا صلہ ہوتی ہے۔ اور رنج و غم بُرے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنت اور دوزخ کسی خاص جگہ کا نام نہیں۔ یہ بھی کفر یہ معنی ہے۔ کفر کی ایک قسم عملی کفر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نعمت کی قدر دانی کی بجائے اس کی ناشکری کی جائے۔ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، حضور! کفر سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ناشکرگزاری اور نفاقہ بی۔ اکثر عورتیں اس قسم کے کفر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ عورتوں کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے تَكْفُرُنَ الْعَشِيرَ یعنی تم خاوند کا کفر کرتی ہو۔ ناشکرگزاری کرتی ہو۔ یہی عملی کفر ہے۔ فرمایا کہ خاوند زمانہ بھر راحت و آرام مہیا کرتا ہے اگر ایک مرتبہ بھی تمہاری مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جاتی ہے۔ تو کہتی ہو، تیرے گھر آکر مجھے کبھی کبھار نصیب نہیں ہوا۔ کفر بن نعمت اکثر عورتوں کے مزاج میں داخل ہوتا ہے۔ یہ اعتقادی کفر نہیں بلکہ عملی کفر ہے۔  
 محدثین اور فقیہ کرام عملی کفر کی دو قسمیں بتاتے ہیں۔ بعض عملی کفر ایمان کے باطل منافقین سے

عملی کفر

ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسے کفر کا ارتکاب کرے تو ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ مثلاً کوئی بت کے سامنے بکھوڑیز ہو جائے، یا قرآن کریم کی توہین کا مرتکب ہوئے گندی جگر پر پھینک دے یا مثلاً کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دے یا کسی نبی کو قتل کئے تو ایسا آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔

عملی کفر کی دوسری قسم دو ہے۔ جن وجوہ سے انسان ایمان سے خارج نہیں ہوتا مثلاً کوئی شخص نماز کا تہ کم ہو، شراب پی لے، کسی کو قتل کر ڈالے، زنا کا مرتکب ہو یا کسی سے ناحق لڑائی کی۔ یہ سب کفر ہی کی قسم سے ہیں۔ مگر یہ ایمان کے منافی نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفًّا رَامِرًا بعد کفار کی طرح نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔ ان امور سے انسان اسلام سے تو باہر نہیں نکلتا۔ مگر کام کافروں واسطے ہیں۔ مومن کی شان نہیں کہ یہ کام کرے۔ قَاتِلُ الْكُفْرِ مَوْتٌ مِّنْ مَّوْتِ الْكُفْرِ ہے۔ مومن کو گالی مے فسق کی بات کرے، ناحق لڑائی یہ سب کفر کی باتیں ہیں۔ کیونکہ کافر، مسلمان کی جان کا دشمن ہوتا ہے جب کہ مومن، مومن کی جان کا محافظ ہوتا ہے۔ فرمایا شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدٍ وَثَنٍ یعنی شراب پینے والا ایسا ہی ہے، جیسا بت پرستی کرنے والا۔ گویا شرابی کو بت پرست کے ساتھ تشبیہ دی۔ نَسَائِی شَرِیف میں آتا ہے مَنْ اَتَى عَرَاْفًا اَوْ كَاهِنًا جَوَّابًا یَا عَرَاْفَ کے پاس غیب کی خبریں پوچھنے کے لیے گیا فَتَذْکُفْرًا اس نے کفر کیا۔ اس کی مزید تفصیل آتی ہے۔ کہ اگر بخومی کی بات کو بالکل سچا سمجھ رہا ہے تو اسلام سے خارج ہو گیا۔ اور اگر سچا سچا تو نہیں سمجھتا، ویسے ہی اس کی رائے لینا چاہتا ہے۔ تو یہ عملی کفر ہے۔ اسلام سے خارج تو نہیں ہوتا۔ مگر سخت گنہگار ہوتا ہے۔

کفر و ہریت بھی اسی قبیل سے ہے۔ قرآن پاک میں اس کفر کے متعلق مذکور ہے کہ بعض کافر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ دَمَآیْہِفْنِکُمْ رَاَ اللّٰہُ ہُمْ یعنی ہمیں زمانہ ہی بدل کر تا ہے ایسے لوگ زمانے کے تمام حادثات کو زمانے ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی ذات

کا اقرار نہیں کرتے کہ وہی ہر چیز کرنے والا ہے۔ بلکہ زمانے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ یہ کفر و ہریت کو کہتا ہے۔  
 اِنَّ الْكَافِرِينَ كَفَرُوْا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاذَنُا۟ اَمْ نَذَرُ لَهُمْۚ فِيْۤ هٰذَا اَشْكَالٌ وَّارِدٌ  
 ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ کہ کفار کو ڈرانے یا نہ ڈرانے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔  
 اگر ایسا ہے تو پھر انہیں ایمان کی تبلیغ و دعوت سے کیا حاصل ؟

ایک اشکال اور  
 اس کا جواب

مفسرین کرام وضاحت فرماتے ہیں کہ اس مقام پر لفظ سَوَاءٌ عَلَیْہِمَا یعنی ان کفار کے لیے برابر ہے۔ خواہ آپ تبلیغ کریں یا نہ کریں۔ سَوَاءٌ عَلَیْہِمَا کے الفاظ نہیں آئے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ ان کو تبلیغ کرنا یا نہ کرنا آپ کے لیے برابر ہے۔ یہ تو ان کے لیے برابر ہے۔ کہ انہیں کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ کا تو فرض ہے کہ آپ فریضہ تبلیغ انجام دیتے ہیں۔ کوئی ماننے یا نہ ماننے۔ یہ اس کی اپنی صوابیہ پر ہے۔ آپ کے لیے حکم یہ ہے "فَذَكِّرْ لَّہٗ نِعْمَتَ الذِّکْرِ اِیَّی" آپ نصیحت کرتے چلے جائیں، چاہے وہ انہیں فائدہ دے یا نہ دے۔ آپ کو اس تبلیغ کا ہر حالت میں اجر ملے گا۔

سفا

دوسرے نمبر

البقرة ۲

(آیت ۶۴)

إِنَّ الْكَافِرِينَ كَفَرُوا سَوَاءً عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥ خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦

بج

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان کے لیے برابر ہے کہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥ اللہ تعالیٰ نے ہر عادی سے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ⑦

ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے دو سرگروہ گذشتہ پہلے یعنی کفار کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گروہ متعین کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ دو سرگروہ کا بیان ہے اور دوسرے گروہ منافقین کا تذکرہ اگلے رکوع میں آئے گا۔ یہ دوسرا گروہ کفار کا ہے۔ جو ظاہر اور باطن اللہ تعالیٰ کی توحید کا انککار کرتے ہیں، اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے، کفر کی تشریح اور اس کی مختلف اقسام گذشتہ دس میں مختصر بیان کر دی گئی تھیں۔

گذشتہ دس میں اس اشکال و تذکرہ ہوا تھا کہ اگر کافروں نے ایمان ہی نہیں لانا، خواہ انہیں ڈرایا جائے یا نہ ڈرایا جائے، تو پھر انہیں تبلیغ کرنے کا فائدہ کیا ہے۔ اس کا جواب بھی دیا گیا تھا کہ ڈرانا یا نہ ڈرانا کفار کے لیے برابر ہے۔ نہ کہ خود تبلیغ کے لیے، کیونکہ تبلیغ تو ہر حالت میں اجر کا مستحق ہے، خواہ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے۔

دوسرا سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، کفار ایمان نہیں لائیں گے۔ حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ بہت سے کافر

ان آیات کے مصداق کون ہیں



اگرچہ ایمان نہیں لائے مگر دوسرے بہت سے ایمان لائے۔ اہل سفیان کافر ہی تو تھے۔  
وہ ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ اہل جبل جیسے بدترین دشمن کا بیٹا عکرمہ ایمان لایا۔  
مشہور جبریل خالہ بن ولید بھی بڑی دیر کے بعد ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ تو اس کا  
جواب یہ ہے کہ یہاں پر کفار سے مراد وہ کفار ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے  
کہ ان کی استعداد خراب ہے۔ ان کا خاتمہ کفر پر ہونے والا ہے۔ ان کے متبعہ شیخہ۔ اہل لب۔ اہل  
اہل جبل جیسے کافر مراد ہیں جن کا خاتمہ حالت کفر پر ہوا۔

بعض مفسرین کراہت فرماتے ہیں کہ ان آیات میں یہودیوں کی طرف اشارہ ہے جب  
قرآن کریم نازل ہوا تو انہیں اسلام کی دعوت پیش کی گئی مگر وہ جانتے بوجھتے ہوئے ایمان نہ  
لائے ماسوائے اکا دکا آدمی کے جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم پہلی کتابوں  
پر ایمان لائے ہیں۔ لہذا ہمیں اس کتاب یعنی قرآن پاک پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں ہے  
وہ انتہائی درجے کے متعصب لوگ تھے۔ یہ روش انہوں نے عذرا کی وجہ سے اختیار کی۔  
چنانچہ اس سورۃ مبارکہ میں کثرت سے یہود کا ذکر آئے گا۔ بلکہ اس سورۃ کا موضوع ہی یہود کی  
اصلاح ہے۔ یہود کا ذکر یہ سورۃ میں اس لیے شروع ہو کر اختتام پا رہا ہے اور پھر  
دوسرے پارے تک چلا گیا ہے۔

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے  
تو پھر انہیں اسلام کی دعوت دینے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ بلکہ انہیں دعوت دینا تو خلاف انصاف  
معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہود کے ہدف  
کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں  
ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے وہ ایمان سے محروم رہیں گے۔ اس کی مثال ایسے  
ہی ہے جیسے کوئی ماہر ڈاکٹر یا طبیب کسی مریض کو دیکھ کر بتائے کہ اسے ٹی بی کا مریض لاحق  
ہے۔ لہذا اب یہ یقین درجے مجبور کر کے چوتھے درجے میں داخل ہو گیا ہے۔ مریض کی موت



طرف جانا چاہتا ہے۔ خدا اسی طرف کی توفیق دیتا ہے۔ توفیق تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ مگر ارادہ تو انسان کا ہوتا ہے۔ اور ارادے کی مدد تک انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے کسب کہتے ہیں۔ گویا ارادہ انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے **رَفُضِلَ جَهَنَّمُ** آخر کار اس کو جہنم میں داخل کریں گے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اختیار کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک تندرست آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اور دوسرا شخص جوش کامریض ہے۔ اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر حرکت کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر کوئی تندرست آدمی اپنے ہاتھ سے کوئی نقصان کرے، کوئی برتن توڑے کسی کو تھپڑ مارے تو وہ اس فعل کا ذمہ دار ہوگا۔ اور قابل گرفت ہوگا۔ برخلاف اس کے کسی معیشتے داسے آدمی سے غیر ارادی طور پر کوئی نقصان ہو جائے تو وہ قابل مواخذہ نہیں ہوگا۔ وہ تو بیچارہ مجبور ہے۔ اس کے ہاتھ سے قرار گر کر کسی کی ہلاکت کا سبب بھی بن جائے۔ تو اس کے ذمے قصاص نہیں ہوگا بلکہ بیت ہوگی، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو جو محدود اختیار دیا گیا ہے۔ اسی کو شریعت میں کسب کہا جاتا ہے چنانچہ جو شخص بقائم ہوش و حواس اپنے ارادے سے صحیح ٹہکتے سے روگردانی کرے کہ اللہ تعالیٰ منہ کے طور پر اس کے دل اور کانوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور آنکھوں پر پردہ حائل کر دیتے ہیں۔ مہر لگانے کا یہی مطلب ہے۔

دلوں کی سیاحت

مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے **لَمُحَرِّضُ الْفِتَنِ عَلَى الْقُلُوبِ كَالْخَصِيفِ هُوَذَا عُوْدًا دُلُوں پر فتنے دار دہرتے ہیں۔ جس طرح شکار گاہ جوڑ کر چٹائی تیار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دلوں پر فتنے بکے بعد دیگر گھسائے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ انسان گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر ٹھپہ لٹک جاتا ہے۔ یہ فتنے گمراہی کی باتیں ہیں جو ایک ایک کر کے انسان پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص ان فتنوں کو قبول کر جاتا ہے اس کا دل سیاہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پورے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور انسان اس شیخ**

پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں نیکی کو نیکی نہیں سمجھتا اور بُرائی کو بُرائی نہیں جانتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے  
 لٹے کو اٹا کر کے رکھ دیا جائے یعنی مینہ اوپر اور منہ نیچے کی طرف کر دیا جائے۔ تو اس میں کوئی  
 چیز نہیں سما سکتی۔ اسی طرح انسان کا دل بھی اٹا ہو جاتا ہے۔ نیکی کی کوئی بات اس میں جگہ نہیں پاتی۔  
 برخلاف اس کے جو شخص دل پر وارد ہونے والے فتنوں کو قبول نہیں کرتا، اس کا دل منگھل  
 کی طرح سفید ہو جاتا ہے۔ اُسے کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

ایک دوسری حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ پہلی مرتبہ گناہ کا ارتکاب  
 کرتا ہے۔ تو اس کے دل پر سیاہ داغ پڑ جاتا ہے اگر بندہ توبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ  
 لے تو سیاہ داغ دھل جاتا ہے اور دل پھر سفید ہو جاتا ہے۔ اور اگر توبہ کرنے کی بجائے دوبارہ گناہ کا  
 مرتکب ہوا تو سیاہ داغ بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ہر گناہ کے ارتکاب پر دل کی سیاہی میں اضافہ  
 ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اَسْخَاطُ  
 بِہِ خَطِیئَتِہٖ" اس کے گناہوں نے اس کا اعطاء کر لیا ہے۔ اس کا دل معصیت، کفر اور  
 شرک میں گھبر گیا ہے۔ اسی حالت کے متعلق فرمایا "کَلَّا یَلْعَنُہٗ اَنْ عَلٰی قَلْبِہٖ مَّکَالًا یَّکْبُہُنَّ"  
 خبردار! سن لو! ان کے دل پر زنجیر چڑھ گئی ہے۔ اور اس کی وجہ ان کا اپنا کیا دھرم ہے۔ یہی وہ  
 شیج ہے جس کے متعلق فرمایا "خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قَلْبِہٖ" یعنی اللہ تعالیٰ نے بطور سزا  
 ان کے دلوں پر مہر لگائی ہے۔

اعضائے پیر کے  
 ہاتھ میں بازو پر  
 ہونے

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے انسان کے تین اہم اعضاء یعنی دل، کان اور آنکھوں کا ذکر کیا  
 ہے۔ دل محض گوشت کا ایک ٹکڑا ہی نہیں بلکہ اس کو عقل، قلب اور فہم سے بھی تعبیر کرتے ہیں  
 حقیقت یہ ہے کہ سوچ کا تعلق دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور قوتِ ارادہ کا تعلق قلب کے ساتھ  
 ہوتا ہے۔ اسی قوتِ ارادہ کی فزادہ کیا ہے قرآن پاک میں موجود ہے "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ  
 وَ الْفُؤَادَ لَکُلِّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَشْهُودًا" یاد رکھو! کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق ہوال  
 ہو گا۔ یہ اعضا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہیں۔ انسانی جسم میں یہی چیزیں علم کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ



الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم نعمتیں انسان کو وصیت کی ہیں۔ یہ اس کے لیے حصول طہ کے ذرائع ہیں۔ جو شخص ان ذرائع کو ضائع کرتا ہے۔ اس کی مثال حسرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یوں دی ہے۔ جیسے کوئی امیر کبیر کسی کی تنخواہ مقرر کر دے۔ کہ بجائی تم غریب ہو ہر ماہ یہ وظیفہ وصول کریا کرنا۔ وہ شخص ہر مہینے اپنا مشاہرہ وصول تو کرتا ہے مگر کسی مصروف میں لانے کی بجائے اسے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ یہ پانی میں ڈبو دیتا ہے۔ امیر دیتا رہتا ہے اور غریب ضائع کرتا رہتا ہے۔ آخر کار اس امیر کو کنا پڑتا ہے۔ کہ یہ شخص کس قدر نیک حرام ہے۔ کہ میں نے اس پر رسم کرتے ہوئے اس کا وظیفہ مقرر کیا ہے۔ مگر یہ اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا چنانچہ اس کا وظیفہ بند کر دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس شخص کو افسوس بلکہ احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کی آمدنی ختم ہو گئی ہے۔ تو اس قسم کے شخص کے متعلق سوائے اس کے در کیا کہا جائے گا کہ یہ بوقوف سزا کا ہی مستحق ہے۔

عذاب عظیم  
کی وعید

یہی حالت اس شخص کی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے دل عطا کیا۔ کان اور آنکھیں دیں مگر وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ان کو بروئے کار نہیں لاتا۔ تو آخر اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ نعمتیں سلب کر لی جائیں گی، اور ایسا شخص نیک حرام قرار پائے گا۔ جن دو حالت ہے۔ جس کے متعلق فرمایا کہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے لہذا ان کے لیے عذاب عظیم مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہ اسی کے مستحق ہیں۔

احسن تدبیر کا  
مرکز ایک ہے

یہاں پر جن تین اعضاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں قلوب جمع ہے۔ سمع واحد اور البصر جمع کا صیغہ ہے۔ کہتے ہیں کہ قلب کی حالت تو ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ لہذا بہت لوگوں کی وجہ سے اسے جمع فرمایا۔ ”یہاں اگرچہ ہر انسان کے دو ہیں مگر ان دونوں کی سماعت اکٹھی ہوتی ہے۔ ان کا مرکز ایک ہے۔ لہذا اس کے لیے واحد کا صیغہ بولا۔ اور آنکھیں دونوں الگ الگ ہیں ان دونوں سے اکٹھا بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ اور ایک کو بند کر کے کسی ایک سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ لہذا ان کے لیے جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ پہلے دو اعضاء یعنی دل اور

کانوں کے متعلق فرمایا کہ ان پر ٹپہ دگا دیا گیا ہے۔ اور آنکھوں کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ ان کو استعمال نہیں کرتے ان پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ان کو کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ کفر، شرک اور برائی کا پردہ ہے۔ جو آنکھوں پر پڑا ہوا ہے۔ صحیح بات نظر ہی نہیں آتی۔ جب کسی شخص کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ تو ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ان کے لیے سزا ہے۔ جو آگے چل کر انہیں ملے گی۔

ان دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کے گروہ انسانی کا حال بیان فرمایا۔ جنہوں نے ظاہراً اللہ بظن کفر کو اختیار کیا۔ اور ہدایت سے محروم ہے۔ ان کی سزا کا ذکر بھی اجماعاً کر دیا۔ اہل الفاظ کے ضمن میں وجوہات بھی ذکر کر دیے۔ ان کا حال محسوس ہوتا ہے۔ ان کے منافقین کا ذکر آئے گا۔ چونکہ یہ زیادہ خطرناک گروہ ہے۔ اس لیے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ تیسرا گروہ ہے۔



# الْعَم

## درس ششم

البقرة ۲

آیت ۱۲۹:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝۸ يَخْدَعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝۹ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَفَرَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۰ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝۱۱ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝۱۲ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِن لَّا يَشْعُرُونَ ۝۱۳

ترجمہ: اور بعض لوگوں میں سے وہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں ۝۸ وہ دھوکا دیتے ہیں اللہ کو اور اُنی لوگوں کو جو ایمان لائے اور حقیقت میں وہ نہیں دھوکا دیتے مگر اپنی جانوں کو، اور وہ سوچتے بھی نہیں ۝۹ ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس وجہ سے کہ وہ مجھوٹ بولتے ہیں ۝۱۰ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں بیشک ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۝۱۱ سنو! بیشک یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں۔ مگر یہ سمجھتے نہیں ۝۱۲

ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر چاہیے۔ پہلا گروہ وہ ہے جو ظاہر اور باطن ہدایت کو قبول کرتے ہیں، وہ مومن و متقی کہلاتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال بیان ہوا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ظاہر اہل باطن ہدایت الہی کا انکار کرتا ہے۔ وہ کافروں کا گروہ ہے۔ اگلی دو آیات میں ان کا حال بیان ہو چکا ہے اب ان آیات میں تیسرے گروہ منافقین کا ذکر ہے جو ظاہر میں تہذیب کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان

گذشتہ پیرت

کے باطن میں کفر ہوتا ہے۔ اگلی تیرہ آیات میں منافقین کی خرابیاں، ان کی سازشوں اور چال بازیوں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مثالوں کے ذریعے سارا معاملہ سمجھایا ہے۔

منافقین کا گروہ قرآن کریم میں منافقین کا حال مختلف سورتوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بعض سورتیں صرف منافقین کے نام پر ہیں مثلاً سورۃ منافقون، اسی طرح نندل کے اعتبار سے آخری سورۃ توبہ میں بھی منافقین کی سازشوں سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور ان سے خبردار رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

امام ابو بکر جصاصؓ بہت بڑے مفسر قرآن ہوئے ہیں، امام فزید بن ہرذ بھی بہت بڑے عالم گزشتے ہیں انہوں نے علوم عربیہ میں کامل نامی عظیم کتاب لکھی ہے۔ یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ نفاق کا اشتقاق نَافِقًا لِیَرْجِعَ سَبَّہ جس کا معنی ہے جھٹکی چوبے کا بل، مشہور ہے کہ گوہ یا جھٹکی چوبے کے چار بل (سوراخ) ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ شکاری کو دھوکا دیتا ہے یہ کسی ایک سوراخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ شکاری اس کو کھوٹتے ہیں، تو وہ کسی دوسری طرف غائب ہو جاتا ہے۔ منافق کا حال بھی یہی ہے۔ یہ شرک کو پوشیدہ رکھتا ہے، اور ایمان کو ظاہر کرتا ہے جھٹکی چوبے کی طرح یہ بھی خدائے معنی دھوکے باز ہوتا ہے۔ شریعت میں منافق کی تعریف اس طرح کرتے ہیں لِمَنْ یُظْهِرُ الْإِیْمَانَ وَیُکْفِرُ الْکُفْرَ جَوَایمان کو ظاہر کرتا ہے، اور کفر کو چھپاتا ہے۔

منافقین کی قسمیں اب منافق کی کسی قسم کا منافق وہ ہے جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ اور وہ اس پر مطمئن ہے۔ دوسری قسم کا منافق وہ ہے جو ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے متنبہ رہتا ہے۔ وہ ظاہر اور باطنی شک میں ہوتا ہے ایسا منافق مُدْبِذٌ بَيْنَ بَیْنِ ذَٰلِكَ کا مصدق ہوتا ہے۔ ان دونوں قسم کے منافقین کا نفاق شدید ہوتا ہے ان کا اعتقاد غائب ہوتا ہے۔ اور اس مقام پر جن منافقین کا ذکر ہے، وہ یہی اعتقادی منافق ہیں۔ جن کے عقیدے میں کفر بھرا ہوا ہے۔

تیسری قسم کا منافق وہ ہے، جو اخلاقی اور عملی منافق ہوتا ہے ایسا شخص اپنے گناہوں کی وجہ سے آخرت کے نقصان کو دنیا کے نقصان پر ترجیح دیتا ہے۔ اور دنیا کے نفع کو آخرت کے نفع پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ ایسے منافق ہوتے ہیں کہ اگرچہ ان میں ایمان موجود ہوتا ہے مگر یہ لوگ آخرت کو دنیا پر ترجیح نہیں دے سکتے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ  
الْآخِرِ بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے  
ہیں وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں ایسے لوگ دھوکے باز ہیں۔  
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا اللہ تعالیٰ اور ایمانداروں کو دھوکا دیتے ہیں۔ مگر  
حقیقت یہ ہے وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ کہ یہ اپنی جانوں کو دھوکا دے رہے  
ہیں۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ یا ایمان والوں کو کیا بگاڑیں گے۔ یہ تو اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ اور اپنا  
سہی انجام خراب کر رہے ہیں۔ اور یہ سوچتے بھی نہیں وَمَا يَشْعُرُوْنَ یہ اتنا شعور بھی نہیں رکھتے  
کہ خود اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ آخرت کو برباد کر رہے ہیں فِي قُلُوْبِهِمْ مَّرَمٌ ان کے  
دلوں میں بیماری ہے۔ اور یہ بیماری شک کی بیماری ہے۔ اکثر صحابہ کرام خصوصاً حضرت عبداللہ  
بن مسعودؓ نے یہی معنی کیا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں شک ہے۔

نفاق کی بیماری جسمانی بیماری نہیں بلکہ دین کی بیماری ہے۔ جس طرح اجمام کی بیماری  
ہوتی ہیں۔ اسی طرح دین اور عقیدے کی بھی بیماریاں ہوتی ہیں۔ تو اس بیماری سے مراد عقیدے  
کی بیماری ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اعتدال کی حالت سے نکل جاتا ہے۔ وہ  
بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جسم کے مختلف غصا اور اجزاء جب تک اعتدال پر قائم رہیں انسان  
کی صحت درست رہتی ہے۔ اور جب یہ اعتدال خراب ہو جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ عقیدے  
کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ جب آدمی اعتدال کا راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ تو پھر بد عقیدگی، حسد،  
کینہ، اور گناہوں کے ساتھ محبت کا راستہ کھل جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو انسانوں کو

نفاق دینی  
بیماری ہے

فحیست کی باتوں سے روکتی ہے۔ اور ابدی اور حقیقی زوال کا باعث بنتی ہے۔ اسی لیے عربی زبان میں مَرَضٌ کا لفظ نفاق پر بھی بولا جاتا ہے۔ کہنے اور حسد کو بھی نفاق کہتے ہیں۔ نفاق کا کام یہ ہے کہ خیر کو ظاہر کرتا ہے اور شر کو چھپاتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان عجمانی کا کام کر رہا ہے۔ مگر باطن میں فتنہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دل کی بیماریوں کا پتہ چلتا ہے۔ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ ان کے دلوں میں بھی بیماری ہوتی ہے۔ اور یہ بیماری خون، صفرا وغیرہ کی ظاہری بیماری نہیں ہوتی جو ظاہری جراثیم سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے محرک باطنی جراثیم یعنی گناہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑے گناہ شرک، کفر، نفاق، شک، تردد اور اتحاد وغیرہ ہیں۔ اور ان سے پیدا ہونے والی روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔

فرمایا فَزَادَ هُمْ اللہ مَرَضًا اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو بڑھا دیا کیونکہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری ہے کہ جب علاج نہیں کیا جاتا تو بیماری بڑھ جاتی ہے دیکھ لیجئے اسلام کو ترقی نصیب ہو رہی ہے۔ مگر منافقوں کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان کے باطن میں پریشیہ و حسد اور کینہ، اسلام کی مخالفت اور بدعتیگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی کو فرمایا فَزَادَ هُمْ اللہ مَرَضًا اب اس بیماری کا نتیجہ یہ ہو گا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔ اور یہ سزا انہیں اس جرم کی پاداش میں ملے گی۔ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ زبان سے حق کا اقرار کرتے تھے۔ اہل ایمان کی رفاقت کا دم بھرتے تھے۔ مگر دل سے کفر کے ساتھ ہوتے تھے۔ گویا وہ زبان سے جھوٹ بولتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ان کے اس جھوٹ کی وجہ سے انہیں سزا کا عذاب کا مزہ چکنا ہو گا۔ یہ ان کے نفاق یا حسد یا کفر کی سزا ہے۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ منافقین اپنے نفاق کی وجہ سے خدا فی الارض کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس سلسلے میں جب ان سے کہا جاتا ہے وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا

خدا فی الارض



پر بیعت کرتے ہیں۔ وہ گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا: مَنْ يَطُوعِ  
الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت  
کی۔ کیونکہ رسول خدا کا نائب اور اس کا پیغام مخلوق تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ تمام امور کی  
رضا کے لیے انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے  
رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔

منافقین کا طریقہ وارادت بھی وہی ہے۔ جو ایک عام دھوکا باز ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔  
کہ اس طریقہ سے ہم اپنے مفاد بھی حاصل کر لیں گے۔ اور ہمیں نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ اس طرز  
ہم اس برعقیدگی پر قائم رہ سکیں گے۔ گویا اسلام کا دھوکے بھی کرتے ہیں۔ اور کفر کے پروگرام کو  
بھی ساتھ ہی جاری رکھتے ہیں

حالانکہ یہ دو متضاد پروگرام ہیں اور کسی صورت میں ان کے درمیان ہم آہٹی پیدا نہیں ہو  
سکتی۔ اسلام کا پروگرام نہایت ترقی یافتہ پروگرام ہے۔ جب کہ کفر انتہائی رجعت پسندانہ نظام  
ہے۔ یہ دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔

ایک طرف توحید، ایمان، اور تقویٰ کا پروگرام ہے۔ اور دوسری طرف کفر، شرک اور باطنی  
بیماریوں کا نظام ہے۔ معاصی اور جنگ و جدل کا نظریہ رکھنے والے ہی لوگ فساد فی الارض کے  
مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا اِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ  
اصل فساد ہی ہیں۔ جو زبان سے اسلام کا نام لیتے ہیں وَلٰكِنْ لَا يَتَفَرُّوْنَ مَعَكُمْ  
یہ لوگ سمجھتے نہیں ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور فساد ثابت ہو گیا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو آج کل کی حکومتیں بھی اسی نفاق کا شکار ہیں۔ یہ بھی حق و باطل کو  
یکجا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں۔ خود ہماری حکومت کا کیا حال ہے۔ اسلام  
کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ اور یورپ کے غیر اسلامی پروگرام بھی ساتھ چل رہے ہیں انگریز کا قانون بھی  
راج ہے۔ اور اسلامی قوانین بھی جاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ دونوں پروگرام اکٹھے  
نہیں چل سکتے، صرف ایک نظام کو اپنانا ہو گا۔ ورنہ فساد فی الارض کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔  
اسی طرح اسلام کے نظام تعلیم اور انگریزی تعلیم کو یکجا چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے ایک

دھوکہ بازی  
پر نفاق



تظام کا معنی ہی فساد ہے اور دوسرے کا ایمان، تو یہ انکٹے کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب تک تمام باطل نظاموں کو ختم کر کے صرف اسلامی نظام کو قائم نہیں کریں گے۔ کبھی فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں نے یہ بات اشارہ کر دی ہے۔

عذاب عظیم اور  
عذاب الیم  
میں فرق

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے قبل کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں فرمایا: **وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ** اور منافقوں کے متعلق فرمایا: **وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ** یعنی کافروں کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اور منافقوں کے لیے دردناک عذاب۔ اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں: کہ کافر مردود اور محروم اذلی ہے۔ اس کی استعداد تو ابتدا ہی سے خراب ہے۔ کافروں نے اپنی استعداد کو بگاڑ کر بالکل محرومی کی حالت اختیار کر لی ہے۔ لہذا ان کے لیے عذاب اول سے آخر تک بڑا ہی ہوگا۔

جہاں تک منافقین کا تعلق ہے۔ ان میں استعداد تو موجود تھی، مگر انہوں نے اس استعداد میں بگاڑ پیدا کر کے اپنے اندر خود محرومی پیدا کر لی۔ جب سزا کی نوبت آئے گی، تو ان کو اس کا احساس ہوگا اور دکھ پیدا ہوگا۔ کراؤں ہمارے اندر استعداد تو موجود تھی مگر ہم نے اس کو نظر انداز کر دیا لہذا ان کو مولم عذاب ہوگا۔ یعنی جس قدر احساس ہوگا۔ اسی قدر تکلیف ہوگی۔

اس کے علاوہ مفسرین کرام ایک اور بات بھی بیان فرماتے ہیں۔ کہ کافروں نے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہی نہیں۔ وہ تو اول و آخر کافر ہی رہے۔ برخلاف اس کے منافقین نے اگرچہ دل سے حق کو قبول نہیں کیا، مگر زبان سے تو ایمان کا ذائقہ چکھا ہے۔ اور جو آدمی کسی چیز کا ذائقہ چکھ لیتا ہے۔ اس کا حکم اور ہوتا ہے۔ لہذا ان کے لیے عذاب الیم مقرر کیا گیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بکثرت پھل پیدا کرنے والے علاقے کے لوگ کسی ایسی جگہ جاتے ہیں۔ جہاں ایسے پھل نہیں ہوتے۔ تو انہیں احساس محرومی ہوتا ہے۔ اور بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ بڑا مشورہ تھا کہ ابدالی نے جب پانی پت کا معرکہ لڑا۔ تو دل کے بعض لوگوں نے کہا کہ آپ یہیں ٹھہر جائیں۔ تو انہوں نے یہ تاریخی جگہ کا تھا۔ ایں جانار قنہ صابر کجاست یعنی یہاں قنہ صابر کا انار کہاں ہے۔



جو میں یہاں قیام کروں۔ وہ قندھاری انار کے ذائقے سے واقف تھا۔ اس لیے وہ وہاں ٹھہر کر  
ذائقے سے محروم نہیں ہونا چاہتا ہے۔

منافقین کا مال بھی یہی ہوگا۔ چونکہ انہوں نے زبان سے ایمان کا ذائقہ چکھا تھا۔ اس  
لیے آخرت میں انہیں محرومی کا سخت احساس ہوگا۔ اور اس احساس کی وجہ سے ان کے دھڑ  
دھڑ میں اعنافہ ہوگا۔ اسی لیے اس کو عذاب الیم کہا گیا ہے۔

---

الْعَمَّ:

درس ہفتم ۵

البقرہ - ۲۵۰

(آیت ۱۳ تا ۱۶)

وَإِذْ قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ  
 السُّفَهَاءُ أَلَا نَشْكُرُ هُمُ السُّفَهَاءُ وَنَكُنُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذْ  
 آمَنَ الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيَاطِينِهِمْ قَالُوا  
 إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّا عَنَّا مُتَهِنُونَ ﴿١٤﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ  
 وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ  
 اشْتَرَوُا الضَّلَالََةَ بِالْأَمْثَلِ مِمَّا رَبِحَتْ بِحِبَارَتِهِمْ وَمَا  
 كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

توجہ دے: اور جب ان سے کہا جائے۔ ایمان لاؤ اس طرح جس طرح درج  
 لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں۔ کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بیوقوف لوگ  
 ایمان لائے ہیں۔ سنو! بیشک یہی لوگ بیوقوف ہیں، لیکن یہ جانتے نہیں ﴿۱۳﴾  
 اور جب یہ مٹے ہیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے، تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان  
 لائے ہیں، اور جب یہ تنہا ہوتے ہیں، اپنے شیطانوں (سرداروں) کے پاس، تو کہتے  
 ہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں، بیشک ہم تو ہنسی کرتے ہیں ﴿۱۴﴾ اللہ ان کے ساتھ  
 ہنسی کرتا ہے، اور جلدت دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں وہ سرگردان ہو رہے ہیں ﴿۱۵﴾  
 یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے خریدے گمراہی کو ہدایت کے بدلے پس نہیں فائدہ دیا  
 ان کو ان کی تجارت نے۔ اور نہیں تھے یہ لوگ ہدایت پانے والے ﴿۱۶﴾

ہدایت کے اعتبار سے قیہ اگر وہ منافقین ہے۔ کل بھی ان کا ذکر ہوا تھا۔ اور آج کی آیت  
 میں بھی منافقین کا ہی ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی خرابیوں کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا  
 ہے۔ پہلی آیت میں آیا تھا کہ بعض لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے  
 ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے بیان کی نفی فرمادی ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ

گزشتہ سے پیوستہ

اور ایمانداروں دونوں سے دعا بازی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو تو دعو کا نہیں ملے سکتے اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو بھی ان کے دعو کے سے پہچانے گا۔ کیونکہ ان کا دعو کا ان کی اپنی ہی جانوں پر ہے اور یہ ان باتوں کو سوچتے ہمک نہیں۔ ان کے دلوں میں شک، تردد اور نفاق کی بیماری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری کو ابد بڑھا دیا ہے۔ اور ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ کیونکہ یہ تھوٹ بولتے تھے ظاہر اسلام کرتے تھے مگر ان کے باطن میں کفر تھا۔ ان کی ایک اور بیماری فساد فی الارض تھی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو اکڑ جاتے اور کہتے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ہمیں کوئی فساد کیسے کہہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی لوگ فساد میں مگر یہ سمجھتے نہیں۔

حقیقی ایمان

اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک اور غرابی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ حُبُّ انِّ مَنَافِقُونَ سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح وہ بے لگ ایمان لائے میرے قائلو۔ ترجمان میں کہتے ہیں الَّذِينَ آمَنُوا كَمَا آمَنَ اسْتَفْهَمُوا کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں فرمایا رَبِّ انْفَعُوا هُمُ السُّفَهَاءُ سن لو! بیوقوف خود ہی ہیں وَلٰكِنْ لَا يَعْلَمُونَ مگر یہ جانتے نہیں۔ یہاں یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ منافقین تو بڑے ایمان کا انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بظاہر تو وہ ایمان لا چکے تھے۔ تو پھر وہ یوں کیسے کہہ سکتے تھے کہ ہم بیوقوفوں کی طرح کیسے ایمان لائیں۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ایسی بات بڑے مسلمانوں کے سامنے نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے خاص محنت آدمیوں کے رد و رد کرتے تھے جنہیں اپنا راز داں سمجھتے تھے کہ وہ ایسی بات کا بڑا نہیں منائیں گے۔

اس مقام پر ایک اندازہ قابل غور ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے۔ ایمان لاؤ، حالانکہ ایمان کا دعو سے تو وہ پہلے ہی کر رہے ہیں۔ تو ایمان لانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ محض زبانی طور پر ایمان نہ لاؤ بلکہ حقیقی اور صحیح ایمان لاؤ۔ جیسے وہ مسلمان ایمان لائے ہیں۔ کیونکہ علاج کا دار و مدار اسی ایمان پر ہے۔ لذات فانیہ، شوائع نفسانیہ، ریاکاری، طلب جادو وغیرہ حقیقی ایمان کی بدولت ہی دفع ہوتی ہیں کسی بطل مقصد کے لیے خالی ایمان کا اظہار بے گزیر مفید نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ حقیقی ایمان لاؤ۔ یعنی دال کی پوری تصدیق اور اخلاص کے ساتھ ایمان و تسلیم

کرو۔ دوسرے مقام پر آئے یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا ۝ اے ایمان والو! ایمان لاؤ  
یعنی محض زبانی ایمان کافی نہیں بلکہ حقیقی اور مخلصانہ ایمان اختیار کرو۔

اسی لیے منافقین سے کہا گیا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ایمان لاؤ۔ وہ دوسرے لوگ کون  
ہیں؟ بلاشبہ وہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اخلاص کے ساتھ  
ایمان لائے۔ ابن مساکر جو بہت بڑے مورخ ہیں۔ انہوں نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن  
عباس سے روایت نقل کی ہے کہ آیت پاک کا مطلب یہ ہے کہ تم اس طرح ایمان لاؤ کہ  
أَمِنَ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَبْنُ عَفْرَةَ یعنی جس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ،  
حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ایمان لائے ہیں۔ اس طریقے پر تم بھی ایمان لاؤ۔ ان کا ایمان خلوص اور  
حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کے معیار پر پورے اردو محض زبانی دعوے سے بات نہیں بنے گی تم تو  
تھوڑے ہو وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ یہ لوگ قطعاً مومن نہیں ہیں۔

اسی سورۃ میں آگے چل کر سورتوں کے تعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں هٰذَا آمِنُوا  
بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا ۝ اگر یہ لوگ بھی تمہاری طرح ایمان لے  
آئیں تو یہ بھی ہدایت پا جائیں گے۔ یہاں سے معیار حق ہونے والی بات سمجھ میں آجاتی ہے۔  
کہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام خصوصاً خلفائے راشدین معیار حق ہیں۔ یہ اصحاب کبار اگرچہ  
نبی کی طرح معصوم تر نہیں ہیں مگر امت کے لیے نمونہ ہیں۔ وہ اپنے اخلاص اور حقیقی ایمان کی  
وجہ سے ان خرابیوں سے محفوظ تھے جو ایمان کے باوجود انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور جن  
کی وجہ سے آدمی ناکام ہو جاتا ہے معیار حق اسی فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر قرآن پاک میں  
فرمایا ہے: لَسْتُ كُنْتُ أَشْهَدُكَ عَلَى الشَّيْءِ وَكَوَدَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا  
شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ جو جاوید لوگوں کو جاننے والے  
اور معلم اور اللہ کا رسول تمہیں بتانے والا ہے :

۱۔ تفسیر درمنثور ص ۳۳ بحوالہ ابن مساکر وغیرہ عزیزی فارسی پارہ ۱ ص ۱۰۱  
۲۔ قرآن مجید ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ ص ۳۳ مطبوعہ حج کمیٹی



کو انسان اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر انس کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے۔

حقیقی انسان  
کون ہیں؟

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی یہاں پر ایک نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ اس مقام پر منافقوں کو کہا جاتا ہے کہ تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسلانے کے وہی لوگ تھے ہیں جو حقیقی ایمان سے محروم ہیں۔ یہی لوگ انسانیت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں اور انہی کی وجہ سے دنیا کا نظم درست رہا ہے۔ جو لوگ حقیقی ایمان سے محروم ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُولَٰئِكَ كَانُوا فِيْهَا يَسْتَكْبِرُوْنَ اَمْ اَمْضَلٌ اَمْضَلٌ یہ تو جانوروں کی مانند ہیں یا ان سے بھی بدتر۔ یہ انسان کسلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ یہ لوگ جانوروں کی طرح کھانے پینے اور جنسی کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ لہٰذا حقیقی انسان وہ ہیں جو حقیقی ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔

بیوقوف کون ہیں؟

پہلے گزر چکا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح اسے ایمان لاؤ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں حالانکہ حقیقت میں منافق ہی بیوقوف ہیں۔ مگر انہیں علم نہیں۔ یہ لوگ ایمانداروں کو اس لیے بیوقوف سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا کے نفع سونے کو چھوڑ کر آخرت کی فکر کرتے ہیں۔ اس کو حاصل کرنے کی ٹمک و درد میں لگے بستے ہیں۔ مگر وہ بیوقوف یہ بات نہیں سمجھتے کہ ممکنہ ہی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نقصان سے بچ جائے اور فائدہ حاصل کرے ایماندار دنیا کے اس عارضی فائدے کی پروا نہ کرتے ہوئے آخرت کے ابدی فائدے کو حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا صحیح فہم میں ممکنہ ہی میں اور منافق بیوقوف ہیں۔ جو آخرت کو چھوڑ کر عینی حقیقی اور ابدی فائدہ کی بجائے دنیا کا عارضی اور فانی فائدہ تلاش کرتے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو ممکنہ سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو بیوقوف جانتے ہیں۔ اور اس طرح اس فریب سے دنیا کا مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ حَقِیْقَت میں یہی بیوقوف ہیں وَلٰكِنْ لَا یَعْلَمُوْنَ مگر یہ حقیقت حال کو نہیں جانتے۔

منافقوں کی  
دو جگہ پائی

اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے فرمایا وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔

جب یہ اہل ایمان سے ملے تو خوشام کرتے ہیں قَالُوا اَمَّا نَحْنُ کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لے  
 آنے میں بنائے گئے ہیں اپنی پہلی کہ آدمی سمجھیں مگر حقیقت یہ ہے وَرَدَا خَلَقُوا الْاِنْسَانَ  
سَجْدَةً جب یہ شیطانوں کے پاس جاتے ہیں۔ قَالُوا اِنَّا مَعَكُمْ تو کہتے ہیں  
 کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ثُمَّ اخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ تو ہم مسلمانوں کا محض تمسخر اٹا رہے ہیں۔  
 تو یا محمد ان کی ناسیت کا دعویٰ کر کے نہیں بے وقوف بنائے ہیں۔ یہاں پر شیاطین سے مراد  
 منافقوں کے بڑے بڑے سردار اور سرغنہ ہیں۔ جو نفاق کے پردہ گرام کے بانی تھے۔

بعض بولے اعتراض کرتے ہیں کہ تبلیغی نقطہ نظر سے ان لوگوں کو بے وقوف یا شیطان کا لقب  
 دینا کسی قدر زیادتی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو یہ القاب اس وقت دیے گئے ہیں۔  
 جب تبصرے کے تمام تقاضے پورے ہو چکے ہیں۔ اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی بٹ دھرمی  
 کی وجہ سے اپنی کرتوتوں سے اپنے آپ کو دسے نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تبصرے کے ابتدائی  
 دور میں اس قسم کے القاب دینا درست نہیں۔ مگر اتمام محبت کے بعد ایسا کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں  
 منافقین نے کہا تھا کہ مسلمانوں کا تمسخر اٹا رہا ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے  
فَرَايَا اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ اللّٰهُ تَعَالٰی ان کے ساتھ ہنسی کرتا ہے وَيَمْدُ لَهُمْ  
مُكْفٰی لَهُمْ اور مصلحت دیتا ہے۔ ان کی سرکشی میں کھینچ دیتا ہے اور سرگردان ہو رہے  
 ہیں۔ یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ ہنسی کرنا۔ اس کا تمسخر اٹانا تو فعل عجب اور ناجائز  
 ہے۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام عیوب سے متبرک ہے۔ اس کے  
 جواب میں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ استہزاء نہیں بلکہ شاکت ہے۔ یعنی جو سلوک منافقین نے  
 مسلمانوں کے ساتھ کیا، ویسا ہی سلوک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا۔ اس قسم کی مثالیں  
 درجہ معامات پر بھی ملتی ہیں مثلاً حَبْرًا وَّ اَسِيَّةً سَيِّئَةً بڑائی کی جزا بڑائی ہے ملائکہ  
 جزا تو عدل کا نام ہے۔ اور عدل بڑائی نہیں ہوتا۔ تو یہاں پر بھی مراد یہی ہے کہ جیسا سوال ہے  
 اس کا ہم شکل جواب ہے۔ یہی بات ہے وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا وَمَكْرُؤًا مَّكْرًا میں

استہزاء من اللہ  
 کا محض



بھی پڑی جاتی ہے۔ یہ عربی زبان کی لطافت، جو غلت اور فصاحت ہے۔ اور اسے شاکست کے میں  
 اس طرز کلام کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے استتار کا نقصان انہی کی طرف ہوتا  
 ہے۔ اللہ خود ٹھٹھا نہیں کرتا بلکہ منافقین کے قسز کا ضرب خود خود ہی ٹٹ جاتا ہے۔ وہ خود کو کیا  
 ضرب پہنچائیں گے۔ نبی علیہ السلام اور مومنین کو اللہ تعالیٰ ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ  
 مومنین کو منافقین کی چالوں سے آگاہ کر دے گا۔ تاکہ وہ اپنے شر سے بچیں **اللہ یستہزیئ**  
**بہم** کا یہی مطلب ہے۔ استتار بجانب اللہ کا ایک اور مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ  
 منافقین کے ساتھ دیا ہی معاملہ کرتا ہے۔ بیٹھا ٹھٹھا مذاق کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے چونکہ  
 منافقین محض زبانی دعوے کی بنا پر جماعت المسلمین میں شریک ہوتے ہیں اور مفاد حاصل کرتے ہیں  
 اس لیے اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے۔ **تب ان کو دنیا کو نہ دے۔ وہ غازیں پڑھیں۔ عہد قدس جہاد**  
**میں شرکت کریں۔ مگر ان کا کوئی ثل فسرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ دل سے تو ایمان لائے نہیں**  
**لہذا ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو مذاق کرنے والے کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ بھی گویا ان کے**  
**ساتھ ایک قسم کا تمسخر ہے۔**

حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن منافقین  
 دوزخ کے گڑھے میں پہنچ جائیں گے۔ تو جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ گویا انہیں جنت میں جانے  
 کی اجازت مل گئی ہے۔ جنتی ان منافقوں کی طرف دیکھیں گے۔ تو وہ محسوس کریں گے کہ واقعی ہمیں  
 جنت میں داخلے کی اجازت مل گئی ہے۔ چنانچہ وہ دوزخ کو جنت کے دروازے پر پہنچیں گے  
 مگر اتنے میں دروازہ بند ہو جائے گا۔ اور منافق ہمہ دورہ جائیں گے۔ **اللہ یستہزیئ بہم**  
 کی یہ بھی ایک صورت ہے۔ یہ لوگ اس دنیا میں اس قسم کی چالاکی کر رہے ہیں، تو کل قیامت  
 کے دن ان کے ساتھ بھی تمسخر ہوگا۔

گائے کا واقعہ اس سورۃ میں آ رہا ہے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارا آدمی  
 قتل ہو گیا۔ مگر قاتل کا پتہ نہیں چلتا تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ گائے ذبح کریں، تو اس

موقع پر ان لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، کیا آپ ہمارے ساتھ ٹھٹھا کرتے ہیں۔ تو اپنے جواب دیا: **أَعُوذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ** میں خدا کی پناہ اٹھتا ہوں اس بات سے کہ میں تم سے ٹھٹھا کر کے جاہلوں میں شمار ہو جاؤں۔ خدا کے بندو! میں تو اللہ کا حکم تم کو سن رہا ہوں کہ گائے ذبح کرو۔ اس کے گوشت کا سڑا مرے پر مارو۔ تو قاتل کا پتہ چل جائے گا۔ میں تم سے ٹھٹھا نہیں کر رہا ہوں۔

الغرض! فرمایا: اللہ تعالیٰ اُن کی سرکشی میں ان کو مہلت دیتا ہے۔ اور وہ ان سے ہوتے ہیں یاں پر **يَقْمَهُونَ** سے مراد دل کا اندھا بننا ہے۔ جیسا کہ سورۃ حج میں ہے۔ کہ دیکھو ظاہری انہیں اکثر اندھی نہیں ہوتے **تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ** وہ دل اندھے ہوتے ہیں۔ جو سینوں میں موجود ہیں۔ نہ وہ سمجھ بات کو دیکھتے ہیں نہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے پہلی آیت میں کافروں کے دلوں پر مہر لگانے کا بھی ذکر آیا ہے۔ آگے اُن کی مثالیں بھی آ رہی ہیں۔

فرمایا: **أُولَٰئِكَ الَّذِينَ شَرَوْا الصَّلَاةَ بِالْهَيْدِ** یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لیا ہے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں۔ ظاہر میں انہوں نے زبان سے یہی کہا تھا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس ہدایت کو چھوڑ کر انہوں نے باطن کی بے عقیدگی اور گمراہی کو اختیار کیا **فَمَا يَشَاقُّهُمْ عِبَادَتُهُمْ** پس ان کی تجارت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا **وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ** اور انہیں تم سے وہ ہدایت یافتہ۔

ہدایت کے  
بدلے گمراہی

یہ تجارت کا لفظ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ تو عمر اور تمام اسباب دیکر بھیجتا ہے۔ کہ یہ تمہاری پونجی ہے۔ اس کے ساتھ اعمال خیر و۔۔۔ اس سے تمہیں آخرت کی دائمی زندگی میں فائدہ پہنچے گا۔ عمر کی یہ پونجی برف کی مانند ہے۔ اوپر سے بھادروں کی تیش پڑے۔ یہی ہے۔ اور یہ برف چلتی جا رہی ہے۔ اگر اس کے چھلنے سے پہلے اس سے قیمتی اشیاء ایمان اور اعمال صالحہ خرید لو گے۔ تو یہ عمر

کی پونجی ٹھکانے لگے گی۔ اور تم ہمیشہ کے لیے راحت پاؤ گے۔ اور اگر تم نے عمر عزیز کے بدلے کفر، شرک، بدعتیہ گی، معاصی اور سود و لعب خریدا، تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خلتے میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اسی لیے فرمایا کہ منافقین کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ اس کی ایک اور مثال ایسی ہے کہ انسان تریاق کے بدلے زہرِ ہلاک خریدا۔ اگر تریاق حاصل کر لیا تو ہر قسم کی تکلیف سے بچ جائے گا۔ زندگی آسودہ ہو جائے گی۔ اور اگر فدا خواستہ اس نے زہر کو پسند کیا، تو تباہ ہو جائے گا۔ اس قسم کی تجارت نے کوئی نفع نہ دیا۔ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ اور یہ لوگ ہدایت یافتہ نہ تھے۔ بلکہ ابھی خسارے میں مبتلا ہوئے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی بعض خرابیاں بیان فرمائی ہیں۔ اگلی آیات میں مثال کے ذریعے ان کی مزید خرابیاں اور ان کا انجام بیان فرمایا۔

الذی  
درہ ہشتم

البقرة ۲  
(آیت ۱۸۱)

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْفَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ  
مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ لَّ  
يُبْصِرُونَ ﴿١٨﴾ مَثَلُ آبِكُمْ عَنِّي فَمَنْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٩﴾

ترجمہ: + ان منافقوں کی مثال اُس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلانی جب  
آگ نے اس کے — اس پاس کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی  
زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ بھی نہیں دیکھتے ﴿۱۹﴾ وہ برے  
گونگے اور احمق ہیں، پس وہ نہیں لوٹیں گے ﴿۱۸﴾

بدبختی اور شقاوت کے لحاظ سے درہم اگر وہ منافقین کا ہے اللہ تعالیٰ نے منافقین کا حال  
بیان فرمایا ہے۔ کہ ان کا کام جھوٹ بونا، فریب دینا، زمین میں فساد کرنا ہے وہ ایمانداروں کو  
بیوقوف کہتے تھے۔ اور اپنے آپ کو اصلاح کرنے والے سمجھتے تھے۔ جب انہیں حقیقی مومنوں  
کی طرح ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تو کہتے کہ ہم بے وقوفوں کی طرح کیوں ایمان لائیں۔  
مسلمانوں کی جماعت کے بدبرد اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے۔ تاکہ ان کی جان و مال محفوظ رہے۔ وہ  
ان کے حقوق کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ مگر جب اپنے سواروں کے پاس جاتے تو کہتے کہ ہم تمہارے  
ساتھ ہیں۔ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ تمسخر اور ہنسی کرتے ہیں حقیقت میں ہم ان کے ساتھ نہیں  
ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کی ایک نشانی یہ بھی بتائی کہ انہوں نے ہدایت کے بارے میں  
گمراہی کو اختیار کیا۔ اور اس تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ بلکہ ایسے لوگ ابدی نقصان میں  
مبتلا رہے۔

گزشتہ سے پورے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منافقین کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں جن سے منافقوں کے حالات  
پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ کسی مسئلہ میں مثال بیان کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاصر واقع اور قریب الغم  
جو ہمارے جو چیز غامض اور تاریک ہوئے واضح کر دیا جائے۔ ایسی مثالیں تمام آسانی کتب میں بیان

کتب آسانی  
اور مثلاً

کی گئی ہیں۔ توراۃ، زبور اور انجیل میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحیفہ اور دیگر قلم آسانی صحیفوں میں مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ خود قرآن پاک میں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ جن سے بات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کا اپنا بیان ہے: **وَقُلْنَا لَآؤْمِنَا نَصْرُیْہَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا یَعْقِلُہَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ** یعنی ہماری ان مثالوں سے اہل علم ہی سمجھ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور مقصد کو پالیتے ہیں۔

شیخ ابو جراح ابن العربی مابین نے تفسیر احکام القرآن مکمل کی ہے۔ آپ کی تفسیر میں تین چار کتابیں ہیں۔ حدیث کی شروحات، فتویٰ، خواہ در سکر علوم و فنون میں بھی بے شمار کتابیں ہیں وہ فرماتے ہیں کہ صرف سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار مثالیں بیان کی ہیں۔ گویا قرآن کریم دیگر آسمانی کتب اور قلم حکماء کے کلام میں مثالیں موجود ہیں۔ حضرت لقمانؑ ان کی طرف منسوب کتب نیز ہر زبان کے فصیح و بلیغ لوگوں کے کلام میں مثالیں پائی جاتی ہیں۔

تفسیر  
احکام القرآن

احکام القرآن کے نام سے بہت سے مفسرین نے کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں قرآن پاک کی صرف انہیں آیات کی تفسیر و تشریح کی گئی ہے۔ جن میں حلال و حرام کے احکام بیان ہوئے ان میں سے ایک کتاب ابو جراح صاحب رازیؒ کی احکام القرآن ہے۔ در سکر تفسیر ابو جراح ابن العربی اندلسیؒ ہیں۔ آپ کی احکام القرآن مابین مسک کے مطابق ہے۔ اسی طرح کشف و تصوف کے بہت بڑے اہم شیخ ابن عربیؒ کی تفسیر احکام القرآن ہے۔ اس میں زیادہ تر تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے بھی ایک چھوٹی سی تفسیر لکھی ہے جس کا نام **الکلیلی فی تفسیر سباط الشریعہ** ہے۔ اس میں قرآن کریم کی ان آیات کی مختلف تفسیر ہے۔ جن سے احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ آپ فری اور دسویں صدی کے حافظ الحدیث ہوئے ہیں۔ عمر بھی کوئی زیادہ نہیں پائی۔ بائیس سال کی عمر میں وفات پائی مگر پانچ سو برس کے مصنفہ میں آپ کے بعد کوئی حافظ الحدیث نہیں ہوا۔ حافظ الحدیث وہ بلند پایہ ہوتی ہے جسے ایک لاکھ حدیث جمع سند زبانی یاد ہو۔

آپ کے بعد بڑے بڑے محدثین ہوئے ہیں۔ مگر حافظ الحدیث کوئی نہیں ہوا۔ البتہ

## مشاورت حکمت

من فقیہ کی  
مقالہ

فَرَا مَا مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الذِّبْيِ اسْتَوْقَدَ نَارًا ۖ اِنْ مَنَافِعُكَ كِ مَثَالِ اس  
شخص کی طرح ہے۔ جس نے جہل میں سخت اندھیرے کی حالت میں آگ جلائی۔ تاکہ اُس سے مدد  
اور گرمی حاصل کر لے۔ یہ دونوں چیزیں ضروریات زندگی میں سے ہیں جن کے بغیر گزارا نہیں۔

چنانچہ ان منافقوں نے بھی اپنی فطری استعداد کے مطابق اپنے اندر ایمان کی شمع روشن کی۔ اور پیغمبر علیہ السلام کی صحبت اختیار کی ان لوگوں نے اہل ایمان کی رفاقت بھی حاصل کی۔ اور زبان سے اقرار کیا: اَمَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ چاہیے تو یہ تھا کہ ایمان کی اس روشنی سے ان پر تمام حقائق روشن ہو جاتے۔ مگر انہوں نے قریم صحیح معنوں میں ایمان قبول ہی نہیں کیا تھا۔ محض وقتی مفاد حاصل کرنے کی خاطر ایمان کا دعویٰ کیا تھا۔ مگر وہ دل سے نہ ایمان کی آگ کو روشن کرتے۔ تو ان میں اطماعتِ الہی کا جذبہ پیدا ہوتا۔ اور ان کے دل میں ذکرِ الہی کا شوق پیدا ہوتا۔ ان کے دل بھی توحیدِ خالص سے نور ہو جاتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ تو وقتی طور پر ایمان کا اعلان کر کے اپنے مال و جان کی حفاظت چاہتے تھے۔ کیونکہ اسلام کا قانون یہ ہے: هُنَّ قَالَتْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ فَتَدْعُكُمْ مِمَّنْ مَالَهُ وَنَفْسُهُ حُضُورِ صَلَواتِ اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے زبان سے لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا اقرار کر لیا اس کا جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہو گئی۔ اسی سے یہ منافقین اپنی فطری صلاحیت کو برتنے کا نئے برسے نہانی ایمان سے آئے۔ ان کا یہ ایمان لانا گریبا جھٹل کے اندھیرے میں آگ جلانے کے مترادف تھا۔

فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ جَبَّ اُسْ آگ نے آگ جلاتے والے شخص کے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ اُسے حضورِ اہست گرد و پیش کا پتہ چل گیا۔ تو پھر کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس آگ کو بجھا دیا۔ یہاں پر اَطْعَمَہَا اللہُ مَکْدُون ہے۔ اس طرح کہ موت طاری ہو گئی۔ جب وہ آگ بجھ گئی جس کی روشنی میں یہ لوگ اپنی جان و مال کی حفاظت کر رہے تھے۔ تو پھر ذَہَبَ اللہُ بِنُورِہِہِ اللہ تعالیٰ ان کی روشنی کر لے گیا۔ وَتَرَکَہُمْ فِی ظُلُمَاتٍ اُنہیں بے پناہ اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ پھر ان کی حالت یہ ہو گئی کہ لَا يُبْصِرُونَ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتے۔ روشنی تو عارضی تھی جب وہ مستطیع ہو گئی۔ تو وہ اپنی اختیار کردہ بڑائیوں کے اعتقاد اندھیروں میں گم ہو گئے۔

اس مقام پر جن اندھیوں کا ذکر ہے۔ اور جن میں منافقین سرگردان ہیں ان کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور وہ ساری کی ساری منافقین کی جماعت پر صادق آتی ہیں۔

اندھیروں کی  
مختلف قسمیں



سب سے پہلا اندھیرا کفر کا ہے۔ یہ لوگ صرف زبان سے ایمان کا اقرار کرتے تھے مگر ان کے دِل میں کفر کا اندھیرا بھرا ہوا تھا۔ قرآن پاک میں جُملہ موجود ہے: **اللَّهُ قَوْلُ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ** یعنی اللہ تعالیٰ ایمانداروں کا دل اور کار سنا ہے وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر ایمان اور ہدایت کی روشنی کی طرف لاتا ہے۔ جس کی وجہ سے دل میں روشنی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ روشنی آگے چل کر حقیقی روشنی میں تبدیل ہو جائے گی۔

فرمایا دوسرا اندھیرا جو منافقین میں پایا جاتا ہے۔ وہ مکر و فریب کا اندھیرا ہے۔ **يُخَذِّلُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا** یہ وہی دھوکے اور فریب کا اندھیرا ہے۔ جو وہ اہل ایمان کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔

اسی طرح تیسرا اندھیرا دروغ گوئی اور کھٹا کھٹا بولنا کہہ سکتے ہیں ہم مومن ہیں۔ حالانکہ یہ صریح مہوٹ بول رہے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز مومن نہیں۔ ان کے دل میں کفر چاہا ہوا ہے۔ لہذا یہ ایمان کے دعوے میں مہوٹے ہیں۔

منافقین کا چوتھا اندھیرا طعن و تشنیع کا اندھیرا ہے۔ یہ لوگ اہل ایمان کو احمق اور بیوقوف کہتے تھے۔ حالانکہ ایمان والے آخرت کے طلبگار ہیں۔ انہوں نے دنیا کو چھوڑ کر آخرت کو اختیار کیا ہے۔ مگر منافق اُن کو بیوقوفی کا طعن دیتے ہیں۔ یہ ان کا چوتھا اندھیرا ہے۔

جہالت دو قسم کی ہے۔ جہل بسیط اور جہل مرکب۔ کوئی شخص کسی چیز سے ناواقف ہو یہ جہل بسیط ہے۔ جب بھی ایسا شخص متعلقہ چیز سے واقفیت حاصل کرے گا، وہ اس جہل سے نکل جائے گا۔ دوسری قسم کا جہل جہل مرکب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان غلط بات کو صحیح سمجھنے لگے۔ بڑے عقیدے کو اچھا خیال کرے۔ یہ بہت خطرناک جہت ہے کیونکہ اس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ ایسا شخص نہ غلط کو غلط سمجھے گا اور نہ وہ اس جہالت سے نکلے گا۔

منافقین کا پانچواں اندھیرا جہل مرکب ہے۔ وہ اپنے دھوکے اور فریب کو بڑا اچھا سمجھ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو دھوکا دے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ پانچویں قسم کے اس اندھیرے میں مبتلا ہیں۔

پہلا اندھیرا معاصی اور شہوات کا اندھیرا ہے۔ اطاعت و روشنی ہے اور معاصی اندھیرا ہے جن خواہشات کی تکمیل میں یہ لوگ سرگردان ہیں۔ وہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ ساتواں اند میرا قبر کا اند میرا ہے۔ مسلم شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُورَ مَمْلُوءَةٌ ظُلُمَةً عَلٰی اَهْلِهَا یہ قبریں اپنے مکینوں کے لیے اندھیروں سے بھری پڑی ہیں۔ ہاں جو شخص اپنے دل میں نور ایمان رکھتا ہوگا۔ اس کو وہاں بھی روشنی میسر ہوگی۔ جس نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نماز پڑھی اس کی قبر میں روشنی ہوگی۔ ایمان والوں کے دل سے روشنی کی لٹ نکلتی گی، نیز ان کے اعمال صالحہ کی روشنی انہیں حاصل ہوگی۔

بخاری شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلظُّلُمَةُ ظُلُمَاتٌ يُّوَفُّ الْقِيَمَةَ اس دنیا میں کسی پر کیا ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی شکل میں سامنے آئے گا۔ یہ قبریں جا کر پتہ چلے گا کہ ظلم کا اندھیرا کس قدر شدید ہے۔ پل صراط سے گزرتے وقت حشر کے میدان میں اندھیر دوزخ کی گہرائیوں میں اندھیروں کا احساس ہوگا۔ الغرض! یہ تمام اندھیرے ہیں جو منافقین پر وارد ہوں گے۔ اور یہ لوگ غضب الہی کا شکار ہوں گے۔

ان لوگوں کی بے نیسی کی حالت یہ ہے کہ حُشْرَہ یہ ہرے ہیں۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو اس قدر خراب کر لیا ہے۔ کہ صحیح بات کو سننے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ اس بے نیستی کی بنا پر بُسکُہ یعنی گونگے ہیں۔ ان کی زبان سے کبھی سچی بات نہیں نکلتی۔ دھوکے فریب اور جھوٹ کے سوا ان کی زبان پر کچھ نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ لوگ حُسن و قبح میں، اچھائی اور برائی میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ عُشْرٰی یعنی اندھے بھی ہیں۔ ان کی ظاہری آنکھیں تو موجود ہیں۔ مگر ان کے دل اندھے ہیں۔ جو حق و باطل میں فرق نہیں کر سکتے۔ ایمان و شرک، سنت اور بدعت ان کے نزدیک برابر ہیں۔ ان کے نزدیک ان میں کوئی امتیاز نہیں۔

فرمایا یہ لوگ کفر و شرک اور معاصی میں اس قدر آگے نکل چکے ہیں۔ فَهَسَّ لَا يَرَوْنَ جَعُولًا کہ اب ان کے نیکی کی طرف واپس ہٹ آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اللہ تعالیٰ نے پچھلے منافقوں کا یہ حال بیان فرما دیا۔

يَسْرِجَعُونَ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص مر گیا اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ کہ  
 رہیں اگر کوئی نئی کمانی کر لے گا۔ انسان جو اعمال فیہومی زندگی میں کما گیا۔ ان میں تغیر تبدیل نہیں ہو سکے  
 گا۔ دنیا میں تو کئی چیزیں مٹ سکتی ہیں مگر آخرت میں پہنچ کر دنیا میں کیسے گئے اعمال میں  
 کوئی رد و بدل نہیں ہو سکے گا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَكُلُّ رَجُلٍ لَّزِمَتَهُ طَهْرَةٌ فِي  
عُنُقِهِ ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے اور پھر مرنے کے بعد وَيُخْرِجُ  
لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا قیامت کے دن ہر نبی کو کتاب لکھ کر سامنے کر دیں گے۔ کہ یہ تیرا اعمال  
 نامہ ہے۔ لَوْ خُذَ لُطْفٌ لَّو۔ لطف یہ ہے کہ پڑھنے کی سدا حیت بھی اس وقت دیا ہو جائے گی  
 اللہ تعالیٰ فرمائیں گے لَوْ خُذَ لُطْفٌ لَّو الْغَرَضُ فَهَسَوْا يَسْرِجَعُونَ کا مطلب یہی ہے کہ یہ  
 پلٹ کر نہ بدایت کی طرف آ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی دنیا کی طرف آ سکتے ہیں۔ اور نہ ہی کوئی کمانی  
 کر سکیں گے۔ یہ ان منافقوں کا حال ہے جن کے دل کفن میں راسخ ہو چکے ہیں۔

الْعَمَاءُ

دس سہ

الحقۃ ۲

آیت ۲۰-۲۱

أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَّجْعَلُونَ  
 أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ  
 مُخِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿٢٠﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ  
 كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْافِيئُهُ إِذَا ظَلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُومًا  
 وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ  
 عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢١﴾

۲

ترجمہ: یا ان کی مثال آسمان کی طرف سے اترنے والی اس بارش کی ہے۔ جس میں  
 آریحیاں گھٹن اور بھیگی کی چمک ہے۔ یہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ بادل کی کڑک سے  
 موت کے ڈر سے۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے ﴿۲۰﴾ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں  
 کو اچک لے۔ جب وہ ان کے لیے روشنی کر لے۔ تو اس میں پلٹتے ہیں۔ اور جب ان پر تاریکی  
 چھا جاتی ہے۔ تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو لے  
 جائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۲۱﴾

گزشتہ پورے

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی برائی میں درمیاں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی مثال گزشتہ درس میں  
 گزشتہ جگہ ہے کہ منافقوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے جہنم میں آگ جلائی ہو۔ اور جب اُس  
 نے ارد گرد کو روشن کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی روشنی کو لے گیا۔ اور آگ کو بجھا دیا۔ منافقین کو  
 اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے وہ برے گونگے اور اندھے ہیں پس وہ لوٹ  
 کر نہیں آئیں گے۔

یہ پہلی قسم کے وہ منافق ہیں جو اپنے نفاق میں پختہ ہیں اور جہنم میں مبتلا ہیں۔ ان  
 کی اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی کیونکہ وہ غلط بات کو صحیح سمجھ رہے ہیں۔ ایسے لوگ  
 محض پال بازی اور فریب کاری کی بنا پر کلمہ اسلام پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ



دوسرا دل اعلیٰ ہے۔ جو غلاف میں بند کر دیا گیا ہو اور پھر اوپر سے دھاگے کے ساتھ  
باندھ دیا گیا ہو۔ فرمایا تیسری قسم کا دل معکوس ہے یعنی اونٹن کا ہے۔ اس کا سر نیچے اور منہ اوپر  
ہے۔ اور چوتھی قسم کا دل مصغی ہے۔ یعنی دو پہلو والا دل۔

پہلی قسم کے دل کے متعلق فرمایا کہ صاف و شفاف دل مومن کا دل ہے جس میں فحشاء  
بالکل صاف اور واضح ہے۔ اس میں کوئی خرابی یا کسی قسم کی عیوب نہیں ہوتی۔ غلاف میں بند دل کے  
متعلق فرمایا۔ یہ کافر کا دل ہے امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کسی  
پرندے کو ایسے بجر سے میں بند کر دیا گیا ہو جس میں کوئی سوراخ نہ ہو۔ ایسا دل کافر، مشرک یا دہریے  
کا ہوتا ہے۔ جس میں سے باہر دیکھنے کے لیے سونے کے برابر بھی سوراخ نہ ہو کہ وہ اپنے خول سے  
باہر حق کی بات کو دیکھ سکے۔ فرمایا اونٹن کا دل منافق کا دل ہے۔ جس نے ایمان کو پہچان تو لیا ہے  
مگر قبول نہیں کیا۔ محض اپنے بچاؤ کی خاطر کوئی فریب کاری کی ہے۔ مگر ہے پکا منافق۔ دو پہلو  
دل، تو وہ ایسا ہے جس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی۔ یہ عملی منافق ہے۔ جسے کسی مذمتی  
بھی ہر تہ سے۔ اور کبھی متردد بھی ہوتا ہے۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا ایمان کی مثال گمشدہ القلۃ یعدھا نمکاً و  
الطیبت اُس پوٹے کی ہے جسے پاکیزہ پانی میراب کرتا ہو۔ پوٹے کا بیج اچھا ہو، اس کی  
آبیاری بھی صاف پانی سے ہو۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کی نشوونما بھی اچھی ہوگی۔ نیز فرمایا کہ منافق کی  
مثال انسانی جسم میں پیدا ہونے والے پھوڑے کی ہے۔ ایک طرف سے پیپ آتی ہے۔  
تو دوسری طرف سے خون کا دورہ ہوتا ہے۔ گویا پھوڑے کی غذا خون اور پیپ ہوتی ہے۔ ان  
میں سے جس چیز کا غلبہ ہوگی۔ تو مر بیض ہو جائے گا۔ اور اگر خون غالب آگیا۔ تو صحت یابی  
ہو جائے گی۔ منافق میں دونوں قسم کے مائے پائے جاتے ہیں۔

دل کے حالات بہت مختلف ہوتے۔ یہ کبھی بچاں نہیں ہوتے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ  
بڑے پائے کے بزرگ ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ قلب پر چھ قسم کی حالتیں وارد ہوتی ہیں۔



یعنی حیات اور موت۔ صحت اور بیماری، بیداری اور نیند، فرماتے ہیں کہ قلب کی حیات ہدایت کی مروجہ منت ہے۔ اگر ہدایت نصیب ہو گئی ہے تو سمجھ لیں کہ دل زندہ ہے۔ اور قلب کی موت گمراہی سے واقع ہوتی ہے۔ فرمایا مَوْتُهُ الْخَلَلَةُ دِل کی موت کا سبب گمراہی ہے۔ کسی قسم کی گمراہی دل میں پیدا ہو جائے۔ سمجھ لیں کہ دل مردہ ہو گیا، اس میں زندگی کی کوئی رمت باقی نہیں رہی۔

قلب کی صحت طہارت اور صفائی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور طہارت کا حصول ایمان اور توحید کی بدولت ہے۔ کہ ایمان کے بغیر طہارت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف قلب میں بیماری، کہ مدت گزرتے تعلقات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے: **يُؤْمَرُ لَا يَنْفَعُ هَالِكٌ وَلَا يَنْفَعُ ۝۸۸ إِلَّا هُنَّ آتَى اللَّهَ بِقُلُوبٍ سَلِيبَةٍ** اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے۔ انہوں نے قیامت کے تذکرہ میں فرمایا۔ اُس دن نہ مال کسی کام آئے گا۔ اور نہ اولاد مفید ہوگی، ہاں! جو قلب سلیم ہے کریم ہو گیا، اُس کو فائدہ ہوگا۔ اور قلب سلیم وہی ہے جس میں طہارت، پاکیزگی اور نور ایمان ہوگا۔

فرمایا دل کی بیداری ذکر الہی میں ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے اس کا دل بیدار ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَلَكَ ذِي لَا يَذْكُرُ مَثَلُ الْحَيِّ وَالْمَيِّتِ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہے تو سمجھ لو کہ اس کے دل پر غفلت کی غند طاری ہے قرآن میں جگہ جگہ آپ پڑھتے ہیں کہ اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِينَ اور غافلوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

فرمایا منافق کی مثال ایسی ہے **أَوْ كَصَيْبٍ مِّنَ السَّمَاءِ** جیسے آسمان سے بارش آتی ہے۔ صیب کا معنی زور سے برسنے والی بارش ہے اور عربی زبان میں سارا آسمان کو بھی کہتے ہیں، فضاء کو بھی اور یہ لفظ بادل پر بھی بولا جاتا ہے، اسی طرح عربی زبان کے اعتبار سے چھت

بارش کی مثال



کو بھی سارے کہتے ہیں۔ تاہم اس مقام پر سارے مراد بادل ہیں۔ کیونکہ بارش بادلوں میں سے برستی ہے ہو سکتی ہے اس کا تعلق آسمان سے بھی ہو۔ جس کو عام انسان اور سائنس دان نہیں سمجھ سکتے تاہم بظاہر بارش کا تعلق بادلوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے یہاں پر آسمان کا لفظ فرمایا۔

فرمایا فَإِنْ ظَلُمْتَ اس میں اندھیرے میں۔ ظاہر ہے کہ بارش کے دوران بادل چھائے ہوئے ہیں اور سورج غائب ہوتا ہے، اللہ کسی قدر اندھیرا ہوتا ہے۔ اللہ اگر ایسا رست کے وقت ہوا تو تاریکی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ سائے تک نظر نہیں آتے۔ جب قرآن پاک نازل ہوا۔ تو اس وقت ہر طرف کفر و شرک کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیروں کے علاوہ فرمایا وَكُنْ اس میں گرج بھی ہوئی ہے۔ فرشتے بادلوں کو ہلک کر لاتے ہیں۔ تو ان کے لئے گرج پیدا ہوتی ہے۔ اے اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرے معنی میں کفر و شرک پر وعید کو بھی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فرمایا وَبَرَقَ بارش میں اکثر اوقات بجلی بھی چمکتی ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ بادل آہیں میں رگڑ کھاتے ہیں۔ تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ نیز اس کا معنی یہ بھی ہے کہ قرآن پاک میں بڑے واضح دلائل موجود ہیں جن سے حق و باطل میں تمیز ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دلائل بمنزلہ برق کے ہیں۔

منافقین کی  
بے بسی

فرمایا يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصابہم فی اذانہم من الصواعق اپنی انگلیاں کڑک کے خوف سے اپنے کانوں میں ڈالتے ہیں۔ جب بارش کے دوران بجلی چمکتی ہے۔ اور بادلوں میں گرج پیدا ہوتی ہے۔ تو دہشت کے لئے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ حَذَرَ الصَّوْتِ کہ کہیں ہلاک نہ ہو جائیں۔ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں سے لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ موت سے بھاگ نہیں سکے۔ کیونکہ وَاللَّهُ يَخْطُبُ بِالْكَفْرِ اللہ تعالیٰ کافروں کو ہر طرف سے گھیرنے والا ہے۔ وہ پکڑنا چاہے گا تو فوراً گرفت کر لے گا۔ منافقین کا خوف و ڈر انہیں اللہ کی گرفت سے بچانے کا۔

فریاد یگاہ الہدق یخطف ابصارہم قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ نافرمانی کی وجہ سے ان کی آنکھوں کو اچک لے۔ اور وہ اندھے ہو کر رہ جائیں۔ کَلَمًا اَصْنَاءَ لَهُمْ مَشْوَرٰتِہٖ جب بجلی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ تو اس کی روشنی میں تھوڑی دیر چلتے ہیں وَاِذَا اَخْلَعُوْا عَلٰیہِمْ قَلَمُوْا اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تو ٹھہر جاتے ہیں۔ اہم جلیل الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کفر و شرک کا ذکر فرمایا ہے اور یہ اندھیروں کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھیں، بصارت، قلب اور حواس عطا کئے۔ یہ سب اس کے انعام ہیں۔ اور ہدایت حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ یہ منافقین کس خیال میں پھرتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی عطا کردہ نعمتیں چھین نہیں سکتا بلکہ فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللّٰہُ لَذَہَبَ بِسَمِیْعِہُمْ وَاَبْصَارِہِمْ اَکْر اللّٰہِ تَعَالٰی چاہے تو ان کی سماعت اور بصارت ہی زائل کر دے۔ یہ لوگ اپنی طور پر تو اندھے ہی ہیں۔ اللہ چاہے تو ظاہری طور پر بھی ان کی مبنائی ضائع ہو جائے اور قوت شنوائی سلب ہو جائے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں اس لیے عطا کی ہیں کہ ان کے ذریعے ہدایت قبول کریں اپنے لیے کمال حاصل کریں تاکہ آئندہ زندگی میں ان کے کام آئے۔ مگر یہ ان ذرائع کو غلط طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ ان سے صحیح طور پر استفادہ نہیں ہو رہا ہے۔ لہذا یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنا عطا کیا ہوا انعام واپس لے سکتا ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ان ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے ہدایت کا راستہ اختیار کریں۔ تاکہ انہیں فلاح نصیب ہو۔

الْعَمَّ

دیں دم نہ

البقرة ۲

(آیت ۲۱ تا ۲۲)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ  
 قَبْلِكُمْ لَكُمْ تَشْقُونَ ﴿٢١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ  
 فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بَنَاءً ۖ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ  
 بِهِ مِنَ الشِّجَرِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَذَكِّرْهُمْ لِقَاءِ اللَّهِ أَتَدَارَ  
 ۚ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

ترجمہ: اے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور  
 ان لوگوں کو جو تم سے پہلے گذرے ہیں، تاکہ تم بھی جاؤ۔ ﴿۲۱﴾ وہی رب جس نے تمہارے  
 لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا ہے۔ اور آسمان کی طرف سے پانی اتارا ہے۔  
 پھر اس پانی کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے روزی نکالی ہے۔ پس نہ ٹھہراؤ اللہ  
 کے لیے شریک، اور تم جانتے ہو۔ ﴿۲۲﴾

دوسرے رکوع کے اختتام تک اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے انسانوں کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ البقرہ  
 کی ابتدائی چار آیتوں میں ایمان والوں کا ذکر کیا ہے اور ان کے اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ اگلی  
 دو آیتوں میں ظاہر اور باطن اشارہ کرنے والے کفار کا حال اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ اس کے  
 بعد تیسرے آیت میں منافقین کا حال تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان کی چال بازی۔ دھوکا بازی  
 فریب کاری، ریشہ دوانی، ظاہر و باطن میں تغاوت، فساد فی الارض اور غلط عقیدے کا رد ہے۔  
 پھر اس کی وضاحت و مثالوں کے ذریعے کی گئی ہے۔ ایک آگ کی مثال اور دوسری پانی کی۔  
 منافقین کا انجام بھی بیان ہوا ہے اور تنبیہ بھی کی گئی ہے۔

اب تیسرا رکوع شروع ہو رہا ہے۔ یہاں سے تمام انسانوں کو خطاب ہے۔ حضرت  
 عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں بھی يَا أَيُّهَا النَّاسُ سے خطاب ہے

اے تغیر منظری ص ۲۵



کی عبادت کرو۔ توحید فی العبادت وَحْدُ ذُوْاْہُ رَبِّکُمْ کو مدد لا شریک مانو۔ اور اس کی عبادت کرو۔ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے توحید جیسی سب سے اہم انسانی ذمہ داری کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں اکثر لوگ غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ عبادت کا مفہوم یہ کہ تَعْبُدُ میں ذکر کر دیا گیا تھا۔ کہ عبادت حقیقت میں اپنے ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف کرنا ہے۔ اور اس خاص عقیدے اور تصور کے ساتھ کرنا ہے کہ پوری کائنات اور اس کے تمام اسباب پر اسی مالک الملک کا تسلط ہے۔ ہر قسم کا نفع و نقصان اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وہ عظیم کل۔ قادر مطلق اور محتار مطلق ہے۔ اس ہستی کا تصور کرتے ہوئے اس کے سامنے انتہائی عاجزی کے اظہار کو عبادت کہتے ہیں۔ عبادت کی ادائیگی بدن۔ زبان۔ دل۔ مال اور افعال سے ہوتی ہے۔ اور اس تصور کے ساتھ عبادت صرف خدا تعالیٰ کی ہی ہو سکتی ہے۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی چند صفات بیان کر کے اس ہستی کی پہچان کرائی گئی ہے جس کی عبادت مطلوب ہے۔ فَرِیْداً اَعْبُدُوْا رَبَّکُمْ یعنی اپنے رب کی عبادت کرو۔ اور رب خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہی انسان کو پالنے والا ہے۔ انسانی زندگی کی ترقی اور بقا کے تمام اسباب پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ انسانی وجود سے باہر جتنی بھی نعمتیں ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت خَلَقَ بیان کی گئی ہے۔ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ انسان کو سب سے پہلے اور سب سے بڑی نعمت جو میرا آئی ہے۔ وہ اس کا وجود ہے۔ اسی لیے فرمایا اُس ذات کی عبادت کرو۔ جس نے تم کو پیدا کیا۔ خالق اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ گویا تمہارا خالق بھی وہی ہے۔ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ اور تم سے پہلے قوموں کا خالق بھی وہی ہے۔

اہم غزالی نے حدیث پاک کے حوالے سے لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر معرفت الہی





ہی حاصل نہیں ہوئی کہ وہ کن صفات کا مالک ہے۔ تو عبادت کس کی کر دے۔

فرمایا يَا أَيُّهَا النَّاسُ عِبُدُوا رَبَّكُمُ سے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو الَّذِي خَلَقَكُمْ وہ رب جس نے تم کو وجود کی نعمت بخشی۔ وَلَذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ اور جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم بچ جاؤ۔ لَعَلَّ قریبی کے لیے ہوتا ہے اور توجہ کی کامیابی ہے امید۔ لیکن اہم جملہ الَّذِينَ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں لَعَلَّ کا لفظ تحقیق کے لیے آتا ہے۔ تاکہ تم بڑے انجام اور کفر شرک سے بچ جاؤ۔ تَتَّقُونَ یعنی متقی بن جاؤ۔ اس رب کی پہچان کرنے کے بعد اس کی عبادت کرو۔ خَلَقَكُمْ میں صفت ایجاد کا تذکرہ ہے کہ اس نے انسان کو عدم اور نیستی سے پیدا کیا ہے جس کے متعلق فرمایا لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَذْكُورًا کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ اُسے عدم سے وجود میں لایا۔ لہذا اپنے رب کی عبادت کرو۔ جس نے وجود جیسی نعمت عطا کی۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی عبادت سے متعلق احادیث میں بہت سے احکام موجود ہیں۔ ترمذی شریف اور منہ احمد میں یہ روایت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام پر وحیازل فرمائی کہ لوگوں کو ان باتوں کی تبلیغ کرو۔ سب سے پہلی بات یہ کہو کہ إِنَّ تَعْبُدُوا وَهَذَا تَشْرِكُوا بد شئی اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ کیونکہ اس کی مثال ایسی ہے کہ مَتَبَدَّلَ رَجُلٌ شَتْرَى عَبْدًا کہ کوئی شخص غلام خریدے۔ وہ یہ یا سونا چاندی غلام خریدنے پر خرچ کرے۔ پھر اس غلام کو کام پر لگا دے۔ اور غلام مزدوری کر کے جو معاوضہ حاصل کرے وہ اپنے مالک کی بجائے کسی دوسرے شخص کو دے۔ فرمایا يَشْكُرُهُ میری رضی إِنْ يَشْكُرُ عَبْدًا كَذِبٌ اس قسم کے غلام سے کون راضی ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا مالک دوسرا ہے۔ اس کی خوراک یا لباس اور رہائش کا بندہ دست دہ کرتا ہے۔ مگر غلام دن بھر کی کان مالک کی بجائے دوسروں کو دے آتا ہے۔ فرمایا شرک کا حال بھی یہی ہے کہ تمام نعمتیں اور ان کے اسباب اللہ تعالیٰ نے میاں کیے ہیں۔ مگر وہ تعظیم غیز کر رہا ہے۔ یہ شرک اس ملک حرام عدم



کی طرح ہے۔ جو اپنی کھائی دوسروں کے گھر میں ڈال آتا ہے۔

الغرض فرمایا رب تعالیٰ کی پہچان نشانوں سے ہوتی ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات بیان ہوئی ہیں۔ ایک ولہریت اور دوسری خالقیت اگر انسان غور و فکر کر کے ان صفات کو پہچان لیں گے۔ کہ یہ صفات خدا تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہیں۔ تو پھر وہ عبادت بھی اُسی ہی کی کریں گے۔

وجود الہی پر دلائل

امام ابن الرشید نے ام المک صاحب سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کے وجود پر کوئی دلیل بتلائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ انسان کی مختلف بریاں، مختلف آوازیں، مختلف لہجے اور مختلف نغمے خود خدا تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ دنیا میں چار ہزار مختلف بریاں بری جاتی ہیں کیا یہ وجود الہی پر کچھ کم دلیل ہے۔

اہل سنت کے چار اماموں میں سے امام ابوحنیفہ اور امام مالک بڑے ام ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد ان کے شاگرد ہیں۔ یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ پھر ان بڑے امروں میں سے امام ابوحنیفہ امام اعظم ہیں۔ ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔ کیونکہ انہوں نے تقریباً آٹھ صدیوں کی زیارت کی ہے۔ یہ سعادت کسی دوسرے امام کو حاصل نہیں۔ آپ صحابہ کرام کے زمانے سے قریب تر ہیں۔ آپ کی ولادت شہر میں ہوئی۔ جب کہ صحابہ کرام شہر تک دنیا میں موجود تھے۔

انہیں امام اعظم کا دافعہ ملتا ہے۔ کہ دہریوں اور زندقوں کی ایک جماعت آپ کے مناظرہ کرنے کے لیے حاضر ہوئی۔ ان کا دعوئے تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی وجود یا ہستی نہیں ہے بلکہ کائنات کا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ جب انہوں نے امام صاحب سے گفتگو کرنا چاہی تو آپ نے فرمایا اِنِّیْ مُفِکْرٌ فِیْ اَمْرِیْ میں ایک معاملہ میں غور و فکر کر رہا ہوں۔ اور بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ سامان سے بھری ہوئی ایک کشتی خود بخود دریا میں چل رہی ہے۔ اس کو چلنے والا کوئی ملاح اس میں نہیں ہے۔ مگر یہ پانی کی موجوں کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ اور واپس آرہی ہے۔ وہ کسے گئے۔ یہ کس قدر بے عقلی کی بات ہے۔ بہلا



بمحرک کی طرح سخت۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا معتدل بنایا ہے کہ انسان اپنی تمام ضروریات  
 اسی سے پوری کرتا ہے۔ اسی پر پتے پھرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ مکان بناتے  
 ہیں، غرض زمین کو کمال درجے کا فرش بنایا۔

---

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ  
لَكُمْ تَشَقُّونَ ۚ ۝۲۱ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَرْعًا وَالسَّمَاءَ  
بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَتَخْرُجُ بِهِ مِنَ الشَّجَرِ نَضْرَاجًا  
فَكَثِفَ لَكُمْ بِهِ جِبَالًا ۚ ۝۲۲

قرآن مجید کے لوگو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی، جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ اور ان  
لوگوں کو جو تم سے پہلے گذرے ہیں۔ تاکہ تم بھی جاد ۝۲۱ وہی رب جس نے تمہارے  
لیے زمین کو فرش اور آسمان کو محبت بنایا ہے اور آسمان کی طرف سے پانی اتار ہے  
پھر اس پانی کے ذریعے پہاڑوں سے تمہارے لیے روزی نکال ہے۔ پس نہ ٹھہراؤ  
مشرکتوں کے لیے شرک اور تم جانتے ہو ۝۲۲

يَا أَيُّهَا النَّاسُ عِبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ  
حُضرت عبد اللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں: اُعْبُدُوا رَبَّكُمُ وَحْدًا  
اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو اور بغیرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ  
کی تفسیر دو طریقے پر ہے۔ وَحْدًا وَاللَّهِ میں توحید کا لفظ پہلے بیان کیا۔ کیونکہ توحید عبادت کے  
لیے شرط ہے۔ اگر توحید ہوگی۔ تو عبادت بھی کارآمد ہوگی۔ ورنہ کوئی فائدہ نہیں جس طرح غذا کے  
لیے طہارت شرط ہے۔ یعنی طہارت کے بغیر نماز اور نہیں ہوگی۔ اسی طرح توحید کے بغیر عبادت  
نہیں ہوگی۔ تفسیر کے دوسرے طریقے میں وَحْدًا وَاللَّهِ کا معنی یہ کیا ہے۔ کہ عبادت صرف  
ایک خدا کے لیے کرو۔ یہ توحید فی العبادۃ ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسرے کے لیے عبادت  
ہرگز جائز نہیں۔ بلکہ ایسا کفر، شرک اور حرام ہے۔

توحید عبادت کے  
لیے شرط ہے

دلائل توحید

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کے قوی دلائل موجود ہیں۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ جو صانع اور  
 قادر ہے۔ اس کی صفات کا ذکر ہے۔ کہ اس کے مشابہ کوئی چیز نہیں۔ نہ اس کا کوئی نہ یعنی  
 مقابل یا شریک ہے اور نہ اس کی کوئی مثل ہے۔ وہ ایسی اعلیٰ ذات ہے جسے کوئی چیز  
 عاجز نہیں کر سکتی۔

دلائل توحید کے متعلق فرمایا کہ آسمان کی بندی پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بغیر ستون  
 کے قائم کیا ہے۔ اس بات کا اشارہ سورۃ رعد میں کیا گیا ہے: بَعَثْنَا سِدْرًا دُحًّ  
لَهُ تَمَّ بَغِيرِ سَتُونٍ کے دیکھ رہے ہو۔ دنیا میں کوئی چھت بغیر ستون کے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ مگر  
 یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جس نے آسمان جیسی عظیم الشان چھت کو کھڑا کیا ہو ہے۔ لطف یہ ہے  
 کہ جب سے اسے قائم کیا ہے۔ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں آیا۔ جب تک چاہے آسمان  
 کو اسی حالت میں قائم رکھے گا۔ اور جب چاہے گا۔ اسے توڑ پھوڑ دے گا۔ اور یہ درہم برہم ہو جائے  
 گا۔ اسی بات کو دوسری جگہ یوں بیان کیا وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ رُفُفًا مَّحْفُوظًا وَقَعْدًا  
أَنِّي بَنَانًا مُّسَوًّى دیکھو! ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ہے۔ مگر لوگ ہماری ان  
 نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں۔ ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔

دلائل توحید کے سلسلے میں زمین کو دوسری دلیل کے طور پر پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ نے  
 اسے کیسا ثبات بخشا ہے۔ اہم البتہ جو صانع فرماتے ہیں۔ کہ زمین کے اوپر بھی ہوا ہے۔ وہ نیچے بھی  
 ہوا ہے۔ اور اسے فضا میں بغیر کسی سائے کے قائم کر رکھا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی  
 قدرت کاملہ کی دلیل ہے۔ لَفْظَ خَلْقٍ كَلَامًا (گنہگاروں میں) بین کر دی تھی۔ کہ سب سے  
 پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ یعنی وہ ذات جس نے  
 تمہیں اور تمہارے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ پھر فرمایا أَسْبَغَ عَلَيْكُمْ أَلْوَانًا مِنْ بَيْنِ  
لَكُمْ وَمِنْ بَيْنِ مَا جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا۔ فرش۔ بستر۔ درمی چٹائی  
 وغیرہ کو کہتے ہیں جس پر انسان آرام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو فرش کے ساتھ اسی طرح تعبیر کیا ہے۔

جیسا پاڑوں کے متعلق فرمایا: **وَالْجِبَالُ أَوْتَادُ**۔ یعنی پہاڑوں کو کیل بنایا۔ اور سورج کے متعلق آتا ہے: **وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا**۔ سورج کو اللہ تعالیٰ نے چراغ بنایا۔

اہم البرجہ جہاں فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں فرشتہ پر نہیں سوؤں گا۔ اور وہ زمین پر سو جائے۔ تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو بھی فرشتہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عرف عام میں فرشتہ، چارپائی، درہی، قالین یا چٹائی کو کہتے ہیں، زمین کو نہیں کہتے۔ اس لیے قسم نہیں ٹوٹے گی۔

اسی طرح اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں چراغ کی روشنی میں نہیں بیٹھوں گا۔ یا نہیں پڑھوں گا اور وہ سورج کی روشنی میں بیٹھ کر پڑھے، تو بھی اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ حالانکہ سورج کو بھی اللہ تعالیٰ نے چراغ کہلایا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ عرف عام میں چراغ کا غلط معنی لالٹین یا بولا جاتا ہے۔ سوچ پر نہیں بولا جاتا۔ لہذا سورج کی روشنی میں اس کے لیے پڑنا مباح ہوگا۔

ابو الحسین قدوری فرماتے ہیں: کہ اگر کوئی شخص قسم اٹھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔ مگر وہ پھلی کھائے، تو اس کی قسم قائم ہے گی۔ حالانکہ پھلی بھی گوشت ہی کی ایک قسم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خود اسے **لَحْمًا حَرِیًّا** یعنی تازہ گوشت فرمایا ہے۔ یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے۔ عرف عام میں گوشت کا اطلاق گائے بھینس یا بھیڑ۔ بڑی وغیرہ کے گوشت پر ہوتا ہے۔ پھلی پر نہیں ہوتا۔

قرآن پاک کی اولین دعوت اللہ **وَاحِدًا لَا شَرِیکَ** کی عبادت ہے۔ اس مسئلہ میں تمام آسمانی کتب متفق ہیں کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کی جائے۔ قرآن پاک جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیتا ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کی عبادت سے منع بھی کرتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا کہ اپنے رب کی عبادت کرو۔ تو عبادت کو ربوبیت پر مرتب فرمایا۔ گویا ربوبیت عبادت کی علت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی لیے کرو کہ وہ رب ہے۔ اگلی آیت میں ربوبیت کی تشریح بیان کر دی گئی ہے کہ اس نے تم پر ایسے ایسے انعام کئے ہیں۔ لہذا اس کی عبادت ضروری ہے۔ ربوبیت

کے سلسلہ میں سب سے پہلے صفت خلق کا ذکر ہے۔ اور پھر ظاہری، باطنی، علمی، اور عقلی ہر قسم کے انعام کا بیان ہے۔ اس ضمن میں قرآن پاک بھی ایک بہت بڑا انعام ہے۔ اس کے چار عمدہ معنایں یعنی توحید، رسالت، قرآن کی حقانیت اور معاد کا ذکر ہو چکا ہے۔

عبادت کے وقت صرف  
ذات باری تعالیٰ ہے

فرمایا اُس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا۔ جب انسان اپنے باپے میں غمہ کرتے گا تو اُسے معلوم ہو گا کہ پہلے وہ موجود نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُسے پیدا کیا۔ نہ صرف اُسے بلکہ اُس کے آباؤ اجداد کو بھی پیدا فرمایا "وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ" تم سے پہلے تمام لوگوں کا خالق ہی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ خالق وہ ہے باقی سب مخلوق ہیں۔ عاجز اور محتاج ہیں۔ انسان اس قدر بے بس ہے کہ اُس کے جسم کی کھال کا کوئی حصہ اتر جائے تو ساری مخلوق مل کر بھی اُسے وہ کھال عیا نہیں کر سکتی۔ اس سلسلے میں نہ جنات کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ فرشتے۔ نہ نیک انسان کسی کام آسکتے ہیں۔ اور نہ بیٹا سی لیے خود انسان یا کسی دوسری مخلوق میں کوئی بھی عبادت کا سہم نہیں۔ مگر یا کسی چیز میں ایسی صلاحیت موجود نہیں جس کی بنا پر اس کی عبادت کی جائے۔ لہذا عبادت صرف اسی ذات اقدس کی ہو سکتی ہے۔ جو واجب الوجود ہے۔ یعنی جس کا وجود خود بخود ہے جو خالق۔ رب، عظیم کل، قادر مطلق، مختار عل اور نفع و نقصان کا مالک ہے۔ جو ازل و ابدی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ باقی ہر چیز حادث اور فانی ہے۔ گن شے، ہکالٹ، رَا وَجْهَةً، ہر چیز بافعال بزرگ ہے۔ یا فانی ہو جائے گی۔ رہا م اور بقا صرف اس ذات اقدس کی ہے۔ جو محسن اور منعم ہے۔ جو سمیع و بصیر ہے لہذا عبادت بھی اسی کی ہو سکتی ہے۔

فرمایا عبادت کیلئے کافیہ یہ ہو گا "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" تاکہ تم خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچ جاؤ۔ تقویٰ بچاؤ کو کہتے ہیں کہ اگر اس کی عبادت کرتے رہو گے تو بچ جاؤ گے ورنہ اس کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ عبادت الہی کو لازم پکڑو گے تو دنیا میں بُرائی سے بچ جاؤ گے۔ اور آخرت میں عذاب سے محفوظ رہو گے۔

زمین کے فوائد

الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ ضَرْأًا وَهِيَ قَادِرٌ مطلق اور مہربان خدا تعالیٰ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش کے طور پر بنایا۔ ایسا فرش جو نہ پختہ کی طرح سخت ہے اور نہ پانی کی طرح بالکل نرم یہ ہوا کی طرح لطیف بھی نہیں بلکہ بالطبع اس کو خشک بنایا۔ آ کر یہ



دوسری چیزوں کے ساتھ مل کر مفید مرکب بن سکے۔ اور لوگوں کے کاروبار ٹھیک طور پر چل سکیں۔  
 اس زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی بے شمار نشانیاں ودیعت کی ہیں۔ کرۂ ارض کے مختلف  
 حصوں کی زمین مختلف ہے۔ یہ بھی ایک نعمت خداوندی ہے "وَفِي الْأَرْضِ قِطْعٌ مُّتَعَدِّدٌ" زمین  
 کے ٹکڑے الگ الگ ہیں۔ رنگت کے اعتبار سے کوئی حصہ سفید ہے۔ اور کوئی حصہ سیاہ ہے۔  
 "وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُمْ" کہیں سرخ گھاٹیاں  
 ہیں اور کہیں سیاہ پتھر ہیں۔ وضع قطع میں واضح اختلافات ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے زمین میں روئیہ گی کی صلاحیت بھی رکھی ہے۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ آتا  
 ہے "وَالْأَرْضُ ذَاتِ الصَّدَاجِ" قسم ہے زمین کی جو پھٹ کر پودے اور نباتات کو باہر  
 نکالتی ہے پانی کو اپنے اندر مذب کر کے محفوظ رکھتی ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی  
 اتارتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر فرمایا "فَسَلَّكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ" پھر اس کو زمین میں  
 نالیوں اور چشموں کی شکل میں چلاتا ہے۔ ضرورت کے وقت چشمے یا نریں جاری ہو جاتی ہیں۔  
 یا کنویں کھود کر پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ جس سے انسان، جانور اور کھیتیاں یکساں طور پر مستفید ہوتے  
 ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے زمین میں کرم و سخادت کا دوا دہ رکھا ہے۔ کہ اس میں ایک دانہ پھینکو  
 یہ ستودنے لگائے گی۔ اس پر خود قرآن شاہد ہے۔

زمین میں انسان ہر روز موت و حیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ فرمایا "وَأَيُّهَا  
 لَكُمْ الْأَرْضُ مِنَ الْحَيٰثَةِ" اُجھٹھا دیکھتے نہیں کہ زمین بالکل مردہ یعنی خشک  
 ہوتی ہے۔ پھر اس کو ہم زندہ کر دیتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ لوگ ہر موسم میں کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ  
 کی قدرت اور قیامت کا نقشہ انسان کی نگاہ میں ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے زمین  
 میں مختلف قسم کے جانور پھیلادئے "وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ" جنہیں انسان شمار  
 تک نہیں کر سکتا۔ پھر دیکھو! اللہ تعالیٰ نے زمین کے مختلف طبقات میں مختلف قسم کے پتھر رکھ  
 دیے جن میں بڑے بڑے قیمتی اور معمولی سے معمولی ہر قسم کے پتھر انسانی ضروریات کے لیے موجود ہیں۔  
 زمین کی افادیت کے متعلق مزید فرمایا "خَلَقْنَا لَكُمْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا"  
 اے انسانو! تمہارے ہی فائدے کے لیے زمین کی ساری چیزوں کو پیدا کیا۔ ذرا غور کرو۔ پتھروں

میں عقیق اور یا قوت بھی ہے۔ اور زمرہ اور ہیرا بھی۔ نفیس مرمر اور سنگ خارا بھی ہے۔ بٹکسٹرنج بھی ہے اور ساق بھی ہے۔ پھر یہ کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے وسیع کانیں رکھ دی ہیں۔ کہیں سونے کی کان ہے۔ اور کہیں چاندی کی کہیں سے تانبا نکل رہا ہے۔ اور کہیں سے لوہا کہیں سے پٹرول برآمد ہو رہا ہے۔ اور کہیں سے کسی اور تیل کے چشتے اُبل رہے ہیں۔ صنعت معرفت کا سارا دار و مدار انہیں کانوں پر ہے۔ اگر زمین یہ چیزیں میاں کرے۔ تو تمام کارخانے بند ہو جائیں اور پوری دنیا افرا تفری کا شکار ہو جائے۔

یہ بڑے بڑے پہاڑ اور سلسلہ ہائے کوہا زمین پر ہی قائم ہیں۔ جن کے ساتھ انسان کے بے شمار فوائد وابستہ ہیں۔ سورۃ حجر میں فرمایا، اللہ تعالیٰ نے پناہوں کو اس لیے پیدا کیا تاکہ تمہاری زمین کا توازن قائم رہے۔ اور یہ مضطرب نہ ہونے پائے۔

فرمایا اُس رب کی عبادت کرو جس نے آسمان کو چھت بنایا وَالسَّمَاءَ بَنَاهُ بِمَاءٍ مَّهِیْنٍ خدا تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ دیکھو! روشنی کے لیے مہتاب اور آفتاب کو آسمان میں ہی رکھا ہے۔ اس میں سائے اور تپائے بھی ٹکائے ہیں۔ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے اعمال کے صعود کی جگہ آسمان ہے۔ اور ادھر سے نزول و کمی کا مقام بھی آسمان ہے فرمایا وہی رب وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً جس نے آسمان سے پانی اتارا اور جس کے نتیجے میں فَنَخْضَجُ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ یعنی پانی کے ذریعے زمین سے پھلوں کو نکالا جو تمہارے لیے روزی کا سامان ہیں۔ اگر آسمان سے پانی نازل نہ ہو۔ تو کھیتی باڑی نہ ہو سکے۔ درخت سوکھ جائیں۔ اور نہ کوئی فصل پیدا ہو اور نہ کوئی پھل۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُسی رب کی عبادت کرو جس نے پانی اتار کر یہ تمام نعمتیں تمہارے استفادہ کے لیے پیدا فرمائیں۔

آسمان اور پانی کی نعمت

یہ سب نعمتیں ذکر کرنے کے بعد فرمایا فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اُشْدًا جب یہ تمام انعامات اللہ تعالیٰ نے عطا کیے ہیں۔ تو پھر اُس کے لیے بُد نہ ٹھہراؤ، اس کا شریک نہ بناؤ۔ بُد کا لفظ غلطی معنی ہے۔ اُشْد المِساویٰ معترض اصطلاحاً بُد اس کو کہتے ہیں۔ جو ذات اور جوہر میں شریک ہو۔ جو یہ کا شریک ہے۔

لفظ بُد کا معنی

اَتَيْنَا نَجْعَلُونَ اِلَىٰ يَدَيْهِ وَهَذَ بَيْنَهُ رِزْقِي حَسْبُ نَبِيٍّ  
 تم نبی تیم کو میرا شریک بناتے ہو۔ حالانکہ بنی تیم تو کسی شریعت آدمی کے شریک نہیں بن سکتے  
 وہ تو کہنے آدمی ہیں۔

ایک مذہب ہے اور ایک شریعہ ہے۔ شیعہ یا مشابہ اُس پیرو کو کہتے ہیں۔ جو کیفیت میں  
 برابر ہو جیسے گرمی، سردی، بختی، نرمی وغیرہ۔ اسی طرح جو چیز طول، عرض اور علق میں برابر ہو۔  
 اُسے مشکل کہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا اللہ تعالیٰ کے لیے شریک مت ٹھراؤ، کیونکہ خدا تعالیٰ  
 کے سوا واجب الوجود کوئی نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی عظیم کل اور قادر مطلق نہیں۔ یہ ایسی صفات ہیں  
 جن میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ مگر تم جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا نہ ٹھراتے ہو۔  
 آج دنیا میں خدا تعالیٰ کے مقابل اور شریک ٹھرانے والے بیشمار مجوسی موجود ہیں۔ ثنوی  
 مذہب والے دو خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا اور دوسرا برائی کا۔ ایک کا نام یزدان رکھا ہے۔ اور  
 دوسرے کا نام اہرمن۔ ان کے نزدیک ایک شر کا خدا ہے۔ اور دوسرا خیر کا۔ نور کا خدا اور بے  
 اور ظلمات کا اور ہے۔ حالانکہ سورۃ انعام میں پڑھیں گے: حَبَّلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورِ  
 یعنی ظلمت اور نور اُسی وعدہ لا شریک لہ کے پیدا کر دیا ہیں۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں  
 اور یہ وہی ذات ہے جس نے خود تمہیں بھی پیدا کیا ہے۔

بعض لوگ ستاروں میں مستقل تاثیر کے قائل ہیں۔ ایسے لوگ نیک بخمتی اور بد بخمتی اور ترقی و  
 تنزل کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ صابلی فرقہ کے لوگ ہیں۔ جو ستاروں کو اللہ تعالیٰ  
 کا نہ ٹھہراتے ہیں۔

بعض لوگ اصحاب قسبر سے حاجتیں طلب کرتے ہیں۔ اور اس طریقے سے خدا کا نہ  
 ٹھہراتے ہیں۔ بعض لوگ پیروں کو ہر حالت میں مستجاب الدعوات سمجھتے ہیں۔ دو کہتے ہیں۔ کہ  
 خدا چاہے راضی ہو یا ناراض پھر ہر حالت میں سفارش کریں گے۔ آج کل پیر پرست لوگوں کا یہی عقیدہ  
 ہے۔ کہ پیر کا دامن پکڑ لیا ہے۔ بس پار ہو جائیں گے۔ کسی نیکی بدی کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ اس  
 قسم کی سفارش کو قرآن پاک نے جبری سفارش سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ وَلَا يَسْعَوْنَ  
 اِلَّا لِحِمْ اِرْقَاضِ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی جبری سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی اجازت اُسے

ہوگی جس سے خدا تعالیٰ راضی ہوگا۔ اور جس کا عقیدہ خدا تعالیٰ کو پسند ہوگا۔ چونکہ کفر و شرک اللہ تعالیٰ کے ہاں مردود عقائد ہیں۔ لہذا کسی مشرک کی سفارش ممکن نہیں ہے۔ یہ نہ ٹھہرانے کی مختلف صورتیں ہیں۔

**شرک فی اثبت** بعض لوگ مشیت میں شرک کرتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے ایک شخص نے کہا مَا شَاءَ اللَّهُ وَمَا شِئْتُ تَوَّابُ نے فرمایا أَجَعَلْتُ حَتَّىٰ لِلَّهِ بِنْدًا کیا تم نے مجھے خدا کے ساتھ شریک ٹھہرایا ہے۔ قُلْ مَا شَاءَ اللَّهُ وَحْدَهُ کہو جو صرف اللہ تعالیٰ چاہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَمَا تَشَاءُونَ إِنْ أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ تم اس وقت تک نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔ البتہ بعض روایات میں یوں آیا ہے کہ کو مَا شَاءَ اللَّهُ تَوَّابُ ہے۔ اس کے بعد جو تمارا ارادہ ہے اس کے مطابق عمل کرو، شرک سے بچ جاؤ گے۔

**شرک فی العادت** شاہ اسماعیل شیعہ اور دوسرے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ شرک عبادت میں بھی ہوتا ہے۔ اور عادت میں بھی ہوتا ہے۔ شرک فی العادت کی مثال زنا کا دھاگا ہے۔ جو ہندو یا جو کسی اپنے جسم کے ساتھ باندھتے ہیں۔ عیسائی صلیب باندھتے ہیں۔ یہ بھی شرک فی العادت ہے۔ حضور علیہ السلام نے صلیب کو کفر کی نشانی بتایا ہے۔ اسی لیے فرمایا اَطْرَحُ عَنْكَ هَذَا الْوُثْنُ اُسے اتار دو، یہ ثبت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مسیح علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ صلیب کی شکلی اس لیے ہوگی کہ یہ کفر کی نشانی ہے۔ اور وہ بھی نبی کے نام پر۔ اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ کہ عیسائیوں نے اُسے بکری کی طرح حلال قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ یہ کسی نبی کی شریعت میں حلال نہیں ٹھہرا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جتنے پیغمبر آئے ہیں۔ سب کی شریعتوں میں خنزیر حرام ہی رہا ہے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر ص ۵۹، اور منثور ص ۲۵۔ ۲۔ تقویۃ الایمان ص ۹۱۰، ۳۔ ترمذی ص ۴۴

۴۔ بخاری ص ۴۹، مسلم ص ۸۶، ۵۔ حجة اللہ ابانہ ص ۱۸

بعض لوگ نیچے کے سر پر چوٹی رکھ کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ چوٹی فلاں بزرگ یا فلاں خواجہ کی رکھی ہے۔ اگر یہ چوٹی نہ رکھتے تو کچھ مر جاتا۔ یہ صریح اور جلی شرک ہے۔ بعض لوگ بوسیسوں کے نوروز یا عیسائیوں کے بڑے دن کی تعظیم بجا کر شرک کرتے ہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ایسے مواقع پر جو تختہ میں پھول، دار، ڈالی یا کئی اور بد پریش کو رکھا اور تعظیم کریا تو شرک میں مبتلا ہو جائے گا۔ بعض مشائخ نے کفر تک کا فتویٰ لگایا ہے۔

کچھ لوگوں کے اندر مذہب ماننے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کے تعرب کے لیے مذہب دینا دیتے ہیں۔ ہم ہر مذہب مشاہدہ کرتے ہیں کہ قبروں اور زیارتوں پر کس کس طرح اور کس کس نام کے عرس منعقد ہو رہے ہیں۔ یہ سب بدعت اور بعض شکلوں میں شرک ہے۔ بعض لوگ غیر اللہ کی قسم اٹھا کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کچھ غیر اللہ کے نام پر نیچے کا نام رکھ کر شرک کرتے ہیں۔ جیسے عبدالمصطفیٰ، حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ عبد اللہ یا عبد الرحمن وغیرہ نام رکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی جائے۔

بعض لوگ استعانت طلب کرنے میں شرک کرتے ہیں معنی غائبانہ طور پر مانق الاسباب قبروں واسے زندگن اور اولیاء سے مدد چاہتے ہیں۔ یہ سب شرک ہے۔ ”وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ“ خدا تعالیٰ کی ذات ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ اُس سے مدد طلب کر دو۔ تم غائبوں کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہو۔ جن کا کوئی اختیار نہیں۔ ان کو تو یہ بھی علم نہیں کہ تم کس تکلیف میں مبتلا ہو۔ چہ جائیکہ ان کے آگے دست سوال دراز کرو۔

بعض لوگ جانور ذبح کرتے وقت بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ کے ساتھ کچھ اور اضافہ کر کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جیسے بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاسْمِ مُحَمَّدٍ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاسْمِ فُلَانٍ یعنی فلاں بزرگ یا فلاں پیر کے نام پر۔ ایسی صورت میں جانور سرے سے مُردار ہو گیا۔ فقہائے کرام نے اسے بسم اللہ میں شرک قرار دیا ہے۔

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو شیخوں کے شرک کے مرتکب ہوتے ہیں حضور علیہ السلام

لے فرمایا اَلْطَّيْرَةُ شُرَكَاءُ شُكُونِ يَنَا شُرَكَاءُ کی بات ہے۔ بعض لوگ غیب کی خبریں معلوم کرنے کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کابن، سنیا سی، بخوی، دست شناس یا جہار کے پاس جا کر پوچھتے ہیں۔ اور ایمان کو ضائع کر لیتے ہیں۔ اس قسم کی خبروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اپنی جیب سے پیسے دیکھ کر شرک خریدنے کے مترادف ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈے کی شکل میں شرک کرتے ہیں۔ تعویذ گنڈے کرنے والے اکثر غلط کار لوگ ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے کلام یا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق پڑھ کر دم کرے یا کھ کرے، تو جائز ہے۔ مگر نہ یہ لٹکے جن کے ساتھ طعن طرح کی شرائط وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ سب شرکیہ یا بدعت اور معصیت کی باتیں ہیں۔

بعض لوگ غیر اللہ کو غائبانہ طور پر پکار کر شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جیسے یا شیخ عبد القادر جیلانی، شیکھ اللہ، یا مذاکا شرک ہے۔ اور پھر ان سے حاجتیں بھی طلب کرتے ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید تقویٰ الایمان میں لکھتے ہیں کہ دیکھو! ایسے لوگ کتنی غلط بات کرتے ہیں کہ بندے کو اصل ٹھہرا دیا۔ اور خدا تعالیٰ کو واسطہ بنا دیا۔ اگر اس کا الٹ کر دیتا تو درست تھا۔ یعنی یا اللہ شیکھ اللہ شیخ عبد القادر جیلانی۔ اے مولا کریم! شیخ عبد القادر جیلانی کے واسطے اور ان کے طفیل سے میرا یہ کام کر دے۔ مگر اس شخص نے شیخ عبد القادر جیلانی کو مستحق بنا کر اللہ تعالیٰ کو واسطہ کے طور پر پیش کیا۔ اور اس کے ساتھ توہین کا بھی مرتکب ہوا۔ غیر سے امداد طلب کر کے کفر میں مبتلا ہوا۔

شرک جلی کے بعد شرک خفی کا ذکر بھی ہو جائے۔ شرک خفی کیا

میں پایا جاتا ہے۔ یا بعض دوسری اعتقادی صورتوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ اس قسم کا شرک خفیف ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے بچنے کے لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال دی گئی ہے کہ بعض دالہ و حیاتیات اللہ کی قسم اور تیری زندگی کی قسم یا میری زندگی کی قسم یا بعض لوگ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اگر رات کو یہ گناہ ہوتا تو ہم لٹ جاتے۔ یہ بطنخ



مکان میں موجود تھی جس کی وجہ سے ہم چھ دی سے بچ گئے۔ یہ شرکِ خفی کی مثالیں ہیں۔ عام محاورے میں یوں بھی کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب یا حکیم صاحب کی مہربانی سے مریض بچ گیا۔ وہ نہ مر گیا تھا۔ یہ پہرے دار یا چہر پاسی نہ ہوتا۔ تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ تمام چیزیں اس لیے شرکِ خفی کی فہرست میں آتی ہیں کہ ان چیزوں کو مؤثر سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ ہر چیز میں اثر ڈالنے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جس طرح غیر اللہ کی عبادت مطلقاً کفر اور شرک ہے۔ اسی طرح غیر اللہ کی: لاستقلال طاعت بھی شرک ہے طاعت غیر کا مطلب یہ ہے کہ بنی یا کسی بزرگ کی اطاعت کرتے ہیں۔ مگر اُس کو مبتغ نہیں سمجھتا بلکہ سب کچھ اُسی کو سمجھ رہا ہے۔ یعنی وہ جو بھی حکم کرے گا، اُس کی بلا چون و پسرا طاعت کی جائے گی۔ اِخْذُوا حَبَارَهُمْ وَرُؤَسَاءَهُمْ اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اسی کو کہا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو رب بنایا تھا۔ یہ شرک ہے۔ البتہ بنی کی مطلق طاعت فرض ہے کیونکہ بنی کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی اور اس کی خوشنودی معلوم نہیں کر سکتا۔ مگر بنی کا حکم مستقل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہوتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا يَطْعَا عَزَّ وَجَلَّ بِمَا يَأْذُنُ اللَّهُ بِهِمْ فِي دِينِهِمْ (علیہم السلام) کو اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کی اطاعت کی جائے۔ نبی کی اطاعت فرض ہے بحیثیت رسالت کے۔ اور علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ نبی کے لفظ میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی جو نب سے کوئی حتم نہیں دیتا۔ بَلَا إِنْ أَسْبَغَ إِلَّا مَا يُكْسِرُ إِلَيْهِ مِنْ تَرَاوُسٍ حُكْم کی تعمیل کرتا۔ ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے یعنی منجانب شہوت ہے باقی رہی یہ بات کہ علمائے کرام، مجتہدین، شیخ طریقت، بادشاہ وقت، مرا احکام اور



مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ خَالِق کی معصیت کرتے ہوئے، اس کی نافرمانی کرتے ہوئے۔ مخلوق کی اطاعت  
 عدا نہیں ہے۔ ایسا کرنا شرک کے مترادف ہے۔ ان کی اطاعت مطلق نہیں ہے۔ بلکہ نبی کی  
 اطاعت مطلق ہے۔ کیونکہ نبی اپنی جانب سے حکم نہیں دیتا۔ بلکہ وہ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ باقی  
 لوگ چونکہ اپنی طرف سے حکم دیتے ہیں، اسی لیے ان کے حکم کو جانچنا ہو گا۔ صحیح حکم کی اطاعت  
 ہوگی۔ اور خلاف شرع غلط بات کو ٹھکرا دیا جائے گا۔

اسی لیے فرمایا فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ کے  
 لیے بڑے بڑے ٹھکانے۔ اور تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں۔ کوئی نافع اور ضرر  
 نہیں۔ کوئی خالق اور قائم مطلق نہیں۔ جب یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ تو پھر اس کی عبادت  
 اور اس کی صفات میں غیروں کو کیوں شریک منستے ہو مسئلہ توحید قرآن پاک کا بنیادی مسئلہ ہے۔  
 اللہ تعالیٰ نے ان دو آیتوں میں یہ مسئلہ سمجھا دیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مضامین ہوں گے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ  
 مِّمَّنْ مِثْلِهِ ۚ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِمَّنْ دُونِ اللَّهِ إِنَّ كُنْتُمْ  
 صَادِقِينَ ②۲ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَأْزَنُوا  
 النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ  
 ②۳ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ  
 جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ  
 ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ  
 مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا  
 خَالِدُونَ ②۵

ترجمہ: اور اگر تم اس چیز سے شک میں ہو جس کو ہم نے نازل کیا ہے پتے بند سے  
 (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پھر لاؤ تم ایک سورۃ اس کے مانند اور بلاؤ اپنے  
 مددگاروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا اگر تم بچے ہو ②۲ پھر اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر  
 سکو گے پس پھر اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے جو کفر کرنے والوں  
 کے لیے تیار کی گئی ہے ②۳ اور آپ خود بخبری سنا دیں ان لوگوں کو جو ایمان لائے  
 اور جنہوں نے اچھے عمل کیے کہ بیشک ان کے لیے باغات ہیں جن کے سامنے  
 نہریں بہتی ہیں جب بھی وہ ان بہتوں میں پھلوں سے روزی دیے جائیں گے  
 تو کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے روزی دی گئی اور وہ اس  
 میں دیے جائیں گے ایک درخت کے مشابہ پھل اور ان کے لیے ان بہتوں  
 میں پاکیزہ عورتیں ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ②۵

سورۃ کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کا جواب

ذٰلِكَ لِكُتُبٍ كَرِيْمٍ مَّا رَفَعْنَا مِنْهُ دِيَارَ السُّلُوٰلِ كَيْ تَمْلِكُوْا مِنْهُ بِرُءُوْسٍ .  
 مستقین کا گروہ . اور اس کے اوصاف بیان فرمائے . اس کے بعد دوسرے گروہ کفار کا ذکر کیا جو ظاہراً  
 اور باطناً اللہ تعالیٰ کی توحید اس کے دین اور قیامت کے منکر ہیں اس کے بعد تیسرے آیات میں منافقین  
 کا حال ذکر کیا . جو سب سے زیادہ خطرناک گروہ ہے ان کی علامات کارنامے اور ان کی ذہنیت کا بیان ہوا .  
 اس کے بعد مشاغل کے ذریعے ہر دو قسم کے منافقوں کی تشاہد کی . جو کفر میں پختے ہو چکے ہیں یا پھر ابھی  
 متردد ہیں . اور پھر ان کے بڑے انجام کا بھی ذکر فرمایا .

سورۃ بقرہ دو سو چھیالیس آیات کی سب سے لمبی سورۃ ہے . مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے  
 مکی زندگی میں جس قدر سورتیں نازل ہوئیں اور ان میں جتنی تعلیم دی گئی . سب کا خلاصہ اس سورۃ میں آگیا ہے  
 اس کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام اس میں آئے ہیں . بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے نظام کو مکمل  
 طور پر اس میں بیان فرمادیا ہے . چنانچہ سب سے پہلی بنیادی تعلیم جس پر تمام کتب آسمانی متفق ہیں اس کا حکم  
 دیا کہ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ“ یعنی عبادت  
 خالق اللہ تعالیٰ ہی کی کرنا . اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں . اس کے بعد معرفت الہی پر  
 زور دیا کہ اللہ تعالیٰ کی پہچان ضروری ہے . اس کے بعد عبادت بھی کسی کی کار آمد نہیں . مشرکین اور یہود و  
 نصاریٰ اگرچہ خدا تعالیٰ کو مانتے تھے . مگر صحیح پہچانتے نہیں تھے . اسی لیے وہ ناکام ہوئے . فرمایا  
 اللہ تعالیٰ کی پہچان اس کی ذات سے نہیں ہو سکتی . کیونکہ وہ انسانی عقل و فک سے بلند ہے . وہ ہر تک  
 کسی کی رسائی نہیں . اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو عالم جبروت سے تعلق رکھتی ہیں . ان کا پہچانا بھی بڑا  
 مشکل ہے . اللہ تعالیٰ کی صفت کی پہچان اس کی مخلوق اور اس کی مصنوعات میں غور کرنے سے ہوتی  
 ہے . جب کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو پہچان لیتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی  
 پہچان لیتا ہے . اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان صفات کا ذکر کیا ”رَبُّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ“  
 تمہارا رب وہ ہے . جس نے تمہیں پیدا کیا . اس کے سوا کوئی خالق ہے نہ قایم مطلق ہے اور نہ عظیم کل  
 ہے . عبادت کے لائق وہی ذات ہے . جو ان صفات کی مالک ہے .

پھر اللہ تعالیٰ نے ربوبیت اور خالقیت کو بیان کیا کہ دیکھو ! اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین کو  
 تمہارے لیے بچھونا اور فرش بنادیا . اور آسمان کو چھت کی مانند کھڑا کر دیا . آسمان سے پانی اتار کر پہلوں کے

ذریعے تمہاری روزی کا سامان متیا کر دیا۔ لہذا عبادت صرف اسی کی کر دو۔ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ  
اَشْدَادًا کہی چیز میں بھی خدا کا شریک نہ بناؤ۔ تم جہنم سے ہو کہ خدا کے سوا دوسرا کوئی کچھ بھی نہیں  
کر سکتا۔ سائے محتج اور اس کی عاجز مخلوق ہیں، خواہ وہ انسان ہوں۔ جن ہوں یا فرشتے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی ان آیات میں چار عمدہ مضامین کا ذکر کیا۔  
یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کہ یہ بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کے بعد رسالت ہے۔ کہ نبی پر ایمان لائے بغیر  
اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کے اوامر اور نواہی کا علم نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے یونانی علماء و محققین  
اس لیے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے نبیوں کی اتباع کی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔ وہ تو کہتے تھے کہ  
یہ تو جاہل لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ ہم تو بڑے عقلمند ہیں۔ تیسرا مضمون خود قرآن پاک کی  
صدائے حق ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ اور چوتھا مضمون قیامت  
پر ایمان ہے۔ نیک و بد اعمال کی جزا و سزا قیامت پر منحصر ہے۔ لہذا اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے

ان حالات میں قرآن پاک کو پیغمبر علیہ السلام کا اٹھاتا ذکر فرمایا ہے وَ اِنْ كُنْتُمْ  
فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا اِنْ كُنْتُمْ اِلَّا قَوْمٌ يَّحْكُمُونَ اس چیز کے بارے میں شک ہے۔ جو ہم  
نے اپنے بندے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے۔ کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے۔  
گویا اس کلام الہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے نبی کی نبوت کی تصدیق مطلوب ہے۔ نبی دعوٰی کرتا  
ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا فرستادہ ہوں۔ تو اس کی تصدیق کے لیے کسی معجزہ کا ہونا ضروری ہے۔  
احادیث میں حضور علیہ السلام کے تین ہزار سے زیادہ معجزات کا ذکر آتا ہے۔ مگر قرآن پاک حضور  
علیہ السلام کا خصوصی معجزہ ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی خصوصی معجزہ عطا  
فرمایا ہے۔ پھر جس کی قسمت میں عطا ہوا ایمان لے آیا۔ فرمایا میرا خصوصی معجزہ وحی الہی ہے۔ جس  
کے ذریعے قرآن پاک جیسا بیشال معجزہ عطا ہوا۔ اسی لیے آپ نے ارشاد فرمایا اَرْجُوا اَنْ اَكُوْنَ  
اَكْثَرُكُمْ قَابِلًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز سب سے زیادہ  
پیر و کار میرے ہوں گے۔ کیونکہ میرا خصوصی معجزہ پائیدار اور دائمی ہے باقی پیغمبروں کے معجزات عارضی تھے

قرآن پاک  
خاص معجزہ ہے

جو وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ مگر میرا معجزہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا لافنی کا معجزہ حضرت صلح علیہ السلام کی اونٹنی کا معجزہ عارضی معجزات تھے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو گئے مگر حضور علیہ السلام کا معجزہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔

عبد با عزت  
لفظ ہے

اس آیت میں حضور علیہ السلام کے لیے عبد کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو کہ بڑا با عزت لفظ ہے۔ نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا کسی پیغمبر کی عبدیت کا اظہار اس کی بہت بڑی صفت ہے کیونکہ کامل درجے کی عبدیت انبیاء کرام علیہم السلام میں ہوتی ہے۔ اور پھر تمام نبیوں میں حضور علیہ السلام اکمل ترین بندے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب نصیب ہے۔ قرآن پاک میں جہاں بھی عبد کا لفظ آیا، وہاں پر خاص انعام کا ذکر ہے۔ جیسے سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ دوسری جگہ فرمایا "نَزَّلَ الْفُرْقَانُ عَلَىٰ عَبْدِهِ" ایک اور جگہ ارشاد ہے "فَأَوْسَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْسَىٰ" الغرض یہ عبد کا لفظ نہایت اعلیٰ مقام کا حامل ہے نماز میں جب تک کہ نہ کہل نہ اَللّٰهُ اَللّٰهُ وَاشْهَدُ اَنْ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ نہ کہے۔ اس کی نماز کامل ہی نہیں ہوتی۔ تمام انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ نہ تو خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ نہ اوتار ہیں اور نہ خدا نے ان میں مخلوق کیا ہے۔ زبان میں اللہ کی صفت پائی جاتی ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اس کے عبد یعنی بندے ہیں۔ معبود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

بعض لوگ جہالت کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بشر یا انسان نہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہونا فخر کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إِنِّي خَالِقُ الْبَشَرِ مِن طِينٍ" میں تو مٹی سے انسان جیسی برگزیدہ بستی کو پیدا کرنے والا ہوں۔ بشر ہونا کوئی بے عزتی کی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر عبدیت تو بہت اعلیٰ صفت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کرے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اندر تو عبدیت والی بات ہی نہیں پائی جاتی۔ ہماری عبدیت کی حالت خراب ہے۔ ہم گندے انسان ہیں۔ جو گناہوں سے آلودہ ہیں۔ جنہیں عبدیت کا مقام حاصل ہے وہ تو پاکیزہ نفوس ہیں جو ہر وقت خدا تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں مشغول رہتے ہیں۔

قرآن پاک  
بطور حنیف

خود قرآن پاک اس بات کا گواہ ہے کہ مشرکین اسے خدا تعالیٰ کا کلام ماننے کے لیے

تیار نہ تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کے رد کے طور پر قرآن پاک میں تین قسم کی آیات نازل فرمائیں۔ اولاً سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن پاک کسی انسان کا وضع کردہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ انسان کے بس کی بات ہے۔ بلکہ لَہِیْنِ اجْتَمَعَتْ الْاَنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُہُمْ بِبَعْضٍ خٰفِیْنَ یعنی تمام انسان اور تمام جن مل کر بھی اس قرآن پاک کی مثل لانا چاہیں تو نہیں لاسکتے۔ اگرچہ یہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ گویا یہ ساری مخلوق عاجز ہے۔ اس بات سے کہ قرآن پاک جیسا کوئی کلام پیش کر سکیں۔ دوسری جگہ فرمایا کہ اگر تمہیں اس کلام پاک کے منجانبہ ہونے میں کسی قسم کا شک ہے یعنی یہ کہ یہ انسانی کلام ہے تو فَاْتُوْا بِمِثْلِ سُوْرَةِ مِّثْلِہِ۔ تو اس جیسی دس سو قیں ہی بنا کر لے آؤ خواہ چھوٹی۔ چھوٹی ہی ہوں۔ پتا چل جائے گا کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ کوئی انسان بھی ایسی چیز پیش کر سکتا ہے۔ مگر کوئی بھی اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔ اب تیسرے نمبر پر آیت پاک میں آخری چیلنج دیا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم کو اس کلام پاک میں شک ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِہِ۔ تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لے آؤ چاہے وہ تین آیات کی پھر ملے چھوٹی سورۃ ہی کیوں نہ ہو۔

امام ابو بکر جصاص چوتھی صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کے اس چیلنج کو صدیاں گزر جانے کے باوجود کسی نے اس کا جواب دینے کی جرأت نہیں کی۔ اور اگر میلہ کذاب جیسے کسی شخص نے حماقت کی تو اسے منہ کی کھانی پڑی۔ اس کے ہم عصر کافروں نے اس کے منہ پر ہتھوک دیا تھا کہ تم پر لعنت ہو۔ کیا تمہارا وضع کردہ کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو نیا لے کلام کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ قرآن پاک کا یہ اعجاز چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود قائم و دائم ہے۔ اور آج تک کوئی ایک سورۃ بھی بنا کر پیش نہیں کر سکا۔

عام مفسرین کریم فرماتے ہیں کہ یہ چیلنج قرآن پاک کی نصاحت و بلاغت کے لحاظ



سے ہے۔ اہم اور بزرگ جہاں بھی انہیں مفسرین میں شامل ہیں۔ جو فرماتے ہیں کہ قرآن پاک ایسا فصیح و بلیغ کلام ہے کہ اس جیسی فصاحت و بلاغت آج تک کوئی دوسرا کلام پیش نہیں کر سکا۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ جلیغ فصاحت و بلاغت تک ہی محدود ہے۔ تو پھر یہ خط عرب تک ہی محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ جلیغ صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کے لیے ہے۔ اگر اس جلیغ کو بین الاقوامی جلیغ تسلیم کیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ فصاحت و بلاغت کے علاوہ نہ کوئی دوسرا کلام اس جیسا ہے نہ اس میں دیے ہوئے نظام جیسا کوئی نظام دیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اس جیسا کوئی دوسرا دستور پیش کیا جاسکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ماحول جیسی اجتماعیت کوئی دوسرا قانون پیش نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ سابقہ کتب آسمانی اور صحیفے بھی ایسا اجتماعی نظام نہیں دے سکتے۔ جیسا قرآن پاک نے عطا کیا۔ اسی لیے فرمایا کوئی ایک سورۃ لا کر دکھاؤ۔ جو قرآن جیسی جامعیت پیدا کر سکے۔

حضرت مولانا حبیب اللہ سندھی برصغیر کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ صرف سوڑ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی۔ اور آپ سکھ مت چھوڑ کر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ حضرت سندھیؒ کے دوست تھے اور آپ کے ساتھ ہی اسلام لائے۔ رشتے کے لحاظ سے حضرت مولانا سندھیؒ حضرت مولانا لاہوریؒ کے خسر تھے۔ تو مولانا حبیب اللہ سندھیؒ نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ دنیا بھر کی اقوام اگر انصاف کی نظر سے دیکھیں تو ان پر واضح ہو جائے گا کہ جو پر وگرام اور نظام عدل اسلام اور قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ انہیں حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ اسلام جیسا اعلیٰ مضبوط اور غیر تغیر پذیر قانون کہیں سے نہیں مل سکا۔ اہم شائع فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی چھوٹی سی سورۃ ”الْعَصْرِ“ اتنی جامع سورۃ ہے کہ ساری کائنات کی ہدایت کے لیے یہی کافی ہے۔ بشرطیکہ بنی نوع انسان اس



پر غور و فکر کر کے اس سے رہنمائی طلب کریں۔

الغرض! فرمایا اگر ہمارے نازل کردہ کلام میں تمہیں کوئی شک ہے تو اس جیسی ایک سورۃ ہی بنا کر لاؤ۔ صرف یہی نہیں بلکہ وَدْعُوا شُهَدَاءَكُمْ قَوْمًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ اور اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے علاوہ اپنے گواہ بھی بلاؤ۔ یعنی خود بھی آجاؤ اور اپنے دیگر مددگار اور حمایتی بھی بلاؤ۔ مگر تم اس کلام جیسی ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکو گے۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام نہیں ہے تو اس چیلنج کو قبول کرو۔ یہ قرآن پاک عربی زبان میں ہے۔ یہ تمہاری مادری زبان ہے۔ حضور علیہ السلام نے اسی تمہارے ماحول سے عربی زبان سیکھی ہے۔ آپ مکے میں رہے ہیں۔ یاد یا رہی بخیریں۔ یہ اسی علاقے کی زبان ہے اگر حضور علیہ السلام خود کلام بنا سکتے ہیں۔ تو پھر تم بھی کوئی سورۃ بنا کر دکھاؤ۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں عربی زبان اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اس انتہا پر پہنچنے کے بعد تنزل کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مگر کسی شاعر نے قرآن پاک کی مثل لانے کی جرأت نہیں کی۔ جو بھی قرآن پاک کی کوئی آیت سننا تھا۔ دم بخود رہ جاتا تھا۔ حضرت ابو بکر غفاریؓ کے بھائی حضرت امیرؓ کہتے تھے یہ کہ میں شاعروں کا کلام بھی جانتا ہوں اور ماحوروں کا بھی۔ اور کامیوں کا بھی۔ میں نے کلام الہی کا ان سب کلاموں کے ساتھ موازنہ کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی قرآن پاک کا مقابل نہیں۔ خدا کا کلام تمام کلاموں سے منفرد اور ممتاز ہے۔

معرین قرآن  
کی سزا

قرآن پاک نے چیلنج پیش کرنے کے بعد پھر خود ہی اس کا جواب دیا فَإِن لَّا تَفْعَلُوا وَلَٰكِنَّ تَفْعَلُوا پس اگر تم نہ کر سکو اور نہ ہو گز نہیں کر سکو گے۔ گویا پیشگوئی بھی کر دی کہ تم اس کلام کی مثل ہو گز نہیں کر سکو گے۔ تو پھر خبردار فرمایا فَا تَقْوُ التَّارَاسُ آگ سے بچو! وَقُوْهُمُ النَّاسُ وَالْجِبَارَةُ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ گویا دوزخ کی آگ میں اس کلام کے مکذبین خود کفار جلیں گے۔ اور پتھر جلانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کوئلے سے جلائی گئی آگ سخت ہوتی ہے۔ اسی طرح پتھر سے جلنے والی آگ شدید تر

ہوگے۔ یا پھر سے مراد وہ پتھر کے ٹبت ہیں جن کی پر جا کی جاتی تھی۔ وہ بھی دوزخ کی آگ میں جلائے جائیں گے۔ فرمایا یہ ایسی آگ ہے اَعْدَتْ لِلْكَافِرِينَ جو کفار کے لیے تیار کی گئی ہے۔ کفار لوگ اسی آگ کا ایندھن بنیں گے۔

ایمانداروں کے  
لیے بشارت

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے تہ سب و ترغیب کو ساتھ ساتھ بیان فرمایا ہے۔ کفار کا انجام کا انجام بیان کرنے کے بعد ایمانداروں کے لیے بشارت سنائی زَكَشِرَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ آپ ان لوگوں کو خوشخبری سنادیں جو اللہ تعالیٰ کی وعدہ نیت لہر نبی کی رسالت پر ایمان لائے۔ کلام الہی کو سچا کلام تسلیم کیا۔ قیامت کو برحق جانا اور پھر اس کے ساتھ ثنائت کام بھی انجام دیے۔ یعنی نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ جیسے فرائض پورے کئے۔ صدقہ و خیرات کیا۔ عدل و حرام میں امتیاز روا رکھا۔ کہ اِنَّ لَهُمْ جَنَّتْ عَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا اِلٰذْهُمْ رِیْے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے پچھے نرس جاری ہیں۔

پھلوں میں  
مشابہت

فَرِیْءًا لِّكُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا فَاِذَا حُجِبَ وَه ان بشتوں میں پھلوں سے روزی دیے جائیں گے قَالُوا هٰذَا الَّذِیْ رَزَقْنَا مِنْ قَبْلُ اَوَلَا نَرٰکُمْ تَرْجِعُوْنَ وہی ہے۔ جو ہمیں اس سے پہلے دی گئی ذاتوا بہ مثابہت اور وہ اس میں دیے جائیں گے ایک دوسرے کے مشابہ پھل۔ مقصد یہ کہ ایک دفعہ جنتیوں کو پھل پیش کیے جانے کے بعد جب دوسری دفعہ ان سے ہتے جلتے پھل دیے جائیں گے۔ تو جنتی لوگ کہیں گے کہ یہ وہی پھل ہیں جو ہمیں اس سے پہلے دیے گئے تھے۔ مگر جب وہ انہیں کھائیں گے۔ تو ان کا ذائقہ پہلے پھلوں سے بالکل مختلف ہو گا۔ یا اس کا معنی یہ ہے۔ کہ جنت کے پھل دنیا کے پھلوں سے مشابہ ہوں گے اور جنتی انہیں دیکھ کر دنیا کے پھلوں پر قیاس کریں گے مگر ان دونوں قسم کے پھلوں میں ذائقے کے اعتبار سے بڑا تفاوت ہو گا۔

حضرت مولانا شاد اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ پھلوں میں مشابہت کی ایک اور توجیہ یہ ہے۔ کہ فطرت سلیمہ رکھنے والے اس دنیا میں جب یہی اور اطاعت کے کام کو کرتے

تو انہیں لذت محسوس ہوتی تھی۔ اس کے نتیجے میں جب بہشت میں انہیں محسوس دینے جائیں گے تو وہ لوگ کہیں گے کہ ان میں وہی لذت پائی جاتی ہے۔ جو دنیا میں نیکی کرتے وقت حاصل ہوتی تھی۔  
ترمذی شریعت کی روایت میں آتا ہے کہ جنت کی زمین خالی ہے سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلِلَّهِ الْأَلَاءُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ کہنا اس خالی زمین میں درخت لگانے کے مترادف ہے۔ جب کوئی مومن دل کی گمراہیوں سے اَلْحَمْدُ لِلَّهِ کہتا ہے۔ تو جنت میں اس کے لیے ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔ جب اس درخت کا پھل انہیں میسر ہوگا۔ تو وہ کہیں گے کہ اس کا ذائقہ تو بالکل وہی ہے جیسا ذائقہ ہمیں دنیا میں نیکی کی ترغیب پر حاصل ہوتا تھا۔ اسی نیکی کے صلے میں آج ہمیں جنت میں یہ نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا میں آرام و راحت کا جو بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ وہ سب جنت میں حاصل ہوگا۔ خواہ وہ لباس کی صورت میں ہو خوراک کی صورت میں ہو یا اعلیٰ مقام کی صورت میں۔ ہر چیز وہاں حاصل ہوگی اور اسی کو پھلوں کی مشابہت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پاکیزہ بیویاں

جنتیوں کے ایک اور انعام کے متعلق فرمایا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَلَهُمْ فِيهَا مِمَّا نَشْتَهُی الْفُكُّوْا اس میں تمہارے لیے ہر وہ چیز ہوگی جس کے لیے تمہارا جی چاہے گا۔ جنت کی نعمتوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ نہ ختم ہونے والی ہونگی۔ دنیا میں کسی چیز کے میسر آجانے کے بعد بھی ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔ کہ یہ کسی وقت چھین بھی سکتی ہے۔ یا ختم ہو سکتی ہے۔ مگر جنت کی نعمتیں دائمی ہوں گی۔ ان کے لیے زوال کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا اسی لیے فرمایا کہ جنتی لوگ کسی محدود عرصے کے لیے جنت کی نعمتوں سے مستغنیہ نہیں ہوں گے۔ بَلْكَرَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ اور وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہیں رہیں گے۔ اور ان کے انعامات میں اضافہ ہی ہوتا ہے گا۔

ان آیات میں قرآن پاک پر ایمان لانے والوں کا انجام بھی بیان فرمادیا اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے حشر سے بھی اللہ تعالیٰ نے آگاہ کر دیا۔

الْقُرْآنِ

البقرة ۲

(آیت ۲۶ تا ۲۷)

درس سیزدهم ۱۳

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا فَعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَنَّ  
الَّذِينَ كَفَرُوا يَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهِمْ ۖ هَذَا مَثَلٌ يُضِلُّ  
بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ  
۝۳۱ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ  
مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ  
مُتَّحِسُونَ ۝۳۲

ترجمہ: • بیشک اللہ تعالیٰ نہیں شرما اس بات سے کہ بیان کرے مثال ٹھہر  
کی یا اس سے بڑی۔ بہر حال جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان  
کے رب کی طرف سے اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، پس وہ کہتے ہیں۔ کیا ارادہ  
کیا اللہ تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ؟ اللہ تعالیٰ ٹھہرا کر ہے اس کے سبب سے  
بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے اس کے سبب سے بہتوں کو۔ اور نہیں ٹھہرا کرتا  
اس کے سبب سے مگر فاسقوں کو ۝۳۱ وہ جو ٹوڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے  
کے عہد کو اس کو مضبوط کرنے کے بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو  
اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ  
نقصان اٹھانے والے ہیں۔ ۝۳۲

گذشتہ پیر سے  
پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حقانیت، صداقت اور اس کے منزل  
من المشرق ہوئے اور حضور علیہ السلام کی رسالت کا ذکر کیا تھا۔ اس سے پہلے توحید اور دوشرک  
کے متعلق بیان تھا۔ لوگوں کے اس خیال کی تردید تھی کہ یہ قرآن خدا تعالیٰ کا کلام نہیں۔  
بلکہ پیغمبر علیہ السلام کا اپنا وضع کردہ ہے۔ اور پھر اس ضمن میں قرآن پاک کے چیلنج کا ذکر تھا۔ کہ اگر

تمیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے۔ تو اس میں کسی ایک ہی سورتہ نہ کر لاؤ۔ اس کے ساتھ پیش گوئی کر دی گئی تھی کہ قیامت تک تم اس قرآن کی مثل نہیں لائو گے لہذا یاد رکھو کہ جب ایسا کلام پیش کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ تو پھر اس کلام سے انکار کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم ایسی دوزخ میں ڈالے جاؤ گے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اس کے ساتھ ایمان والوں کو ثبات بخشی کہ آخرت میں وہ کامیاب ہوں گے۔ اور ان کا انجام نہایت اچھا ہو گا۔

حقیر چیزوں  
کی مثالیں

کنارہ قرآن پاک کے متعلق یہ اعتراض پیش کرتے تھے کہ اس میں بعض چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے شایان شان نہیں کہیں مکملی کا ذکر ہے۔ اور کیسے مکملی کا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اُس کا کلام بھی بہت اعلیٰ مالوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ ایک عام محاورہ ہے کَلَامُ الْمُلُوكِ مُلُوكُ الْکَلِمِ یعنی بادشاہوں کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بلند و برتر ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی اعلیٰ و ارفع ہونا چاہیے۔ اس میں مکملی۔ پھر جیسی اور چیزوں کا ذکر نہیں ہونا چاہیے۔

اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٰ اَنْ يَّصْرِفَ مَثَلًا مَّا يَعْوَضُهُ فَمَا فَوْقَهَا یعنی اللہ تعالیٰ کی شان اور عظمت کے یہ ہرگز مافی نہیں کہ وہ پھر یا اس سے کسی بڑی چیز کی مثال بیان فرمائے۔ کیونکہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالیں انسانوں کے سمجھانے کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ یہ تو بعض لوگوں کی عقل یا انکے عرف کی کمزوری کی دلیل ہے کہ وہ بعض حقیر چیزوں کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر حکمت کے اصول کے تحت ایسی چیزوں کے بیان کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی کسی سے خوفزدہ ہو کر کسی کو خوش کرنے کے لیے کسی چیز کا بیان روکا جاسکتا ہے۔ حقیر چیزوں میں بڑے مفید پہلو بھی ہوتے ہیں قرآن پاک میں مکملی اور مکملی کا ذکر ہے۔ اور ان کی مثال سے کہ بڑی مفید باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ لہذا ایسی مثالوں کے ترک کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

اس قسم کی مثالیں اکثر علماء کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ خود عرب کہتے ہیں مَا الْبَقْرُ وَشَحْمَةُ یعنی کیا پھر اور کیا اس کی چربی۔ اسی طرح مَا الْجُرَادُ وَطُعْمُهُ یعنی کیا

نہی اور کیا اس کا گوشت وغیرہ حضور علیہ السلام نے بھی تغیر حقیقت کے لیے مثال بیان فرمائی ہے۔  
مسند احمد۔ ابن ماجہ اور ترمذی شریف میں یہ الفاظ موجود ہیں لَوْ كَانَتِ الشَّيْءُ مِثْلَ مَنْزِلِ عِشَّةِ اللَّهِ  
جَنَاحَ قَبُورٍ مَسْكِي كَافِرٍ مَقْتَلًا قَطْرَةً أَبَدًا يَعْنِي اِذَا لَمْ يَكُنْ لَكَ فِي الدُّنْيَا كَيْفِيَّةٌ  
قد و قیمت ایک پھر کے پڑ کے برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی عطا نہ دیتے۔  
کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ یہ پھر کی مثال آپ نے اس لیے بیان فرمائی کہ ساری دنیا کی قیمت  
اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنی بھی نہیں جتنی پھر کے ایک پڑ کی ہوتی ہے۔ اسی لیے لو کفار اس دنیا  
میں آرام و عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کچھ نہیں۔ آخرت میں حساب  
کا حساب کتاب پیش ہو گا۔ تو سخت سزا میں مبتلا ہوں گے۔

مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اُمّ سلیم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت  
کیا اور تمہیکے طور پر عرض کیا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَكْتُمُ خَيْرٍ مِّنَ الْحَقِّ يَعْنِي اللّٰهَ تَعَالٰی تو حق بات سے  
نہیں شرماتے۔ میں آپ سے مسئلہ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ کیا عورت کو بدخوابی ہو جائے تو اس پر  
غسل واجب ہو تب یا نہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا فَعَسَىٰ اَنْ يَّامُ سُبْحَانَكَ اِذَا رَأَتْ  
الْمَكَاءَ مَاں جب مادہ خارج ہو جائے تو اس پر غسل آتا ہے۔ جس طرح مرد کو احتلام ہوتا ہے  
اسی طرح عورت کو بھی بدخوابی ہوتی ہے۔ الغرض اس حدیث میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ  
حق بات کو ظاہر کرنے سے نہیں شرماتا۔

حیا کی مختلف قسمیں

حیا انسان کی اُس انحراری اور شگفتگی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی شخص قبیح امور سے  
باز آجاتا ہے۔ حیا انسانوں سے بھی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے جب کوئی  
شخص بُرائی کا ارادہ کرتا ہے۔ تو وہ چھپ کر کرتا ہے۔ کیونکہ اُسے ان لوگوں سے حیا آتی ہے کہ اگر  
وہ دیکھ لیں گے تو کیا ہو گا۔ خدا تعالیٰ اگرچہ نظر نہیں آتا۔ مگر جب یہ یقین ہو جائے کہ اُس کی نظر سے  
کوئی فعل پوشیدہ نہیں ہے۔ تو پھر ذرہ بھر بھی خوف خدا رکھنے والا شخص فعل قبیح کے ارتکاب کے  
وقت اللہ تعالیٰ سے حیا کرے گا۔ اگرچہ کوئی دوسرا انسان اس کو نہ دیکھ رہا ہو۔



حیا کی ایک قسم حیا بخودیت ہے۔ ایک عابد و زام اپنی تمام قوی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف کرنے کے باوجود یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا اللہ تعالیٰ نے اس پر جس قدر انعامات کئے ہیں اگر وہ ساری عمر بھی عبادت میں لگا دے یعنی پیدائش کے وقت ہی اللہ تعالیٰ اس کو فرم عطا کرے اور کچھ سے میں گرجاؤں اور ساری عمر اسی ایک کچھ میں گزار دے۔ اور وہیں اس کی موت آجائے۔ تو وہ بارگاہ رب العزت میں عرض کرے گا کہ مولاکریم! میں تیری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ حیا بخودیت اسی چیز کا نام ہے۔

حیا خود اپنے نفس سے بھی ہوتی ہے۔ جب اُسے کوئی شخص دیکھنے والا نہ ہو۔ تو بعض اوقات انسان خود اپنے جی میں شرم محسوس کرنے لگتا ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کبھی دھوکا دے رہا ہوں۔ یہ نفس کی حیا ہے۔

حیا کی ایک قسم حیا کرم ہے۔ خود حضور بنی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کو کھانے پر بلایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد دو لوگ وہیں بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے۔ یہ چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گذری مگر آپ نے حیا کرم کی وجہ سے انہیں زبان مبارک سے کچھ نہ کہا۔ بلکہ اٹھ کر باہر چلے گئے تاکہ یہ لوگ بھی چلے جائیں۔ مگر وہ بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ حضور علیہ السلام پھر تشریف لے آئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں کہ: وَجِبْنِي عَلَيْهِ السَّلَامُ كَيْفَ يَكْفِيهِمْ کہ جب بنی علیہ السلام کے گھر پر کھانا کھانے کے لیے جاتے ہو تو وہاں بیٹھ کر بات چیت میں وقت نہ گزارو۔ اللہ تعالیٰ کا نبی تو حیا کرم کی وجہ سے تمہیں نہیں کہتا۔ مگر تم خود ہی احساس کرو۔ اور کھانا کھا کر واپس چلے جایا کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتا:

ہدایت و گمراہی

فرمایا جب اللہ تعالیٰ اس قسم کی مثالیں بیان فرماتے ہیں تو مومن اور کافر پر ان کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ایماندار لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ معمولی معمولی مثالیں بے معنی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ ان کا بیان کرنا حکمت کے منافی نہیں۔ لہٰذا وہ اس سے بڑا نہیں مناتے وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا جن لوگوں نے کفر کیا فَيَقُولُونَ پس وہ کہتے ہیں مَا ذَا الَّذِي أَدَّبُنَا اللَّهُ بِهَذَا ہم خدا تعالیٰ نے اس مثال کے ساتھ کیا ارادہ کیا ہے۔ وہ لوگ طعن کرتے ہیں۔



اور بطور استنزاء اور تحقیر کے کہتے ہیں کہ ایسی معمولی چیزوں کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا حاصل ہوا۔ اگر مثال ہی بیان کرنا سہی تو کسی اعلیٰ چیز کی بیان کی ہوتی۔ بلکہ کسی اہم چیز کی مثال کی کیا حیثیت ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس مثال کو معمولی چیز نہ سمجھو۔ کیونکہ يُضِلُّ بِهٖ کثیْرًا اللہ تعالیٰ اسی مثال کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ ایسی بات بعض لوگوں کے ذہن میں نہ نہیں بیٹھتی۔ جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ تو وہ حکمت کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کلام کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ لہذا فضول اعتراض پیش کرتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔ فرمایا ایسی مثالیں صرف گمراہ ہی نہیں کرتیں بلکہ يُضِلُّ بِهٖ کثیْرًا اللہ تعالیٰ انہیں مثالوں کے ذریعے ہدایت بھی دیتا ہے۔ جو لوگ مثال کے ذریعے بات کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں اور حقیقت کو پہانتے ہیں۔ لہذا ہدایت پاتے ہو جاتے ہیں۔ فرمایا اہم و مایض يُضِلُّ بِهٖ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ یعنی گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو فاسق ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں۔ کوئی ایمانداروں منصف مزاج اللہ حق کا طالب گمراہ نہیں ہوتا۔

فاسق کا معنی

فاسق کا معنی خروج یا باہر نکلنا ہے۔ عربی میں کہتے ہیں فَسَقَ الرَّطْبَةُ عَنْ قَشْرِهَا اِذَا مَلَأَتْ بِهٖ مِثْلَ سِقِّ النَّوْءِ یا کہتے ہیں فَسَقَ النَّوْءُ مِنْ الشَّجَرَةِ تَحْتَلُّ کَبُورَہٗ سے باہر نکل گئی۔ اسی اصطلاح میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر نکل جاتا ہے۔ شریعت کے عرف میں فاسق دو محضوں میں استعمال ہوتا ہے پہلے معنی میں فاسق اس شخص کو کہتے ہیں۔ جس کے دل میں ایمان موجود ہے۔ مگر وہ اطاعت کی بجائے صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایسا شخص مسلمان ہے۔ اور اس کے متعلق امید ہے کہ اُسے آخرت میں شفاعت نصیب ہو جائے گی۔ اور وہ نجات پا جائے گا۔ کیونکہ ہر حال وہ مسلمان ہے۔ مگر نافرمانی ہے وہ نماز کو فرض سمجھتا ہے مگر پڑھتا نہیں۔ زکوٰۃ کو فرض جان کر ادا نہیں کرتا۔ گروائی کی کو صحیح سمجھتے ہوئے اس کی طرف مال نہیں ہوتا۔ شریعت کی اصطلاح میں فاسق کلام ہے۔ دوسری قسم کا فاسق وہ ہے۔ جو کفر میں مد سے بڑھ جائے۔ سرکش ہو جائے۔ جیسا کہ اعتقادی منافقوں یا سخت کافروں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ان یہودیوں کو فاسق کہا گیا ہے۔ جو بڑے سرکش، ضدی

اور نافرمان ہیں اور کفر میں بڑے پختے ہیں۔ فاسق کے یہ دونوں معنی قرآن پاک میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس مقام پر بطور تشریح یوں کہہ سکتے ہیں کہ فاسق وہ ہیں جو قرآن پاک کی بیانی کردہ مثالوں سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ مقصد یہ کہ جو شخص قرآن کے پروگرام کی غلات مدد زنی کرتا ہے وہ فاسق ہے۔ قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے کہ: **الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿۳﴾** وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ﴿۴﴾“ نیز قرآن پاک کا پروگرام یہ ہے: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي هُوَ اللَّهُ**“ مگر جو شخص اس کے غلات کرے گا۔ وہ فاسقوں کی فہرست میں رکھا جائے گا۔

یہودی و نصاریٰ  
کی عہد شکنی

آگے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی تشریح کرتے ہوئے ان کی تین بڑی خصلتوں کا ذکر کیا ہے پہلی بات یہ ہے کہ **الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ**۔ فاسق وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑتے ہیں اس کو پختہ کرنے کے بعد۔ اگر وہ اشخاص منافق ہیں تو وہ زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ: **أَمْسَا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ** ہم اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں۔ مگر یہ عہد کر پورا نہیں کرتے۔ عملی طور پر ان کا ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے اور نہ آخرت کے دن پر۔ اور اگر فاسقوں سے مراد یہود ہیں۔ تو ان سے تو پہلی کتابوں میں عہد لیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبیوں پر ایمان لائیں گے۔ اور خاص طور پر نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے۔ اس کا ساتھ دیں گے اور اس کی نصرت کریں گے۔ نیز یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو ہدایت نازل فرمائی ہے۔ اُسے چھپائیں گے نہیں۔ بلکہ ظاہر کریں گے۔ مگر ان لوگوں نے اس عہد کو توڑ دیا۔ گویا فاسقوں کی پہلی خصلت یہ بیان فرمائی کہ وہ عہد کرنے کے بعد کھینچتے ہیں۔ عہد شکن لوگوں کا دوسرا گروہ معاند کافر ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا: **سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ**۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اُس عہد کو توڑا۔ جو نازل میں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پرچھا تھا: **أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ** کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا تھا: **بَلٰی** اے مولاکریم! کیوں نہیں بیشک تو ہمارا رب ہے۔ اس عہد کی یاد دہانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف رسول بھیجے۔

کتب میں نازل کیں۔ مگر انہوں نے اس پختہ غمہ کو توڑ دیا۔ لہذا یہ بھی غمہ شکنوں کی صف میں شامل ہوئے  
ایک عام مومن جب لَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ کہتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ  
کی وحدانیت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا عہد کرتا ہے۔ ان کے احکام کو تسلیم کرنے اور  
ان پر کاربند ہونے کا عہد کرتا ہے۔ مگر جب وہ اس کے خلاف چلتا ہے۔ گویا عہد شکنی کرتا ہے۔ ایسا  
شخص بھی غاصق یا منافق کی فہرست میں لکھا جائے گا۔ عہد کی خلاف مندی کرنا منافق کی واضح نشانی ہے۔

قطع رحمی

غاصقوں کی دوسری خصلت یہ بیان فرمائی کہ لَقَطَعُونَ مَا آمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوَصَّلَ  
جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اُسے قطع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرابتوں  
کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ اس کے برخلاف قطع رحمی کے مرتکب ہوتے ہیں جیسے  
کافروں کے متعلق فرمایا کہ وہ قطع رحمی کرتے ہیں۔ اور کسی مومن کے  
بارہ میں نہ تو عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں نہ قرابت داری کو خاطر میں لاتے ہیں۔ بلکہ انہیں  
ہر طرح سے ایذا پہنچاتے ہیں۔ حالانکہ قطع رحمی بہت بڑا جرم ہے۔ حدیث شریف میں اکہ ہے  
کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو شخص جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے۔ میں بھی اس کو  
جوڑوں گا۔ اور جو قطع کرتا ہے۔ میں بھی اس کو کاٹ دوں گا۔

صلہ رحمی

اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ رحم معنی قرابت داری کو اپنے نام رحم سے  
نکالا ہے۔ اور رحم کا معنی بے حد مہربان ہے۔ لہذا ہر انسان کو اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نہایت  
مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔ فرمایا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ  
یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اور قرابت داری کا خیال رکھو۔ صلہ رحمی بہت بڑا عمل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ  
کو بہت پسند ہے۔ اس میں انسان کے تندرہ معقوق آجاتے ہیں۔ جن کی ادائیگی کا اللہ تعالیٰ نے  
حکم دیا ہے۔ فرمایا آتِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ بِرَحْمَةٍ رَحِيمَةٍ۔ یہی صلہ رحمی ہے۔

فلاح فی الدین

منافقین کی تیسری خصلت یہ بیان فرمائی کہ يَفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ دوزخ میں  
فساد پھیلاتے ہیں۔ فساد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اور کافروں کو ایمان سے

متضرر بنتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ اسی لیے تو وہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں۔ کیونکہ اس میں مکھی اور مچھر جیسی حقیر چیزوں کی مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہی وہ پڑ پگینہ اس ہے جس کی بدولت وہ لوگوں کو ایمان سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسی کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اہم بیضاوی فرماتے ہیں کہ کفر، شرک اور شریک کو خراب کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا فساد فی الارض ہے۔ زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت سے ہوتی ہے۔ کفر، شرک اور معاصی کی وجہ سے اس میں جھاڑ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام قسم کی قبیح رسوم بھی فساد فی الارض کے قبیل سے ہی ہیں۔ شرک، بدعت، مانع، گانا، عریانی اور فحاشی یہ سب قبیح رسوم ہیں۔ قبروں پر عرس منانا، قبر پرستی کو رواج دینا یہ بھی انہیں رسوم میں سے ہے۔ اور فساد فی الارض ہے۔ تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ منافق لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی بجائے اُس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ ان کے کسی فعل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اللہ وہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ الغرض عمدہ شکنی، قطع رحمی، اور فساد فی الارض یہ تین بڑی خصلتیں ہیں جو فاسقوں یا منافقوں میں پائی جاتی ہیں اور جن سے اجتناب کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

فاسقوں کی علامات بیان کرنے کے بعد فرمایا اُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ  
یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔ ناکام دنیا بردہونے والے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خصلتوں کی وجہ سے دنیا میں بھی ناکام ہیں۔ کیونکہ فساد فی الارض کی بدولت دنیا میں امن و سکون پیدا نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا رہیں گے اور آخرت میں ہمیشہ کے لیے ناکامی کا مزہ دیکھنا پڑیگا۔ اسی لیے فرمایا خَسِرَالْ دُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْعَبِيْنُ یہ دنیا اور آخرت ہر دو جگہ کی ناکامی ہے۔ اور یہی بہت بڑی ناکامی ہے۔ ابتدائے سورۃ میں متین کے متعلق فرمایا تَعَذُّوْا لَیْسَ عَلٰی هٰدٰی مِّنْ تَرْبِیْمَہٗ وَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ یعنی یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور یہی کامیاب ہیں۔ اس مقام پر فاسقین کے متعلق فرمایا اُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ یہی لوگ ناکام ہیں۔

الہ

البقرة

درس چودھم

(آیت ۲۸ تا ۲۹)

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ  
يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾  
هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَكَانَ الْاَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ  
اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ  
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾

ترجمہ : کس طرح تم کفر کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، حالانکہ تم بے جان  
پس اللہ تعالیٰ نے تم کو زندہ کر دیا۔ پھر وہ تم پر موت طاری کرتا ہے۔ پھر وہ تم کو دوبارہ  
زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹے جاؤ گے ﴿۲۸﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے  
جس نے پیدا کیا ہے۔ تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب۔ پھر وہ متوجہ ہوا آسمان  
کی طرف۔ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۹﴾

اس سے پہلی آیات میں ان لوگوں کا رد فرمایا جو قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے کا  
انکار کرتے تھے۔ کیونکہ اس کلام میں کچھ مکمل جیسی حقیر چیزوں کا بیان ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ  
کی ذات اعلیٰ دارفع ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کچھ یا اس سے  
بھی کم تر چیز کی مثال بیان کرشمے نہیں شرماؤ۔ کیونکہ اس کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں  
ہوتی۔ بعض اوقات ادنیٰ چیزوں میں بھی اہم باتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے ایسی کسی چیز کے بیان سے  
اجتناب کرنا خلاف حکمت ہوتا ہے۔ معترضین کا اس قسم کا اعتراض ان کی نا کھجی کی دلیل  
ہے۔ البتہ ایمان والے خوب سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔  
نا کھجہ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی حقیر چیز کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کو کیا مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ  
نے فرمایا ایسی ہی مثال کے ذریعے وہ بہتوں کو ہدایت سے نواز رہا ہے۔ اور بہتوں کو گمراہ کر دیتا ہے  
مگر گمراہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو منافقان ہوتے ہیں۔

گزشتہ صفحہ پر

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تین خصلتیں بیان فرمائیں۔ کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد و پیمان کو توڑتے ہیں۔ جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ یہ لوگ انہیں توڑتے ہیں۔ اور یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ فرمایا یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ گو یا قرآن کریم کا انکار، معاد کا انکار، راستہ کا انکار یا خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا انکار سب کی صفات کا انکار سب کا مال راہِ انجام ایک ہی ہے۔ ان سب باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک چیز کا انکار بھی اللہ تعالیٰ کے انکار کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ کے  
ساتھ کفر

اس مقام پر اللہ تعالیٰ اپنی بعض نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کو مخاطب فرماتے ہیں۔ کہ کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ یہ انعام پانے کے باوجود تم اللہ تعالیٰ کی ذات کا کیسے انکار کرتے ہو۔ تمہارا انکار محض جہالت، ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ہے ورنہ اس کے حق میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: وَمَنْ يَتَذَعَّعْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرًا لَا بُدَّ لَهَا لِدَيْهِ فَاِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ يَعْنِيْ جَوْشَنُ اللّٰہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے۔ یعنی شرک کرتا ہے۔ اُس کے پاس ایسا کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اس کا حساب تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ یہی بات بیاں پر بیان کی گئی ہے۔ کہ تمہارے پاس کفر کرنے کی کون سی دلیل ہے کیفَ تَكْفُرُونَ تمہارے لیے کفر کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ میں نہ صرف خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے کا بیان ہے۔ بلکہ اس میں ایمان لانے کی دوسری چیزیں بھی شامل ہیں۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کیوں نہیں لاتے اس کے کلام کا کیسے انکار کرتے ہو۔ اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کیوں نہیں مانتے۔ اور معاد پر تمہارا ایمان کیوں نہیں ہے۔ گویا کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن کا کفار انکار کرتے تھے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ کیفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ کا تعلق گزشتہ آیت یَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ کے ساتھ ہے



وہاں پر بھی بعض اعلیٰ درجات کا ذکر فرمایا کہ اُس پر وہ دگار کی عبادت کر رہے تھے پھر  
 کیا۔ تمہارے لیے زمین و آسمان کو پیدا کیا، پھر آسمان سے بھی پانی نازل کر کے زمین کو سیراب کیا اور  
 تمہارے لیے پھل پیدا کیے۔ اس مقام پر موت و حیات اور زمین سے پیدا ہونے والی نعمتوں کا ذکر  
 کر کے ایک دوسٹر انداز سے بیان کر رہا ہے کہ ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے تم اللہ تعالیٰ کے  
 ساتھ کس طرح کفر کرتے ہو۔

بر خلاف اس کے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو مانتا ہے۔ اور اُنہی کی عبادت کرتا ہے۔  
 اس کے سامنے معرفت الہی کی لاکھوں کر دلوں عقلی و نقلی دلیلیں موجود ہیں۔ اُس کے اُس پاس  
 آسمانی کتابیں موجود ہیں، جو اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت انسان کے  
 ذمے فرض ہے۔ حضورِ میرِ اسلام نے فرمایا: **حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يُعْبُدُوْا اللّٰهَ وَلَا**  
**يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا** یعنی اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ الہی کی عبادت کریں اور  
 اس کے ساتھ کسی کو نہ شریک نہ ہٹریں۔

ام الرضیۃ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص سپاڑ کی چوٹی پر زنگی بسر کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُسے  
 عقل و شعور عطا فرمایا اس سے نوازا ہے۔ وہ زمین و آسمان کے نظام کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا  
 ہے۔ اور اس کے باوجود وہ کفر کرتا ہے۔ تو پکڑا جائے گا۔ اُسے معافی نہیں مل سکتی۔ کیونکہ مشاہدات  
 قدرت کو دیکھنے کے باوجود اگر وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لایا تو اس کی بے نیسی ہے۔ گویا عقلی طور پر  
 بھی اللہ تعالیٰ کو پہچانا واجب ہے۔ ایک شخص عملاً نماز نہیں پڑھا یا روزہ نہیں رکھا مگر اللہ تعالیٰ  
 کی رحمت پر ایمان ہے۔ تو اُس کی بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر کفر کرنے کی صورت میں وہ  
 قابلِ گرفت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تمہیں عقل دی، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بخشی۔  
 تمہارے ارد گرد دنیا نیاں پھیل دیں۔ اس کے باوجود تم نے ایمان کی بجائے کفر کا راستہ اختیار کیا۔  
 لہٰذا تمہارا معاملہ ناقابلِ معافی ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ تم ان تمام دلائل کے باوجود کیف تکفروا؟ یا اللہ تم اللہ تعالیٰ

موت الیٰ انظر  
 الہی میں ہے



کے کفر کرتے ہو۔ وَكُنْتُمْ أَمْوَئًا عَالًا تَقْبَعُ بَعْدَ جَانِ تَحْتِی۔ فَاحْبِ كُفْرًا پَس  
 اللہ تعالیٰ نے تم کو زندگی بخشی۔ مطلب یہ کہ تم اپنے باپوں کی پشتوں میں بالکل بے جان چیز تھے۔  
 پھر انہی نے تمہیں آدمیوں کے رموز میں قطرہ آب یا لطف کی شکل میں منتقل کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ  
 نے تمہیں زندگی بخشی اور تمہیں وجود جیسی نعمت عطا کی۔ مگر یا تمہیں جیسی نعمت عطا کی۔ اس میں تبدیل کیا۔ اس  
 کے بعد پھر ایک وقت آیا آئے گا۔ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ پھر وہ تم پر موت طاری کرے گا۔  
 ثُمَّ يُحْيِيكُمْ پھر قیامت کے دن تم کو زندہ کرے گا۔ دیکھو یہ سب تصرف خدا تعالیٰ کے  
 کتبے۔ جبر یہ کہتا ہے۔ موت بھی وہی طاری کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کوئی مستغرق  
 نہیں۔ نہ کوئی کچھ ٹے سکتا ہے۔ نہ کوئی چھین سکتا ہے۔ اسی بات کو سورۃ واقع میں اس طرح بیان  
 فرمایا کہ دیکھو تم کیسے بے بس ہو۔ جب ہمارے کارندے آتے ہیں۔ تو کون ہے جو انہیں روک سکے  
 بڑے بڑے بادشاہ اور بڑے بڑے طاقتور عاجز آجاتے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ تمام چیزوں کا تصرف  
 خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مستغرق فی الامور وہی ہے۔ اور ایک ایماندار کا عقیدہ یہی ہے کہ  
 اللہ تعالیٰ نے ان کو جاندار بنایا۔ وہی موت طاری کرتا ہے۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔

فرمایا موت و حیات کی اس کشمکش کے بعد انسان کو یوشی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ وہ انسانی  
 اعمال کا محاسبہ بھی کریگا ثُمَّ الْيَوْمَ تَرْجَعُونَ پھر اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ  
 کے سامنے پیشی ہوگی اور تم سے پوچھا جائے گا کہ میں نے تم کو وجود کی نعمت دی۔ تمہاری پرورش  
 کی اور تمہاری ضروریات و آسائش کے تمام سامان مہیا کیے۔ تمہارے جسم میں ہڈیت کی مشینیں  
 نصب کی۔ علم حاصل کرنے کے لیے حواس ظاہر و باطن سے نوازا۔ قوت متینہ عطا کی۔ غرور و فخر کے  
 ذرائع بنائے۔ قوت حافظہ دی۔ جوڑ توڑ کرنے کی طاقت بخشی۔ اس کے علاوہ بہت بڑی مہربانی  
 یہ فرمائی کہ راہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا۔ رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ  
 انہیں بشیر اور منذر بنایا اور دوسری جگہ فرمایا وَ نَزَّلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ  
 کے ساتھ کتابیں نازل فرمائیں۔ وہی نازل کی شریعت دے کر بھی لیتے قوم الناس بالقسط  
 تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قائم رہیں۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ یہ شرک تو بہت بڑا  
 ظلم ہے۔ اور کفر سے بڑا اور کون ظلم نہیں۔ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ سب سے

محاسبہ و عمل

بڑے ظالم تو کافر ہیں۔ یہ تمام ہدایت سے کرمجت پر دی کر دی۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ انہیں کوئی  
سمجھانے والا نہیں آیا: لَيْسَ يَكُونُ لِلنَّاسِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

میت دفن کرنے  
کے آداب

مشکوٰۃ میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے: لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرَّبُكُمْ إِلَى  
الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ یعنی جو چیز جنت  
سے قریب کرنے والی اور دوزخ سے بچانے والی ہے وہ سب میں نے تمہیں بتا دی ہے۔  
اب تمہارے پاس انکار کی کیا دلیل ہے۔ موت و حیات اور تصرفات کے بنیادی عقائد بیان  
جو گئے ہیں جن کی قرآن پاک میں تعلیم دی گئی ہے

فرمایا میت کو دفن کرتے وقت یوں کہو بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلَى مِلَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ اور  
اسی طرح قبر پر مٹی ڈالتے وقت یہ آیت پڑھنی چاہیے: مِنْهَا خَلَقْتُمْكُمْ وَفِيهَا  
يُخَوِّدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى مگر لوگ اس کی بجائے زور زور سے  
کلمہ شریف پڑھنے لگتے ہیں۔ کلمہ طیبہ بے شک افضل الذکر ہے۔ مگر اس مقام پر وہی کلمہ کتنا چاہے  
جسکی تعلیم دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ اسی میں اس کو لوٹائیں گے۔  
اور پھر اسی میں سے دوبارہ زندہ کر گئے ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ کا یہی مطلب ہے۔

تمام چیزیں انسان  
کے لیے ہیں

انسان کی موت و حیات کا تذکرہ کرنے کے بعد دیگر انعامات کا اجماعی خاکہ پیش کیا  
هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَنَافِيَ الْأَرْضِ مِنْ جَمِيعِ مَا فِي الْأَرْضِ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ بھی پیدا  
کیا ہے۔ وہ سب تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ غذا، لباس، پانی، ہوا، نباتات، خوشبو،  
آلات، نیک بختی اور کہاں حاصل کرنے کے ذرائع سب انسانی مفاد کے واسطے ہیں۔ بعض چیزیں  
براہ راست انسانی مفاد میں ہیں۔ اور بعض بالواسطہ۔ حتیٰ کہ روزی جائز بھی تمہارے فائدے کے لیے  
ہیں۔ بعض اوقات زہریلے جانوروں کا زہر بھی تریاق کا کام دیتا ہے۔ کسی موسم میں انسان نگیموں سے

تنگ آجاتا ہے۔ مگر یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ یہ غلاظت کے ڈھیر جو بیماری کا باعث بنتے ہیں، انہیں مکیاں ہی چاٹ جاتی ہیں یہ تو انسان پر احسان کرتی ہیں کہ غلاظت کے خاتمے کا سبب بنتی ہیں۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی تخلیق دالی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا کیا۔ اور جمعہ کے روز نماز عصر کے بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ یہ سب چیزیں پہلے پیدا کر دی گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ذریعہ انسانی کی مصلحت فرشتوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انسان کی تخلیق سے کروڑوں سال پہلے فرشتوں کو پیدا کیا۔ ان میں جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام اور ملائکہ اعلیٰ کے درجہ فرشتے ہیں۔ ان میں مقرب فرشتے بھی ہیں ان میں ملائکہ سافل کے فرشتے اور فضائی اور ہوائی فرشتے بھی ہیں۔ یہ سب کے سب انسان کی مصلحت کے لیے ہیں تاکہ انسان درجہ کمال تک پہنچ سکے۔

موت سدان  
عبرت ہے

اللہ تعالیٰ نے موت کو پیدا کیا اور یہ ایک بڑی خطرناک چیز ہے۔ مگر اس میں بھی انسان کے لیے عبرت کا سدان موجود ہے۔ یہ بھی فائدے سے خالی نہیں۔ شیخ سعدیؒ نے اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کی ہے۔ ————— بادشاہ نذیر  
خوش گہیوں میں مصروف تھے۔ بادشاہ کہنے لگا۔ کاش کہ اگر یہ موت نہ ہوئے، چہ خوش بودے، یعنی اگر یہ موت نہ ہوتی۔ تو کیا اچھا ہوتا۔ ہماری بادشاہت ہمیشہ قائم رہتی۔ نہ موت وارد ہوتی اور نہ بادشاہت کا خاتمہ ہوتا۔ وزیر بڑا دانا آدمی تھا کہنے لگا۔ اگر موت نہ ہوئے اس سلطنت تارکے پر سے یعنی اگر موت نہ ہوتی، تو یہ سلطنت تم تک کیسے پہنچتی۔ یہ موت ہی ہے جس کے ذریعے یہ بادشاہت تم تک پہنچے ہے۔ ورنہ یہ تمہارے آباؤ اجداد تک ہی محدود رہتی۔ آگے نہ چلتی۔ مقصد یہ کہ موت جیسی چیز بھی انسان کے لیے مفید ہے۔ کہ اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔

اس مقام پر فقہائے کرام اور محدثین ایک اور مسئلہ بیان کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اشیاء میں اصل چیز اباحت ہے۔ خَلْقُ نَفْسٍ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا یعنی زمین کی تمام چیزیں تمنا سے

لیے پیدا کیں۔ اصلاً تمام چیزیں مباح یعنی جائز ہیں۔ البتہ جس چیز کے متعلق حرمت کی دلیل آئے گی صرف وہی حرام ہوگی۔ باقی سب جائز بھی جائے گی۔ ہر قسم کے جانور اور ہر قسم کے پھل انسان کے لیے مباح ہیں۔ مگر جہاں حکم آگیا کہ خنزیر حرام ہے۔ مردہ حرام ہے۔ یا غلاں قسم کا جانور حرام ہے تو وہ حرمت کے زمرہ میں آگیا۔ باقی سب جائز ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی وضع ہی ایسی رکھی ہے کہ انہیں انسان کے فائدے کے لیے بنایا ہے۔ البتہ جس چیز کو حرام قرار دیا ہے۔ اس میں ضرر کوئی روحانی یا جہانی قباحت ہوگی۔ جس کی وجہ سے اُسے ناجائز قرار دیا گیا ہے وہ سب چیزیں مباح ہیں۔

میاں پر ایک دوسرے سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر اباحت کے اس اصول کو من وعن تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر چیز ہر حالت میں مباح قرار پائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہے ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی ضابطہ مقرر کیا گیا ہے۔ مثلاً ہر چیز کا ہر شخص مالک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قبضہ اور ملک کا قانون مقرر کیا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی حدود میں رہ کر کسی چیز کا قبضہ یا ملک ہوگا کسی صاحبِ بیاد کی موت کے بعد ہر شخص اس کی جائیداد کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس جائیداد پر قبضہ کس کا ہے۔ وراثت کے طور پر اس کا کون حقدار ہے۔ غلبہ کے طور پر کسی کو ملے یا نہیں۔ یا کسی اور قانون کے تحت اس کا کون حقدار ہے یہ سب قانونِ شریعت میں موجود ہیں۔ اور انہیں کے مطابق حقوق کا تعین ہوگا۔ ہر شخص حقدار نہیں ہو سکتا اسی طرح ایک عورت صرف ایک آدمی کے نکاح میں آ سکتی ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ بجز اس کے کہ خاوند کی وفات یا طلاق کی صورت میں وہ عورت کسی دوسرے شخص کے نکاح میں جا سکتی ہے لہذا اباحت کے اس نکتے کو چھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

آسمانوں کی تخلیق

زمین کی تمام اشیاء کی تخلیق کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اے انسان! میں نے تمہارے لیے صرف زمین کی چیزیں ہی پیدا نہیں کیں۔ بلکہ ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَاءِ پھر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان۔ یعنی تہ در تہ سات آسمان پیدا فرمائے۔ اور زمین سے آسمان تک اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنے دہیز آسمان پیدا کئے ہیں۔ یونانی حکایات کے ماہرین آسمانوں کی تعداد نو بتاتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔ سات

آسمانوں کے ساتھ عرش اور کرسی کو شامل کر لیں تو فوج جاتے ہیں۔ کیونکہ عرش الہی ہے۔ اور کرسی الہی ہے۔ وہ آسمانوں سے بھی وسیع تر ہیں اور ذات خداوندی ان تمام چیزوں سے ورادوار ہے۔

سبحانہ کی نخلی عرش پر واقع ہوئی ہے۔ امام شاہ ولی اللہؒ اُسے نخلی عظیم نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس نخلی سے اول ساڑھ ستر رنگین ہوتے ہیں۔ پھر تمام کائناتیں جن سے ہوتی ہیں اس کے نیچے تمام اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تمام مراحل طے کرنے کے بعد وہ نخلی اس پست جاتی ہے۔

فرمایا: "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَظِيمٌ" یعنی وہ ہر چیز کو جانتے والا ہے۔ اُس کے علاوہ ہر چیز کو جسنے والا اور کوئی نہیں۔ لہذا عبادت بھی اُسی کی کرنی چاہیے۔ جو عظیم کل اور قادر مطلق ہے۔ "إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" جو قادر ہے۔ جو خالق اور رب ہے۔ اُس کے حورہ الہی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ فتنے کو جتنے والا وہی ہے نہ عظیم صرف نہ اتنا ہی کہتے نہ جبرائیل علیہ السلام اور دیگر فرشتوں کا۔ نہ نبیوں کا نہ ولیوں کا۔ اس لیے معبود برحق بھی صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پہچان کی یہ صفات جس طرح قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ اسی طرح توراۃ اور انجیل میں بیان ہوئی ہیں۔ مگر لوگوں نے دس کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ نافع اور ضار بھی وہی ذات ہے۔ خدا تعالیٰ کے سوا غائبانہ طور پر نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔ اور نہ نقصان۔ نہ کوئی فریاد سن سکتا ہے۔ اور نہ کوئی جرمی بنا سکتا ہے۔ نہ کسی کو تفصیل سے علم ہے۔ کہ کسی کو کیا تکلیف یا پریشانی ہے۔ کیونکہ عظیم کل صرف ذات خداوندی ہے۔ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

عبادت الہی  
دائم ہے

"كَيْفَ تَكْفُرُونَ" سے لے کر "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَظِيمٌ" تک دو آیات کا تعلق "يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا" کے ساتھ ہے۔ یعنی اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو۔ کہ یہ تمہارے لیے لازمی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں وجود کی نعمت بخشی، زندہ کی دین، پھر موت کا طاری کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ پھر اُس نے تمہیں زمین کی تمام نعمتیں مہیا کیں۔ دوسری جگہ فرمایا: کہ زمین کی تمام ہنریاں اور پھل پیدا کئے۔ نے

انسان متلے لکھو ولا ذکا مکتھو یہ سب چیزیں تمہارے اور تمہارے ہوشیوں کے فائدے کے لیے ہیں۔ یہ ہوشی بھی تمہاری ہی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ ان پر سواری کرتے ہو۔ ان سے کھیتی باڑی میں مدد دیتے ہو۔ اور پھر ان کا گوشت بھی کھاتے ہو۔ یہ سب چیزیں تمہاری خاطر پیدا کی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے: خَلَقَ الْكَثِيفَ لَكُمْ وَخَلَقْتُمْ لِلْآخِرَةِ لے انسان! یہ مادی دنیا ترے لیے پیدا کی ہے۔ اور تو آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم اس کی معرفت حاصل کرو۔ اور اُسی کی عبادت کرو۔ وَمَخْلَقَتُ الْجَزَدَ وَالْإِنْسَانَ الَّذِي يُعْبُدُ ذُنَّ قُرْآنِ پاك شاہ ہے کہ انسانوں اور جنوں کی تخلیق محض عبادت الہی کے لیے ہوئی۔

قرآن پاک میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کا مادہ پیدا کیا۔ آسمان و خان درمحل کی شکل میں تھا۔ پھر اس کو برابر کر دیا۔ زمین کا پھیلاؤ اس کے بعد عمل میں آیا۔ وَارْتَمَى بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا زمین کا مادہ کثیف ہے۔ اہم شاہ ولی اللہ تعفیات الیہ میں فرماتے ہیں کہ جس طرح زمین مختلف عناصر کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح آسمان بھی کئی عناصر پر مشتمل ہے مگر آسمان کے عناصر زمین کی نسبت لطیف ہیں۔ اسی لیے وہاں شفافیت نظر آ رہی ہے۔ اور کوئی چیز جس قدر لطیف ہوگی، اسی قدر طاقتور ہوگی۔ دیکھئے روح لطیف چیز ہے۔ اس لیے اس میں قوت بھی زیادہ ہے۔ اور جتنی کوئی چیز کثیف ہوتی ہے۔ اتنی ہی کمزور اور ضعیف ہوتی ہے۔ الْغَرَضُ فَرَايَا وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ہر جبر کا جاننے والا خدا تعالیٰ ہے لہذا عبادت بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔



الْبَقَرَةُ

البقرة

درس پانزدہم

(آیت ۲۰)

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَیَنۡحُكُ السَّیۡۤیۡۡمَ بِعَمۡدٍ رَّۤفَعَدۡسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: اور اس وقت کہ خیال میں لاؤ جب تیرے رب نے فرشتوں سے

فرمایا: تحقیق میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کیا

کیا زمین میں ایسوں کو بنائے گا جو اس میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے اور

ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ تیری تعریف کے ساتھ اور تیری تنزیہ کرتے

ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ﴿۲۰﴾

اس سے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے چار بنیادی مسائل یعنی توحید، رسالت، ایمان بالقرآن اور معاد (قیامت) کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد قرآن و رسالت میں شک کرنے والے لوگوں کا رد فرمایا۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے اُن بے شمار انعامات کا بھی تذکرہ فرمایا جو اُس نے بنی نوع انسان پر کئے۔ ان میں خصوصاً مادی انعامات کا بیان تھا جس میں انسان کا اپنا وجود، زمین و آسمان کی تخلیق، زمین میں پیدا ہونے والی تمام چیزیں شامل ہیں۔ بالخصوص زمین سے نکلنے والے پانی کا ذکر تھا جس سے انسان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی سے نباتت پیدا ہوتے ہیں جو انسان کی روزی کا ذریعہ ہے۔

مادی انعامات کے تذکرہ کے بعد اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اُن روحانی اور نفسانی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اس نے انسان کو عطا فرمائیں۔ چنانچہ اس مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت ارضی کو بیان فرمایا گیا۔ تخلیق آدم ایک بنیادی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت آدم علیہ السلام کو عطا کی اور پھر یہ خلافت بنی نوع انسان میں ودیعت کر کے خلافت ارضی کے مسئلہ کو واضح کر دیا۔ مگر اس رکوع کا موضوع خلافت ارضی ہے۔



قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور احادیث سے یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی کے بعد حشر و نشر کی منازل طے کر کے جنت میں پہنچیں گے۔ ان میں سے ہر شخص بادشاہ ہوگا۔ اس دنیا میں تو بادشاہی کروڑوں میں سے ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ مگر جنت کے ہر باشندے کا اعزاز دنیا کے بادشاہ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ ہر جنتی کو آرام و راحت کے لیے الے الے سامان میسر ہوں گے۔ جو دنیا کے کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں جنت میں ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی حاصل ہو جائے۔

تخلیق الہی سے  
قبل کے ادوار

اس رکوع میں تخلیق آدم کا ذکر ہے، مگر پہلے کے ادوار کو ہم نہیں جانتے کسی کو خواب میں بھی معلوم نہیں ہوا۔ کہ آدم علیہ السلام سے پہلے کتنے دور گزر چکے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب تفسیرات النبی میں بیان کیا ہے۔ اور شاہ اسماعیل شہید

نے بھی اپنی کتاب "معانی" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ کسی حکیم انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف آدم علیہ السلام کے دور ہی کو ابتداء سے انتہا تک سمجھ لے۔ چہ جائیکہ کوئی شخص اس دور سے پہلے کے ادوار کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ حضرت مجتہد دالغ ثانیؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے بعد امجد خود شاہ ولی اللہؒ اس امت کے آخری دور کے حکماء میں سے ہیں۔ البتہ ان پہلے بڑے بڑے حکماء گزشتہ ہیں جنہوں نے قرآن پاک کی تفاسیر اور تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں امام ابن کثیرؒ بڑے پائے کے محدث، مفسر اور تاریخ دان ہوئے ہیں۔ آپ امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد تھے آپ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ آپ کی تفسیر کی مشہور کتاب ابن کثیرؒ ہے آپ نے بخاری شریف کی شرح اور اصول حدیث پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی تاریخ کی کتب البدایہ والنہایہ نہایت مستند کتاب ہے۔ جو چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے ابتداء سے لے کر اپنے دور تک تمام زمانوں کی تاریخ لکھی ہے۔ یہ کتاب آپ نے روایت کے اعتبار سے ترتیب دی ہے۔ صحیح اور غلط روایت کی پڑتال کی ہے۔ اگرچہ ابن خلدونؒ اور ابن جریرؒ جیسے بڑے مؤرخوں نے تاریخ کی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں اور ہزاروں تاریخ کی کتب موجود ہیں۔ مگر ان سے مستند ترین کتاب امام ابن کثیرؒ کی ہے۔

اس کتاب کی پہلی جلد میں امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے

البدایہ والنہایہ

اس زمین پر کمی دور گزر چکے تھے۔ مثلاً ایک قوم یا افراد کو جن کئے تھے، اس کے بعد جن کا دور گزرا۔ اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل اس دنیا میں جنات کا دور دورہ تھا۔ انہوں نے زمین میں فساد برپا کیے۔ جس طرح آج کل کی دنیا میں قتل و غارت گری ایک عام معمول ہے اس طرح اُس دور کے جنات میں بھی جنگ و جدل عام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جنات کی سرکوبی کے لیے فرشتوں کو بھیجا۔ چنانچہ سوں نے جنات کو مار مار کر پاڑوں اور جزیروں میں بھگا دیا اور اس زمین کو صاف کیا۔ اس واقعہ کے دو ہزار سال بعد آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔

جنات کا ذکر تو قرآن پاک میں بیشتر مقامات پر آیا ہے۔ مابہم جن اور جن کے ادوار کا علم تاریخی روایات سے ہوتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ موجودہ دور سے پہلے کتنے دور گزر چکے ہیں۔ حکماء نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اپنی کتابوں میں ان ادوار کا ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فرشتوں کا دور تخلیق

اللہ تعالیٰ نے انسانوں، فرشتوں، جنات اور شیاطین کو مختلف مادوں سے پیدا فرمایا۔ پھر ان مادوں کے مانعہ بھی مختلف ہیں۔ فرشتے ایک خاص ذریعہ سے پیدا کئے گئے ہیں۔ پھر ان فرشتوں کے مختلف درجات ہیں۔ امام شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی فرماتے ہیں کہ فرشتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ ملا اعلیٰ کا ہے۔ یہ عالمین عرش فرشتے ہیں۔ درجہ فہر پر حَافِظِ حَوْلِ الْعَرْشِ والے فرشتے ہیں۔ یہ سب خلیفۃ القہس کے فرشتے ہیں۔ پھر آسمانوں کے فرشتے پھر فضائی فرشتے، اس کے بعد ہوائی فرشتے اور ارضی فرشتے ہیں جو زمین پر موجود ہوتے ہیں۔ (یہ مسائل کے فرشتے ہیں)

حجۃ اللہ ابانغہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول درجے کے فرشتوں کا مادہ تخلیق اُس آگ کی مانند ہے جو دوران سفر طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر ہوئی۔ آپ اپنی زوجہ کے ہمراہ باہر تھے۔ بھیڑ بکریاں ساتھ تھیں۔ رات کا اندھیرا تھا۔ بیوی حاملہ تھی۔ اُن کو در ذرہ شروع ہو گیا موسیٰ علیہ السلام کو دور سے آگ نظر آئی۔ آپ اُس طرف گئے۔ تو وہ آگ ایک درخت سے نکل رہی

محق۔ جو درخت کے پتوں کو جلانے کی بجائے انہیں سرسبز و شاداب کر رہی تھی۔ آگ جس قدر بھڑکنی تھی وہ فتنہ کی شاطروں اور پتوں میں شادابی آتی تھی۔ یہ واقعہ کس قدر قرآن پاک میں موجود ہے۔ بعض تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگ نہیں تھی بلکہ حجاب نوری یا ناری تھا۔ الغرض! فرشتوں کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے مادے سے کی۔ پھر اس میں مقدس روحیں ڈالیں۔ جس طرح انسانوں اور جنوں میں روحیں موجود ہیں۔ اسی طرح فرشتوں میں بھی روحیں ہیں۔

جنات دریاہیں جنات کے مادہ تخلیق کے متعلق قرآن پاک میں موجود ہے: وَالْجَانَّ تَخْلَقْتُهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارٍ یعنی جنات کا مادہ تخلیق آگ اور ہولہ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شیاطین کا مادہ تخلیق نہایت گندا اور غلیظ ہوتا ہے۔ بالکل سٹنڈ اس کی مانند کہ جب وہ زیادہ مقدار میں ہوتا ہے۔ تو اس سے بخار اور بڑا ٹھنسی ہے۔ اگر گویا جنات اور شیاطین کا مادہ آگ اور ہولہ ہے۔ اس میں گیس برقی ہے۔ اور قبض کا مادہ بھی ہوتا ہے۔

انسان کا مادہ تخلیق انسان کا مادہ تخلیق خاک ہے۔ دنیا میں جتنے بھی خارجی عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ سب آدم کے وجود میں موجود ہیں۔ تخلیق انسانی کے متعلق قرآن پاک میں آتھ ہے خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ انسانی کو کھڑکنے والی مٹی سے پیدا کیا۔ دو سکر مقامات پر تراب اور طین کا لفظ بھی آتا ہے۔ الغرض۔ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ اور یہ تخلیق باقی تخلیقات کی نسبت پیچیدہ ہے۔ اس میں تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔

اس مقام پر تخلیق انسانی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً یعنی اس بات پر غور کرو کہ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں کے سامنے فرمایا کہ تحقیق میں میں میں خلیفہ بنانے والا ہوں گویا آدم کی تخلیق اس واسطے ہوئی کہ اُسے دنیا میں خلیفہ مقرر کیا جائے۔ لہذا آدم کی تخلیق مستقل تخلیق نہیں بلکہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہاں خلافت کا ایک اہم ترین مسکہ بھی سمجھا دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا: يٰۤاٰدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْاَرْضِ یعنی اے داؤد! ہم نے تجھ کو دنیا میں خلیفہ بنایا ہے۔

قرآن پاک میں خلیفہ و درمعال میں آتا ہے۔ پہلا معنی وہی ہے جو آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ میں آپ کو اپنا خلیفہ یعنی نائب بنانے والا ہوں۔ خَلَفْتُ يَخْلُفُ و دوسرے کے پیچھے آنے والے یعنی نیابت کرنے والے کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں یہ بھی آتا ہے "هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنْ خَلْفَتِكَ فِي الْأَرْضِ" یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و و ذات ہے۔ جس نے تمہیں ایک دوسرے کا نائب بنایا۔ جس طرح بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوتا ہے۔

خلیفہ کا دوسرا معنی جو اس مقام پر واضح ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ یعنی نیابت انجام دینے والا پیدا کیا۔ انسان کے علاوہ باقی بے شمار مخلوقات بھی اسی زمین پر پیدا کی گئی ہیں۔ مگر خلافت کا حق اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت انسان کو دیا ہے۔ اور اس سے بھی مراد یہ ہے کہ زمین اور ساری کائنات کی اصل بادشاہت تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔

آدم علیہ السلام کو صرف نیابت تفویض ہوئی ہے۔ گویا انسان دنیا میں خلافت اپنی مرضی سے انجام نہیں دے گا۔ بلکہ حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوگا۔ ————— اور انسان اس حکم کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ سورۃ فوج میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ سے جس خلافت کا وعدہ فرمایا، اور جس کو پورا فرمایا وہی خلافت ہے۔ رَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفْنَهُمْ فِي الْأَرْضِ

منہ خداوت

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا مقصد ہر فرد کو نظم و نظام میں رکھنا ہے۔ دین میں طہارت اور پاکیزگی کی کوئی حیثیت نہیں۔ انسان تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے والا ادارہ ہے۔ اس کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ کہ جس قسم کے احکام چاہے نافذ کرے بلکہ اُسے احکام اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل کرنا ہوں گے۔

مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ خلیفہ منتخب ہونا چاہیئے۔ صرف ایک خارجی فرقہ ایسا ہے۔ جو کہتا ہے کہ حکومت اللہ ہی کی ہے۔ کوئی اس کا خلیفہ نہیں ہے۔ یہ انڈیکسٹ روگ ہیں۔ جو خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ہی بطور خلیفہ کے کی ہے۔ اس معاملہ میں شیعہ مذہب بھی باطل ہے۔ کہ اس کے پیروکار خلیفہ یا حاکم دایم کو محسوم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ مانتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ خلیفہ کو

منتخب کرنے والے عام لوگ ہیں۔ اور وہی اسے معزول بھی کر سکتے ہیں۔

اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کا نظریہ بالکل واضح ہے کہ خلیفہ کا انتخاب واجب ہے اس کو مخصوص اور مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ جماعت المسلمین پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے بہتر شخص کو اس منصب پر فائز کر لیں۔ خلیفہ کے بغیر نظام ارضی کا چلانا درست نہیں ہے صحابہ کرامؓ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی وفات پر مسئلہ خلافت آپ کے دفن سے پہلے طے کر لیا گیا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اگر مسئلہ خلافت طے نہ کیا جاتا تو امت کے اختلافات کا ختم ہونا ممکن نہ تھا۔ خود حضور علیہ السلام کے دفن کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہوا۔ کسی کی رائے یہ تھی کہ آپ کا جسد اطہر بیت المقدس لے جایا جائے۔ کئی مکر مصلحت لے جانے کے حق میں تھا۔ تو اس کا فیصلہ بھی حضور علیہ السلام کے ہاشمین حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس معاملہ میں جھگڑا نہ کرو۔ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ جس جگہ پر آپ کا وصال مبارک ہوا۔ اُسی جگہ پر آپ کو دفن کیا جائے گا۔ اس طرح یہ اہم معاملہ طے ہو گیا۔ تاہم یہ واضح ہے کہ قرآن پاک یا حضور نبی کریم علیہ السلام نے کسی کا نام لے کر خلافت کا فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کام جماعت المسلمین پر چھوڑا کہ جس کو مناسب سمجھیں خلیفہ مقرر کر لیں۔ البتہ نبی علیہ السلام نے اشارہ تا یہ بات سمجھا دی **يَا أَيُّهَا النَّاسُ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي بَارَأَ الْإِنسَانَ مِنْ ذُنُوبِهِ** یعنی میرے بعد اللہ تعالیٰ بھی انکار کرے گا اور مومن بھی انکار کریں گے کہ خلیفہ ابو بکرؓ کے سوا کوئی نہیں ہونا چاہیئے۔

انتخاب خلیفہ کا ایک طریقہ تو یہ ہو گیا کہ عاتقہ المسلمین جس کو چاہیں اپنے میں سے خلیفہ منتخب کر لیں جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے انتخاب ہوا۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع بھی ہیں۔ جو امت میں ملے ہیں مثلاً حضرت ابو بکرؓ نے اپنے آخری ایام میں حضرت عمرؓ کا انتخاب بطور خلیفہ خود کر دیا تھا۔ آپ نے ایک خط لکھ دیا تھا کہ لوگوں کے سامنے پڑھ دینا۔ یہ گویا خلافت کا پروانہ تھا۔ حضرت عمرؓ

۱۔ شامی ترمذی ص ۶۶۰ ۲۔ شامی مع ترمذی ص ۶۶۰ ۳۔ مطبع نور محمد کراچی

۴۔ مسلم ص ۲۴۲ ۵۔ البدایہ والنہایہ ص ۱۸۰

امت میں بہترین آدمی تھے۔ ان کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے چھ آدمیوں کی شوریٰ قائم کی اور فرمایا کہ میرے بعد خلافت کا فیصلہ یہ لوگ کریں گے۔ یہ چھ آدمی وہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہونے کے وقت ان سے بڑے راضی تھے۔ چنانچہ ان حضرات نے حضرت عثمان غنیؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔

خلافت پر فائز ہونے کی ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص خود بخود علیہ پا کر حکومت حاصل کرے۔ کہتے ہیں کہ ایسا شخص بھی قابل اطاعت ہے۔ ہاں اگر وہ شریعت کے احکام جاری کرنے میں کوتاہی کرے۔ تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اس کے احکام نافذ کرنے کے لیے خلیفہ بنایا۔ اور پھر یہ خلافت آپ کی نسل میں باقی رکھی کہ خلافت کا حق بنی نوع انسان کو حاصل ہے۔ یہ حق کسی اور مخلوق کو نہیں پہنچتا۔  
الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ فرمایا تو "قَالَ اَتَجْعَلُ فِيهَا مَخْلُوقًا مُّفْسِدًا فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ"۔ یعنی فرشتوں نے کہا اے مولا کریم تو دنیا میں ایسی ہستی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہے جو زمین میں فساد کریں گے۔ اور خون بہائیں گے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا یہ جواب کئی وجوہات کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ اولیٰ یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے یہ بات انہیں الہام کی ہو جس کی بنا پر انہوں نے یہ رائے دی۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں نے جنات کے حالات پر قیاس کیا۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ جنات نے زمین پر فتنہ و فساد برپا کیا۔ انہوں نے گمان کیا کہ آدم کی اولاد بھی ایسا ہی کرے گی۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فرشتوں نے خلیفہ کے لفظ سے یہ قیاس کیا کہ خلیفہ جب زمین پر حکومت کی باگ ڈور سنبھالے گا۔ تو وہاں پر لانا فتنہ و فساد اور خونریزی بھی ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ کو یہ جواب دیا۔ تاہم زیادہ تر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتوں کا یہ گمان جنات کے حالات کی بنا پر تھا۔

اس گمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ فرشتوں نے بارگاہ رب العزت میں یہ بھی عرض کیا وَنَحْنُ

نَسِيتُ بِحَمْدِكَ مَوْلَانِيْم : اس فتنہ و فساد برپا کرنے والی مخلوق کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ۔ وَنَقَدْتُ لَكَ اَدَّتِيْ پکیزگی بھی بیان کرتے ہیں۔ لہذا ہم اس کام کے لیے کافی ہیں۔

تحمید کا معنی یہ کہ خوبی کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اور تنزیہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقائص و عیوب سے پاک ہے۔ وہ ہر قسم کی کمزوریوں اور نقائص والی چیزوں سے مبرا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ تمام شریحوں سے پاک ہے۔

فرشتوں کا یہ جواب سن کر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قَالَ اِلٰی اٰهْلِكُمْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے۔ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے آدم میں کس قدر کمال اور شرف و ولایت کیا ہے۔



الْبَقَرَةِ

البقرة

درس شانزدهم

(آیت ۲۱ تا ۲۴)

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَكِ  
فَقَالَ أَسْمُوْنِي بِأَسْمَاءٍ هَؤُلَاءَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢١﴾  
قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ  
الْحَكِيمُ ﴿٢٢﴾ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَاءِهِمْ فَلَمَّا  
أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَاءِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ  
غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ  
تَكْتُمُونَ ﴿٢٣﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سب نام سکھائیے۔ پھر پیش کیا ان  
کو فرشتوں پر۔ پس کہا مجھے ان چیزوں کے نام یاد اگر تم سچے ہو ﴿۲۱﴾ انہوں نے  
کہا پاک ہے تیری ذات، نہیں ہے ہمارے پاس علم مگر وہ جو تو نے ہم کو سکھایا ہے۔  
بیشک تو ہی علم وال اور حکمت والا ہے ﴿۲۲﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم!  
بتلائیے ان کو ان چیزوں کے نام پس جب اُس نے ان کو ان چیزوں کے نام  
بتلا دیے تو فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمینوں  
کی پوشیدہ چیزوں کو۔ اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور جس کو  
تم چھپاتے ہو۔ ﴿۲۳﴾

اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع ان کو مددیت اختیار کرنے اور اپنے خالق کی عبادت کرنے  
کا حکم دیا ہے۔ اور اس کی پہچان کے سلسلے میں اُس کی صفات و کمالات کا ذکر ہوا۔ اللہ تعالیٰ  
نے ان انعامات کا ذکر فرمایا جو اُس نے نسل انسانی پر کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام  
کی تخلیق کا ذکر کیا "وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَكِ كَرِّمِي جَارِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً"۔  
اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے سامنے تذکرہ کیا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تو فرشتوں

نے جواب میں کہا: اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا؟ کیا تو زمین میں ایسی ہستی کو بنائے گا جو فساد کریگی اور خون بہائے گی۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں۔ تیری حمد کے ساتھ۔ اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "یعنی بیشک میں جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔"

خلافت کے متعلق بھی پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خلافت نیابت کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد کو بطور خلیفہ بنا دیا ہے۔ تاکہ وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی نیابت کے فرائض انجام دے سکیں، مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر شرعی قانون انسان کے ذریعے نافذ فرمایا ہے۔ اور انکو اپنی احکام یعنی وہ احکام جو انسانوں سے متعلق نہیں ہیں وہ قدرت کے مقرر کردہ دوسرے کارندے انجام دیتے ہیں۔

تخلیق آدم پر فرشتوں کا گمان کرنا کہ یہ زمین پر فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ اس کا بیان بھی ہو چکا۔ فرشتوں نے خیال کیا کہ خلیفہ کی ضرورت ہی ایسی جگہ پڑتی ہے۔ جہاں قتل و غارت اور خونریزی ہوگی۔ لہذا انہوں نے ایسا گمان کیا۔ یا پھر یہ وجہ تھی کہ انہوں نے انسانوں کو جنوں پر قیاس کیا۔ جو اس نسل سے پہلے اس زمین پر فتنہ و فساد برپا کر چکے تھے۔

آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان سوال و جواب ہونے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کی حکمت کے اظہار کے لیے فرمایا: وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا "اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سب نام سکھا دیے۔ ان ناموں سے کیا مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے کون سے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے۔ اس سلسلے میں مفسرین کرام کے کئی اقوال ہیں۔ تفسیر السعوی اور مذکور عربی زبان کی چار چار جلدوں کی مختصر تفسیریں ہیں۔ ان کے مؤلفین حنفی اہم تھے۔ وہ اور بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ: عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ سے مراد تمام انواع و اجناس کے نام ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے سکھائے۔ اس سے مراد ہر ہر فرد کا نام سکھانا نہیں۔ کیونکہ ہر ہر فرد اور جہز کا تعلق غیب سے ہے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا۔ انواع و اجناس

آدم علیہ السلام کو  
کئی چیزوں کے  
نام سکھائے گئے

کا مطلب یہ ہے کہ جیسے انسان ایک نوعی نام ہے۔ اس طرح اجناس میں سے جو ان ایک جنس ہے۔ اور پھر آگے اس کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً گھوڑے، بھینس، گائے بھیڑ بکریاں، کیڑے مکوڑے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے۔

بعض مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ عَلَّمَ اَدَمَ الرَّسْمَ اَدَمَ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی قیامت تک پیدا ہونے والی اولاد کے نام بتلا دیے۔ برخلاف اس کے شیخ ابن عربی فرماتے ہیں کہ اسما سے مراد اللہ تعالیٰ کے اسما الحسنی ہیں۔ نہ کہ بعض دوسری چیزوں کے نام بعض مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ اسما سے مراد جزایات ہیں۔ مگر تمام کی تمام اور ہر قسم کی جزایات نہیں۔ بلکہ صرف وہ جزایات مراد ہیں جن کی ضرورت تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ صرف انسانی ضروریات کی تمام چیزوں کے نام بتلا دیے۔ جو چیزیں انسانی ضرورت سے باہر ہیں۔ ان کے بتانے کا نہ کوئی فائدہ تھا۔ اور نہ ہی وہ بتائیں۔ قرآن پاک میں اس کی مثال سورۃ نمل میں آتی ہے کہ عَلَّمَ بَابُکُمْ وَابْنِیَّتُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ ہر چیز دی گئی تھی۔ تو بیاں پر ہر چیز سے مراد اس کی سلطنت کی ضروریات ہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس زمانے میں ملکِ سبا کے پاس فیثیم طیارے اور راکٹ بھی موجود تھے۔ بلکہ ضرورت کی تمام اشیاء سے متبرک تھیں۔ تو بیاں پر بھی الرَّسْمَ اَدَمَ اَدَمَ سے مراد انہی چیزوں کے نام ہیں جو انسانی ضروریات میں شامل ہیں۔ اسی طرح سورۃ نمل میں شہد کی مکھیر کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ثُمَّ کُلِّیْ مِنْ کُلِّ الشَّجَرِ پھر تمام پھلوں سے کھاؤ اور شہد پیدا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں ایک پاکیزہ چیز رکھ دی ہے۔ اور اس کے بریٹ میں ایک لطیف قسم کا مادہ پیدا کر دیا ہے۔ جس سے شہد بنتا ہے۔ تو بیاں پر تمام قسم کے پھل کھانے سے مراد یہ نہیں ہے کہ دنیا جہاں کا ہر اچھا بُرا کھانا کھلا پھیل کھائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کی ضرورت اور رسائی کے مطابق جتنے پھل میں مکھی اُن پر چمکتی ہے۔ اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ شہد جیسی مفید چیز پیدا کرتا ہے۔ باوام اور

۱۔ ابن کثیر ص ۲۱۱، تفسیر طبری ص ۲۱۱، ۲

۳۔ تفسیر ابن کثیر ص ۲۱۱

۴۔ معالم التنزیل ص ۲۱۱



موجودہ امتحان

آدم علیہ السلام کو تمام ضروری اشیاء کے نام کھلانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آزمایا۔ چنانچہ وہ تمام چیزیں فرشتوں کے سامنے پیش کر دیں ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اور فرشتوں کو حکم دیا يٰۤاٰنٰجِیُّوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ مجھے ان تمام چیزوں کے نام بتاؤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ اگر تم سچے ہو۔ یعنی اے فرشتو! تمہارا دعوے یہ ہے کہ ان فی مخلوق کے یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ تم میری تسبیح و تہلیل بیان کرنے کے لیے کافی ہو۔ اور یہ مخلوق تو دنیا میں خوریزی کرے گی۔ مگر تم نہیں جانتے کہ انسان کون سے کلمات کا محل ہوگا۔ بھلا ان کے علم و فہم کا کمال سب سے اعلیٰ ہے۔ جو اے دیا گیا ہے۔ اور غیب کے لیے ان چیزوں کی مابیت اور حقیقت کا جانا بھی ضروری ہے۔ جن پر اس نے احکام کا نفاذ کرنا ہے۔ مثلاً اگر غیب کو شراب کی خاصیت کا ہی علم نہ ہو کہ یہ کس طرح انسانی عقل کو مادت کرتی ہے۔ اور یہ کن نقصانات کی وجہ سے ام الحجاب ٹھکراتی ہے۔ تو غیب کو شراب کے رسیا کو سزا کیسے دے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تمام ضروری چیزوں کے نام ان کی حقیقت اللہ مابیت سے آدم علیہ السلام کو اکا گاہ کر دیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت کا پورا پورا حق ادا کر سکے۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ نَعْمَ لَکَ اے مولا کریم! تیری ذات پاک ہے لَا عَلٰیہُمْ لَنَا اِلَآ مَا عَلَمْتَنَا ہمیں اعتراف ہے کہ ہمیں ان چیزوں کے اسماء ان کی خاصیت اور مابیت کا علم نہیں ہے۔ ہم اس معاملہ میں عاجز ہیں۔ ہمارا علم تو اسی قدر ہے جس قدر تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتا دیا تھا کہ آدم میں ہمیت اور حکیت دونوں خواص ہوں گے۔ مگر فرشتوں کی نگاہ صرف ہمیت تک ہی پہنچی۔ آدم کی حکیت تک نہ گئی۔ چنانچہ اس کمال کو واضح کرنے کے لیے علمی صلاحیت پیش کی۔ تب فرشتوں نے عاجزی کا اظہار کیا۔ کہ ہمارے پاس یہ کمال نہیں ہے۔

ہیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے عطا کیا۔ ہاں جس ہستی کے پاس علم و فہم کا یہ خزانہ ہو گا۔ خلافت کے لائق وہی ہوگی۔ اور وہی ہستی قانون خداوندی کو نافذ کر سکے گی۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک علم فرشتوں کو عطا ہی نہیں کیا تو ان کے امتحان کا کیا مطلب؟ اگر آدم علیہ السلام کی طرح فرشتوں کو بھی وہ علم سکھلادیا جاتا تو وہ بھی جواب دے دیتے۔ اس کے جواب میں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو اس کی تعلیم فرشتوں کی موجودگی میں ہی دی گئی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو ان چیزوں کی ضرورت تھی۔ لہذا انہوں نے ان کے نام ذہن میں محفوظ کر لیے۔ مگر فرشتوں کو چونکہ ایسی چیزوں کی ضرورت ہی نہ تھی لہذا انہوں نے یہ نام ذہن نشین نہ کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی استاد پڑھنی کلاس کے سامنے پچھڑے سبق کی پوری پوری وضاحت کر دے۔ مگر بتا دے کہ امتحان کے وقت بعض طالب علم ٹھیک ٹھیک جواب دیتے ہیں۔ مگر بعض کو کچھ یاد نہیں ہوتا۔ حالانکہ استاد نے سب کو بیک وقت ایک ہی پتھر دیا تھا۔ یہی حال آدم علیہ السلام اور فرشتوں کا ہوا۔ آدم علیہ السلام نے حسب حال بھولنے کی بناء پر ان چیزوں کے نام یاد کر لیے اور بوقت امتحان بتا دیے۔ مگر فرشتے اس سبق کو ضبط نہ کر سکے لہذا انہوں نے امتحان کے وقت عاجزی کا اظہار کر دیا۔

انفرض! جب فرشتے اس امتحان میں ناکام ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے قَالَ يٰٰآدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاسْمٰیْہُمْ فرمایا اے آدم! ان کو ان چیزوں کے نام بتا دے۔ چنانچہ قُلَّمَا اَنْبَاہُمْ بِاسْمٰیْہُمْ جب آدم علیہ السلام نے ان کو ان چیزوں کے نام بتا دیے۔ کہ یہ بٹریا ہے۔ اس میں سالن پکایا جاتا ہے۔ یہ تو اسے اس پر مدلی پکائی جاتی ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ یہ فلاں چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس قدر امتحانی سوال کیے۔ آدم علیہ السلام نے فر فر جواب دے دیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ یٰٰمَنْ نَّعْلَمُ سِرِّہُمْ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ ان کے غیب کے کلمات وہ تو ان میں کہ میں آسمان و زمین کی پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا ہوں۔

آدم علیہ السلام  
کی کامیابی



یہاں آسمان و زمین کے غیوب کا تعلق مخلوق کے اعتبار سے ہے۔ نہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے  
 بھی کوئی چیز غائب ہے۔ اس کے لیے تو کوئی چیز بھی پس پردہ نہیں۔ البتہ مخلوق کے لیے  
 بعض چیزیں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور بعض پوشیدہ۔ دوسری جگہ ہے ”وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ  
 مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ“ تیرے رب کے تو ایک ذرہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ اس پر تو ہر چیز عیاں ہے۔  
 اللہ تعالیٰ کے ساتھ عالم الغیب والشہادۃ اس لیے بولا جاتا ہے۔ کہ وہ ہر چیز کو جانتا  
 ہے۔ جو مخلوق کے اعتبار سے پوشیدہ ہے یا ظاہر ہے۔ یہاں پر بھی اِنِّیْ عَلَّمَ غَیْبَکَ  
 السَّمَوٰتِ وَارْضَیْکَ کا مطلب یہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں زمین و آسمان کی تمام  
 چیزوں کو جانتا ہوں۔ جو مخلوق یعنی انسان جن اور فرشتوں کے اعتبار سے خواہ پوشیدہ ہیں یا  
 ظاہر ہیں۔ حتیٰ کہ آدم علیہ السلام کی صلاحیت اور ان کے کمال کو بھی جانتا ہوں۔ نے فرشتوں کی  
 نظر تو آدم علیہ السلام کی ہیئت تک ہی پہنچی ہے اور اسی سے تم نے اندازہ لگایا ہے۔ کہ یہ  
 فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ اور خود بزرگی کا مرتکب ہو گا۔ یا تم نے جات پر قیاس کر کے کہہ دیا ہے  
 کہ آدم زمین میں لڑائی کھجڑے کا موجب بنے گا۔ تمہاری نظر اس کے کمال تک پہنچ جاتی تو یہ  
 گمان نہ کرتے۔

ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کے دل میں یہ بات آئی ہو کہ اے مولا کریم! ہم تیری تسبیح و تعریف  
 بیان کرنے والے ہیں لہذا اگر زمین میں نیابت کی ضرورت ہے۔ تو ہم حاضر ہیں۔  
 اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ہر اس چیز کو جانتا ہوں جس کو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے  
 ہو۔ اے فرشتو! شاید تمہارا خیال ہو کہ جو صلاحیت ہم میں پائی جاتی ہے۔ وہ آدم میں نہ پائی جاتی ہو۔  
 مگر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے آدم میں وہ کمال رکھ دیا ہے۔ جہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہے۔  
 لہذا نیابت کا حقدار آدم علیہ السلام ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا ”وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ  
 تَكْتُمُونَ“ اے فرشتو! میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔  
 اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بزرگی اور فضیلت کو عملی طور پر فرشتوں کے سامنے پیش  
 کیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں فرشتوں کو سجدہ کے حکم کا بیان ہے۔

الْعَا

درس ہفتہ چہارم

البقرة

آیت ۲۴ تا ۲۶

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ  
 اِلٰی وَاسْتَکْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ۝۲۴ وَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ  
 اَسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّةَ وَکُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ  
 شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَکُوْنَا مِنَ الصّٰلِحِیْنَ  
 ۝۲۵ فَآزَلَهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا کَانَا  
 فِیْهِ مِنْ وَّ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَکُمْ  
 فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ اِلٰی حَیْنٍ ۝۲۶

ترجمہ: اور اس بات کو اپنے دھیان میں لاؤ جب کہ ہم نے فرشتوں سے  
 سجدہ کرو آدم کے لیے پس سجدہ کیا انہوں نے۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور تنجر  
 کیا اور وہ کفر کرنے والوں میں سے تھا ۝۲۴ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری  
 بیوی جنت میں رہو۔ اور تم دونوں اس میں سے وسعت اور کشادگی سے کھاؤ۔  
 جہاں سے بھی چاہو۔ اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا، پس ہو جاؤ گے  
 تم دونوں ظلم کرنے والوں میں سے ۝۲۵ پس پھلایا اُن دونوں کو شیطن نے  
 اُس سے۔ پس اُن کو اُس نعمت سے نکالاجس کے اندر وہ تھے اور ہم نے کہا اتر  
 جاؤ بعض تمہارے بعض کے لیے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا

ہے۔ اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانے کی بات ہے ۝۲۶

فرشتوں کی  
 سجدہ دینے کی  
 میں تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آدم علیہ السلام کی تعظیم پرانی۔ تاکہ ان کی نیابت واضح ہو جائے۔  
 تو فرشتوں کو حکم ہوا۔ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِآدَمَ کہ آدم علیہ السلام کے  
 لیے سجدہ کرو فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔

مفسرین کرام نے اس مسئلہ میں بڑی بحث کی ہے۔ مگر جو سجدہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے  
 آدم علیہ السلام کے لیے کرایا، وہ کس قسم کا سجدہ تھا۔ انتہائی درجے کی مابین تہنّی اور تواضع  
 کے ساتھ پیشانی کو زمین پر رکھ دینا سجدہ کہلاتا ہے۔ اور اس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً اگر پیشانی  
 معجوب حق کے حق کو ادا کرنے کے لیے جھکانی ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا ایسا کون نامہر دور اور ہر  
 شریعت میں حرام، باطل، کفر اور شرک رہا ہے۔ اور ایسے سجدہ کو سجدہ عبادت کہتے ہیں البتہ  
 سجدہ تحیہ و تکریم جو محض عزت و اعزاز کے لیے کیا جائے۔ یا جو سلام کے وقت کیا جائے۔ یا  
 سجدہ پہلی شریعتوں میں رافقا۔ مگر ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو یہ سجدہ  
 کرنا بھی عرام قرار دیا گیا ہے۔ جو سجدہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام سے رو برد کیا۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا  
 یہ سجدہ عبادت نہ تھا۔ جو ہر شریعت میں حرام رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیمی کے درمیان فرق منہ نیت سے ہی  
 ممکن ہے۔ اگر بوقت سجدہ نیت یہ ہے کہ یہ وہی سجدہ ہے جو حق تعالیٰ کے سامنے ہوا ہے  
 تو پھر ایسا سجدہ غیر اللہ کے سامنے کفر اور شرک ہوگا۔ اور اگر سجدہ محض تعظیم و تہنّی کے لیے ہے  
 تو پہلی امتوں میں جائز تھا۔ جیسے یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ یا فرشتوں  
 کا آدم علیہ السلام کو سجدہ۔ مگر ہماری شریعت میں ہر قسم کا سجدہ ناجائز ہے۔ خواہ وہ تعظیمی ہو یا عبادتی  
 ہو۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی غیر کے سامنے سجدہ منع ہے۔ ترمذی شریعت کی روایت میں حضور  
 علیہ السلام کا فرمان ہے لَوْ كُنْتُ أَهْرَاحِدًا لَّكَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِي وَجْهًا  
 یعنی اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کے سامنے سجدہ کرے  
 کہ اللہ تعالیٰ نے خاوند کا بڑا حق رکھا ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتے ہیں لَا يَصْلَحُ  
 لِبَشَرٍ أَنْ يَسْجُدَ لِبَشَرٍ یعنی کسی انسان کے لیے لائق نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو  
 سجدہ کرے۔ ایک صحابی نے حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت! ہم ہم

۱۔ تفسیر عزیزی فارسی ۱۸۶۱ء تفسیر ابن کثیر ۱۸۶۱ء ۲۔ حجة اللہ ابوالفتح ۱۸۶۱ء

۳۔ ترمذی ص ۱۸۶۱ء ۴۔ عنہ احمد ص ۱۸۶۱ء

خدا تعالیٰ کے  
 ہر کوئی ہر قسم  
 سجدہ حرام ہے

جا کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ اپنے بادشاہوں کو کعبہ کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ تو باطل ہیں۔ اور آپ نبی برحق ہیں۔ تو ہم آپ کے سامنے کیوں کعبہ نہ کریں۔ حضور علیہ السلام نے منع فرما دیا اور کہا کہ دیکھو بھائی! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔ تو کیا تم میری قبر پر کعبہ کر دو گے۔ تو اس شخص نے کہا حضور! ہم ایسا نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا جس طرح میری قبر پر کعبہ حرام ہے۔ اسی طرح میرے سامنے کعبہ گونا آج بھی حرام ہے خواہ تعظیمی ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے قبر کو کعبہ کیا تو اس کو کفر اور شرک تو نہیں کہیں گے مگر اس کے حرام ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔ اور اگر اس کعبہ سے مراد وہی کعبہ ہے جو بندے اپنے رب کے سامنے کرتے ہیں۔ تو ایسا کرنے والا کافر اور مرتد ہو جائے گا۔ اور اگر محض تعظیم کے لیے قبر بادشاہ یا استاد کے سامنے کیا ہے۔ تو قاصد صمد کرام، ائمہ دین، علمائے کرام اور سلف صالحین کا متفقہ فتویٰ ہے کہ اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔ اگرچہ کفر کے درجے تک نہیں پہنچتا۔

فرشتوں کے کعبہ  
کی بعض آجیت

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کو کعبہ بمنزلہ قبلہ کے تھا۔ یعنی حیثیت میں کعبہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا گیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام محض حجت تھے۔ جن کی طرف منہ کر کے کعبہ کیا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم آج بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور کعبہ ریزہ ہوتے ہیں۔ اور اس سے مراد قبلہ کو کعبہ کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ کعبہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوتا ہے۔ ابی طہر فرشتوں نے بھی آدم علیہ السلام کی طرف منہ محض قبلہ ہونے کی حیثیت سے کیا تھا۔ کعبہ آدم علیہ السلام کو نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی تھا۔

بعض فرماتے ہیں کہ لا اذم کال سببی ہے۔ یعنی حکم یہ تھا کہ حق تعالیٰ کو کعبہ کر دو۔ آدم علیہ السلام کی وجہ اور سبب۔ اور بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اس کعبہ میں دونوں باتیں

۱۔ بوراؤد ج ۱ ص ۲۹۱ ۲۔ بیان القرآن ص ۳۰ ۳۔ ابن کثیر ج ۱ ص ۱۱۱ ۴۔ منثور ص ۵

۵۔ تفسیر مظہری ص ۱۱۱ ۶۔ ابن کثیر ج ۱ ص ۱۱۱ ۷۔ معالم التنزیل ص ۲۱۱

پائی جاتی ہیں۔ یعنی سجدہ و عبادت تو اللہ تعالیٰ کے لیے تھا۔ اور تعظیم و تکریم آدم علیہ السلام کے لیے تھی۔  
گویا یہ خلافت کا تعظیمی سجدہ تھا۔

سجدہ خلافت یا سجدہ تعظیمی میں سجدہ الیہ عرضی یا مجازی ہوتا ہے۔ حضرت مولانا نذوقی فرماتے ہیں: کہ سجدہ عبادت میں سجدہ الیہ بالذات ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبید اللہ سندھی مفسر قرآن کی توجہ یہ ہے کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی اس زبردست تجلی کو سجدہ کیا تھا۔ جو آدم علیہ السلام کے قلب پر پڑ رہی تھی۔ یہی توجہ مولانا نذوقی نے خانہ جبر کے متعلق اس وقت کی تھی جب ایک بندہ دیانند سرسوتی نے اعتراض پیش کیا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اگر بندہ پتھر کی مورتوں کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ تو مسلمان بھی پتھروں سے بنی ہوئی دیواروں والے مکان یعنی خانہ کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں۔ پھر ہندو اور مسلمان میں فرق کیا ہوا؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نذوقی نے فرمایا تھا کہ مسلمان اس مکان کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ اس تجلی الہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جو اس گھر پر پڑتی ہے۔ چونکہ یہ تجلی عظیم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ لہذا مسلمان پتھر کی دیواروں کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ خدا تعالیٰ کو کرتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کسی وقت خدا نخواستہ بیت اللہ شریف کی دیواریں منہدم بھی ہو جائیں اور بظاہر دہاں کوئی چیز باقی نہ رہے تو بھی مسلمان اسی جہت میں سجدہ ریز ہوں گے برخلاف اس کے بندہ دائی طرف سجدہ کریں گے۔ جس طرف ان کا بت رکھا ہوا ہوگا۔ لہذا معلوم ہو کہ بت کے سامنے سجدہ کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔

الغرض! جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا تو فَسَجَدُوا سب نے سجدہ کیا اِلَّا ابلیسَ سوائے ابلیس کے۔ یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کرنے کا حکم تو فرشتوں کو دیا تھا۔ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ابلیس کے انکار کا کیا مطلب؟ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سجدہ کا حکم نہ صرف ملائکہ کو تھا، بلکہ جنات کو بھی تھا۔ اور ابلیس جنات میں سے ہے۔ بلکہ ابلیس جنات تھا۔ اور جب کسی بڑے کو کوئی حکم دیا جاتا ہے۔ تو

ابلیس علیہ السلام

اس کے ماتحت والے خود بخود اس حکم کے پابند ہو جاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں ابلیس کے متعلق آتا ہے کہ جب اس نے سجدہ نہ کیا۔ قرآن اللہ تعالیٰ نے دریافت کیا مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ ۚ اَدَّ اَمْرًا ۚ فَجَاءَ مِنْهُ سَافِرٌ مِّنْ رَّبِّهِ ۚ وَاَوْثَرُ ۚ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۚ اور فسیق سے تھکا۔ پس اپنے رب کے حکم سے باہر ہو گیا۔ مقصد یہ کہ سجدہ کا حکم فرشتوں اور جنات و نازل النوح کو ہوا تھا۔ فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے سر بسجود ہو گئے۔ مگر ابلیس اور اس کی قوم نے انکار کیا۔

حضرت یحییٰٰ مینیریؒ خواجہ نظام الدین ابویہؒ کے خلیفہ اور بڑے پائے کے عالم اور بزرگ تھے انہوں نے اپنے مکتوبات میں لکھا ہے کہ ابلیس نے سات لاکھ سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تھی۔ مگر ایک حکم کی سرکشی پر مردود ہو گیا۔ بعد اتنے لمبے عرصے کی عبادت برباد ہو گئی۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ محدث ابن ابی الدنیل نے اپنی کتاب مکایہ الشیطان میں ایک حدیث بیان کی ہے۔ مکایہ الشیطان کا مطلب ہے۔ شیطان کی مکاریاں۔ تردہ فرماتے ہیں کہ کسی موقع پر ابلیس کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہو گئی۔ ابلیس نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پاس میری سفارش کریں۔ وہ میری توبہ قبول کرے۔ موسیٰ علیہ السلام نے سفارش کا وعدہ کیا۔ اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ اور صبر سے خدا تعالیٰ کا حکم ہوا کہ میں ابلیس کی توبہ اس شرط پر قبول کرنے کو تیار ہوں کہ وہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ابلیس کو یہ شرط پیش کی تو کہنے لگا کہ زندگی میں تو میں نے آدم کو سجدہ کیا اب اس کی قبر کو سجدہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ ابلیس اپنی بات پر پکا تھا۔ اس نے انکار کیا۔ اَبٰی وَاَسْتَكْبَرُ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِیْنَ نہ صرف انکار کیا بلکہ تکبر بھی کیا۔ اور تھا انکار کرنے والوں میں۔

میاں پر ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں۔ آپ کے مشاہدہ میں بھی شاید آیا ہو کہ آجکل کے بعض



مرد پختہ پیروں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ شرک کا فعل ہے۔ اگر نیت عبادت کی تھی۔ تو سجدہ کرنے والا کافر ہو گیا۔ اور اگر عبادت کی نیت نہ بھی تھی، محض تعظیم مقصود تھی، تو اس کے حرام ہونے میں کسی عالم کو کسی بزرگ کو اختلاف نہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ یہ بھی شرک ہے۔ اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور جو ایسا کرتا ہے اس کو روکنا چاہیے۔

حسد و حسد  
کنا مہ

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ ابن منذر نے عبادۃ بن ابی امیہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ اس کائنات میں سب سے پہلا گناہ حسد تھا۔ جو ابلیس نے آدم علیہ السلام پر کیا۔ اور نہ اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ فِیْهِ اس سے بہتر ہوں۔ خَلَقْتَنیْ مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَ مِنْ طِیْنٍ مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔ لہذا میں اس سے افضل ہوں۔ میں کیوں اس کو سجدہ کروں۔ یہی ابلیس کی بھول تھی کہ اس نے اپنی شخصیت کی طرف دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر نگاہ نہ ڈالی۔ لہذا مردود محض۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو کوئی بھی خدا تعالیٰ کے حکم کا انکار کرے گا۔ وہ ابلیس کی طرح کافر ہو جائے گا۔ ابلیس نے حسد کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِیْنَ اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ کفر کرنے والا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام  
اور حضرت حوا جنت میں

انکار ابلیس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حکم دیا وَقُلْنَا يَا اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ سَاۡءَ اٰدَمُ اَقَم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ حضرت حوا کی تخلیق کے متعلق در سکر مقام پر فرمایا خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا آدم علیہ السلام کی دشت کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں کی پسلیوں سے اُن کا جوڑا پیدا فرمایا۔ اور آبِ حیات حوا سے نازل ہو گئے۔ اس لیے فرمایا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ وَطَرِ مِنْهَا رِجْلًا حَيْثُ شِئْتُمَا اور تم اس میں سے کٹ دگی کے ساتھ نکھاؤ۔ جہاں سے چاہو۔

اس جنت کے متعلق بھی مختلف روایتیں ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جنت زمین پر تھی۔ مگر صیح قول یہ ہے کہ جس جنت میں آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کو بسنے کا حکم ہوا۔ عالم بالا میں جَنَّةُ الْعَاوِیِیَہ جس کا ذکر قرآن پاک کے در سکر مقامات پر آیا ہے۔ سورۃ نجم

میں موجود ہے عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی جو کہ سِدْرۃ الْمُنْتَهٰی کے قریب ہے عِنْدَ هَاجَتِ الْمَاوٰی یہ عالم بالا ہی کے متعلق ہے۔

شجر ممنوعہ جنت میں سکونت اختیار کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور حوا کو یہ حکم بھی دیا۔ کہ جہاں سے جتنا بھی پیاسے کھاؤ مگر وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ اگر ایسا کرو گے فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِیْنَ تو ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمادی۔

یہ کون سا درخت تھا جس کی مقاربت سے منع فرمایا گیا۔ اس کے متعلق مفسرین کرام کے کئی اقوال ہیں۔ بعض اسے کھجور کا درخت بتاتے ہیں بعض انجیر کا اور بعض انڈور کا۔ بائبل کی روایت کے مطابق یہ نیکی اور بدی کی پہچان کا درخت تھا۔ اور بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ آدم علیہ السلام اور حوا کے ملاپ یعنی مباشرت کو درخت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس لحاظ سے پیدا ہونے والی اولاد کو پھیل کھا گیا ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ شجر ممنوعہ گندم کا درخت تھا۔ مگر یہاں یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ گندم کا درخت نہیں بلکہ چھوٹا سا پودا ہوتا ہے۔ مفسرین نے اس اعتراض کا جواب بھی دیا ہے، فرماتے ہیں کہ شاعر لوگ لطفے کی زبان میں کہتے ہیں۔

۔ بخور ان جوارہی گر جوار اللہ می خوبی کہ گندم کرد آدم را بیرون از جنت المادانی اگر اللہ تبارکے کا قرب چاہتے ہو تو جوار کی روٹی کھاؤ جو قدسے ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گندم گرم ہوتی ہے۔ اگر اس کی روٹی کھاؤ گے تو اس نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوا دیا۔ مولانا رومی بھی فرماتے ہیں ۔ این عشق نیست این فساد گندم است۔ یہ عشق نہیں ہے بلکہ گندم کی گرمی کا اثر ہے۔ اور یہ اسی کا برپا کردہ فساد ہے۔ غرضیکہ گندم کے اس درخت کو دنیا کے ٹنڈے درخت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

ابو داؤدؒ نے خود اپنا مشابہہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے مصر میں آنا بڑا سنگرہ دیکھا۔ جسے

دو بھڑے کر کے بڑی مشکل سے اونٹ پر لا دیا۔ اگر اس دنیا میں آنا بڑا سنگڑ ہو سکتا ہے۔ تو جنت میں گندم کا درخت آنا بڑا کیوں نہیں ہو سکتا۔ ام المومنین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ انہوں نے دین باشت لبا کھیرا دیکھا ہے۔ یہ ترکی قسم کا کھیر جو موسم گرما میں ہوتا ہے۔ اور بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت انار کے دانے سننے بڑے بڑے ہوں گے۔ کہ ایک دانے کے نصف خول سے آنا بڑا خیمہ بن سیکے گا۔ جس کے نیچے دس دس آدمی ٹھہر سکیں۔ ہر حال یہ اعتراض معقول نہیں ہے۔ کہ گندم کا پودا ہوتا ہے۔ درخت نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ جنت میں گندم کا بہت بڑا درخت ہو۔ جس کے قریب جانے یا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا۔

شیطان دوسرے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آدم علیہ السلام اور حضرت خا جنت میں بہتے گئے۔ وہ بچوں کی طرح معصوم تھے۔ ابھی ان میں ہیبت کا وہ نہیں ابھرا تھا۔ کہ شیطان نے آہستہ آہستہ دوسرے ڈان شروع کیا۔ فَازَلَّهُمَّ الشَّيْطَانُ عَنْهَا ان دونوں کو شیطان نے پھسلا دیا۔ دوسری جگہ آتا ہے: فَذُوسُ لَهْفٍ الشَّيْطَانُ نے دونوں میں دوسرے ڈالا۔ کس چیز کے متعلق دوسرے ڈالا۔ اس میں مختلف اقوال ہیں بعض کہتے ہیں کہ درخت کا پھل کھانے کے متعلق دوسرے ڈالا۔ دوسری جگہ موجود ہے۔ کہ شیطان نے کہا کہ اس کو کھا لو گے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں رہ جاؤ گے۔ اور کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہوگا۔

بعض کہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ دوسرے دل کے اندر ہی ڈالا جائے۔ کوئی فعل سرزد کرنے سے بھی دوسرے انداز ہی ہوتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شیطان ایک جنیہ کو کچلا کر لایا۔ اور جنت کے دروازے پر اس سے مباشرت کی جسے آدم علیہ السلام دیکھ کر سب سے تھمے۔ تو ان کے دل میں بھی ویسا ہی خیال پیدا ہوا۔ انہوں نے حضرت خا کے ساتھ معاربت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنت کا لباس اتر گیا۔ اور وہ دونوں برہنہ ہو گئے۔

شیطان کی دوسرا اندازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دوسرا اندازی نے فَاَخْرَجْنَاهُمَا مَعًا كَانَا فِيْهِ  
 ان دونوں کو اس جگہ یعنی جنت سے نکال دیا جس کے اندر وہ تھے۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوا  
 ہم نے کہا اتر جاؤ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ شیطان تمہارا  
 دشمن ہے اور تم اس کے دشمن ہو۔ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مَسْقَرٌ اور زمین میں تمہارے  
 لیے ٹھکانا ہے۔ اب تمہاری رہائش زمین پر ہوگی۔ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِينٍ اور ایک مدت  
 تک فَاَمَّا اٹھانا ہے۔ یعنی تمہاری اصل رہائش گاہ زمین ہی ہوگی۔ البتہ اگر زمین کو چھوڑ  
 کر کہیں فضاؤں یا مہندروں میں جاؤ گے تو وہ عارضی قیام گاہ ہوگا۔ مستقل قیام زمین پر ہی کرو گے  
 آج کے دور میں جو پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ ہم زمین پر مستقل طور پر نہیں رہیں گے۔ بہت چاند،  
 مریخ یا دوسرے سیاروں میں چلے جائیں گے۔ تو یہ محض شیطانی پراپیگنڈا ہے۔ چاند ہماری زمین سے  
 قریب ترین سیارہ ہے۔ اور اس کا فاصلہ اڑھائی لاکھ میل ہے۔ مریخ تو یہاں سے پچاس کروڑ  
 میل دور ہے۔ اور دوسرے سیدے اس سے بھی دور ہیں۔ فرض کر لیا کہ چاند پر رہائش کا بندوبست  
 ہو جاتا ہے۔ وہاں ہوٹل قائم ہو جاتے ہیں۔ تو ساٹھ انڈوں کا اپنا اندازہ یہ ہے کہ ایک پونڈ  
 غذا کو چاند پر پہنچانے کے لیے تیس ہزار پونڈ خرچ ہوں گے۔ وہاں پہنچنے کا خصوصی لباس چار لاکھ  
 روپے میں تیار ہوگا۔ یہ لباس تو راستے میں ہی جل جائے گا۔

زمین ہی مس  
 ٹھکانا ہے

چاند پر تو ایسی لباس پہنا ہوگا۔ وہاں کی گرمی  
 کی مقدار تقریباً چالیس ہزار سنی ڈگری ہے۔ جہاں پر پانی تو کھاتا بنا ہی ٹھکنے لگتا ہے۔ یہ اند کے  
 ایک طرف گرمی ہے۔ اور دوسری طرف اتنی سردی ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔  
 لہذا ایسی جگہ پر بننے کے لیے اتنا قیمتی لباس تیار کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ خوراک اور لباس  
 پر اتنی رقم کون خرچ کر کے رہائش پذیر ہوگا۔ اگر کوئی وہاں پہنچے گا بھی۔ تو اس کا قیام  
 بالکل عارضی ہوگا۔ آخر کار اُسے زمین پر ہی آنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہارا اصل ٹھکانا زمین  
 ہی ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا مِنْهُمْ خَلَقْنَاكُمْ وَفِيْهَا نَعِيْذُكُمْ  
وَمِنْهُمْ نَخْرِجُكُمْ كَاٰرَةَ الْاٰخِرٰی اے انسان! ہم نے تمہیں اسی  
 زمین سے پیدا کیا۔ اسی میں لوٹائیں گے۔ اور پھر قیامت کو دوسری مرتبہ اسی سے نکالیں

گئے۔ اسی لیے یہاں پر فرمایا کہ اے آدم اور حوا تم یہاں سے زمین پر تر جاؤ۔ ایک خاص  
دست تک وہی تمہارا ٹھکانا ہوگی۔

البقرة

آیت ۲۹، ۳۰

درس پیر و جہمت

فَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ  
الرَّحِيمُ ﴿٣٩﴾ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ  
مِنْهُ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ  
يَحْزَنُونَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ  
أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٩﴾

ترجمہ

ترجمہ :- پس آدمؑ رحیم السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا آدمؑ کی طرف وہ پانی کے ساتھ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا ہے وہ مہربان ہے ﴿۳۸﴾ ہم نے کہا تم سب زمین پر اتر جاؤ۔ پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت کی پس جس نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ اُن پر کوئی خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ نہ کھائیں گے ﴿۳۸﴾ اور جنہوں نے کفر کیا۔ اور ہماری آیتوں کو ہٹلایا۔ وہ دوزخ واس ہیں۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۳۹﴾

گہرے پوچھو

جب حضرت آدمؑ علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھایا۔ جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ تو ان سے انعام و اکرام لے لئے گئے۔ اور انہیں حکم ہوا کہ زمین پر اتر جاؤ۔ بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے۔ اور تمہیں ایک وقت تک فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اب آدمؑ علیہ السلام کو بڑی پریشانی ہوئی کہ انہیں زمین پر اترنے کا حکم مل گیا ہے۔ بعض روتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام آئے اور آدمؑ علیہ السلام کے سر سے قح اُتار لیا۔ اور اُن کے جسم سے بہشت کا لباس بھی اُتار لیا اور انہیں برہنہ کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے ترہنہ پہننے کے لیے جنت کے درخت کے پتے استعمال کیے۔ کیونکہ دوسروں کے سامنے ستر کا کھنڈ غلافِ فطرت ہے۔



حضرت آدم علیہ السلام  
کی قرب

اس کے بعد کیا ہوا۔ فَتَلَقَىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ پس آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے  
چند کلمات کیے۔ تعقی کا معنی پانا یا سیکھنا ہے۔ ان کلمات کا اللہ تعالیٰ نے الہام کیا یا آدم علیہ السلام  
کے دل میں ڈالا۔ ان کلمات کے ساتھ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کی۔ جیسا کہ سورۃ اہق  
میں آتا ہے: قَالَ رَبِّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا سَاءَ مَا كُنَّا نَعْمُرُ لَكَ وَتَرْحَمُنَا  
لَسَوْنَا مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ یعنی اے پروردگار! بیشک ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ اگر تو ہمیں بخش  
نہیں کرے گا۔ اور ہم پر رحم نہیں کرے گا۔ تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔ اس کے  
علامہ حدیث میں ان دعائے کلمات کا ذکر ہے۔ جن کے ذریعہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی  
نتیجہ یہ ہوا کہ فَتَابَ عَلَيْهِ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا۔ اور عید السلام کی طرف مہربانی کے ساتھ  
تَابَ کا معنی رجوع کرنا ہے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا  
مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا اپنی مہربانی کے ساتھ۔ اور جب اس منکر بندے  
کی طرف منسوب کیا جائے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بندے نے رجوع کیا اپنی عاجزی کے  
اعتراف کے ساتھ اور بُرائی کے ترک کرنے کے ساتھ۔ گویا تو بہ کی صفت کا تعلق فوق اور مخلوق  
دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں تَوْبُوا إِلَى اللہِ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ  
گنہگاروں کو چھوڑ دو۔ اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے معافی مانگو۔  
إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ بے شک وہ رجوع کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ  
نے اُن کی لغزش کو معاف کر دیا۔

اہم بیعتی نے اپنی مشہور کتاب شعب الایمان میں روایت بیان کی ہے کہ اپنی لغزش  
پر آدم علیہ السلام اس قدر رنے کہ لَوْ رَزَقَ دُمُوعٌ أَدْعُرُ بِجَمِيعِ دُمُوعٍ وَلَكِنَّهُ لَرَجَحَ  
دُمُوعَهُ عَلَى جَمِيعِ دُمُوعٍ وَلَكِنَّهُ لَرَجَحَ دُمُوعَهُ عَلَى جَمِيعِ دُمُوعٍ  
مقابلہ ان کی قیامت تک آنے والی ساری اولاد کے ساتھ کیا جسے۔ تو آدم علیہ السلام کے  
آنسو غالب آجائیں۔ اور بیعتی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت بھی مروی ہے۔



مزار یہ دی کہ گوشت کھانا شروع ہو گیا۔ آج کل گرمی کے موسم میں تو ایک دو دن سے زیادہ گوشت نہیں رہ سکتا۔ بدبو آنے لگتی ہے جسکو رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر بنی اسرائیل اپنے نبی کے حکم کی پاسداری کرتے۔ گوشت کو ذخیرہ نہ کرتے تو یہ بھی خراب نہ ہوتا۔ خواہ کتنی ہی مہرہ پڑا رہتا۔

”دوسری بات آپ کے یہ فرمانی لَوْلَا حَوَالَةُ خُنْزُرٍ مُّسْتَشْرِئٍ رَّجَحَ۔ یعنی اگر حوا اپنے خاندان کی خیانت نہ کرتی۔ تو دنیا کی کوئی عورت اپنے خاندان کے ساتھ خائن نہ ہوتی۔ حوا کی خیانت یہ تھی کہ اسنوں نے آدم علیہ السلام کو رخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی تھی۔

بہر حال جب آدم علیہ السلام نے پھل کھایا۔ اور پرہیز ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا۔ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ثُمَّ سَبَّ يَمِينٍ بِأُتْرَاجٍ رَّجَحَ شَيْطَانُ۔ آدم علیہ السلام اور حوا اس کے لیے تھے۔ توبہ تو قبول ہو گئی۔ مگر زمین پر اتر جانے کا حکم صادر ہو گیا۔

بائبل اور بعض تاریخی روایات میں مور اور سانپ کا ذکر بھی آتا ہے کہ وہ بھی آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلانے میں معاون ہوئے تھے۔ اور یہ شیطان سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر یہ روایت درست نہیں میں مجموعہ بات یہی ہے کہ شیطان نے جنت کے نام دوسرا مذاذنی کی تھی۔ اس نے دروازے سے باہر جہیز سے مباشرت کی تھی۔ جسے آدم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ اور اس کی بات بھی سن رہے تھے۔ اسی بات سے آپ کو دوسرا پیدا ہوا۔ اور آپ نے وہ کلام کر دیا۔ جس سے منع کیا گیا تھا۔ لہذا آپ کو زمین پر اترنے کا حکم ہو گیا۔

آدم علیہ السلام  
اور جنت حوا  
کی بات

آدم علیہ السلام نے پھل کھایا ہوا تھا۔ اور زمین پر اتار گیا۔ آپ کو بول براز کی حاجت ہوئی۔ پیٹ میں درد پیدا ہوا۔ آپ پریشان ہو گئے کہ اس سے پہلے یہ تکلیف کبھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کی پریشانی دیکھ کر جبرائیل علیہ السلام آئے۔ اور آپ کو بتایا کہ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس طریقے سے فراغت حاصل کریں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ تو براز سے بدبو آنے لگی۔ آپ کو اور پریشانی ہوئی۔ رونے لگے کہ یہ کیا مصیبت ہے۔ کہتے ہیں کہ آپ

سترون تک لٹے ہے۔ اس واقعہ کو بن علی الدین نے روایت کیا ہے۔ اور امام دارقطنی نے بھی کتاب الافراد میں حضرت عمرؓ سے بیان کیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو اس وقت بھیجا جب حضرت حوا کو حیض کی حالت ہوئی جنت میں تو ہر طرح کی پاکیزگی حاصل تھی۔ نہ میں پر اگر یہ پریشانی لاحق ہو گئی۔ مانی حوا نے جبرائیل علیہ السلام کو آواز دی کہ دیکھو یہ کیا معاملہ ہے مجھے وقفہ وقفہ سے خون آ رہا ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا۔ اے حوا! یہ بات تم پر اور تمہاری بہن پر ہمیشہ کے لیے مسلط ہے گی۔

بخاری اور مسلم کی روایت میں آتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ایمان میں حیض کی حالت لاحق ہو گئی۔ آپ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ حیض آنے پر محنت افسردہ ہوئیں اور رونے لگیں۔ حضور علیہ السلام تشریف لائے۔ تو آپ سے بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہذا استغنیٰ عن کتبتہ اللہ علی انبات دم یا ایہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی بیٹیوں پر لازم کر دیا ہے۔

الغرض! جبرائیل علیہ السلام نے حوا کو یہی کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیٹیوں پر یہ چیز لازم کر دی ہے۔ یہ تمہارے کنہوں کا کفارہ بنتے گا۔ اور تمہارے لیے پاکیزگی کا ذریعہ ہوگا۔ اس کی وجہ سے عورت جسمانی غور پر صحت حاصل کرتی ہے۔ اور اگر نیک بخت ہے۔ تو باطنی طور پر بھی اس کو طہارت نصیب ہوگی۔

حب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے۔ تو بعض روایات کے مطابق قیس قسم کے پھلوں کے بیج ان کے ساتھ آئے۔ بعض دوسری روایات میں ہزار قسم کا ذکر کتابے جنس روایات میں خوشبو، تازہ و متا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ خوشبو جنت کا تختہ ہے اگر کوئی پھول یا کلمہ پیش کرے۔ تو اس کو دوزخ میں کرنا پڑے۔ فَإِنَّهُ حَرِّحَ مِنَ الْجَنَّةِ کیونکہ یہ جنت سے آئی ہوئی ہے۔

جنت کے تختے

۱۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۹۳ ۲۔ دیلمی ص ۱۹۳ ۳۔ بخاری ص ۱۹۳ ۴۔ مسلم ص ۱۹۳

۵۔ شامل مع ترمذی ص ۵۴۲

۶۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۹۳

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ نہ ن چلن و نہ سہتموز بھی آدم علیہ السلام کے ساتھ نازل ہوا تاکہ دنیا میں کامرمانی کر سکیں۔ حج اسود بھی جنت سے اترتی۔ پتہ اس نر جبل ابو قیس پر رکھا گیا۔ یہ دودھ کی طرح سفید تھا۔ اور دست کو مس کر کے عورت چلتا تھا۔ اہل بیت انسانوں کے گناہوں کی تیر کیوں نہ تھے پتھر کو سیاہ کر دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام  
جنت سے نازل

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام بندہ وستان کی سرزمین شرق السنہ میں اترے تھے۔ چنانچہ بسمۃ لمرجان فی آثار بندہ وستان کے صنف کھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کا نزل شرق السنہ میں اور حضرت حوا کا نزل جہنم میں ہوا۔ جہنم یعنی دوزخ یا آگ سے۔ غالباً اسی مناسبت سے اس مقام کا نام جہنم پڑ گیا۔ صاحب تسمیۃ المجران سے پائے گئے محدث اور عام تھے۔ اور امام شاہ ولی اللہؒ کے ہم عصر تھے۔

بعض مباحث  
میں آدم علیہ السلام  
پہلے

حضرت آدم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اور کپڑے بننے کا کام بھی آپ ہی سے شروع ہوا۔ واسمہ اور اشرافیاں بھی حضرت آدم علیہ السلام نے بنائیں۔ دیکھ ابیہار جیسلم السلام میں سے حضرت نوح علیہ السلام بخاری بھی پڑھتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام درزی کا کام کرتے تھے۔ حضرت ہود اور صالح علیہما السلام تاجروں تھے۔ حضرت ابراہیم در لوط علیہما السلام نے کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام بکوشی پاتے تھے۔ اور ان کا دودھ اور اون وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیشہ گھربانی تھا۔ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام روئے زمین کی عظیم سلطنت کے بادشاہ ہونے سے بہرہ بردار اپنی نذر اوقات کے لیے گڑیاں اور زنجیریں بناتے تھے۔

تورہ کی روایت

اہم جمعی نے شعب الایمان میں روایت نقل کی ہے کہ جب آدم علیہ السلام سے عرض ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ انہوں نے عرض پر نکلا کہ تو وہاں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ لکھا پایا۔ آپ نے خیال کیا کہ جس شخصیت کا نام اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لکھا

ہوا ہے۔ یہ ضرور کوئی عظیم شخصیت ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ معافی مانگی۔  
 اَسْأَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اِلَّا عَفَرْتَ لِي۔ اے اللہ! میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل سے دعا کرتا ہوں کہ میری غزش کو معاف فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! تمہیں کیا علم کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ مولا کریم! میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ تیرے نام کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نام لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! تیری اولاد میں یہ آخری نبی ہوں گے۔ اور میری پوری مخلوق میں ان کی فضیلت کو کوئی نہیں پہنچے گا۔ اگرچہ یہ روایات ضعیف ہیں بعض نے ان کو موضوع بھی کہا ہے۔ تاہم تشبیہ کی خاطر ان کو مقبول کر لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی غزش کو معاف کر دیا۔ بیہقی کے علاوہ یہ روایات طبرانی، حاکم اور ابن نعیم میں بھی موجود ہیں۔ اور روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو دنیا میں ابوبشر کی کینیت سے پکارا جاتا ہے۔ اور قیامت کے دن حضور نبی کریم کی طرف نسبت کرتے ہو ابوالمحمد کی کینیت سے پکارا جائے گا۔ گویا آپ کو ابوبشر اور ابوالمحمد دونوں اعزاز حاصل ہیں۔

بخاری اور مسلم شریعت کی روایت میں آتا ہے کہ قیامت کے روز جب لوگ آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو کہیں گے کہ اے آدم! انت ابوالبشر آپ تمام نسل انسانی کے جد امجد ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب شروع کریں۔ حضرت آدم علیہ السلام انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ حضرت ابوذر غفاری کی روایت میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا آدم علیہ السلام خدا تعالیٰ کے نبی تھے۔ فرمایا ہاں۔ نَبِيًّا رَّسُولًا كَلَّمَهُ اللَّهُ اَبْنِي تَحْتَهُ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام کیا۔ آپ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اَوَّلُ الَّذِي كَلَّمَ اٰدَمُ اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

زیر ایک ایسا عمل ہے جس سے ان کی سابقہ کوتاہیوں کی معافی ہو جاتی ہے۔

توبہ کی شرط



کافران شبہ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ یعنی کُناو سے توبہ کرنے والا یہی ہے۔ جیسا اس نے کئی گنا وہ کیا ہو مگر توبہ کی قبولیت کے لیے بعض شرائط بھی ہیں۔ اگر ان شرائط کے ساتھ توبہ کی ہے تو قبول ہوگی ورنہ نہیں۔ توبہ میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی علم حال اور عمل۔

علمت ماویہ سے۔ ر آدمی جانتا ہے کہ میں نے واقعی یہ غلط کام کیا ہے۔ اور اس نے ارتکاب پر گناہ اور اس کے ضرر کا احساس ہوتا ہے۔ حال کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس غلط کام کو ترک کر دے۔ اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے یہ عمل ہے۔ اس ضمن میں ذامت کا ذکر بھی آتا ہے التَّوْبَةُ الشَّدَامُ اور اگر کچھ فرائض رو گئے ہوں تو ان کو ادا کیا جائے۔ کوئی حقوق ملت ہوئے ہوں۔ تو ان کو پورا کیا جائے۔ تب انسان کی توبہ قبول ہوتی ہے۔

امام دارقطنیؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت بیان کی ہے جس میں آدم علیہ السلام سے متعلق مختلف باتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مسجد خیمت میں (جو کہ مٹی میں واقع ہے) حضرت آدمؑ کی نماز جنازہ پڑھی اور چار تجیریں کیں۔ فرشتوں کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ تھی۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو لحد میں دفن کیا گیا۔ اور ان کی قبر کو بان واربائی گئی۔ جیسا کہ عام طور پر آج کل بنائی جاتی ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے ہندوستان کی سرزمین سے چالیس حج پیدل کیے۔

زمین پر آنے کی حکمت

ان آیات میں اِهْبِطُوا یعنی اتر جاؤ کا لفظ دو دفعہ آیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے اتر جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر جب اس حکم کی فوری تعمیل نہ ہوئی۔ تو دوبارہ حکمت آرڈر ہوا کہ فوراً زمین میں اتر جاؤ۔

یہاں پر یہ ختمہ قابل غور ہے کہ زمین پر اترنے کا حکم کسی سزا کے طور پر نہیں تھا۔ بلکہ اس

۱۔ ابن ماجہ ص ۲۱۳ ۲۔ ابن ماجہ ص ۲۱۳ ۳۔ فیض القدر، شرح جامع صغیر ص ۲۸۵

۴۔ تفسیر عزیزی ص ۱۹۶ ۵۔ درمنثور ص ۵۶ ۶۔ تفسیر عزیزی ص ۱۹۶ ۷۔ ابن کثیر ص ۸۲

میں جو تبت خداوندی مٹی تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ اِنی جاعل فی رُزقِ میں خلیفہ کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں۔ چنانچہ اس ارادے کی تکمیل یعنی ہندوستان ارضی کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا۔ آپ نے نیابت کے کام کی ابتداء کی۔ وہ پھر یہ فرض آپ کی آنے والی اور درمیں مشغول ہو گیا۔ گویا زمین پر اترنے کا حکم نہ انہیں بعد ایک اعزاز تھا۔ جو آدم علیہ السلام کے حصے میں آیا کہ انہیں نیابت الہی کا فریضہ سونپا گیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مزید حکم یہ دیا کہ قَامًا  
يَا بَنِيَّ نَحْنُ هَدَىٰ جِبْ مِيری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے۔ جی جی جب  
انبیاء طہیم السلام میرا پیغام اور ہدایت لے رہے ہیں فَكُنْ مَبْعَ هُدَىٰ تو جس نے میری  
ہدایت نہ پیر دی۔ فَلَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ اُن پر انجام کے لحاظ سے کوئی خوف نہیں جو کہ  
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

یہاں پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ کہ قیامت کے دن تو بہت زیادہ خوف ہوگا۔ عام انسانوں کا تو کیا حال ہوگا۔ خود نبیوں کے متعلق آتا ہے۔ رَدِّ قَفْسِيْ قَفْسِيْ پتہ ہیں گئے۔ اس کے جواب میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ظاہری طور پر تو یہ واقعی خوف ہوگا، مگر انجام کے اعتبار سے بالکل خوف نہیں ہوگا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی قہری صفات کا لہو ہوگا۔ تو خوف دہرا اس طاری ہوگا۔ جیسے کسی مقدمہ میں ملزم بڑا بچھڑاتا ہے۔ مگر وکیل متہمل مثل دیکھ کر کہہ دیتا ہے۔ کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تسلیم کرو۔ آخر کار انجام بخیر ہوگا۔ اسی طرح جو لوگ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آمدہ ہدایت کی پیروی کریں گے۔ انہیں اگرچہ قیامت کے دن وقتی طور پر خوف پیدا ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق آخر کار انہیں خوف نہیں ہوگا۔ ہدایت اصل میں دین کی روح اور حکمت کو کہا جاتا ہے۔ اور دین حق دائمی قانون کا نام ہے جو انانیت کے اصلی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اسی ہدایت کے مفصلات میں نبی۔ رسول۔ جینات معجزات۔ کتب سادہ اور شریعت وغیرہ آتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا اتباع ہی ہدایت

خونِ کُسر  
کی حقیقت

برائیت کے  
مستبعین

و اتباع ہے۔ قرآن پاک میں بینات کا لفظ لاتعداد مقامات پر آیا ہے۔ اور ہدایت کا لفظ بھی آیا ہے۔ ہدایت وہ ہوتے ہیں۔ جو بالکل واضح اور جریہ ہوں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے وہ ہدایت کو مانا۔ بینات میں سے ہے۔ اسی طرح صبر و شکر کرتا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ہدایت میں۔ ہدایت وہ چیز ہوتی ہے جس کی تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً شعائر اللہ کی تعظیم احکام شریعت میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ چیزیں تعلیم کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ کہتے ہیں انبیاء علیہم السلام وہ ہدایت میں شامل ہیں۔ اسی لیے فرمایا جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ ان پر ثواب ہوگا۔ ورنہ وہ تھمیں ہوں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا اور جنہوں نے کفر کیا۔ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اور ہماری آیات کو جھٹلایا  
 الْبَلَاءُ ضَعُوبُ الْبَلَاءِ وہ دروزخ واسے ہیں ہُمْ فِيهَا خَالِدُونَ اس میں وہ ہمیشہ  
 رہیں گے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ انسان کی سعادت اور شقاوت کا دار و مدار ایمان اور  
 کفر پر ہے۔ یہ ہدایت و ہدایت پر ہے۔ اور پھر یہ بت کر دے کہ دَعْوَالِ بِالْخَوْسِ  
 اعمال کا دار و مدار غلتے پر ہے۔ جس کا ایمان پر خاتمہ ہو گیا۔ یعنی جو ایمان کی دولت ساتھ لے کر  
 دوزخ میں ہے۔ وہ جس کا خاتمہ ہو گیا۔ اب تو ان کی تہذیب و تربیت کے بعد  
 سے نکلنے کے بعد اب دوبارہ داند ایمان اور نیکی کی بنیاد پر ہوگا۔ اس کے اخیر جنت میں دوبارہ  
 داخلے کی کوئی صورت نہیں۔

الف

درس نوزدہم

البقرة

(آیت ۴۰ تا ۴۲)

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اٰفَعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوْا  
 اَوَّلَ نِعْمَتِيْ الَّتِيْ اَوْفَيْتُ بِعَهْدِكُمْ وَاَيَّايَ فَاَرْهَبُوْنَ ۝۴۰ وَاٰمِنُوْا بِمَا  
 اَنْزَلْتُ مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كٰفِرِيْنَ بِهِ ۝۴۱  
 وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۝۴۲ وَاَيَّايَ فَاتَّقُوْنَ ۝۴۳ وَلَا  
 تَلْبِسُوْا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۴

ترجمہ: اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری ان نعمتوں کو --- جو میں نے

تم پر انعام کیں۔ اور یاد کرو میرے عہد کو۔ میں پورا کروں گا تمہارے عہد کو۔ اور

اور خاص مجھ ہی سے ڈرو ۝۴۰ اور ایمان لاؤ اس چیز پر جس کو میں نے نازل کیا ہے

اور وہ ان راصل غیر محرف شدہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ جو تمہارے پاس

ہیں۔ اور نہ جو تم پہلے کفر کرنے والے اس کے ساتھ۔ اور مت فریاد میری آیتوں

کے بدلے بھڑکی قیمت اور خاص مجھ ہی سے پس ڈرتے رہو ۝۴۱ اور نہ ایسا

حق کو باطل کے ساتھ۔ اور تم حق کو چھپاتے ہو۔ اور تم جانتے ہو ۝۴۲

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَعْبُدُوْا نِسْءَ كُلِّ نَبِيٍّ اِنْ سَأَلْتُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ قُلُوْا

ترجمہ بنی اسرائیل

معت۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت ارضی کا ذکر تھا۔ اس کے بعد

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِیْہِمْ نَبٰٓئِیْنًا ۝۴۵

علیہ السلام کے ذریعے تمام انسانوں کو حاصل ہوئی۔ اب یہاں سے بنی اسرائیل کو خدائی خطاب

ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں یہ دلائی ہیں۔ اور ان معجزات کا ذکر کیا ہے۔ جو ان میں

ظاہر ہوئے۔ بنی اسرائیل کے باطل کھول دینے کے لیے یہ بیان کیا ہے۔ اور اس قوم میں جو غریب

پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ بیان یہاں سے شروع ہوا وَإِذْ اٰتٰی

اِسْرٰٓئِيْلَ رَیْطًا یَّحْمِلُ عَلٰی رَکْبَتِیْہِمْ ۝۴۶

خدا مبرا رضی عنہ کی نعمت ہے۔ جو آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کو نصیب ہوئی۔ یہ عزت  
بنی اسرائیل میں سے ایک نام ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ نعمت حبیب بنی اسرائیل  
کو حاصل ہوئی۔ یہاں پر بنی اسرائیل کی ان غالیوں کا ذکر ہو گا۔ جن کی وجہ سے اس عزت و شرافت اور  
فضیلت وہ محروم ہو گئے۔

اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ ان دونوں خاندانوں یعنی بنی اسرائیل اور بنی احمیل  
کے بعد نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جن کا وطن مالوت موجودہ بغداد سے ستر میل دور بابل  
شہر تھا۔ آپ کی پیدائش کے وقت بابل بہت بڑا شہر اور تہذیب کا مرکز تھا۔ یہ چالیس مربع  
میل میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بہت بڑی سلطنت کا پایہ تخت تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے  
اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں سے ہجرت کی جیسا کہ فرمایا: *إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي*، وہ حضرت  
رستے شام پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا اور پھر تیار نے اور مکہ مکرمہ بھی گئے۔ آپ اصل  
عراق تھے۔ پھر شامی پھر مجازی ہوئے۔ اس زمانے میں فلسطین و کنعان کہتے تھے۔ اور یہ شام ہی کے  
مذمت تھا۔ بعد میں اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ہاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام تولد ہوئے۔ آپ کے  
بارہ فرزند تھے۔ پھر ان کے آگے بے شمار قبیلے ہوئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دوسری بیوی  
آپ کی چچا زاد حضرت سارہ بن قیس۔ جن کا ذکر قرآن پاک میں بھی آتا ہے۔ آپ کے بطن سے  
حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور پھر ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے  
عظیم نبی ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی میں ہی بشارت سادی  
تھی: *وَمِنْ ذُرِّيَّتِكَ اسْحَقُ يَعْقُوبَ* یعنی تیرے فرزند اسحاق علیہ السلام سے ان کے بیٹے  
یعقوب علیہ السلام ہوں گے۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے: *إِسْحَاقُ*  
*عَشْرَةُ اسْبَاطِ اُمَمًا* سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے  
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک قیس بن یوی قصور بھی تھی جس کی اولاد بنی قنطریہ کہلاتی ہے

مگر انہیں زیادہ شہرت حاصل ہے نہ ہونی۔

واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت اسحق علیہ السلام کے دو بیٹے یعنی عیسیٰ اور یعقوب نبیوں کے تھے۔ البتہ عیسیٰ ذرا پہلے پیدا ہوئے اور یعقوب علیہ السلام بعد میں۔ یعقوب کا غلطی معنی پیچھے آنے والے کے ہیں۔ خدا کی قدرت کہ اسحق علیہ السلام کو عیسیٰ کے ساتھ زیادہ محبت تھی۔ اور ان کی بیوی کو یعقوب علیہ السلام زیادہ پیار سے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام زیادہ محبت منہ اور مضبوط جسم کے مالک تھے اور حضرت اسحق علیہ السلام نے انہیں یہ فریضہ سونپ رکھا تھا کہ وہ دروازے پر موجود رہیں۔ جب تک میں عبادت میں مصروف رہوں۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دیں تاکہ عبادت میں خلل واقع نہ ہو۔ ایک موقع پر انسانی شکل میں فرشتہ آیا اور اندر جانا چاہا مگر یعقوب علیہ السلام نے روکا۔ جب اسحاق علیہ السلام باہر آئے تو دیکھا کہ یعقوب علیہ السلام فرشتے کے ساتھ الجھ رہے ہیں۔ تو انہوں نے تعجب فرمایا کہ واقعی تم نے اپنی ڈیوٹی پوری پوری ادا کی ہے فرشتے نے آپ کا نام دریافت کیا تو انہیں یعقوب بتایا گیا۔ اس نے کہا اس کا نام اسرائیل ہے۔ سریدانی یا جبرانی زبان میں اسرائیل کا معنی بندہ اور ایل کا معنی اللہ ہے۔ کو یہ فرشتے نے یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ رکھا۔ جو کہ عبد اللہ کے مترادف ہے۔ یہیں سے آپ کا نام اسرائیل مشہور ہوا۔ اور آپ کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ چونکہ حضرت اسحق علیہ السلام کی محبت عیسیٰ کے ساتھ زیادہ تھی۔ اس لیے انہوں نے عیسیٰ سے فرمایا کہ میں آخری وقت میں تیرے لیے خصوصی دعا کروں گا۔ جب ہاں کو پتا چلا تو اس نے جاؤ کہ یہ دعا یعقوب علیہ السلام کے حق میں ہو۔ چنانچہ اس نے یعقوب علیہ السلام کو عیسیٰ کا ہاں پٹنا کر ان کے باپ کے پاس بھیج دیا۔ اور ساتھ نصیحت کی کہ باپ کے سامنے آہستہ بولنا کہ وہ تمہیں پہچان نہ سکیں۔ چونکہ اس وقت حضرت اسحق علیہ السلام کی نظر کمزور ہو چکی تھی۔ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عیسیٰ سمجھے اور ان کے حق میں دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد میں نبوت کو جاری رکھے۔ یہ خصوصی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام



سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اللہ تعالیٰ نے جاریہ نبی اور رسول اس غلام میں مقرر فرمائے۔  
 کچھ عرصہ بعد عیسیٰ نے باب کو یاد دلایا کہ آپ نے میرے حق میں دعا کا وعدہ فرمایا تھا، تو انہوں  
 نے کیا کر وہ دعا تو میں نے کر دی ہے، عیسیٰ نے کہا: اگر وہ دعا تو آپ نے یعقوب علیہ السلام کے  
 کے حق میں فرمائی ہے۔ تو انہوں نے کہا: ہمارا وہ تو اس کے لیے ہوگئی، تمہارے لیے دعا ہے  
 کہ اللہ تعالیٰ تمہارے غلام میں بادشاہت قائم رکھے، چنانچہ آپ کی دعا سے بادشاہت کا  
 زیادہ تر سلسلہ عیسیٰ کی اولاد میں ہی رہا۔

جب حضرت اسحاق علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے، تو ان کے سائے اہل باب  
 پر عیسیٰ نے قبضہ کر لیا اور یعقوب علیہ السلام کو کچھ نہ دیا، اسی دن وہ دولت کی درجے لوگوں کا  
 جوع بھی عیسیٰ کی طرف ہو گیا۔ اور یعقوب علیہ السلام نادار ہونے کی درجے کسی شمار میں نہ آنے  
 لگے۔ ان کے ماموں کسی دوسری جگہ مقیم تھے، اور بڑے مالدار تھے، ان نے مشورہ دیا، کہ  
 ان کے پاس چلے جاؤ، ان کے پاس وہ دولت بھی ہے، اور اس کی بیٹی بھی ہے جس کے  
 ساتھ وہ تمہارا نکاح بھی کر دے گا، چنانچہ آپ اپنے لایان نامی ماموں کے پاس پہنچے۔ وہ  
 آپ کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا، اور کہا کہ اپنے جانی بھائیوں سے دل برداشتہ نہ ہونا، میں تمہاری  
 ہر طرح سے مدد کروں گا، چنانچہ اس نے اپنے سائے اہل باب کا مقدمہ حضرت یعقوب علیہ السلام  
 کو بنا دیا، اور اپنی بیٹی کا نکاح بھی کر دیا۔

اس بیوی سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پندرہ بیٹے عطا کئے، اور اس کے بعد بیوی کا انتقال ہو  
 گیا، ماموں نے آپ پر مزید احسان کیا، کہ دوسری بیٹی کا نکاح کر دیا، اس سے دو فرزند پیدا ہوئے  
 اور وہ بی بی فرستہ ہو گئی۔ اس کے بعد ماموں نے تیسری بیٹی آپ کے نکاح میں دے دی، اس  
 سے ایک بیٹی اور دو لڑکے پیدا ہوئے، اس کے بعد وہ بھی اللہ تعالیٰ کو پیار بن گئیں، چھ  
 ماموں نے اپنی چوتھی بیٹی، عیسیٰ کا نکاح کر دیا، اس وقت تک حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر  
 چالیس برس ہو چکی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمایا، اور حکم دیا کہ اس مقدمہ کو چھوڑ

کہ کنعان چلے جاؤ۔ اور وہاں پر تبلیغ کا فریضہ انجام دو۔ جب ماموں کو پتا چلا تو اس نے کہا کہ تمہاری جدائی سے تکلیف کو ضرور ہوگی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رضا ہر چیز پر مقدم ہے۔ چنانچہ اپنے بخوشی حضرت یعقوب علیہ السلام کو کنعان چلے جانے کی اجازت دے دی۔ اور بیوی بچوں کو بھی ساتھ بھیج دیا۔ اور اُن کی خدمت کے طور پر پانچ سو گھوڑے، پانچ سو اونٹ، پانچ سو گائے پانچ سو بچر، پانچ سو بھیڑیں اور بہت سا دیگر سامان ہمراہ کر دیا۔

کنعان پہنچ کر آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تبلیغ کا کام شروع کر دیا۔ وہاں پر آپ کی چوتھی بیوی راحیل کے بطن سے دو بیٹے یوسف اور بن یامین پیدا ہوئے۔ یوسف علیہ السلام ابھی دو سال کے تھے کہ راحیل بھی فوت ہو گئی۔ جب ماموں کو پتا چلا تو اس نے اپنی پانچویں بیٹی بھی نکاح میں دے دی۔ اور اسے یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں بھیج دیا۔ تاکہ بچوں کی پرورش ہو سکے۔ اس طرح یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے ہوئے۔ جن سے آگے بارہ خاندان نکھو۔ میں آگے :-

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو بھی اس فضیلت سے محروم نہ رکھا۔ جیسا حضرت یعقوب علیہ السلام کنعان کی طرف آئے تھے۔ تو راستہ میں عیسیٰ نے بھی آپ کا استقبال کیا۔ اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے ذریعے مجھ پر فضیلت بخشی ہے۔ آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میرے خاندان میں بھی نبوت جاری فرمائے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ تو وحی نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ کے خاندان میں ایک بنی یوسف علیہ السلام کو پیدا فرمائے گا۔ اور ایک عظیم المرتبت بادشاہ ذوالقرنین بھی آپ کے ہی خاندان میں ہوگا۔ چنانچہ آگے چل کر ایسا ہی ہوا۔

ان آیات میں اُن انعامات کا تذکرہ ہے جو اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل پر کیے۔ يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓءٰیْلُ اذْكُرُوْا اِنْعٰمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ لَے بنی اسرائیل! میرے ان انعامات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیے۔ ان میں سے دو دنیاوی انعام تھے۔ یعنی اس قوم میں انبیاء عظیم السلام مبعوث کیے اور بادشاہت بھی عطا کی۔ سو قرآن

بنی اسرائیل پر  
انعامات

میں موجود ہے۔ اِذْ جَعَلْكَ فِيْكُمْ اَنْبِيَاۗءَ وَجَعَلَكُمْ مَّلٰٓئِكًا ۚ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنْتَ  
 کتنا عظیم احسان اس قوم پر کیا۔ اُس وقت اس کے برہ دنیا بھر میں کوئی دوسری قوم نہیں  
 تھی۔ ان کو عزت اور شہرت حاصل تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ان میں بگاڑ پیدا ہونے لگا جتنی  
 کہ مسیح علیہ السلام کے زمانے تک ان کی ذلت اکتیاد کو پہنچ گئی۔ انجیل اور تورات کی کتابوں  
 سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ہزاروں سال گزرنے  
 کے بعد جب نزول قرآن کا زمانہ آیا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اللہ تعالیٰ  
 کا آخری پیغام اور شریعت نازل ہوئے۔ اس وقت بھی بے شمار خرابیوں کے باوجود یہی لوگ  
 صاحب علم سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس مقام پر بنی اسرائیل کو ہی دعوت فخر  
 دی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو جنہیں تم اپنی غائبی کی وجہ سے کھو چکے ہو۔ لہذا اب  
 ہمیں راہِ راست پر آ جاؤ۔ بنی آخر الزمان پر ایمان لے آؤ۔ اور خدا تعالیٰ کے آخری پیغام کو  
 تسلیم کر لو۔ تو تمہاری تعین ہوئی غفلت واپس آ سکتی ہے۔ اور اگر یہاں نہیں کر دگے۔ اپنی بے بسی  
 پر قائم رہو گے۔ جو تمہارے حصے میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اگلے رکوع  
 میں ذکر آئے گا۔ کہ بنی اسرائیل میں کس طرح غرابیاں پیدا ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے انعامات کا ذکر کر دیا ہے بعد فرمایا وَ اَوْفُوا۟ بِعَهْدِيۡ اَنْتَ  
 بنی اسرائیل میرے عہد کو پورا کر دو۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ عہد تو لیا تھا۔ کہ میری اطاعت  
 کرنا۔ انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کرنا۔ اور فرائض کو پورا کرنا۔ فرمایا اس کے بعد میں اَوْفُوا۟  
 بِعَهْدِيۡكُمْ میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ تمہارا عہد یہ ہے۔ کہ تمہارے سوا وہ تعاف کر کے  
 تمہیں بخش دوں گا۔ اور جنت تک پہنچا دوں گا۔ تمام بنی فرعون انسان نے جو عہد اللہ تعالیٰ سے  
 کیا ہو اسے۔ آگے اُس کے مطالبے یعنی میثاق کا ذکر بھی آئے گا۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ  
 میثاق بھی پورا کر دو۔ اَلَّذِيۡ وَ اٰتٰكُمْ بِلَدٍ نَّجْوٰتِیۡنِ ۚ فَمَا كُنْتُمْ بِعَهْدِيۡ ۚ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنْتَ  
 بنی اسرائیل سے کہا تھا۔ کہ صحیح دین اور سچی بات کو مست چھپانا۔ مسلمانوں نے کیا کیا۔ فَتَبٰذَلُوْا  
 وَ دَخَلُوْا رِیۡثَہٗ ۚ اِسْ عَمَہٗ کُوۡلِیۡسْتَ دَالٍ دیا۔ نزول قرآن کے وقت تک بنی اسرائیل  
 میں جبر اور کتان حق کی بیماری اپنے عروج پر تھی۔ یہ لوگ توراۃ، انجیل اور دیگر کتب میں موجود

آخری نبی علیہ السلام کے متعلق پیش گوئیوں کو چھپاتے تھے۔ اور اس حصہ میں بتلاتے تھے کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل کی بجائے بنی امیئل میں کیوں آیا ہے۔ یہ لوگ صاحب علم ہونے کے باوجود مقصود تھے۔ مشرکین نے تو ایمان قبول کر لیا مگر یہ لوگ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ **مِیَاکَ وَلِکِیْ کَشِیْرَ هَنَہُمْ فِیْ سِقُوْنِ** یعنی ان کی اکثریت نامرمانوں کی ہے۔ جب کہ نہایت ہی قلیل تعداد راہِ راست پر آئی ہے۔ چنانچہ ان میں سے نہایت غلبہ ملتا ہے بنی سلام جیسے چند حق پرستوں نے اسلام کی دعوت قبول کی۔ الغرض فرمایا تم میرا غمہ پورا کرو۔ میں تمہارا غمہ پورا کروں گا۔ **وَ اِیَّایْ فَارْهَبُوْنِ** اور خاص مجھ ہی سے ڈرو۔ میں ہی تمہارا خالق اور مالک ہوں۔ میں نے تم پر پست بھی انعام کیے۔ آئندہ دینی کروں گا۔ بشرطیکہ تجھ سے ڈر کر یہ سچے راستے پر آباد۔

میان باطن

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ **وَ اِیْضًا اَنْزَلْتُ** اور جو چیز میں نے نازل کی ہے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ اور یہ چیز **مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ** اس چیز کی تصدیق کرتی ہے۔ جو تم سے پاس موجود ہے۔ یعنی تورات اور دیگر سابقہ کتب میں یہ خبر یاد ہے۔ کہ قرآن پاک سابقہ کتب کی ہر چھوٹی بڑی چیز کی تصدیق نہیں کرتا۔ بلکہ اصولی طور پر بعض اہم باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ جس طرح ہر نبی کے یہ ضروری ہوتا ہے۔ کہ وہ سابقہ نبی کی تصدیق کرے مگر اس کی شریعت اور احکام کی اس ضمن تصدیق نہیں کرتا۔ کیونکہ سابقہ دوسری پہلے نبی کی بعض چیزیں منسوخ کر دیتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی سابقہ کتب کی تصدیق کرتا ہے۔ لہذا تم میں قرآن پاک کو کثیثتِ ظاہر النہی تسلیم کر لو۔ اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ **وَرَتَّکُوْنُوْا کَافِرًا** کہ کافر بن جاؤ۔ اور وہ لوگ قرآن پاک کے اولین معزین بن جاؤ۔

قرآن پاک کا نزول مکہ مکرمہ میں شروع ہوا۔ اور سب سے پہلے انکار کرنے والے کفار۔ یہ تھے۔ پھر حبیب منور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں۔ وہ نے اس کا انکار کیا۔ لہذا اس لحاظ سے قرآن پاک کے اولین معزین کفار مکہ میں رہ کر یہود مدینہ۔ مگر یہاں بنی اسرائیل کو خطاب ہو رہا ہے کہ تم اولین معزین بن جاؤ۔ مفسرین کرام اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں

نہیں دالوں کے پاس تو کوئی کتاب نہیں تھی۔ کتاب یعنی تورات تو مدینہ کے یہودوں کے پاس نہیں۔  
لہذا اہل کتاب میں سے اولین کافرین یہی لوگ تھے۔ اسی لیے ان کو کہا گیا کہ وہ اولین سرین  
میں سے نہ ہو جائے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسرائیلیوں نے بیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے  
کے کہا گیا کہ اگر تم موجودہ نسل والے نہ ہو گے تو تمہارے بعد آنے والی نسلیں بھی تمہاری  
رہنمائی پر چل کر نکال دیں گی۔ اس سے انہیں یہ سمجھنے آئے کہ ان نسلوں کی عمر اسی کے ذمہ دار بھی تم ہی  
تھا۔ اس لیے اولین سرین نہ بن جائے۔

پھر فرمایا وَلَا تَزِدْوا بِلِسَانِكُمْ قِيلِيْلًا اور مت خرید میری آیتوں کے  
بڑے ٹھوڑی قیمت۔ ٹھوڑی قیمت سے مراد دنیا کا حقہ مال ہے۔ جیسا کہ غنیمت علیٰ ذلتہ  
بیچ کر دنیا کی چار چیزیں ایسی ہیں جن کے پیچھے لوگ مرتے ہیں۔ یعنی کھانا پینا پہنا اور  
سلاح کرنا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کھانے کا، بنیم کنگی اور پینے کا، بنگلہ بوں ہے۔ اچھے  
سے اچھا لباس بھی کچھ عرصہ بعد بھٹ جاتا ہے۔ اور اُسے پھینک دیا جاتا ہے۔ رہا سلاح۔  
تو اس کی وجہ سے انسان طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے  
یہ چاروں چیزیں عقیدے کو فاسد اور دین کو بگاڑنے والی ہیں۔ مگر لوگ ان چیزوں کے حصول  
کے لیے قیمتی اور اعلیٰ چیز یعنی ایمان کو خراب کر لیتے ہیں۔

فرمایا وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَزِدْوا فِي عِبَادَتِي شَيْئًا لَّيْسَ مِنِّي عَمَلًا لَّيْسَ مِنِّي عَمَلًا  
آخرت میں میرے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ حساب کتاب ہو گا۔ اور پھر تمہیں اپنے کئے  
کی جزا یا سزا بھگتنی ہو گی۔ لہذا مجھ سے ڈرتے رہو۔

وَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَا۟ بِأَنبَابِ صِرَاطِ اللَّهِ لَئِن تَتَّبِعُوا الْهَوَا۟ لَنَفْثَنَّوْا فِي سُبُلٍ كَثِيرَةٍ مِّنْ دُونِ سَبِيلِ اللَّهِ  
انہوں اور نہ ہی حق کو چھپاؤ۔ یہ بنی اسرائیل کی عمارت تھی کہ وہ اپنی کتاب میں موجود سچی  
بات چھپا لیتے تھے۔ اُس کے آگے کہ یہ لوگ قرآن پاک اور بنی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم  
کو اسی طرح پیچھتاتے تھے جس طرح اپنی اور دوسروں کو پیچھتاتے تھے مگر پھر بھی انکار کر لیتے تھے۔ یہ

یہ لوگ واضح علامات کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔ اور ان میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے۔ یہ عیسائی اور یہودی تحریف میں ٹٹے ہر ہیں۔ خود عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں نے تسلیم کیا ہے کہ انجیل میں تین ہزار تحریضیں چھپی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس قدر تحریف کا عمل آڑا گیا ہو۔ وہاں کس قدر بگاڑ پیدا ہوگا۔ اور جس کتاب کے ساتھ یہ سلوک برابر ہو۔ اس کا کیا سے کیا بن گیا ہوگا۔

حضرت علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل میں بگاڑ پیدا ہوا، اسی طرح آپ کی امت میں بھی پیدا ہوگا۔ آج کے دور میں دیکھ لیں کہ ہر قسم کے علماء مجلس دینی و مفاد کی خاطر کس طرح غلط فتوے جاری کرتے ہیں۔ یہ چیز کتمان حق سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی قسم کے لوگ امراء اور بادشاہوں کو خوش کرنے کے لیے غلط فتوے دیتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ حاکم وقت راضی ہو جائے۔ تو اپنی عیش ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظالم بادشاہ اور فاسق امراء آخرت سے بے خوف ہو کر کمنہ در طعنے پر غلام و جبر کے پیار توڑتے ہیں۔ یہ لوگ علماء کو کے فتوے کی آڑے کر اپنی من مانی خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہی حال وزیروں اور دیگر دفتری اہلکاروں کا ہے۔ قانون کی آڑ میں غلام کے حق غصب کرتے ہیں۔ حضرت علیہ السلام کا ارشاد ہے: **وَكَبُلَ لِمَنْ رَأَى فَنَكَمَ وَحَدَّثَ مِنَ الْوَيْلِ** جو کسی چیز کو نہیں جانتا۔ اس کے لیے ایک بار ہلاکت ہے مگر وکیل لِمَنْ يَنْكَمُ وَلَا يَعْمَلُ سَبْعَ مَرَّاتٍ الْوَيْلُ جو جاننے کے باوجود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ اس پر سات بار ہلاکت ہے۔ مقصد یہ کہ کتمان حق کرنے والے دنیا پرست لوگ حق بات کو جاننے کے باوجود اس کو چھپاتے ہیں۔ اور حق پر عمل نہیں کرتے۔ لہذا یہ سات گنا سزا کے مستحق ہیں۔

پیردوں، گمراہی نشینوں اور علامات سورہ حال دیکھ لیں۔ انہیں ذرا نفس کا کوئی خیال نہیں کہ پوسے ہوئے ہیں یا نہیں۔ مگر مستحبات اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو سینے سے لگائے



بیٹھے ہیں جنہیں چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ لوگ ملک پر کافر کی حکومت برداشت کر رہے ہیں جیسا کہ پیروں اور علماء سورستہ اسرائیلی حمایت کی۔ سوریہ اپنے خود ساختہ عقیدے کے خلاف کوئی چیز برداشت کرنے کے لیے کبھی تیار نہ ہوں گے۔ ایسے ہی لوگ لبنان حق کے مرتخب ہو رہے ہیں۔

آج کل دین کے ساتھ کیا سوچ ہو رہا ہے۔ نہ کسی کافر النفس کی پروا ہے۔ اور نہ واجبات کی معمولی معمولی باتوں کو نشانہ بنا کر ان کی تشویر ہو رہی ہے۔ پراپیگنڈا جاری ہے۔ تفرقہ بازی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اور پھر کالی گلوچ تک زہت پہنچتی ہے۔ یہ سب کیا ہے بنی اسرائیل کے شیوہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو بیماریاں بنی اسرائیل میں پائی باقی تھیں۔ اے میری امت۔ تم میں بھی وہی بیماریاں نمود کر آئیں گی حَدُّوَالنَّعْلِ بِالنَّعْلِ جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی طرح میری امت کی خرابیاں بنی اسرائیل کی خرابیوں کے مشابہ ہوں گی۔

فرمایا حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔ وَكُنْتُمْ قَلِيلٌ مِّنْ دَاعِيَةٍ اور تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ غرضیکہ اس مقام پر بنی اسرائیل کی خرابیوں کا اجمالاً بیان ہوا ہے۔ اگلے دو کلمات میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک خرابی کی نشان دہی ہوگی۔ آج بھی یہ خطاب موجودہ دور کے بنی اسرائیل کے لیے موجود ہے۔ ان کے بڑوں کی خرابیوں کو ان کے سامنے رکھا جا رہا ہے۔ اور جو خرابیاں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان کی نشان دہی بھی ہو رہی ہے۔ گویا یہ دعوت الی القرآن ہے کہ "اِهْتُمُوا بِمَا اَنْزَلْتُ" جس چیز کو میں نے نازل کیا ہے یعنی قرآن پاک آؤ آج بھی اس پر ایمان لے آؤ تو فلاح پا جاؤ گے۔ قرآن پاک پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔ اور آخری نذرۂ اور صیغہ ہے۔ اس پر ایمان لائے بغیر اور اس کے پیش کردہ پردہ کراہ پر پھنسل کیے بغیر فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔

وَأَقِمْو الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَبُوا مَعَ التَّائِبِينَ ﴿٤٣﴾  
 اتَّامِرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ  
 نَسْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ  
 وَالصَّلَاةِ ۚ إِنَّهَا لَكِبُيرةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿٤٥﴾  
 الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ  
 رَاجِعُونَ ﴿٤٦﴾

ترجمہ :- وہ قائم کرو نماز کو اور دینو زکوٰۃ اور رکھو مع التائبین کے  
 ساتھ (۴۳) کیا تم لوگوں کو برائی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جازوں کو فراموش کرتے ہو  
 حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو کیا تم نہیں سمجھتے (۴۴) اور مدد طلب کرو صبر و نماز  
 کے ساتھ اور بے شک یہ نماز البتہ بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جو عاجزی  
 کرنے والے ہیں (۴۵) وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ بیشک وہ اپنے پروردگار  
 سے ملنے والے ہیں اور بیشک وہ اسی پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے  
 والے ہیں (۴۶)

اس کو مع ان ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے حشر آدم علیہ السلام کی خلافت کا ذکر فرمایا۔  
 ہجر میں پر اترنے کا حکم دیا اور ہدایت و رہنمائی کا وہ اصول ہی بتلادیا جس پر جنت میں دوبارہ  
 داخلے کا دروازہ ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب ہوا دوسری قوموں کے مقابلے  
 میں بنی اسرائیل کو رہت و رزق و فقیہت حاصل رہی۔ نبوت اور حکومت ان میں رہی۔ ان  
 میں بڑے بڑے جاہ و زاہ لوگ پیدا ہوئے۔ مگر ایک طویل عرصہ کے بعد اس قوم میں طغیان  
 پیدا ہو گئیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خلافت ارضی بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں  
 منتقل کر دی۔

گہ شہ ہے ہونہ

گذشتہ درس میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اُن پر کیے گئے انعامات یا ردِ لائے گئے اور انہیں قرآن پاک پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی۔ اور انہیں نصیحت کی گئی کہ وہ بنی اسرائیل میں اولین کافر نہ بنیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے آئندہ نسیمیں بھی بنی کے قدموں پر چھیں گی۔ اور اس طرح اُن کا وبال بھی کفر میں پل کرنے والوں پر پڑے گا۔ انہیں حق و باطل کی تبلیغ سے اور کتمانِ حق سے منع کیا گیا اور ترغیب دی گئی کہ تمہاری اپنی کتابوں میں قرآن پاک اور غلامِ نبیؐ کے متعلق جو پیش گوئیاں موجود ہیں انہیں ظہر کریں۔

مدینہ طیبہ کے اطراف میں بننے والے بل کتاب یعنی یسودنسی بدتری کے زعم میں مبتلا تھے۔ وہ انبیاءِ عظیم السلام کے خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے دوسری اقوام کو کم تر سمجھتے تھے، عربوں کو وہ جاہل، اُن پر اُڑھ اور اُڑھائی خیال کرتے تھے۔ اس قسم کے شائدت گئے اسی سورۃ میں۔ سورۃ الن عمران میں اہلِ وحی سورتوں میں بھی ملتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا دوسرا بل زعم یہ تھا کہ نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بنی کے خاندان میں جاری رہے گی۔ مگر جب بنی اسرائیل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسمعیل میں آگئے تو ان کی ساری برتری ختم ہو گئی اور وہ حد کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ ان کے قبولِ حق سے کار کی ایک بڑی وجہ یہ تھی۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت انہیں جوہل اور مستغیبات برتری حاصل تھی۔ ایمان لانے سے وہ ضائع ہو جاتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب ان کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ اور انہیں حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاجہ بھی کرنی پڑے گی۔ چنانچہ ایسی ہی چیزیں اُن کے ایمان لانے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔

حضرت مولانا شاہ شریف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ یہ دو مثبت دل در ثبوت بہ وہ بھی بیماریاں لاحق تھیں جن کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے گریز کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اکثر لوگ بنی در بیماریوں میں مبتلا ہو کر غیر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مثبت دل کی بیماری کی شدت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَرَنَدُ الْخَبِيثَاتِ الْخَبِيثَاتِ شَكْدِيَّةً لَّكُنَّ مَحْتَلَاتِ

میں فطرۃ بڑی شدید ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: وَتُحِبُّونَ الْعَالَ حُبًّا جَمًّا تَمَّ بِمِثْلِهَا مِمَّنْ يَمُوتُ  
سے محبت کرتے ہو۔ جس کی دیکھ بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں کے حقوق ضائع  
ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں بنی اسرائیل کے قبول حق میں مانع تھیں۔

ان دو بیماریوں کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ بتوڑ کیا وَأَقِمْوُ الصَّلَاةَ نَازِقًا قَامًا كَرُو  
وَأَتُوا الزَّكَاةَ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی حب جاہ کی بیماری کے لیے نماز شافی ہے۔ کیونکہ اس  
میں اللہ تعالیٰ نے غرور، تجبرانہ بڑائی کا علاج رکھا ہے۔ جو شخص نماز قائم کرے گا اس کا مطلب  
سمجھے گا۔ وہ حب جاہ کی بیماری سے شغایہ ہو جائے گا۔ اسی طرح حب مال کی بیماری کا  
علاج ادائیگی زکوٰۃ میں ہے۔ اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں مثلاً ان کے نخل دور کرنا بھی ہے۔ چنانچہ  
جب کوئی شخص ہر سال مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ تو وہ نخل کی نعمت پاک ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے  
کہ صرف مقررہ مقدار میں زکوٰۃ ادا کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ فرمایا لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا  
مِمَّا تُحِبُّونَ یعنی تم ہر گز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو  
یہی وہ جذبہ ہے۔ جو مال کی محبت کو کم کر کے نخل سے نجات دلاتا ہے۔ گویا نماز اور زکوٰۃ  
حب جاہ اور حب مال کی بیماری کا علاج ہے۔

ان بیماریوں  
کا علاج

اہم بیضادی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وَأَسْتَعِينُ بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ  
میں نماز کے ساتھ توسل پکڑنے کا اس لیے حکم دیا ہے کہ نماز تمام عبادت کی جامع ہے۔  
نماز میں روحانی، نفسانی اور جسمانی ہر قسم کی عبادت جمع ہیں مثلاً نماز طہارت پر موقوف ہے اور  
طہارت اسلام میں ایک بہت بڑا اصول ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا حصہ ہے  
اسی طرح ستر کا ڈھانپنا نماز کے لیے شرط ہے۔ ستر لپٹنی تو ہر حالت میں لازم ہے۔ مگر نماز  
کے دوران تو اور زیادہ تو کہ ہے۔ انسان برہنگی کی حالت میں نماز ادا نہیں کر سکتا۔ عبادت  
کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ مال بھی صرف کرنا پڑتا ہے تو اگر نماز میں انفاق جیسی عبادت بھی شامل  
ہے۔ پھر نماز کے لیے قبلہ شریف کی طرف رخ کرنا بھی ضروری ہے۔ نماز کی حالت میں انسان  
معتکف ہوتا ہے۔ اور اعتکاف ایک مستقل عبادت ہے لہذا نماز میں عکوف بھی شامل ہے

نماز جامع  
عبادت ہے

نماز کے دوران انسان کے اعضا اور جوارح شروع کا اظہار کرتے ہیں۔ دل سے نیت اور  
 اخلاص بھی ضروری ہے۔ اگر نیت اور خلوص نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح نماز میں شیطان  
 کے ساتھ مجاہدہ بھی شامل ہے۔ نماز میں انسان رب العزت کے سامنے مناجات کرتا ہے۔  
 اور قرآن کریم کی تلاوت جیسی بہترین عبادت سے فیضیاب ہوتا ہے۔ نماز میں انسان شہدین  
 کا تکلم کرتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ  
 وَرَسُولُهُ۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے جس کی انسان کو ایسا دینا ہے۔ نماز میں انسان کھانے پینے  
 سے بھی اجتناب کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ الغرض اہم بیضاوی فرماتے ہیں۔  
 کہ نماز ایک ایسی اعلیٰ درجے کی عبادت ہے کہ اس میں بہت سی دوسری عبادات بھی شامل ہیں۔  
 نماز و زکوٰۃ کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ اور  
 رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ مطلب یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ مل کر نماز ادا  
 کرو۔ اسی لیے تو نماز باجماعت ہمارے مذہب میں تقریباً واجب کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ حضور علیہ السلام  
 کی ایسی سنت مؤکدہ ہے کہ اگر بلا عذر ترک کرے تو انسان منافقوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔  
 حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت میں ہے کہ اگر تم بلا عذر نماز سے تعلق کر دو گے تو پیغمبر علیہ السلام  
 کی سنت کو چھوٹنے والے بن جاؤ گے۔ اور اگر ایسا کر دو گے تو نَضَلْتُمْ مَعْرَاہُ بَوَاجِدْکُمْ۔ صرف  
 معذور افراد کو گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ وگرنہ تندرست آدمی کو بغیر جماعت کے نماز  
 پڑھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جماعت میں شریک ہوتے تھے  
 اور جماعت سے پیچھے وہی رہتا تھا جس کا اتفاق معلوم ہوتا ہے۔ یا وہ معذور رہتا تھا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ صرف سجدہ ہی ہوتا  
 تھا۔ اس لیے حکم ہوا کہ رکوع بھی کرو۔ اگرچہ یہ سجدہ سے کم درجے کا رکوع ہے۔ مگر بڑی اہمیت  
 کا حامل ہے جس نماز میں رکوع نہ ہو، وہ نماز باطل ہو جاتی ہے۔ بعض دوسرے مفسرین فرماتے  
 ہیں کہ بیشک رکوع نماز کا ایک اہم رکن ہے مگر مع انْشَاءِکَیْنِ سے صاف واضح ہے

۱۔ مسلم ص ۲۲۲ ۲۔ مسند ص ۱۱۱ ۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۱۲ ۴۔ معارف التنزیل ص ۲۱۲

۵۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۱۲ ۶۔ تفسیر ابن کثیر ص ۸۵





سینے تیار نہیں۔ اسی لیے ذبیحہ کرتے دوسروں کو تویشی کی طرف دعوت دیتے ہو۔ مژدہ داروں سے نہ کہتے  
ہو یہ کہاں کا انصاف اور عقلمندی ہے۔

محضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: کہ حجاج کی رات میرا گزریا لے لوگوں پر ہوا۔ جن کے ہونٹ  
جہنم کی قینچیوں سے کاٹے ہوئے تھے۔ میں نے تبرائیل علیہ السلام سے پوچھا۔ یہ کون لوگ ہیں  
انہوں نے بتایا کہ حضور! یہ آپ کی امت کے خطیب ہیں۔ جو لوگوں کو امر بالمعروف یعنی نیکی  
کا حکم کرتے تھے۔ مگر اپنے آپ کو فراموش کر دیتے تھے۔ اہم دینی مسئلہ جی ایک روایت بیان  
کی ہے: کہ جہنم میں ایک ایسا شخص بھی ہوگا۔ جس کی ہر سوسے ستم والے بھی ہزار ہوں گے لوگوں  
نے عرض کیا۔ حضور! ایسا بہشتی شخص کون ہوگا؟ آپ نے فرمایا وہ صاحب علم شخص جو اپنے  
علم سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ایک دوسری حدیث میں اس طرح آتا ہے: کہ جو شخص دوسروں کو  
نیکی سکھاتا ہے۔ اور خود اس پر عمل نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے چراغ جو دوسروں  
کو روشنی دیا کرتا ہے۔ مگر خود بجتا رہتا ہے۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے: کہ قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے  
گا۔ اور اسے اس حالت میں جہنم رسید کیا جائے گا۔ کہ اس کی آنتیں پیٹ سے نکل کر نیچے  
کی طرف ٹھک رہی ہوں گی۔ وہ شخص آنتوں کو اس طرح کھینچے گا۔ جیسا کہ عاخر اس کو کھینچتا ہے  
لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے۔ اور پوچھیں گے کہ اے فلاں! تجھے یہ مصیبت کس طسنت  
پہنچی۔ حالانکہ تو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا تھا۔ اور برائیوں سے منع کرتا تھا۔ وہ کہے گا۔ ہاں میں تم کو  
نیکی کا حکم کرتا تھا۔ مگر خود نیکی نہیں کرتا تھا۔ تمہیں برائیوں سے منع کرتا تھا۔ مگر خود باز نہیں آتا  
تھا۔ اس لیے آج مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔

تو فرمایا اے بنی اسرائیل! تم لوگوں کو نیکی کی تعلیم کرتے ہو۔ بڑے مسائل بیان کرتے  
ہو۔ قرآن پاک کی تہائیت کا اقرار کرتے ہو۔ بنی آخر الزمان کے اوصاف حمیدہ بھی بتاتے

۱۔ تفسیر کبیر ۱/۲۰۰، ابن کثیر ۱/۲۰۰، تفسیر کبیر ۱/۲۰۰، ابن کثیر ۱/۲۰۰

۲۔ مسلم ۱/۲۰۰، بخاری ص ۱۰۰، تفسیر خازن ۱/۲۰۰، مژدہ ۱/۲۰۰

جو نگر خود ایمان نہیں لاتے۔ اپنے آپ کو فراموش کیے بیٹھے ہوا فدا قَعْلُون کیا تم  
میں عقل دشو کا مادہ نہیں ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

عصیر و صلوٰۃ کی  
برکات

فرمایا **وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّابِرِ وَالصَّالِحَةِ** یعنی مدد طلب کرو صبر اور  
نماز کے ساتھ۔ صبر و صلوٰۃ کو اختیار کرو گے۔ تو برائیاں دور ہو جائیں گی۔ حُثِّبَ اَلْبَہَاہُ  
کا علاج بھی تم صبر کے ذریعے کر سکتے ہو۔ نماز پڑھو گے تو عجز و انحراف پیدا ہوگی اور اس میں  
مختلف بیماریوں کی شفا ہے۔ پھر فرمایا **وَرَبُّهَا الْكَبِيرَةُ** اور یہ نماز بے شک بڑی بھل  
اور بھاری ہے۔ **اِنَّكَ عَلَى الْخَشِيعَيْنِ** مگر عاجزی کرنے والوں کے لیے یہی نماز رحمت  
کا سامان بنتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور طیبہ السلام کو اذا حزبه امر  
فَنَزَعَ اِلَى لَعْنَتِهِ جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی۔ تو نماز کی طرف رجوع فرماتے۔ کیونکہ  
نماز سے تعلق باللہ کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اور انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ جبکہ  
مضبوط ہوگا۔ اسی قدر مشکلات کم ہو جائیں گی۔ انسان کو مصائب کا احساس اسی وقت ہوتا  
ہے۔ جب اس کا تعلق باللہ کمزور ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ نماز کئی ظاہری بیداریوں کی شفا کا سبب بھی بنتی ہے۔ اہم ابن کثیرؒ اور ابن جریرؒ نے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ ایک دفعہ پیٹ کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ شدت درد کی وجہ سے آپ لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا آپ پر گزر ہوا۔ تو فارسی لہجہ میں فرمایا: اَشْكُمُ الدَّرْدَ کَیَا تَہَا سَے پیٹ میں درد ہو رہا ہے شکم فارسی میں پیٹ کو کہتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کیا فَکَحُوْهُ کہ حضور ایا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ قُمْ فَکَحِ فَإِنَّ الصَّلَاةَ شِفَاءُ الْعُصَا اور نماز پڑھو کہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے نماز پڑھی۔ تو پیٹ کا درد دور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے شفا عطا کر دی۔ بعض اوقات ایا بھی ہوتا ہے۔

تو فرمایا یہ نماز جو محفل ہے۔ مگر عاجزی کرنے والوں پر نہیں۔ اور وہ کوئی لوگ ہیں کہ جن

مرتجعاً الى الله

يُظَنُّونَ جَوَاقِينِ کرتے ہیں اَنَّهُمْ قُلُوبًا رَاقِبِينَ کہ وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کرنے والے ہیں لفظ ظن اضماعہ معانی میں استعمال ہوئے والا لفظ ہے۔ اس کا معنی گمان بھی ہوتا ہے۔ اور یقین بھی۔ مگر یہاں پر ظن کا معنی یقین ہے۔ عربی زبان میں بعض دوسرے کئی الفاظ بھی متضاد معانی رکھتے ہیں۔ جیسے خون کا معنی سیاہ بھی اور سفید بھی۔ اسی طرح جسم کا کا معنی گرم اور سرد دونوں طرح ہوتا ہے۔

فرمایا یہ نماز ان لوگوں پر واجب نہیں ہے جنہیں یقین ہے کہ انہیں ایک دن اللہ تعالیٰ کی بدگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ وہاں اعمال کی باز پرس ہوگی۔ اور نماز جیسی نعمت کی قدر وہاں جا کر معلوم ہوگی۔ اور انہیں یہ بھی یقین ہے اَنَّهُمْ اَنَّهُمْ رَاجِعُونَ کہ انہیں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ اَلْاُمُورُ "تمام چیزوں کا رجوع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے"۔ وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی "اللہ ہر چیز کی انتہا بھی وہیں ہوگی۔ چونکہ عاجزی کرنے والوں کا ان باتوں پر یقین ہے۔ اس لیے وہ نہایت خوشی اور ذوق و شوق کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔ ان پر یہ بھاری نہیں ہوتی۔

الۃ

البقرة

بِسْمِ رَبِّكَ

(آیت ۴۴، ۵۰)

يٰۤاَيُّهَا اِسْرٰٓئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ  
وَلِيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۴۴) وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِيْ  
نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ  
مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُوْنَ ۝ (۴۵) وَذُحِّجْنَاكُمْ مِّنْ  
اَلٍ فِرْعَوْنَ يَكُوْمُوْنَكُمْ سُورَ الْكَذٰبِ يُذَرِّجُوْنَ اَبْنَاءَكُمْ  
وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ  
عَظِيْمٌ ۝ (۴۶) وَاذْ فَرَقْنَا بِكُمْ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنَاكُمْ  
وَاعْرَقْنَا اَل فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ (۴۷)

ترجمہ : اے اسرائیل کی اولاد! یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر

انعام کی اور یہ کہ میں نے تم کو فضیلت بخشی جہاں دلوں کے متلبے میں ۝ (۴۴)

اور ڈرو اس دن سے کہ نہیں بچائے گا کوئی نفس دوسرے نفس سے کچھ بھی اور

مذہبوں کی جائے کی اس سے سفارش اور نہ یہ جائے اس سے فدیہ اور نہ ان کی

مدد کی جائے گی۔ ۝ (۴۵) اور میں وقت کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم کو نجات دی فرعون

دلوں سے۔ وہ چلتے تھے تم کو بہت بُری نذر۔ وہ ذبح کرتے تھے تمہارے

بیٹوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے۔ تمہاری عورتوں کو اور اس بات میں آزمائشیں

تھی تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی ۝ (۴۶) اور اس بات کو یاد کرو جب ہم نے

تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا تھا۔ اور ہم نے تمہیں نجات دی اور اہل فرعون کو غرق کیا۔

اور تم دیکھ رہے تھے۔ ۝ (۴۷)

پسے رکوع میں اقبال تھا۔ اب یہاں سے اللہ تعالیٰ نے تفصیل کے ساتھ نبی اسرائیل

پر آیات

کا ذکر کیا ہے۔ اور انہیں وہ انعامات و معجزات یاد دلانے ہیں جو ان پر ظاہر کیے گئے تھے۔

نزدیک قرآن کے زمانے کے نبی اسرائیل کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ ایمان قبول کریں نیز اس

قوم میں پیدا ہونے والی چیزوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ اہل ایمان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی روش سے نہ چمکتے۔ میں کہیں ان کی غریبوں میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ فرعون کی خلافت میں عرصہ دراز تک رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بے شمار غریبیاں اور سرکشی کا مادہ پیدا ہو گیا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مینہر بنی اسرائیل سلامت شریعت رہے۔ سرکشی کا جو مادہ اس قوم میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بقیہ رہا۔ یہ سب باتیں ان آیات سے واضح ہوں گی۔

اسرائیل کا معنی خدا کا بندہ ہے۔ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے  
 لَبِئْسَ مَا كُنْتُمْ يَدْعُونَ فَذَكَرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْهِمْ وَأَنَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ  
 اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات میں بنی اسرائیل کی خلافت سے  
 ان کی بکثرت قوم انہیں برتری دینا اور ان میں کثرت سے نبی بھیجنا وغیرہ شامل ہیں اور دوسری بات  
 یہ کہ وہ اپنی فضیلت کو علیٰ الظہیر میں جہاں دلوں پر فضیلت بخشی ہو وہاں  
 میں آتا ہے۔ اِذْ جَعَلْنَا فِيكُمْ رُسُلًا وَجَعَلَكُمْ مَسَاجِدَ فَذَكَرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْهِمْ  
 احسان کو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر بڑے بڑے بادشاہ پیدا کیے۔ اور کثرت سے انبیاء مبعوث  
 فرمائے۔ اور تم کو وہ چیز عطا کی جو جہاں دلوں میں سے کسی دوسری قوم کو عطا نہیں کی۔

یہاں پر بنی اسرائیل کی تباہی دلوں پر فضیلت سے یہ مراد نہیں ہے کہ انہیں غنور اور  
 عمل اللہ علیہ وسلم کی امت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ قرآن پاک میں وضاحت سے یہ بات  
 کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو سب سے زیادہ فضیلت بخشی ہے۔ اور اس فضیلت  
 کا تحقق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی۔ گویا دونوں جہانوں میں امت محمدیہ کی فضیلت مسلم  
 ہے۔ بنی اسرائیل کی فضیلت سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنے دین میں دینی اور دنیوی ہر دو دنیا  
 سے باقی تمام عالم پر برتری حاصل تھی۔ اُس زمانے میں اس قوم میں صد حجت بھی پائی جاتی تھی۔  
 اور اُن کی حقیقت بھی مستند تھی۔ ایک خاص چیز جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے  
 کہ اس قوم نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ بائبل کا ایک بڑا حصہ تاریخ بنی اسرائیل  
 پر مشتمل ہے۔ ہر فرد اس کے بندہ قوم ہزاروں برس تک برسرِ اقتدار رہی ہے۔ بڑے بڑے  
 چھوٹے مرنے قہقہے کہانیوں کے بندہ دلوں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اپنی یہ خامی خود بندہ بھی

بنی اسرائیل  
 کی فضیلت

تسلیم کرتے ہیں۔ گویا بنی اسرائیل کے دور میں جو دوسری اقوام موجود تھیں، ان میں سے کسی کی تاریخ بھی محفوظ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل ہی ایک واحد قوم ہے جس کی تاریخ ملتی ہے۔

اسلامی تاریخ  
کی حفاظت

البتہ جب حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا زمانہ آیا تو انہیں علمی لحاظ سے بھی برتری حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی تاریخ کو بھی محفوظ کر لیا۔ انہیں زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ مگر جب یہ امت بھی زوال پذیر ہوئی۔ تو اس کی حیثیت بھی دنیا کی دیگر زوال پذیر اقوام سے مختلف نہ رہی۔ موجودہ دور کے مسلمان کو اپنی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ نہ اپنی تاریخ کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔ اور نہ اپنی کتاب کی تشریح اور تفسیر معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ مسلمانوں کے زمانہ عروج کی تاریخ تو آج بھی موجود ہے۔ اسلام نے بڑے بڑے مروج پیدا کئے۔ جنہوں نے اپنے ذریعے دور کے ایک ایک لمحے کو اپنی کتابوں کے اوراق میں محفوظ کر لیا۔ ان مؤرخین میں علامہ طبری، تیسری صدی ہجری میں ہوئے ہیں: ابن خلدون اور ابن کثیر، آٹھویں صدی کے مؤرخ ہیں۔ ابن اثیر، جنہوں نے تاریخ اور دیگر علوم کو محفوظ کیا۔ جو مؤرخ بھی ہیں۔ اور تاریخ دان بھی۔ مگر آج ہمیں جو اپنے اکابر کے جمع کردہ علمی ذخیرہ سے بھی خاطر خواہ استفادہ نہیں ہو پاتے جبکہ انگریز کی جدت پیدا ہوئی ہے۔ اس نے مسلمانوں کو ان کی اپنی تاریخ سے بے بہرہ کر دیا ہے آج مسلمان اپنی تاریخ کو فراموش کر چکا ہے۔ اسے اب یورپ کے افراد پر فخر ہے۔ ان کی تاریخ کو حفظ کرتے ہیں۔ اپنی تاریخ سے نہ تو واقفیت پیدا کی جاتی ہے۔ اور نہ اسے محفوظ کرنے کی جگہ دیا جاتا ہے۔

امت مسلمہ  
کی برتری

ہر حال یہ چیز بنی اسرائیل کے خصائل میں سے ہے۔ کہ انہوں نے اپنی تاریخ کو محفوظ کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فضیلت بخشی اور فرمایا کہ میں نے تمہیں عاقبت پر فضیلت بخشی۔ یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ عالمین سے مراد اقوام عالم ہیں۔ اور اس سے صرف انسان مراد ہیں۔ کیونکہ دنیا کی باقی اشیاء تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے پیدا فرمائی ہیں۔ **خَلَقَ لَكُمْ** **فِي الْأَرْضِ** **كُلَّ شَيْءٍ** **لَّعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ**۔ لہذا برتری صرف انسان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو اپنے زمانہ میں اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ یہ فضیلت مطلقاً ہر زمانے کے لیے نہیں تھی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: کہ میری امت سب امتوں سے



بعد میں آنے والے سے ہر قیامت کے دن سبک آگے ہوگی۔ ان کا حساب و کتاب بھی ہائی  
 موتوں سے پہلے ہوگا۔ اور جنت میں بھی سب سے پہلے جائیں گے۔ انہیں باقی تمام امتوں پر برتری  
 حاصل ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان پر کیے گئے افسوسناک حادثات یاد دلانے کے بعد فرمایا: **وَالْقَوْمُ**  
**يَوْمَ لَا يَجْنِزِي نَفْسًا عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا** اور اس دن سے دوسرے دن کوئی نفس نہ بچے  
 گا۔ دوسرے نفس سے کچھ نہیں۔ بہت ہی خوفناک اور خطرناک دن آنے والا ہے۔ ہر نفس کو  
 اپنے عقیدے اور عمل کے مطابق بھگتنا پڑے گا۔ یاد رکھو اس دن انسان کی برتری تقویٰ کے  
 اعتبار سے ظاہر ہوگی۔ تقویٰ کی تشریح میں شیخ عبد حامد حیدریؒ نے یہ آیت پڑھی تھی: **إِنَّ**  
**الْمَلَائِكَةَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِنْسَانُ لِرَبِّهِ لَافٍ** ذی القربیٰ وینہی عن  
**الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ** تقویٰ بہت کہ انسان عدل و احسان کا دامن تھام لے۔ قربت  
 داریوں کے حق ادا کرے اور غش اور بے حیائی کی باتوں سے بچتا ہے۔ غصہ سے ارجل میں  
 اپنوں اور بیکانوں سے عدل لازم ہے۔ اور احسان تو بڑی منزل ہے۔ حقوق کی ادائیگی —  
 اس سے بھی آگے ہے۔ یہ تمام چیزیں تقویٰ میں شامل ہیں۔

**وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةً** اور نہ اس نفس سے سفارش قبول کی جائیگی۔  
 شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مطلق سفارش کی نفی کی گئی ہے، حالانکہ سفارش  
 بہ حق ہے۔ قرآن و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ سفارش ہوگی۔ اس مقام پر جس سفارش کی نفی کی  
 گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کافر کے حق میں سفارش معنی نہیں ہوگی کسی کافر سے  
 سفارش قبول نہیں کی جائیگی۔ جنوریہ السلام نے فرمایا: میری سفارش بہ حق ہے۔ اور بہیر قیامت  
 کے ہر اس شخص کو پہنچے گا **مَنْ لَا يُشِيرُنَا بِاللَّهِ شَيْئًا** جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کوشش میں  
 نہیں جاتا۔ مگر کافر کے حق میں یہ بالکل قبول نہیں ہوگی۔ البتہ اگر کسی کی فطرت پاک ہوگی حیدر  
 صیح ہوگا۔ مشرک اور کافر نہیں ہوگا۔ تو سفارش معنی ہوگی یہ **مَنْ لَا يَنْتَفِعُ عُنْدَ**

برتری کا معیار  
 تقویٰ ہے

سند شفاعت

بِإِذْنِ اللَّهِ تَعَالَى كِى اجازت کے بغیر بھی کوئی سفارش نہیں ہوگی۔ سفارش کی دوسری شرط یہ ہے  
 کہ رضی اللہ عنہ قوتِ سفارش اس کے حق میں ہوگی جس کا عقیدہ اور بات اللہ تعالیٰ کو پسند  
 ہوگی۔ فاسد عقیدہ انسان کے ہاتھ میں سفارش کا کوئی مکان نہیں۔

حضرت شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں کہ ایک وقت یہاں بھی آئے گا۔ تیس وقت اجل  
 کوئی چیز غصہ نہیں ہوں۔ تشریں جوئی بڑی تیز ہیں آئیں گی۔ جب قمری تجلی زور سے نازل ہو رہی  
 ہوگی۔ تو جب یہ عیسو سوداگر بنی فہر جائیں گے۔ عدیث میں آتا ہے کہ نفسی نفسی پکاریں گے اس  
 موقع پر سفارش کہاں ہوگی۔ ہاں جس درجہ سے مواقع پر دو شرط کے ساتھ سفارش ہوگی کہ اللہ  
 تبارک و تعالیٰ کی اجازت ہو اور جس کے حق میں سفارش کی جا رہی ہے۔ اس کا عقیدہ صحیح ہو۔

فرمایا اُس دن سے ڈرو جس دن سفارش بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ وَلَا يُؤْخَذُ  
 مِنْهَا عَدْوٌ اور جس دن فدیہ بھی قبول نہیں کیا جائے گا۔ کہ کوئی شخص فدیہ سے کہ اپنی  
 جان چھڑا سکے۔ یہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔ دوسری بکواسفوت ہو رہے کہ اگر کوئی شخص سونے کی  
 بھری ہوئی پوری زمین بھی فدیہ دیکر اپنی جان بچانا چاہے گا۔ تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اول تو اتنا  
 مال و دولت، سونا، چاندی کیا ہونا ہی ناممکن ہے۔ اللہ اگر بالفرض ایسا بھی جائے۔ تو اتنا بڑا  
 فدیہ بھی کسی کا رہا آئے گا۔ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ اور نہ کسی طرف سے ان کی مدد ہوگی۔ دنیا  
 میں کسی کو چھڑانے کے یہی طریقے ہیں۔ کیس سفارش چل گئی کیس فدیہ یا نذرانہ دے دیا کیس جہانمندی  
 کرنا۔ مگر میدانِ حشر میں ان میں سے کوئی چیز بھی کام نہ آئے گی۔

بعض لوگوں نے سفارش کا عقیدہ بالکل ایسا بنایا ہے۔ جیسے عیسائیوں نے کفار سے  
 کا عقیدہ بنا رکھا ہے۔ یہ غلط عقیدہ ہے۔ سفارش حقیقت میں انسان کے عقیدہ سے اور اعمال  
 کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہودیوں نے بھی غلط امیہ بنا رکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام  
 دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔ اور وہ کسی ختمہ کے بونے اسرہیلی کو دوزخ میں  
 نہیں گرنے دیں گے۔ ہم جو چاہیں کرتے رہیں۔ دوزخ میں نہیں جاسکتے۔ آگے آ رہا ہے کہ



مردوں کے قتل اور عورتوں کے زندہ رکھنے کا عمل بنی اسرائیل کے ساتھ دودھ میں آگ۔ پہلی دفعہ یہ ظلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ڈھایا گیا۔ جب بچہ یوں نے پیش گوئی کی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو فرعون کی سلطنت کے زوال کا باعث بنے گا۔ اُس وقت فرعون نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی بچہ پیدا ہو۔ اُسے ذبح کر دیا جائے اور اُسے زندہ نہ چھوڑا جائے۔ مگر جب موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے گھر میں ہی اُن کی پرورش کی۔ اور وہ سارے واقعات پیش آئے جو سورۃ قصص میں مذکور ہیں۔

ظلم کی اس چکی میں کتنے بچے پسے۔ اسکے متعلق مختلف روایات آتی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اُس وقت تو سب بڑے بچے ذبح کئے گئے۔ ظلم و جبر کی یہ انتہا تھی۔ اُن والدین کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ جس کے سامنے ان کے نومولود بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ ایسے والدین کی پریشانی کا کیا حال ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اُس احسان کو یاد کرو۔ جب میں نے تمہیں اس ظلم سے نجات دی۔

بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کا دوسری دفعہ ظلم فرعون نے اُس زمانے میں دیا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی بن کر آئے اور تبلیغ کا کام شروع ہوا۔ اس وقت فرعون کو دوبارہ خطرہ پیدا ہوا کہ بنی اسرائیل کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اسے کسی طرح کم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو۔ اُسے قتل کر دیا جائے۔ اور اگر لڑکی پیدا ہو۔ تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے۔ لڑکیاں ہماری خدمت گزار ہی کے کام آسکیں گی۔

فرمایا وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑا امتحان تھا۔ بنی اسرائیل کے لیے واقعی یہ بہت بڑی آزمائش تھی کہ اپنے سامنے بچوں کو ذبح کرنا اور وہ کس طرح اس امتحان میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ جب بنی اسرائیل اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔ بہت اور حوصلہ زچھوڑا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس ظلم سے نجات دے دی۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دوسرا بڑا احسان یہ بتلایا کہ اِذَا فَرَغْنَا مِنْكُمْ  
 الْبَحْرَ فَمَا يَكُونُ لَكُمْ اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا۔ اور تم کو نجات دی۔ بنی  
 اسرائیل جب ہجرت کر کے مصر آئے تھے۔ تو اس وقت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کے  
 بڑے آدمی تھے۔ چار پانچ صدیوں کے بعد جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو اس وقت  
 بنی اسرائیل کے تعداد تقریباً چھ لاکھ ستر ہزار ہو چکی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا  
 کہ میرے ان بندوں کو لے کر یہاں سے نکل چلیں۔ آپ نے اپنی قوم سے مشورہ کیا اور طے  
 پایا کہ بغیر اطلاع یہاں سے نکلنا درست نہیں بلکہ فرعون سے اجازت حاصل کر لینی چاہیے۔  
 چنانچہ انہوں نے فرعون سے اجازت طلب کی کہ مجھ پر کسی تقریب میں جانا چاہتے ہیں۔ اجازت  
 مل گئی۔ انہوں نے فرعونوں سے زیورات وغیرہ بھی حاصل کر لیے۔ کہ ایک خاص تقریب میں  
 شامل ہونا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل سفر پر روانہ ہو گئے۔ سارا دن گزر گیا۔ اگلی رات فرعونوں کو  
 احساس ہوا کہ کہیں بنی اسرائیل بالکل ہی نہ چلے جائیں۔ ان کا پتا کرنا چاہیے۔ فرعون نے تعاقب  
 کا حکم دے دیا۔ ایک دن شکر کی تیاری میں گزر گیا۔ اور دوسری رات بھی گزر گئی۔ بنی اسرائیل  
 مسلسل چلتے رہے۔ سب سے شرق کی جانب بیکرہ قلمز آتا ہے۔ اس کو عبور کرنے کے بعد  
 صحرائے سینا آتا ہے۔ یہ بارہ کوس کی مسافت ہے۔

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ فرعون کا لشکر بارہ لاکھ افراد پر مشتمل تھا۔ شاہ رفیع الدینؒ  
 فرماتے ہیں کہ شہزی اور بازاری لوگ ملا کر کل نفری ساٹھ لاکھ کے قریب تھے۔ اور جب  
 بنی اسرائیل بیکرہ قلمز کے کنارے پر پہنچے تو پتا چلا کہ پیچھے فرعون لشکر لے کر آ رہا ہے بڑے گھبرائے  
 کہ اب تو ہم بچنے کے بجائے جاؤں گے۔ اور ہم میں سے ایک شخص بھی زندہ نہیں بچے گا۔ موسیٰ علیہ السلام  
 نے بنی اسرائیل کو تسلی دی کہ گھبراؤ مت۔ اِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِيْنِ بیشک میرا رب میرے  
 ساتھ ہے۔ وہ ضرور راہنمائی کرے گا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا اَنْ اصْرِبْ بِقَصَاةِ  
 الْبَحْرِ۔ یعنی اے موسیٰ اپنی رہتی سے سمندر میں بارہ جگہ ضرب لگاؤ۔ بنی اسرائیل کے بارہ

قبیلے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارہ مقامات پر ضرب مکانی اور بارہ  
ستے کمند میں بن گئے۔ بارہ کوس کے بستے میں پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ گود پانی  
منجمد ہو گیا۔ اور ان بارہ راستوں کی درمیانی دیواریں کھڑکیں بھی بن گئیں۔ تاکہ دریاں نہ ٹریں  
قبیلے کے لوگ دوسرے قبیلے والوں کو چھو بھی نہ سکیں۔ یہ سب چھو مجربہ طور پر ہوا جس کی تفسیر قرآن  
پاک اور تفسیر میں موجود ہے۔ مگر سریشہ دریا دریا کی طرف سے آیا کرتے ہیں۔

بہر حال تمام قبیلے اپنے اپنے راستوں پر روانہ ہوئے۔ نتیجے سے فرعون کا لشکر بھی ان  
پہنچا۔ انہوں نے دیکھا کہ پانی میں رستے بنتے ہوئے ہیں۔ اور بنی اسرائیل ان راستوں پر مدلل  
دواں میں۔ فرعونی کھوڑوں پر سوار تھے۔ لکڑی کے گھوڑے پانی میں تھن کے پتے تیار نہ  
تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو کھوڑی پر سوار کر کے بھیجا۔ آپ آگے چلے۔ کھوڑی  
کی بوسٹھ کر فرعون و کھوڑا بھی پیچھے کیلے چل پڑا۔ میسائیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرعون کے  
ساتھ لشکر کو پیچھے روک چنانچہ انہوں نے کہا کہ دیکھو بنی اسرائیل تمہارے ہاتھوں سے نکلے  
جانتے ہیں۔ تعاقب کر کے ان کو پھڑ پھڑا کر پانچ سو سالہ لشکر پانی میں بنے ہوئے راستوں پر چل نکلا  
بنی اسرائیل بارہ کوس مسافت طے کر کے کمند سے پار ہو گئے۔ اور فرعون کا سارا لشکر پانی میں  
بنے ہوئے راستوں کے درمیان آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: **فَغَرَبْنَا نَهُمْ مِنْ قِبَعِهِمْ**  
**فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ** پھر پانی کی موجوں نے انہیں اس طرح گھیر کر ان میں سے ایک جی زندہ نہ  
بچا۔ صرف فرعون کی ریش کو پانی نے عبرت کے لیے باہر بھینک دیا۔ اسی واقعہ کو یاد رکھتے  
ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرود: **وَأَعْرَضْنَا عَنْ فِرْعَوْنَ إِذْ جَنَّاتٍ مِنْ تَحْتِهَا نَاقُورٌ مِنْ نَارٍ**  
**وَالْجِبَالُ سَوْدَاءُ** اور یہ سب کچھ بتا دی انھوں نے سنا۔ یہ میرے سن، حسان کو یاد کرو۔ جب تمہارے  
یہ منہ ہیں۔ ستے بنائے ہیں کے ذریعے تمہارے کمند کو جو کرنا اور فرعونوں کے نجات پانا۔  
مگر اس پانی میں فرعون کے ساتھ لشکر کہ تمہارے سامنے غرق کر دیا۔ ان معانات کو یاد دلانے کا مقصد  
یہ تھا کہ اب بھی اسی برائیوں سے باز رہنا۔ اور اُس دن سے ڈرنا۔ جس دن نہ کئی سفارش کام آئے  
اور نہ کسی سے ذریعہ سبوتا کیا جاسکے۔ اور جو کچھ میں نے تمہارے اُپر نازل کیا ہے اس پر ایمان رکھو۔

سے تعبیر خاتون بی بی صفی بی بی: اور اس تفسیر میں



وَإِذْ وَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ أَخَذْنَا الْعِجْلَ مِنْ  
بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ سَفَرْنَا عَنْكُمْ مِثْرًا  
ذَلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَىٰ الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ  
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ وَإِذْ قَارَأَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقْرَأُكُمْ  
ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ  
فَاقتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ بَارِئِكُمْ  
فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾

ترجمہ: اور اُس وقت کو یاد کر جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس  
رات کا وعدہ کیا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنایا۔ اور تم ظلم کرنے لگے  
تھے ﴿۵۱﴾ پھر ہم نے معاف کیا تم کو اس کے بعد تاکہ تم شکر یہ ادا کرو ﴿۵۲﴾ اور  
اس بات کو یاد کر جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان تاکہ تم ہدایت  
پا جاؤ ﴿۵۳﴾ اور اس واقعہ کو یاد کر جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا۔  
اے میری قوم! تمہارے لوگو! بے شک تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ جو بنیائے کے  
بچھڑے کو معبود۔ پس توبہ کرو اپنے پیہ کرنے دے کے سامنے۔ پس قتل کرو  
ایک دوسرے کو۔ یہ توبہ جتنا ہے پیہ کرنے دے کے پاس۔ پس اُنہی نے رجوع  
کیا تمہارے اوپر بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے ﴿۵۴﴾

نزل تورات  
اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جو انعامات فرمائے ان کا ذکر مسلسل آ رہا ہے۔ فرعون کی غلامی  
سے نجات دلانے، دریا کو بھاڑ کر عجیبہ طور پر پانی میں راستے بنانا، اور بنی اسرائیل کو بچانا اور پھر  
فرعون اور اس کی قوم کی جلالت وغیرہ کا ذکر آچکا ہے۔ اس دس میں بعض مزید انعامات کا تذکرہ  
ہے۔ منجملہ ان کے بنی اسرائیل کو کتاب اور شریعت عطا کرنا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَرَدُوعَ نَا مُوسَىٰ رُبْعَيْنَ لَيْلَةٍ اِس بات کو دھیان میں لاؤ جب کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ کوہ طور پر چالیس رات تک تنہائی میں اعتکاف کریں۔ قرآن پاک میں ہے کہ اصل وعدہ ایک مہینہ کا تھا۔ مگر بعد میں بڑھا کر چالیس رات کر دیا گیا۔ وعدہ یہ تھا کہ مسلسل چالیس رات کے اعتکاف کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جائے گی۔ اور یہ اس وقت کا واقعہ ہے۔ جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کر چکے تھے۔

وَعَدْنَا بَابَ مَنْعِلِهِ كَالْمِغْذِ بِهٖ۔ اور اس کا معنی بھی وَعَدْنَا ہی ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عظیم اور جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بنی رسول اور صاحب شریعت تھے۔ نہ تعالیٰ کے خلیفہ بھی تھے۔ لفظ موسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ جسے عربی میں ڈھال یا گیا ہے۔ عبرانی زبان کا اصل لفظ هِيت تھا۔ معنی کا معنی پانی اور شا کا معنی درخت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن میں پانی میں بہتے چلے آئے تھے۔ جب انہیں اٹھایا گیا وہاں درخت بھی موجود تھے۔ اس بنا پر آپ کا نام میثا اور پھر عربی میں موسیٰ بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے سولہ سو سال پہلے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر مبارک یک سو تیس سال تھی۔ اسی عمر میں یہ سائے واقعات پیش آئے۔ آپ کے والد کا نام عمران تھا۔ آپ کا شجرہ نسب اس طرح ہے موسیٰ بن عمران بن بصیر بن فاہش بن لاوی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم لاوی یعقوب علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور عرف عام میں بڑا بیٹا بن ریاست اور نیابت کا وارث ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے موسیٰ علیہ السلام کو دونوں حیثیتیں حاصل تھیں۔ حقیقی ریاست یعنی نبوت بھی ان کو حاصل تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی اور رسول بنایا۔ اور عام ریاست یعنی نیابت بھی بڑا ہونے کی حیثیت سے آپ کو ہی حاصل تھی۔

فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل کو احساس ہوا کہ وہ اب آزاد ہو چکے ہیں۔ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ لہٰذا ان کے پاس اپنا قانون ہونا چاہیے۔ جس سے وہ رہنمائی حاصل

کریں۔ اور اس کے مطابق زندگی بسر کریں۔ چنانچہ قوم کی خواہش پر موسیٰ علیہ السلام نے رب العزت کی بارگاہ میں عرض کی کہ ہمیں کوئی قانون عطا کیا جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ کہ طور پر آکر چالیس دن کا اعتکاف کرو۔ تو تمہیں کتاب دی جائے گی۔ جو تمہارے لیے مکمل قانون ہوگی۔

تفسیر معالم التنزیل اور بعض دیگر تفاسیر میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ بنی اسرائیل بحر قلزم کو عبور کر کے صحرائے سین میں وارد ہوئے اور انہوں نے چالیس سال میدان تیر میں گھومنا شروع کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات بھی وہیں ہوئی۔ بارون علیہ السلام بھی اسی مقام پر فوت ہوئے۔ تاریخ سے بھی یہ چیز ثابت ہے کہ چالیس سال تک بنی اسرائیل صحرائے سینا میں ہی محصور رہی کرتے رہے۔ یہ لوگ مصر کی طرف نہیں گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا تھا کہ اگرچہ مقدس پر حمد کرو۔ وہاں پر تمہیں قبضہ دیا جائے گا۔ مگر یہ لوگ اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ چالیس سال بعد نئی نسل نے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے ارض مقدس پر حمد کیا اور کامیاب ہوئے۔ اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نائب حضرت یوشع علیہ السلام منصب نبوت پر فائز تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت یوشع علیہ السلام کا ذکر آتا ہے۔ تو ان کے زمانے میں شام اور فلسطین پر بنی اسرائیل قابض ہوئے۔ اُس زمانے میں اس علاقے میں قوم عیالہ کی حکومت تھی۔

معالم التنزیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بحر قلزم کو پار کرتے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے قوم کے کچھ آدمیوں کو نصر کی طرف بھیجا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہاں کا انتظام کریں۔ ایمان نہ ہو کہ چور۔ ڈاکو، قزاق، مضہ وغیرہ ملک میں بد امنی پھیلا دیں۔ یہ بات اگرچہ عام روایتوں کے خلاف ہے تاہم اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بعض لوگوں کو وہاں بھیجا ہو مگر آپ خود وہاں نہیں گئے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کوہ طور پر محض ہوئے تو وہاں سے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن ملی۔

توراة کا لفظی معنی قانون ہے اور اس سے مراد قانون شریعت ہے۔ پہلے زمانے میں توراة بڑی عظیم المرتبت کتاب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ ایسی کتاب عنایت کروں گا۔ جسکی شریعت اور قانون قرون تک جاری رہے گا۔ آسمانی کتب میں سب سے اعلیٰ مرتبہ قرآن پاک کا ہے اور اس کے بعد توراة کا۔ جس طرح قرآن پاک میں قانون فوجداری، دیوانی، اخلاق، عبادات، معاش و غیرہ موجود ہیں۔ اسی طرح توراة میں بھی ہر قسم کے قوانین موجود ہیں جس طرح توراة کا معنی قانون ہے۔ انجیل کا معنی بشارت ہے۔ زبور کا معنی صحیفہ ہے۔ اور اس میں زیادہ تر دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن ہے۔ جس کا معنی پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ چنانچہ آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن پاک ہی ہے۔

حکمت نامی  
نعمت ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام ذوالقعدہ کی ابتداء میں کوہ طور پر معصوم ہوئے اور ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے توراة عطا کی۔ گویا پورا ماہ ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن آپ نے احکامات کیا۔ یہ چالیس دن کا بھی خاص اثر ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ مَنْ أَخْلَصَ لِلَّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا ظَهَرَتْ يَتَابِعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهِ كُلِّ لِسَانِهِ جس نے چالیس دن تک اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کیا۔ حکمت اس کے دل سے نکل کر اس کی زبان پر ظاہر ہو جائے گی۔ حکمت دانشوری کو کہتے ہیں اور یہ بڑی گہری بات ہے جسے نصیب ہو جائے۔ وَمَنْ يَكُنْ الْحِكْمَةُ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی۔ اُسے خیر کثیر مل گئی۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ ہمنے لقمان کو حکمت عطا کی۔ یہ لقمان اللہ والے ایک بزرگ تھے۔ نبی نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی ذہانت عطا کی تھی۔ تو مقصد یہ ہے کہ چالیس دن تک اخلاص پر تنے سے حکمت زبان پر جاری ہو جائے گی۔ حدیث شریعت کا یہ مطلب ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے۔ خُصِمَ طَيْنِ أَدَمَ أَرْبَعِينَ صَبَاحًا آدم علیہ السلام کو چالیس روز تک خمیر کی گئی۔ اور یہ اللہ کے سلسلہ میں بھی آتا ہے۔ کہ جب

۴۰ روز  
کی سخت

۱۔ معارف القرآن ج ۱ ص ۲۱۲۔ ۲۔ ابن کثیر ص ۱۹۰۔ ۳۔ فیض القدر شرح جامع صغیر ص ۱۲۱۔

۴۔ تفسیر عزیزی قادیانی ص ۲۲۹

حاصل قرار پاتا ہے تو پائیس دن تک قطع رہتا ہے۔ اس کے بعد علقہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کے چالیس دن بعد گوشت کا نو تھرا بنتا ہے۔ پچھ پائیس دن بعد اس میں روح انسانی ڈالی جاتی ہے۔ اس سے پختہ روح جوانی ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام عام طور پر پائیس دن کا پختہ کرتے ہیں پائیس دن روزہ بھی رکھواتے ہیں۔ اور عبادت بھی کر دیتے ہیں جس کا خاص اثر ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک خوبصورت عورت باجماعت نماز پڑھا کرتی تھی۔ کسی زحوان کی نظر پڑی تو اس پر عاشق ہو گیا۔ اس نے عورت کو ملاقات کا پیغام بھیجا۔ وہ بھی سمجھ گئی۔ کہ یہ شخص فتنے میں مبتلا ہو گیا ہے۔ وہ عورت کامل الایمان تھی۔ کتنے ہی کو میں تجھے ملاقات کا موقع اس شرط پر دینے کو تیار ہوں۔ کہ تم حضرت عمرؓ کے پیچھے پائیس دن تک نماز ادا کرو۔ اور یہ اس حالت میں ہو کہ تمہاری تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو۔ اس شخص نے سُنے نہایت آسان کام سمجھتے ہوئے نماز باجماعت شروع کر دی۔ ابھی دو روز ہی گزرتے تھے کہ اس میں تغیر آنا شروع ہو گیا۔ جب پائیس دن مکمل ہوئے تو اس شخص کی کایا ہی پٹ چکی تھی۔ اب اس عورت نے پیغام بھیجا کہ تمہاری شرط پوری ہو چکی ہے۔ تم اگر ملاقات کر سکتے ہو۔ تو ہونے لے جواب بھیجا کہ اب میری ملاقات اللہ تعالیٰ سے ہو چکی ہے۔ تمہاری ملاقات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ چالیس دن کے چلنے کا اس زحوان پر یہ اثر ہوا۔ اس کے بعد اس عورت نے اس واقعہ کا ذکر اپنے خاوند سے کیا۔ اور اس نے سارا واقعہ حضرت عمرؓ کو سنا دیا۔ آپؓ فرمایا صَدَقَ اللہُ تَعَالٰی اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا اِنَّ لَصَلٰوۃَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاۃِ وَالْمُنْكَرِ بے شک نماز بے حیائی اور بڑے کاموں سے روکتی ہے۔ وہ پھر نماز بھی ایسی جو امیر المؤمنینؓ کے پیچھے ادا کی گئی ہو۔ سُبْحٰنَ اللہ اس کا کیا ہی اثر ہو گا۔ بہر حال پائیس کے مدد کا یہ خاص اثر ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام چالیس روز کے لیے کوہ طور پر مشرف ہو گئے تھے اَتَّخَذْنٰمُ الْبَیْطِلَ مِنْ اٰیٰتِہٖ ؕ اَنۡتُمْ تَعْبُدُوْنَہٗ ؕ اَلَمْ یَاۤتِکُمۡ بِالْبُرۡہٰنِ ؕ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ

بنی اسرائیل کی گمراہ پرستی

اور تم بڑے ظلم کرنے والے تھے۔ تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ تمہارے پاس ایک پیغمبر بھی موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود تم گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شرک میں طوط ہو گئے۔ حالانکہ "إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ" شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "وَالَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ أَعْتَمَوْا" کفر کرنے والے بہت بڑے ظلم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں دخل انداز کرتے ہیں۔ اس کی صفات میں شرک کرتے ہیں۔ یا اس کی عبادت میں شرک بٹھراتے ہیں۔ سورہ ظلمہ میں آتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے منع کرتے رہے۔ انہوں نے ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس قوم نے کوئی بات نہ مانی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ گوسالہ پرستی ہر قوم میں پائی جاتی ہے۔ یہ بہت سمجھ کر صرف بکھرے کی پوجا ہی شرک نہ فعل ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی پوجا کی جائے گی۔ وہ شرک ہی ہوگا۔ ترمذی شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ "فَعَسَىٰ عَبْدُ الْبَيْتِ بَنُو دِينَارٍ كَابَنِهِ بَنُو دُرَيْمٍ كَابَنِهِ بَنُو كَيْسٍ كَابَنِهِ"۔ اِنْ اُعْطِيَ رَضِيَ وَانْ كُفِرَ لَقَطَّ سَخِطًا اگر اے دے دیا جائے تو راضی ہو جاتا ہے۔ اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔ یہ دراصل درجہ و دنیا کی عبادت ہی تو ہے۔ اس کو بھی گوسالہ پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایک عام معمول ہے کہ جو چیز تجھے نہ تقاضے کی عبادت سے غافل کر دیتی ہے۔ وہ تیرا طاغوت ہے۔

مختلف ذہنوں نے  
اس پر دست  
اثرات

اس مقام پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہارون علیہ السلام جیسے نبی کی موجودگی میں بنی اسرائیل گوسالہ پرستی میں کیسے مبتلا ہو گئے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کی غالب وجہ یہ ہے کہ مصر میں صدیوں تک بتے ہوئے بنی اسرائیل نے مصریوں کے اثرات قبول کر لیے تھے۔ مفسرین لوگ سانپ کی پوجا کرتے تھے۔ لگنے کی پوجا کرتے تھے۔ اور سورج کی پوجا کرتے تھے۔ فرعون کا معنی ہی بڑا دیوتا ہے۔ اور یہ سورج کے نام پر بنایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مظاہر قدرت کی پوجا کرتے تھے۔ یہی چیز بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر چکی تھی۔ لہذا انہوں نے بھی بکھرے کی پوجا شروع کر دی۔



اقوام عالم کے ایک دوسرے پر اثرات تاہیجی طور پر ثابت ہیں۔ برصغیر کے شہان مندوں کے آثار سے بہت متاثر ہوئے۔ ہندوؤں کی بہت سی دیکھیں شکل زوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مرنے والے کا تیجا۔ ساتواں۔ چالیسواں وغیرہ ہندوانہ رسوم ہیں۔ ورنہ تہذیبوں کو ان دیکھوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل چونکہ منہ یوں کے غلام تھے۔ لہذا ان کے اثرات بنی اسرائیل میں بھی سرایت کر گئے۔ موجودہ زمانے میں دیکھ لیں جو قومیں انگریزوں غلامی میں رہی ہیں۔ وہ سب ان کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہیں۔ مشرقی ممالک میں سے ایرانیوں۔ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے ان کا بڑا اثر قبول کیا ہے۔ یہی حال عربوں مصریوں اور شامیوں کا ہے۔ بعینہ منہ یوں کی عادات بنی اسرائیل میں سرایت کر چکی تھیں۔ لہذا موقع ملے ہی انہوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔

بعض سرکاری اصولی عقیدہ کہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز میں حلول کر جاتا ہے۔ اور اس شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے ہندوؤں میں اوتار کا عقیدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فلاں کی شکل میں ظاہر ہو گیا ہے۔ یا فلاں جہت میں اس نے ظاہر کر لیا ہے۔ تو اسی قسم کے غلط عقیدہ کی بنیاد سامری بہت انہیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن میں موجود ہے۔ سامری نے کہا: **هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ آبَائِكُمْ** یعنی تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا الہی ہے اللہ تعالیٰ اس بچھڑے میں صوں کر آیا ہے۔ لہذا اس کی پوجا شروع کر دو۔ بچھڑے نے بون تو شروع کر ہی دیا تھا۔ جمال قسم کے بنی اسرائیل سامری کی باتوں میں آگے۔ اور انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔

باقی رہا یہ سوال کہ سامری نے یہ کڑمہ کیسے ظاہر کر دیا۔ تو یہ شخص میک۔ سٹریڈز یا جادوگر تھا۔ وہ مختلف قسم کے ٹوک جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے چال بازی سے کام لیا۔ جب فرعون کا لشکر بنی اسرائیل کے تعاقب میں بحیرہ قلزم پر پہنچا اور ان کے گھوڑے گمراہ میں اترنے سے ہچکچائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو گھوڑی پر سوار کر کے بیسی جوشکر فرعون کے آگے چل نکل۔ سامری نے دیکھا کہ جس جگہ پر جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کا پاؤں ٹپکتا ہے وہاں فوراً سبزہ اُگ آتا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس میں کوئی کڑمہ ہے۔ اس نے گھوڑی کے پاؤں کی جگہ کی گھوڑی کی منی ٹھونڈ کر لی۔ وہ سب ترقتا ہی۔ اس نے سونے کا بچھڑا بنایا۔ اور اس کے منہ

میں وہ مٹی رکھ دی۔ جس کی وجہ سے پھر طے سے بولنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے مشورہ کر دیا۔  
کہ خدا تعالیٰ اس میں حلول کر آیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام  
کی واپسی

موسیٰ علیہ السلام چالیس روزہ اعجاز کے بعد اللہ تعالیٰ کی کتاب لے کر واپس آئے  
تو دیکھا کہ کئی لوگ شرک میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ آپ سخت ناراض ہوئے۔ مشرکین کو زجر کیا۔  
پس بھائی ہارون علیہ السلام سے بھی بڑے ناراض ہوئے کہ آپ نے قوم کو شرک میں مبتلا ہونے  
سے کیوں نہ روکا۔ بھائی نے غصہ پیش کیا کہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو انہیں ہر چند شرک  
سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر یہ تو میرے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ "وَكَادُودًا يَقْتُلُونَنِي"  
یہ سارا فقرہ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ لوگ آپ کی بات  
نہیں مانتے تھے۔ تو آپ ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ اس کے جواب میں ہارون علیہ السلام  
نے کہا کہ میں نے تفریق کو پسند نہ کیا۔ کہ آپ واپس آکر اعتراض کرتے کہ قوم کو دو ٹکڑوں  
میں کیوں تقسیم کر دیا۔ ان میں پارٹی بندی پیدا کر دی ہے۔ لہذا میں نے انہیں کے درمیان رہتے  
ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر ان بدتمیزوں نے میری بات نہ مانی۔

پھر طے کے  
پجاریوں کا  
قتل

جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو خوب ڈانٹا تو وہ پشیمان ہو گئے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ  
انہوں نے غلط کام کیا ہے۔ اور اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ تو عرض کیا کہ ہمارے اس جرم کا ازالہ کس  
طرح ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْهُنَّ اَجْدَدَ لِمَا لَعَلَّكُمْ  
تَشْكُرُونَ" ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ تمہاری توبہ قبول کر لی مگر بڑے  
سخت طریقے سے جیسا کہ آیت میں آیا ہے۔ "وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ  
جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور فرقان یعنی فیصلہ کن طاقت یا معجزات عطا کیے  
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا "وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ امْكُثُوا  
فَلَمَّتُمْ أَنْفُسَكُمْ" میری قوم کے لوگو! تم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا ہے۔  
پاؤں کا رخ نہ کرنا کہ ایک پھر سے کو مجبور بنایا ہے۔ "فَتَوَلَّوْا إِلَى بَارِئِكُمْ"  
پس توبہ کر اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے اور یہ توبہ صدق دل سے ہونی چاہیے۔ محض بنانی

توبہ قابل قبول نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا طریق کار یہ متعین فرمایا کہ فَاَقْتُلُوا اَنْفُسَكُمْ اپنی ہی جانوں کو قتل کرو۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ مشرکوں کو قتل کر دیں۔ اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی۔ فرمایا یہ بظاہر بہت بڑا امتحان ہے کہ تم خود ہی ایک دوسرے کو قتل کرو مگر یاد رکھو ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عنہ بَارِبْكُمْ یہ بات تمہارے پیہ کرنے والے کے نزدیک بہتر ہے۔

الغرض حضرت ہارون علیہ السلام اپنے ان بارہ بھائیوں کو لے کر آگئے جنہوں نے پکھڑے کی پوجا سے اجتناب کیا تھا۔ اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ قواریں تھیں۔ ہارون علیہ السلام ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اور کہا يَا مَعْشَرَ بَنِي اِسْرَآئِيْلَ اِنَّ خَيْرَ لَّكُمْ اَنْتُمْ شَاهِرِيْنَ سِيَوْفَهُمْ يُرِيدُوْنَ اَنْ يَّقْتُلُوْكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاصْبِرُوْا یعنی اے بنی اسرائیل کے گروہ۔ یہ تمہارے بھائی برہنہ قواریں لیے تمہارے قتل کے لیے آئے ہیں۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔ اپنے قتل میں مزاحمت نہ ہونا۔ چنانچہ ہارون علیہ السلام کے بھائیوں نے قواریں چلانا شروع کر دیں ان کے پٹے ہی عزیز واقارب مائے گئے۔ ہیشمار لوگ قتل ہوئے۔

فرمایا جب یہ شرط پوری ہوگئی تَرَفَّتْ اَبْعَابُ اللّٰهِ تعالیٰ نے توبہ قبول کر لی اِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے توبہ کی قبولیت کا فائدہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل قتل ہو کر آخرت کے دائمی عذاب سے بچ گئے۔

الْقَلَمِ  
درس بہت در

البقرة  
(آیت دوم تا دہم)

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نُؤْمِنَ بِكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ إِلَٰهَ جِهَنَّمَ فَلَاخِذْكَ  
الْعَصِيقَ ۚ إِنَّكَ تَنْظُرُونَ ۝۵۵ ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَيْنِ  
مَوْتِكَمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝۵۶ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ  
الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوَىٰ ۚ كَذَٰلِكَ  
طَبَّيْتُ مَا رَزَقْتُمْكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ  
يَظْلِمُونَ ۝۵۷

ترجمہ: اور جب تم نے کہاے موسیٰ! ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے یہاں

تک کہ ہم دیکھ لیں اللہ کو ظاہر پس پھر یہ تم کو کھلی سے اور تم دیکھ رہے تھے ۝۵۵

پھر اٹھایا ہم نے تم کو تمہاری موت کے بعد تاکہ تم شکر د کرو۔ ۝۵۶ اور ہم نے تمہارے

دو پر بادل کا سایہ کر دیا۔ اور تمہارے اوپر من اور سلویٰ اتارا۔ لکھا دو پائیزہ چیزیں جو تم نے

تمہیں روزی دی ہیں۔ در انہوں نے ہم پر ظم نہیں کیا۔ بعد وہ اپنی جانوں پر ظم کرتے تھے ۝۵۷

بنی اسرائیل کی غریبوں اور ان کی سرکشی کا ذکر آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر جو

رہنمائی

انعامات کیے ان کا ذکر بھی ہو گیا ہے۔ گزشتہ درس میں بیان ہوا تھا: وَإِذْ أَنۢبَا مُوسَىٰ

النَّبِیَّ وَالْمُرۡقَانَ ۚ یعنی اس وقت کو دھیان میں لاؤ۔ جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب

اور فیصلہ کن بات عنایت کی۔ اس سب سے خود بنی اسرائیل کے لوگوں نے خواہش ظہر کی

تھی کہ ان کے لیے کوئی ضابطہ حیات ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور

پر اسکاٹ جیٹھنے کی ہدایت کی۔ اور تکمیل اشکات پر اللہ تعالیٰ نے توراۃ عطا فرمائی۔

موسیٰ علیہ السلام کتاب توراۃ لے کر قوم کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے

روایت میں  
کیا ہے

تمہارے لیے یہ ضابطہ حیات دیا ہے۔ قوم نے کہا کہ ہمیں پڑھ کر سنا دیجئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے

کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ تو وہ کہنے لگے کہ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ

نے آپ کو دئی ہے۔ یا آپ خود بنا لائے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں اُسی واقعہ کی طرف اشارہ کئے گئے ہیں۔ اسرائیل کو خطاب ہے وَإِذْ قُلْتُمْ لِمُوسَىٰ اور اس وقت کو یاد کرو۔ جب تمہارے کہائے موسیٰ نے تمہیں ہم ہرگز آپ کی بات کی تصدیق نہیں کریں گے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ کتاب ہے۔ حَتَّىٰ نَسْأَلَ اللَّهَ جَهَنَّمَ یہاں تک ہم خود اللہ تعالیٰ کو ظاہر ہر طور پر نہ دیکھ لیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ چلو تمہاری یہ شرط بھی پوری ہوگی۔ آپ نے ستر آدمی منتخب کئے۔ کہ میرے ساتھ طور پر چلو۔ وہاں میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے براہِ راست پسندیدہ اور گوارہ کتاب اُسی نے نازل کی ہے۔ کوہ طور پر چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ آپ نے ہر قبیلے سے نو چتر آدمی بکھائے۔ بارہ قبیلوں کے بہتر آدمی جمع ہوئے۔ ان میں دو آدمی حضرت یوشع اور قابیل کے لئے۔ کہ ہمیں آپ کی بات پر یقین ہے۔ لہذا ہمیں طور پر جانے کی ضرورت نہیں۔ چرچہ ان دو آدمیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی اس لیے اللہ تعالیٰ نے بعد میں انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اپنی ستر آدمیوں کو لے کر طور پر پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا۔ کہ ہاں یہ کتاب میں نے ہی دی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی بات سننے کے باوجود یہ لوگ ایمان نہ لائے۔

بعض مفسرین کلام کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے کچھ بڑے کی پوجا کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا۔ کہ کوہ طور پر جا کر اللہ تعالیٰ سے اس فعل شیع کی معافی طلب کریں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد ان لوگوں نے یہ بے ادبی کی۔ کہ اے موسیٰ! ہم ہرگز تیری تصدیق نہیں کریں گے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہر نہ دیکھ لیں۔ اس بادشاہ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی۔ جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

آخری روایات اور بائبل کی روایات کے مطابق جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہ سننے کے بعد بھی قرآن کو کتاب الہی تسلیم نہ کیا۔ فَاحْشَ كُفْرُ الصَّابِقِينَ تو انہیں بھلی نے پھڑپھڑایا۔ ان کی سرکشی کی یہ سزا دی گئی کہ کچھ بھلی چلیں اور سب کو فنا کر گئی۔ کہتے ہیں کہ

بجلی دراصل عالم مثال کا حجاب زری یا ناری تھا جس کی چمک ظاہر ہوئی تھی۔ اور جو ان لوگوں کی تباہی کا باعث بنی۔ بنی اسرائیل کو یاد دلایا گیا کہ یہ سارا واقعہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔  
وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ۔

رؤیت الہی اس  
جہان میں ممکن نہیں

بنی اسرائیل کی رؤیت الہی کی شرط قابل قبول نہیں تھی۔ کیونکہ اس جہاں میں کسی شخص کے پاس یہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کر سکے اس مادی جہان کے بعد جب اگلے جہان میں پہنچیں گے۔ تو وہاں پر یہی نگاہیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ ان میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اِنَّكُمْ لَنْ تَعُوْذَ رَبَّكُمْ عَزَّ وَجَلَّ حَتَّى تَمُوتُوْا ثُمَّ كَمْ بَعِيْرَ بَنِي رَبِّ كُوْنِيْسٍ دِيْخِرُ كَيْتَ۔ چنانچہ قیامت کے بعد جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی رؤیت تمام محدثین اہل فہار کے نزدیک بالاتفاق ثابت ہے۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَجُوْہٌ يُّقَابِذُ نَاجِوَةً ۝۱۱۱ اِلٰى رَیْظِنَا فَاِظْمَۃٌ مِّمَّنْیَ چہے اس دن تہہ تازہ ہوں گے۔ اور اپنے رب کا دیدار کرنے والے ہوں گے۔ مگر یہ سب اگلے جہان کی بات ہے۔ اس جہاں کے کشف اعضاء میں یہ طاقت نہیں ہے۔ کہ وہ زیارت الہی سے مشرف ہوں۔ بلکہ اگلے جہاں کے لطیف اعضاء میں اللہ تعالیٰ یہ صلاحیت پیدا فرمادیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا انکار بعض گمراہ فرقے مثلاً رافضی، معتزلہ اور خارجی وغیرہ کرتے ہیں۔ جن کا اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ اس دنیا میں ممکن ہے۔ اور نہ اگلے جہان میں دلیل ان کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لامکان ہے۔ جہت اور سمت سے بھی پاک ہے۔ اور رؤیت کسی مکان اور سمت میں ہی ممکن ہے۔ دائیں، بائیں، اوپر، نیچے وغیرہ لہذا اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت قرآن و سنت سے ثابت ہے مگر اس رؤیت کی کیفیت کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہ بے کیف رؤیت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ انسان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دے کہ اسے بے کیف رؤیت الہی نصیب



ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ روایت تو یقیناً ہوئی مگر "لَا تُذِرُكُمْ  
الْأَبْصَارُ" وَهُوَ يُذِرُكُمْ الْإِبْصَارُ "انسانی آنکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر وہ  
آنکھوں کو پالیتا ہے۔ یہاں یہ کیفیت ہے۔ مگر وہاں کیا ہوگا۔ وہاں تو تجلیات ہوں گی۔ اور  
علی قدر المراتب ہوں گی۔ وہاں ذاتی اور صفاتی دونوں قسم کی تجلیات ہوں گی۔ جن میں انسان دیکھے گا  
خدا تعالیٰ کی رویت اس طریقے سے ہوگی۔ مگر یہ اس جہاں میں ممکن نہیں۔

آگے سورۃ اعراف میں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آتا ہے۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کلام  
کیا تو انہیں رویت کا اشتیاق بھی پیدا ہوا۔ عرض کیا رَبِّ ارْنِيْ اَنْظُرُ الْيَتِيْمَ مَوْلَاكَرِيمٍ میں تجھے  
ایک نظر دینا چاہتا ہوں۔ حکم ہوا "لَنْ تُرَیْ" تم نہیں دیکھ سکتے فرمایا پیار کی طرف دیکھو۔  
فَإِنْ نَسَقْنَا مَكَانَهُ فَتَنُوفَ تَرْمِسِيْہِ "اگر یہ پیار اپنی جگہ پر قائم رہ گیا تو پھر شاہ قمر  
بھی مجھے دیکھ سکے۔ فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جِبَلًا رَّابِعًا "جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تھوڑی سی تجلی ڈالی۔  
مَحَعَلَهُ دَكَاةً "پہاڑ ریزے ریزے ہو گیا۔ وَخَرَّ مُوسَى صَاحِقًا "اور موسیٰ علیہ السلام ہوش  
ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے تَبَنَّى الْيَتِيْمَ "مولا کریم! میں تو بہ کرتا ہوں  
میری درخواست درست نہیں تھی۔ فرمایا فَخُذْهَا اَنْتَ تَدْعُہَا "تو ہی! جو میں تمہیں دے  
دوں اسی پر اتکا کر رہو۔ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ "اور شکر گزار بن جاؤ۔ مقصد یہ کہ رویت الہی اس  
جہاں میں ممکن نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اہل فیصلہ ہے۔ جسے بدلائیں جاسکتی۔

حضور علیہ السلام نے معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا تھا یا نہیں۔ اس میں مختلف آراء  
ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ دیدار کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور قاضی شہار الشہابی پتی و  
فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔ مگر عالم بالا میں کیا۔ اس بلوی جہاں  
ہیں نہیں کیا۔ ————— عالم بالا میں رویت کے وقت تو حضور  
علیہ السلام خطیرۃ القدس میں پہنچے ہوئے تھے۔ وہاں تو رویت یقیناً ہوگی۔

الغرض جب بنی اسرائیل نے یہ بے ادبی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس کتاب پر ایمان  
نہیں لائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔ بھلی پڑی اور سترے ستر آدمی ہلاک ہو گئے۔ اب

بنی اسرائیل کو ہلاک کرنا  
اور دوبارہ زندہ کرنا

موسى علیہ السلام کو ایک اور پریشانی لاحق ہو گئی۔ جیسا کہ سورۃ اعراف میں آیت۔ موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں دعا کی۔ مولا کریم! اگر تو چاہتا تو مجھے بھی ہلاک کر دیتا۔ تو ان اسرائیلیوں کو اس سے پہلے بھی ہلاک کر سکتا تھا۔ یہ بیوقوف ہیں۔ ان کی دوسری میری ذات پر کوئی حرج نہ آئے اگر میں واپس قوم میں اکیلا جاؤں گا۔ تو وہ کہیں گے۔ کہ ہمارے آدمی نے جا کر مر ڈائیے۔ اے مولا کریم! میری فرزند تیرا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور فرمایا۔ ثُمَّ بَعَثْنَاكَ مِنْ بَيْنِ الْمُتَوَكِّلِينَ ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا۔ صریح لفظ موجود ہیں۔ وہ لوگ مر چکے تھے۔ موت کے بعد انہیں زندہ کیا۔ بعض توجیہ کرتے ہیں کہ مرے نہیں تھے۔ بلکہ سکتے پرہی تھا۔ جس پر بحث میں آگئے۔ یہ بات درست نہیں۔ مَوْتِكُمْ سے واضح ہے کہ ان لوگوں کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اور پھر تفسیری روایتوں میں یہ بھی آتے ہیں کہ ان کی زندگی سر کی طرف سے شروع ہوئی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جسم کا باقی حصہ راکھ ہو چکا ہے۔ پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اور پھر وہ پوسے کے پوسے زندہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ فرمایا یہ اس واسطے کیا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔

قرآن پاک میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بھی اسی قسم کا ہے۔ جب عزیر علیہ السلام سوال کے بعد اٹھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ كَمْ لَبِثْتَ تم کتنے دن سوئے ہو۔ عرض کیا لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ایک دن یا اس کا کچھ حصہ سو یا ہوں فرمایا بَلْ كَمْ لَبِثْتَ إِلَّا عَاصِرًا تم تو سو سال تک سوئے ہو۔ اتنا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران تمہارا گدھانا ہو گیا۔ اس کی ٹہیاں چوہا چرا ہو گئیں۔ اب دیکھو اس کی ہڈیوں کو سم کیسے اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر انہیں گروشت پیسائے ہیں۔ اور زندگی بخشے ہیں۔ یہ خلاف اس کے کھانا جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے۔ مگر وہ بالکل تازہ پاس پڑے۔ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ وہ گدھانا نہیں۔

آخر میں فرمایا أَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ میں جانتا ہوں کہ خدا تعالیٰ قادر ہے

ہے۔ وہ جس طرح چاہے اور جب چاہے کر سکتا ہے۔

الغرض! ان ستر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد دوبارہ زندگی دی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخش۔ ان لوگوں نے دوبارہ زندہ ہو کر اقرار کیا کہ ہم ہی غلطی پر تھے۔ میں ایسی بات نہیں کرنا چاہیے تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے قوم میں بکرا گواہی دی کہ بے شک ہم نے خدا تعالیٰ کا کلام سنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی ہے۔ اے بنی اسرائیل! اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

جہاد

اس کے علاوہ دوسری بات یہ تھی کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو یاد دلایا کہ شام و فلسطین تمہارے جدا مجہد تہذیب و تمدن اور اخلاق علیہا السلام کی وراثت ہے۔ منہ اقد اپنی وراثت دوبارہ حاصل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ ان کا ٹھکانا یہی ہے اب اس علاقے پر عمالہ قوم کا قبضہ ہے۔ تم ان کے خلاف جہاد کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں تمنا و وطن واپس دلا دیں گے وہی وطن جہان تمہارے آباؤ اجداد آباد تھے۔ اور جن کی قبریں بھی وہیں ہیں۔ تم محرومی سے محبت کرو۔ اللہ تعالیٰ فتح عطا کریں گے۔

بنی اسرائیل مسلسل غلامی کی جڑ سے بزدل ہو چکے تھے۔ ان میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ان کے ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ جہاد پر آمادہ نہیں تھے۔ یہ غلامی ہڈی بڑھا۔ آج ہمارا حال بھی یہی ہے انگریز کی سو سالہ غلامی کے نتیجے میں اخلاق بگڑ چکے ہیں جنہوں نے انگریز کا درد بردہ چاہا ہے۔ ان کے اخلاق کی درستگی کا کوئی مکان نہیں۔ البتہ نئی نسل آئے گی۔ نئے حالات پیدا ہوں گے۔ تو عمرہ کے بعد اخلاق کی درستگی کی توقع کی جا سکتی ہے۔

قوم عمالہ بڑے سخت لوگ تھے۔ جب بنی اسرائیل نے ان کی جرأت و شجاعت کے کارنامے سنے تو ان کے حوصلے مزید پست ہو گئے۔ کہنے لگے ہم جہاد نہیں کر سکتے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بڑا بھجایا کہ تم صرف کہہ مت بانہ صر۔ اللہ تعالیٰ ضرور فتح عطا فرمائیں گے۔ سو قلمدانہ میں تفصیلات موجود ہیں۔ یہ قوم کسی طرح جہاد پر آمادہ نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا میں مبتلا کیا۔ چالیس سال تک صحرا میں نظر بند رہے۔ "يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ"

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ" اے موسیٰ! یہ فاسق لوگ ہیں۔ ان پر افسوس نہ کریں۔ یہ اسی سرزمین میں حیران و پریشان پھرتے رہیں گے۔ اس صحرائے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ تیرے کہ یہ ساری نسل یہیں ختم ہو جائے گی۔ نئی نسل کا نیا خون آئے گا تو ان میں جذبہ جہاد بیدار ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام وہیں وفات پا گئے۔ پرانی نسل کے وہ لوگ جنہوں نے فرعون کی غلامی کا درد دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ ستر سال کے بعد نئی نسل نے علم جہاد بند کیا اور شام و فلسطین کو فتح کیا۔

بدل کا سایہ  
بنی اسرائیل کی تمام تر نافرمانیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو انعامات سے نوازتا رہا۔ صحرائے تیرہ میں نظر بندی کے دوران بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں معاش اور زندگی کے اسباب معجزانہ طور پر فرمائے۔ بنی اسرائیل غیموں میں اقامت پذیر تھے۔ جب خیمے بچھ گئے۔ تو ان کے لیے سورج کی گرمی سے بچنا مشکل ہو گیا۔ صحران کی گرمی بھی ایسی جو پاکستان کی گرمی سے چھ گنا زیادہ ہو۔ بنی اسرائیل سخت تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک اور انعام فرمایا وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ یعنی بنی اسرائیل بہنے تم پر بادلوں کا سایہ کر دیا۔ جب دن کے وقت دھوپ تیز ہوتی تو اللہ تعالیٰ بادلوں کو تخم فیتے وہ بنی اسرائیل پر چھا جاتے۔ اور اس طرح وہ دن کے وقت سورج کی تیش سے محفوظ رہتے۔

حق اور سوزی  
صحرائے سینا میں خورد و نوش کے لیے کوئی چیز میسر نہ تھی۔ نہ کھیتی باڑی اور نہ کوئی فصل ملے۔ چھ لاکھ ستر ہزار افراد کے لیے کھانے کے بغیر چارہ نہ تھا۔ نسل بتدریج بڑھ رہی تھی۔ اور اشیائے خورد و نوش کی ضرورت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے پینے کا انتظام اس طرح فرمایا وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوٰی اے بنی اسرائیل! ہم نے تم پر من اور سلوی نازل کیا۔ من کا فعلی معنی احسان ہوتا ہے۔ سورہ ہجرات میں آتا ہے۔  
يَعْمَلُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَتْلُمُوا أَنْتُمْ بِرَحْمَتِ رَبِّهِمْ اَلْاٰمَانِ اے ان کے من۔  
آج من میں یہ معنی پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی محنت و مشقت کے احسان کے طور پر انہیں کھانا مہیا کیا۔ کوئی کھیتی باڑی نہیں کرنی پڑی۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا کاروبار کرنا پڑا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بالکل محنت میں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کر دیا۔

من ترنجبین کی قسم کے دانے تھے۔ جیسے دھنیا کے دانے ہوتے ہیں۔ یہ نہایت شیریں مادہ تھا۔ جو رات کو بنی اسرائیل کے غیموں یا دوسری رہائش گاہوں کے ارد گرد برس جاتا تھا۔ اور اس کی مقدار اس قدر کافی ہوتی تھی۔ کہ ہر فرد کو ایک ایک یہ کے قریب میسر آجاتا تھا۔ بسج اٹھتے تھے۔ اور یہ دانے اکٹھے کر لیتے تھے۔ یہ ان کی چوبیس گھنٹے کی خوراک کے لیے کافی ہوتا تھا۔ چونکہ ہفتے کے روز چھٹی ہوتی تھی۔ اس لیے مجبور کے دن دو دن کی خوراک مل جاتی تھی۔

من کے دنوں میں خاص قسم کی شر ہوتی تھی۔ جو کہ حیات انسانی کے لیے بڑی ضروری ہے۔ انسانی جسم کی حرارت کو برقرار رکھنے کے لیے شکر کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ انسان کا جسم ٹھنڈا ہو کر ختم ہو جانے کا۔ قدرت نے ان کے جسم میں ایسا نظام پیدا کر دیا ہے۔ کہ ان میں جو بھی غذا استعمال کرتا ہے۔ یہ جسم میں پہنچ کر شکر بن جاتا ہے۔ یہ شکر جسم کے اعضاء و اعضاء وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر جسم یہ اصلی شکر نہ بھی کھائیں۔ تو بھی ان میں جسم خوراک کے دیگر اجزاء سے شکر حاصل کر لیتا ہے۔ گویا ان میں جسم کو کوئی ذاتی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اشیائے خورد و نوش سے جسم میں پیدا کرتا ہے۔ اور پھر وہ جسم کے باقی اعضاء میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسانی جسم کو نشتر پر دھن یا لیموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو دالوں وغیرہ سے بھی حاصل ہوتے ہیں۔ الغرض! بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے من کے دانے مہیا کر کے ان کی یہ ضرورت پوری کر دی۔

حضور علیہ السلام نے اپنے ایک شاگرد میں عبود نامی کعبہ اور من کی تعریف فرمائی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: الْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَفِيهَا شِفَاءٌ مِّنَ السَّعَةِ عَجْوَةٍ۔ جنت کی کعبہ ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے زہر اور سحر کا علاج رکھا ہے۔ اسی طرح فرمایا: الْكُمَةُ مِنَ الْحَمْنِ وَمَاءُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ یعنی کھجور من میں سے ہے اور ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ یہ کھجور کی مٹی زہر و سمیہ کھجور خورد و بینی سے بڑی لذیذ چیز ہے۔ انسانی جسم کے لیے گوشت کا اثر کمزوری ہے۔ نہ ان کا کوئی نفع ہوتا ہے۔ اور نہ ان کی کوئی مخالفت کرتا ہے۔ خود بخود انسانی جسم میں اور لوگوں کے کام آتی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

ان کے پانی میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ اس کا پانی سر میں جو کر لگایا جائے یا ویسے ہی سنانی اس کے پانی میں بھگو کر آنکھوں میں لگانی جائے۔ تو آنکھوں کی کئی بیماریوں کے لیے شفا کا حکم رکھتی ہے فرمایا یہ کھنبیاں جس ہی کی ایک قسم ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے تو انجمن کی قسم کے اس مادہ کو بنی اسرائیل کے لیے خوراک کا ذریعہ بنایا۔

سلوی سلوان کے مارہ ہے۔ یہ بٹیر کی قسم کا جاذب تھا۔ ہر بھتے ان جاذبوں کے غول کے غول دیاے شکر کی طرف سے اڑا کر آتے تھے۔ اور بنی اسرائیل کے غمبوں کے قریب آکر بیٹھ جاتے تھے۔ جنہیں وہ آسانی سے پکڑ لیتے تھے۔ انہیں پکڑنے کے لیے دوسرے شکار کی طرح ان کو محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ بلکہ جتنی ذرا اذیہ ہوتا تھا۔ بنی اسرائیل ان جاذبوں کو آسانی کے ساتھ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق پکڑ لیتے تھے۔ چہر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت پکاتے تھے۔ اور کباب بناتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ درجے کی خوراک مہیا کی تھی۔

پنہ آپ پر

بادل کے سائے اور خوراک کی بہم رسانی کے عداد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک اور نعمت عطا کی تھی۔ تعمیری راتوں میں آتا ہے کہ ایک بہت بڑا ستون نما ڈھانچا جس سے بنی اسرائیل برہنہ حاصل کرتے تھے۔ رات کے وقت یہ ڈھانچہ اٹھتا تھا جس سے اس قدر روشنی میسر آجاتی تھی جو بنی اسرائیل کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔

فرمایا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ بنی اسرائیل کا ذپاک چیزیں جو ہم نے تم کو روزانہ روزی میں دیا ہے وَمَا ظَلَمُونَا اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ بلکہ انہوں نے اپنی ہی جاذبوں پر ظلم کیا۔ بنی اسرائیل کو حکم یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں جس نے عطا کی ہیں۔ انہیں خوب کھاؤ پو۔ مگر ان کا ذخیرہ نہ کرو۔ لیکن انہوں نے ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گوشت گلنے سڑنے لگا۔ مسلم شریعت کی روایت میں آئے کہ لَوْ زَا بَنُو إِسْرَءِيلَ یعنی اگر بنی اسرائیل ذخیرہ افندی کا ارتکاب نہ کرتے تو گوشت نہیں مٹا سکتا۔ خواہ مہینوں پڑا رہتا۔ مگر ان کی اس نافرمانی کی وجہ سے گوشت سڑنے لگا۔ اس



طرت گویا انہوں نے خود اپنا نقصان کیا۔ ہم پر کوئی غلط نہ کیا۔ بندہ خود اپنی جانوں پر ظلم کے مرتب ہوئے  
 اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بڑے انعام کئے۔ ان کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے  
 خرچ طرح کی آزمائشیں بھی آتی تھیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ سرکشی میں مبتلا ہوئے۔ جہاد کا انکار  
 کیا۔ نبی کی تکذیب کی۔ اس کو ستایا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کا غیر معمولی انتظام  
 فرمایا۔ پانی کی ضرورت پیش آئی تو جیسا کہ آگے آئے گا وہ بھی مہیا فرمایا۔

---

الْاٰ

لقمۃ

رأیت ۵۸: ۵۹

دیں بہت دجہا

وَإِذْ ثَلَاثًا أَذْخَلُوا فِي هَذِهِ الْقَرْيَةِ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ  
 شِئْتُمْ رَغَدًا ۖ وَأَدْخَلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ  
 نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ وَسَازِغِ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾  
 فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ  
 فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا  
 كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥٩﴾

ع

ترجمہ: اس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس بستی میں اور  
 کھاؤ اس میں سے جہاں بھی تم چاہو کھاؤ دگ سے۔ اور داخل ہو دو درے میں سجدہ  
 کرتے ہوئے۔ اور کنو خشش۔ ہم بخش دیں گے تمہاری غلطیوں کو۔ اور زیادہ دیں گے  
 ہم نیکی کرنے والوں کو ﴿۵۸﴾ پس تبدیل کر دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا بات  
 کو۔ سوائے اس کے جو ان کو کوئی نئی تھی۔ پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے  
 ظلم کیا عذاب آسمان کی طرف سے۔ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے ﴿۵۹﴾

ربایات

جس طرح ابتداء رکوع میں بنی اسرائیل سے خطاب تھا۔ یٰبَنِي إِسْرَءِیْل اذْكُرُوا  
 نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ اسی طرح ان آیات کے مخاطب بھی بنی اسرائیل  
 ہی ہیں۔ جہاں اس قوم پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل  
 کے تقصیر اور نافرمانی کا حال بھی بیان ہو رہا ہے۔ انعامات میں سے فرعون کی غلامی سے  
 نجات دہن کتاب تورات کا حصول اور من و سلویٰ کا ذکر ہوا۔ پھر ان کی نافرمانی کا ذکر ہوا۔ انہوں نے  
 اللہ تعالیٰ کی بنیادوں کی جس پر انہیں سزا بھی ملی۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ  
 تعالیٰ نے سعادت بھی کر دیا۔ مرنے والے اسلام نے فرمایا کہ تم جہاد کی تیاری کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں  
 شام و فلسطین کا وہ علاقہ واپس دلا دیں گے جو تمہارے آباء و اجداد کا مسکن رہا ہے۔ مکہ بنی اسرائیل

نے اشارہ کر دیا۔ کہنے لگے۔ وہاں پر بڑے محنت لوگ ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر وہ خود بخود اس بستی سے نکل جائیں۔ تو ہم وہاں جانے کو تیار ہیں۔ اس کی مکمل تفصیلات تو سورۃ مادہ میں ہیں۔ تاہم کچھ باتیں سورۃ بقرہ میں بھی آ رہی ہیں۔ ان کی نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل ستر سال تک تیسہ کے بیابان میں سرگردان پھرتے رہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ترقی اور سرکشی کا حال بیان فرما کر دوسرے لوگوں کو متنبہ کر دیا ہے۔ کہ سرکشی کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آتی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو من و سلوئی کھاتے ہوئے کئی سال گزر گئے۔ بعض روایات میں اشارہ سال کا ذکر آتا ہے۔ تو انہوں نے بعض دوسری چیزوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ جس کا ذکر اگلے کوع میں آئے گا۔ کہ ہم ایک ہی طرح کا کھانا کھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ من و سلوئی کی بجائے سبزیاں اور دال وغیرہ کھانے کو بنی چاہتا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اگر تم ایسا ہی چاہتے ہو۔ تو اس بستی میں چلے جاؤ۔ وہاں پر یہ چیزیں تمہیں میسر آجائیں گی۔

وہ کون سی بستی تھی جس میں بنی اسرائیل کو داخلے کا حکم ہوا تھا۔ اس کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء ہیں بعض مفسرین اسے بیت المقدس سے منسوب کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔ زیادہ قریب قیاس یہ ہے کہ وہ اریحا نامی بستی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بستی کے لوگوں سے جہاد کرو۔ تو اللہ تعالیٰ غلبہ عطا کرے گا۔

اس معاملہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کہ مذکورہ بستی میں واقع حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں واقع ہوا یا ان کے بعد۔ تاہم صحیح بات یہی ہے کہ وہ بستی موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد فتح ہوئی۔ حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کی نئی نسل جہاد پر آمادہ ہوئی۔ ترانیں شہ اور فلسطین پر غلبہ حاصل ہوا۔ ہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ من و سلوئی کی بجائے دوسری خوراک کی طلب ہے۔ تو اس اریحا نامی بستی میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں تمہیں تمہاری مطلوبہ چیزیں میسر آئیں گی۔

فَمَا وَادَّ قُلْنَا اَدْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ اِنَّ اِسْرَءِلَ

ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ فَكَلَّمُوا هُنَّهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَعَدًا اس میں کھلے طور پر وصیت کے ساتھ تمہیں اس محلہ میں کوئی رک رک نہیں ہوگی۔ اِن یہ بات یاد رکھو کہ وَادَّخُلُوا الْبَابَ مُجْتَدًا اور اس بستی کے دروازے میں داخل ہو کچھ کرتے ہوئے

بجائے

بستی میں داخل ہوتے وقت سجدہ کرنے سے مراد سجدہ شکر ادا کرنا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فتح عطا کی ہے۔ اس بستی کا قبضہ دلایا ہے۔ تو اس کے بدلے غرور و تکبر نہ کرنا بلکہ عاجزی اور انکاری کرتے ہوئے سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہونا یا کرنا انبیاء علیہم السلام کا عمل اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں اور ایمان والوں کا شیوہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب مکہ معظمہ فتح ہوا تو حضور علیہ السلام اونٹنی پر سوار تھے۔ اور دغلے کے وقت آپ سر کو جھکائے ہوئے تھے۔ آپ اگر کمر داخل نہیں ہوئے۔ بلکہ نہایت عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ پھر آپ نے غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ چاشت کا وقت تھا۔ اسی طرح جب حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایران کا پایہ تخت مائن فتح کیا۔ اور آپ نے اس قلعہ میں جا کر آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر تھا جو فتح و کامیابی پر پیش کیا گیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو بھی یہی حکم تھا کہ جب فتح حاصل ہو جائے۔ اور اس بستی میں داخل ہونے لگو تو نخواست و تکبر کی بجائے عاجزی دکھاتے ہوئے اور سجدہ شکر بجا لاتے ہوئے داخل ہو۔ کیونکہ یہ آسمانی تعلیمات کا اہم اصول ہے۔

مگر کہہ رہے ہیں بڑے بڑے کفار مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فتح دی تو اہل ایمان نے شکرانہ کے طور پر دو نفل پڑھے۔ اور اس بات پر اللہ رب العزت کا شکر یہ ادا کیا کہ اس نے اہل ایمان کو ظالموں سے نجات دلائی۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحر قلزم سے باہر نکالا تو شکر فرعون کو غرق کیا تو موسیٰ علیہ السلام نے بھی سجدہ شکر ادا کیا۔ کیونکہ یہ ایمان والوں کا شیوہ ہے کہ جب کوئی نعمت ملے تو سجدہ شکر بجا لاتے ہیں شریعت محمدیہ میں سجدہ شکر کی بجاآوری نہایت مستحسن فعل ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ سجدہ شکر ادا کرنے کے لیے دو رکعت نماز

نقل ادا کرنی چاہیے۔ تاہم صرف سجدہ کر لینا بھی درست ہے۔

استغفار  
برکات

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دو احکام دیے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس بستی میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے داخل ہوں۔ اور دوسرا یہ کہ وَقُولُوا حِطَّةً اور زبان سے یوں کہیں کہ اے اللہ! ہماری غلطیوں کو معاف فرما دے۔ حِطَّ لَانْغَلِيْ مَعْنٰی مَحْرَا دینا ہے۔ ہماری خطاؤں کو گرا دے۔ لفظ حِطَّ دراصل اَحْطَطْنَا حِطًّا کا مخفف ہے۔ یعنی ہماری غلطیوں کو تباہیوں اور خطاؤں کو مٹانے معاف کر دے یا مد گزر فرما۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو سجدہ اور استغفار کی تلقین کی۔ اور فرمایا کہ اگر تم اپنی خواہش کے مطابق خوراک حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو ان دو شرائط کے ساتھ بستی اریحا میں داخل ہو جاؤ۔

بزرگ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کی کون بہتر بات ہوتی ہے۔ وَأَوَّلُ الْخَيْرِ الْأُتْبَغَارُ اور خیر کی ابتدا استغفار سے ہوتی ہے۔ یعنی انسان اپنی غلطیوں کی معافی طلب کرے۔ ابن ماجہ اور ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے۔ وَخَيْرُ الْخَطَايَا مِثْلُ التَّوَابُونَ ہر شخص خطا کرے غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں بڑی بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کریتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اَلْثَّابِتُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ لَئِنْ سَأَلَ تَوْبَةً كَرِهَ لَهَا اَلَا اِيَّا هِيَ جیسا اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔

فرمایا جب تم استغفار کرو گے۔ مجھ سے معافی مانگ لو گے۔ تو پھر میں اس کا صلہ یہ دوں گا۔ كَرَفَعْنَا لَكُمْ ذَخِيرًا خَطِيْبُكُمْ بِمَقَادِرِ خَطَايَاكُمْ اور لغزشوں کو بخش دیں گے۔ معاف کر دیں گے۔ اور صرف معاف ہی نہیں کریں گے بلکہ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ يَتُوكَارِوْنَ کو مزید اجر عطا فرمائیں گے۔

علم خداوندی  
میں تبدیلی

بنی اسرائیل کی طبیعتوں میں ترمذ اور سرکشی گھر کر چکی تھی وہ معمولی سے معمولی حکم بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ قَبَسَ لَكَ ذِيْنَ ظَلَمُوْا بِسَبِيلِ كَرْدِيْ اِنْ لَوْ كَرُوْنَ نَعْمُوْنَ نے جنہوں نے ظلم کیا تو وہ غیر سزاوار ہیں قَبِلْ نَهْتُوْا دَوَاتِ جَرَانِيْہِمْ کبھی گئی تھی۔ یعنی انہیں حکم تو یہی

کہ سجدہ ٹکرا دیا کرتے ہوئے جائیں۔ وہ اکڑتے ہوئے اور چوڑا گھیسے ہوئے داخل ہوئے۔ اسی طرح حکم یہ تھا کہ زبان سے استغفار کرتے ہوئے داخل ہوں۔ مگر انہوں نے لفظ حِطَّة کی بجائے حِطَّة کُنا شروع کر دیا۔ کُنا تو یہ چاہیے تھا کہ اے اللہ ہم معاف کر دے حِطَّة مگر انہوں نے کہا حَبَّة رَفِ شَفْوۃ یعنی ہمیں تو خوشی کے اندر گنہ چاہیے۔ ایسی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگے۔ جو کہ حد سے کی بے ادبی، گستاخی اور سرکشی تھی۔

یہاں پر لفظ ظَلَمُوا کہہ کر اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ احکام کو تبدیل کرنے والے سائے کے سائے بنی اسرائیل نہیں تھے۔ بلکہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ظلم کیا جس طرح پھٹسے کی پوجا کرنے والے بھی۔ سائے کے سائے لوگ نہیں تھے۔ اسی طرح احکام میں تبدیلی کے مرتکب بھی کچھ لوگ تھے۔ چنانچہ آگے ان کی سزا کا ذکر بھی آئے گا۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی نصیر، تبدیلی کی جو کہ بہت بڑی بات ہے۔ انہیں قوا تابع کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے مامور ہے۔ لہذا اے اللہ تعالیٰ کے ہر فرمان پر تسلیم خم کر لینا چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جو کوئی بھی احکام خداوندی میں تغیر و تبدل کا باعث بنے گا۔ وہ ذلت و رسوائی میں مبتلا ہوگا۔

حاکمی قوانین اور  
حق شفعہ

اسلامی اصولوں میں تغیر و تبدل ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں ہمارے ہاں بھی بعض تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ جبریل ایوب نان کے زمانے میں حاکمی قوانین نافذ ہوئے۔ حکام و مامور نے ہر چیز پر احتجاج کیا۔ کہ اس کی بعض شقیں قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ مگر حکومت کے سربراہوں نے یہ قوانین آج تک نافذ ہی کیے آئے ہیں۔ اسی طرح حق شفعہ کا قانون بنایا گیا۔ امارت کی ذمہ داری سے شفعہ سرور تین قسم کے لوگوں کے لیے ہے۔ اے۔ یعنی شفعہ کا وہ شخص حقدار ہے جو یا تو حایہ اور کی حیثیت میں شریک ہو یا حق میں شریک ہو یا پڑوسی ہو۔ مگر اب دوستیں اور بھی مل گئی ہیں۔ حالانکہ اہم تانغی تو پڑوسی کے حق کے بھی قابل نہیں ہے مگر اس دہانے میں مزارع اور باغ کے لڑکے وغیرہ کو بھی حق شفعہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ خدا کی قانون میں ترمیم نہیں تو اور کیا ہے؟



وراثت میں ملنے  
کا حصہ

لڑکیوں کی وراثت سے محرومی بھی غدا کی احکام میں تبدیلی کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے  
لوگوں اور لڑکیوں ہر دو کو وراثت میں حصہ دیا ہے۔ مگر جہاں اس میں بھی رد و بدل ہوا ہے۔  
لڑکیوں کی وراثت کے اکثر لوگ قائل نہیں۔ اس ملک میں خرید آیا۔ تو اس نے خود لوگوں سے  
پوچھا کہ تم اپنے معاملات کو شریعت کی رو سے نبھانا چاہتے ہو۔ یا رواج کے مطابق۔ تو بعض  
اصلاح کے لوگوں نے رواج کے مطابق تقسیم کو قبول کیا۔ چنانچہ یہ قانون آج تک موجود ہے  
کہ وراثت کی تقسیم رواج کے مطابق کی جاتی ہے۔ جس سے لڑکی محروم ہو جاتی ہے۔

صوبہ سرحد میں یہ قانون ڈاکٹر خان کی وزارت میں نافذ ہوا۔ مال کا سارا عملہ اس قانون  
کا پابند تھا۔ آفسر مال، تحصیلدار، پٹواری دہیزہ اسی کے مطابق انتقال چڑھاتے تھے۔ مشور ہے کہ  
وہاں پر ایک شخص کا چھ مربع میل بیماری رقبہ تھا۔ اس نے ساری جائیداد لڑکیوں کے نام پر  
کر کے لڑکیوں کو محروم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے دنیا پر ہی یہ سزا دی کہ نفوس کی بیماری میں مبتلا ہوا  
وہ جب تک زندہ رہا اس کا نہ ٹیڑھا رہا۔ وہ بڑوں کے بھی آپس میں لڑتے بھڑتے رہے۔ ایک  
نے دوسرے پر گولی چلا دی اور اس کا بازو کٹ گیا۔ اس طرح گویا اس شخص کو اسلامی قانون کی خدمت  
کر کے کچھ نصیب نہ ہو سکا۔

ظالموں کی سزا

بہر حال خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام میں رد و بدل بہت بُری بات  
ہے اور قابلِ عذاب ہے۔ مگر بنی اسرائیل کے بعض ظالم لوگوں نے اس بات کو بدل دیا جو انہیں  
کی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مَا نَزَّلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ لُغَمٍ كَمَا يَحْكُمُونَ، ہم نے  
ان پر نازل کیا رَحْمَةً مِّنَ السَّمَاءِ آسَمَانَ سے عذاب۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ  
نے طاعون کی بیماری کی صورت میں عذاب نازل کیا۔ صرف ایک دن میں چوبیس ہزار اشخاص لقمہ  
ہل بوتے۔ اور کل ستر ہزار آدمی اس عذاب میں مبتلا ہو کر اپنے انجام کو پہنچے۔ دو چار دن کے  
اندہ اس بیماری نے پناہ کی اور بنی اسرائیل کا صفایا ہو گیا۔ فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ بَعَا كَذِبًا  
يَفْضُقُونَ وہ لوگ فسق کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے۔ لہذا

اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی۔ اگر آج بھی کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ تو وہ خدا تعالیٰ کے عذاب کی زد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ جہنم سے لے کر اس کی حکمت ہے۔ وہ اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

زمین کی آبادی  
اور بربادی

اہم بیضاوی فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ کی زمین کی آبادی نیکی اور اطاعت سے ہوتی ہے اور مخلوق کی بڑائیوں کی وجہ سے اس کی بربادی ہوتی ہے۔ فسق و فجور کو آپ بیشک ترقی کا نام دیں مگر حقیقت یہ ہے کہ کھیل تماشہ، لہو و لعب، بے کاری، فحاشی، زنا، سود خوری وغیرہ سب بگاڑ کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ زمین میں فساد پھیلانا ہے۔ آبادی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کی آبادی تو ہر حال نیکی اور خدا تعالیٰ کی اطاعت سے ہوگی۔ جس قدر کچھ چین نصیب ہوگا۔ اسی قدر آبادی ہوگی۔ جس قدر گناہوں میں اضافہ ہوگا۔ اتنی ہی بے چینی بڑھے گی۔ لوگ اضطراب اور طرح طرح کے مسائل کا شکار ہوں گے۔ لہذا معلوم ہوا کہ نافرمانی بہت بُری چیز ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ ان آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ہم سب کے لیے تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے کہ نیکی اور بے ایمنی میں تمیز کریں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں۔ نافرمانی سے پرہیز کریں۔

الْعَصْرُ  
درس بیت بیچ ۲۵

البقرة ۲  
(آیت ۶۰)

وَإِذِ اسْتَقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ  
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ نَجِيًّا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ  
كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۖ ⑥

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی  
طلب کیا۔ پس ہم نے کہا کہ اپنی راہی کے ساتھ پتھر کو مارو۔ پس اس میں سے بارہ چشمے  
پھوٹ پڑے۔ تحقیق جان یا سب لوگوں نے اپنا اپنا ٹھاٹھ۔ اللہ کی دی ہوئی روزی  
سے کھاؤ اور پیو۔ اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو ⑥

بد آیات

گذشتہ آیات میں اُن انعامات کا ذکر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر کیے۔ منجملہ  
ان کے دشمن سے رهایی اور دولت، ناک عذاب اور غلامی سے نجات کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ  
نے بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان کتاب عطا فرمائی۔ صحرائے سینا میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے سر پہ  
بادل کا سایہ کیا۔ خوراک کے لیے مَن اور سنوئی فراہم کیا۔ جب بنی اسرائیل نے بنسری اور ترقاری کا  
مطالبہ کیا۔ تو انہیں ایک دوسری بستی میں اترے کا حکم دیا جہاں ہر چیز بشرعی ہوگی ساتھ یہ نصیحت  
بھی کر دی کہ اس بستی میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے ہوئے داخل  
ہونا۔ مگر بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کو تبدیل کر دیا۔ سجدہ شکر ادا کرنے کی بجائے اگر اگر  
بنی میں داخل ہوئے۔ اور زبان سے استغفار کرنے کی بجائے بعض یہودہ باتیں کہتے ہوئے  
گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور تمرد کی یہ سزا دی کہ آسمان سے ٹاخون کی صورت میں عذاب  
ازل ہوا۔ ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل ہلاک ہوئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ انہوں  
نے صحرائے سینا میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت اور موسیٰ علیہ السلام کی بات کو ٹھکرا دیا۔

بنی اسرائیل  
کی طلب کی

توراة اور بعض سرکاری روایتوں میں ذکر آتا ہے کہ بنی اسرائیل دارق سکات کے قریب

ایک مقام پر تھے۔ اُسے قادس کہتی تھیں۔ یہ علاقہ کچھ پہاڑی ہے۔ وہ کچھ صحرا ہے پانی نایاب ہے۔ اس مقام پر ہی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا مطالبہ کیا۔ کہنے لگے ہمارے پاس پانی کا ایک قطرہ تک نہیں۔ حلق خشک ہو رہے ہیں۔ اُسے موسیٰ علیہ السلام ہمارے لیے پانی کا بندوبست کرو۔ اس معاملے میں وہ موسیٰ علیہ السلام سے اس قدر بدتمیزی سے پیش آئے کہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں ان الفاظ کے ساتھ دعا کا آغاز کیا کہ اے مولیٰ کریم! بنی اسرائیل میرے ساتھ اس قدر سختی سے پیش آ رہے ہیں کہ مجھے شکار کرنے کے ورپے ہیں۔ لہذا تو ہی ان کے لیے پانی کا انتظام فرما۔ آیت زیر درس میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے:

وَإِذْ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ الْيَمِّنَ وَأَنَّهُ كَانَ وَفَّىٰ قَوْلَهُ لِيَوْمِهِ

تو ہم کے لیے پانی طلب کیا۔ استسقی کا فعلی معنی طلب آب ہے۔ اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے گرا گزانا، استغفار کرنا اور معافی مانگنا ہے۔ حضرت ابو علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات میں ملتے ہیں کہ قحط سال کے دوران انہوں نے اپنی اپنی قوم سے کہا تھا: يَتَقَوَّمُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُؤْبَوْنَ إِلَيْهِ سَيَكُونُ مِنكُمْ مَرْجُوعٌ فَأَتُوا نَجْمَ اللَّيْلِ إِذَا هُمْ أَقْبَرُ فَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا۔ تاکر وہ تمہارے لیے آسمان سے پانی برسا دے۔ جب کبھی دنیا خشک ساں لا شکار ہو جائے۔ زمین، باغات، انسانوں، حیوانوں کے بے پانی کی قلت پیدا ہو جائے۔ تو فوراً ہی آپ کے لیے تہ ابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ منجملہ ان تہ ابیر کے شریعت نے استغفار کو بڑی اہمیت دی ہے کہ انسان اپنے رب تعالیٰ سے نہنگوں کی معافی مانگیں صد ذخیرات کریں۔ جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسا دے گا۔ باران رحمت نازل کرے گا اور خشک ساں دور ہو جائے گی بغرضیکہ استسقی کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رو رو کر گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔

مستحقان کی  
عقیدت

عنا کرام میں سے ہم ابر حنیفہ و کو باقی تمام فقہاء پر فوقیت حاصل ہے۔ فقہا ہست و اجتہاد میں کوئی بھی آپ کا ہم پلہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی گہری بصیرت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے دین کی ایسی زبردست خدمت کی ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ ہے۔ آپ نے دین کا کچھ اور خلاصہ اس طریقے پر پیش کیا کہ تمام علمی قریب اسے بخوشی قبول کرے۔

استفادہ کا طریقہ

گئیں۔ اہمیت پر آپ کا بڑا احسان ہے جس طرح محدثین کرام نے احادیث کے الفاظ کی حفاظت کی بمقتدرین کرام نے قرآن پاک کی تشریح بیان کی اسی طرح فقہائے کرام نے اجتہاد کے ذریعے ضروری مسائل کا استنباط کیا۔ اور مشکلات کے حل بخشے۔ انہوں نے دین اسلام کو احسن طریقے پر اہمیت کے ساتھ پیش کیا۔ راستے میں آنے والی تمام گھوڑوں کو دوڑا دیا۔

اب وہاں سب فرمے ہیں کہ مستحقانِ تقرب ہوتے۔ کہ انہوں نے گناہوں کی معافی طلب کرے۔ اس کے لیے نماز پڑھنا ضروری ہے۔ تمام استغفار کے تمام طور پر درحیث ہیں۔ جیسا کہ حضور جلی مایہ وسلم نے بتایا ہے۔ یہاں طریقہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی سے ہر کھلے میدان میں نکل جائیں۔ دو بعت نذر آکر ہیں۔ فقہ نے کرام فرماتے ہیں کہ استغفار کے لیے صرف مومن کھنٹے ہوں۔ کسی کافر و قریب نے نہ دین۔ چہرہ بھری اور انحراف کے ساتھ دو نفل آکر ہیں۔ اس نے بعد دعا کریں اللہ تعالیٰ بڑی رحمت نازل کرے گا۔ اور خشک سال دور ہو جائے گی۔

دوسرا طریقہ بھی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپ منبر پر تشریف فرما تھے خطبہ ارشاد فرما جیسے تھے کہ ایک شخص نے اگر عرض کیا کہ حضور! جانور مال مرے ہیں۔ فلسس تباہ ہوئیں۔ دعا کریں اللہ تعالیٰ پانی برسا دے۔ آپ نے منبر پر بیٹھ کر دھاکے لیے بتہ ای دیے۔ اس وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ بادل کا کیں نام و نشان نہ تھا۔ آپ دعا فرماتے تھے کہ کسی کائنات سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا دیکھتے ہی دیکھتے وہ بادل بھل گیا۔ اور یکایک موسلا دھار باتس شروع ہوئی۔ ایک تیسرے طریقہ بھی ہے کہ کسی بھی ماہ کے بعد بارش کے لیے دعا کی جائے۔ مستحقانِ برکت۔ وہ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی صورت انانی باکمی ہے۔

بہر حال مومن علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ ساری قوم سخت پریشانی کے ضرب لگی ہوئی تھی۔ مومن علیہ السلام کے ساتھ قبر بنی سے عیش آئے۔ مٹرا آب دعا میں مصروف ہو

گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ فَمِنْهَا  
 ہوئی اس پتھر پر بارہ موئی علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔ جو سنی لامعی یغریہ ماری فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ  
 اُثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا اس میں سے بارہ چشمے بھوٹ پڑے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے  
 بنی اسرائیل کے لیے پانی کا انتظام فرمادیا۔

اس بابے میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ دو کون سا پتھر تھا جس پر لامعی ماننے سے پانی  
 جاری ہو گیا تھا۔ بعض معمرین فرماتے ہیں کہ وہ پتھر موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں موجود تھا لغیری  
 روایات کے مطابق یہ پتھر حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے دنیا میں آیا تھا۔ اور نسل بعد نسل موسیٰ  
 علیہ السلام تک پہنچا تاہم کسی صحیح روایت سے ایسا ثابت نہیں ہے۔ بخاری اور مسلم شریف کی  
 بعض روایات سے موسیٰ علیہ السلام کے ایک دوسرے واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ اس  
 زمانے میں بنی اسرائیل کے لوگ پرے کا خاص خیال نہیں کرتے تھے۔ نہات وقت بھی ایک  
 دوسرے کے سامنے کپڑے اتار کر نہانا شروع کر دیتے تھے۔ بر خلاف اس کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام  
 بڑے حیا دار تھے غسل کرتے وقت ستر بونتی کا خاص خیال رکھتے اور پرے میں نہاتے۔ دین کا  
 اصول بھی یہی ہے کہ بول و براہ غسل کرتے وقت دوسرے شخص کی نظر نہیں پڑنی چاہیے۔  
 ایسے اوقات میں پر وہ واجب ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل الٹی ذہنیت کے مالک تھے موسیٰ  
 علیہ السلام کو پرے میں غسل کرتے دیکھا تو سمجھا کہ اس کے جسم میں کوئی عیب ہے جسے چھپانا  
 چاہتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ آپ کو آدرہ کی بیماری لاحق ہے جس میں خیسے پھول بدلتے ہیں۔  
 اللہ تعالیٰ کی قدرت ایک روز ایسا واقعہ پیش آیا کہ موسیٰ علیہ السلام کسی بڑے پتھر کی  
 اوٹ میں اس پتھر پر کپڑے رکھ کر پرے میں غسل فرماتے تھے کہ وہ پتھر آپ کے کپڑوں  
 سمیت بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے یہ ماجرا دیکھا تو سخت پریشان ہوئے ثَوْبِي حَجَبٌ وَ  
 ثَوْبِي حَجَبٌ یعنی پتھر میرے کپڑے۔ پتھر میرے کپڑے کہتے ہوئے۔ پتھر کے قہقہے بھاگے



اور اسی حالت میں اپنی قوم کے پاس پہنچ گئے۔ لوگوں نے آپ کو برہنہ حالت میں دیکھا مگر جسم میں کوئی عیب نہ پایا تو کہنے لگے مَا جَعَلُوا سِوَايَ اللَّهِ بَنِينَ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو تو کوئی بیماری لاحق نہیں۔ ہم تو غلط سمجھ رہے تھے۔ بہر حال جب موسیٰ علیہ السلام اس بجھکتے ہوئے پتھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو اپنی جلالی طبیعت کے مطابق اس پتھر کو اپنے ڈنڈے سے خوب پیٹا جس کی وجہ سے اس پتھر پر لامنی کے پانچ سات نشان پڑ گئے۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ بڑا مبارک پتھر ہے۔ ایک طرف اس نے میرے حکم کی تعمیل کی کہ کپڑے لے کر بھاگ نکلا اور دوسری طرف موسیٰ علیہ السلام کے ادب کو بھی ملحوظ رکھا۔ یعنی اتنا نرم ہو گیا کہ اس پر لامنی کے نشان پڑ گئے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس پتھر کو اپنے پاس رکھ دو۔ اس میں بڑی حکمت ہے۔ کہتے ہیں: یہ وہی پتھر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھیلے میں تھا۔ اور جب بنی اسرائیل نے پانی طلب کیا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسی پتھر پر لامنی مانی۔ بارہ چشمے بھوٹ پڑے۔ بہر حال یہ تفسیری روایات ہیں کسی آیت یا مجموع حدیث سے ثابت نہیں

بعض تاریخی روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دادی حوریب میں جو پیاری سلسلہ اور چٹانیں ہیں۔ وہیں زمین پر پڑی ہوئی ایک چٹان پر موسیٰ علیہ السلام نے لامنی ماری تھی۔ اور اس میں سے پانی برآمد ہوا تھا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اس پتھر میں اب پانی تو نہیں ہے۔ مگر پانی کے نکلنے کے مناسبات اب تک موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سوراخوں سے کسی وقت پانی نکلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پانی بنی اسرائیل کی ضرورت پوری کرنے کے لیے نکالا تھا۔ جب وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ پانی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ تو وہ بھی ختم ہو گیا۔

پانی کے بارہ چشمے بھوٹنے کی حکمت یہ تھی کہ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے۔ ان کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان کے آپس کے کسی متوقع جھگڑے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے

نے ہر قبیلے کے لیے علیحدہ علیحدہ چتر مقرر کر دیا۔ چتروں کا تعین ہر قبیلے کی تعداد کے لحاظ سے کیا گیا تھا۔ بڑے قبیلے کے لیے بڑا چتر مقرر ہوا۔ اور چھوٹے قبیلے کے لیے چھوٹا چتر۔ اس طرح گویا پانی تقسیم کر دیا گیا۔ فرمایا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ سِرِّمَکَیْنِ اِنَّا اَنۡاۤیۡنَاکُمۡ اَکۡثَرًا مِّنۡ ذٰلِکَ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلے میں ایک ایک چتر تقسیم کر دیا۔ ہر قبیلے نے اپنی ضرورت کے مطابق نمایاں کھود لیں۔ اور پانی کو دور تک لے گئے۔

اس تقسیم سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مشرکہ مفاد کی اشیاء کی تقسیم عدل و انصاف پر ہونی چاہیے۔ تاکہ کسی قسم کا تنازعہ پیدا نہ ہو۔ حضرت صواع حیدر سلمہ کی اومنی دے معاطہ میں ہی پانی تقسیم کیا گیا تھا۔ لَسَّکَ شَرِبَ یَوْمَ مَعۡلُوۡجٍ۔ اور صالح علیہ السلام سے فرمایا کہ پانی پینے کی ایک روز قساری باہر ی سوگی۔ اور ایک روز اومنی کی۔ قوم نے مقررہ مدت تجاوز کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم تباہ ہو گئی۔

ایک اعتراض کہ  
اس جواب

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ پتھر سے پانی کیسے آیا۔ یہ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کی چیزوں کو اپنی ناقص عقل سے قیاس کرنا مناسب نہیں۔ ایسا کام ناقص العقل لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے سائنس دان ، یا ماضی دان، جغرافیہ دان سب کے سب ناقص العقل ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت یا تخلیق کی کوئی خبر نہیں۔ وہ تو محض اپنی دھند میں مگن بستے ہیں۔

۱۔ بیضاوی فرماتے ہیں کہ پتھر سے پانی نکلنا کون سی بعید العقل بات ہے۔ یہ تو عام مشاہدے کی بات ہے۔ مقناطیس بھی ایک پتھری ہے جو لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کسی پتھر میں پانی کو اپنی طرف کھینچنے کی تاثیر پیدا کر دے۔ تو یہ کون سی ایسی بات ہے جو عقل میں نہ آتی ہو۔ ہاں سرسبز کوکھ میں نہ آتی۔ پانی تو پتھر کے نیچے موجود تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر کو ذرا سا ہلا دیا تو پانی کو دھڑا سرسبز بیچارہ تو پتھر بیت کا اہم تھا۔ اور معجزات کو منکرت تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ پانی کا جبراً محض اللہ تعالیٰ نے

کے حکم سے ہوا۔ یہ معجزہ تھا۔ جو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر ہوا۔ بحیرہ قمر میں کیا ہوا۔ موسیٰ علیہ السلام نے لاکھنی چٹائی اور بارہ راستے بن گئے۔ پانی کناروں کے ساتھ منجھ بکریوں کی۔ وہاں لاکھنی مارنے کا حکم ہوا۔ تو پانی میں راستے بن گئے اور سیاں لاکھنی ماری تو خشک سمندر سے پانی کے چشمے بھوت پڑے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا۔ پانی نکالنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ لاکھنی مارنا امتیاز کا کام ہے۔

نبی کا معجزہ بویادولی کی کرامت ہو۔ اصل حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ بکری کرنے والی وہی ذات ہے۔ اسی مقام پر اگر لوگ غلو کر کھا جاتے۔ نبی کے معجزے بادل کی کرامت کہ ان کا ذاتی فعل سمجھتے ہیں۔ اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو ان کا ذاتی فعل سمجھا۔ وہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔ **وَلَا تَخْذُوا زِينَةَ الْفُلِ** اللہ تعالیٰ فرمایا **وَأَنْبِرِي الْأَكْمَامَ وَلَا تَبْرَحُوا وَاتَّخِذُوا ذُنُوبَكُمْ** میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادہ زاد اندھے اور ابرص کو ٹھیک کر رہا ہوں۔ اور مردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی جو کرامات صحیح طریقے سے ثابت ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عزت بخشے ہیں اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو جاتی ہے اپنی مرضی سے تو کوئی نبی بھی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ **وَمَا كَانَ لِلرَّسُولِ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ**۔ فعل تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ مگر نبی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیا جائے گا۔

بہار سے ہادی عظیم علیہ السلام کی زندگی میں بے شمار معجزات پیش آئے۔ پتھروں سے پانی نکالنا تو عام مشاہدہ کی بات ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں سے چشمے نکلتے ہیں۔ مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہاتھ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ لشکر اسلامی جہاد کے لیے سفر پر تھا۔ راستے میں پانی کی قلت پیدا ہو گئی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کسی کے پاس تھوڑا سبب پانی سے تو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ایک لوطے میں تھوڑا سا پانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس پانی سے وضو فرمایا۔

پھر وہ پانی پیالے میں ڈال کر اپنا ہاتھ مبارک اس پیالے میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انگلیوں مبارکہ کے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ آپ نے فرمایا یہ بابرکت پانی ہے۔ اے اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے۔ آدھ پانی پی لو اور اس سے وضو کر دو لوگوں نے پانی حاصل کیا۔ اس سے وضو کیا اس میں سے پیا اور دوسری ضروریات پوری کیں۔ جب سارا شہر سیراب ہو گیا۔ تو آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اٹھایا اور پانی نکلنا بند ہو گیا۔ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیاء علیہم السلام کو جو معجزات عطا کیے وہ اس کا کمال ہے مگر جو معجزات حضور علیہ السلام کو عنایت کیے وہ کمالوں سے بھی بڑے کر کمال ہے۔ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہوا یا ہمارے رسول عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو۔ اصل میں کمال اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

برفمت پر  
اللہ تعالیٰ کا شکر

بنی اسرائیل کے کھانے کے لیے من و سلوی کا بندہ رست ہو گیا۔ اور پینے کے لیے بارہ چشمے جاری ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرید کَلُوا وَشَرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ساری نوع انسانی کو یہ بات سمجھا دی گئی ہے کہ ہر قسم کی روزی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے۔ اے کھاؤ اور پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ شیخ سعدیؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔

ابو باد و مرد و خورشید و فلک در کھندہ      تا توانی بخت آری و بخت غوری  
ہر اندہر تو سر گشتہ و فرماں بردار      شرط انعام نباشد کہ تو سرمان نبری  
فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے گردش کر رہی ہیں۔ تاکہ تو دنی کو ہاتھ میں لائے اور غفلت سے نہ کھائے۔ روٹی کھاتے وقت انسان کو غور کرنا چاہیے کہ روٹی کا یہ ٹکڑا کتنے مراحل طے کر کے آپ کے ہاتھ میں پہنچا ہے۔ کارخانہ قدرت میں لاکھوں مشینیں اور کرڈروں ہاتھ کام کر رہے ہیں۔ جب ایک روٹی اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہے پانی کا ایک گلاس جو آپ کے ہونٹوں تک پہنچتا ہے۔ یہ کن کن مشینوں سے گذر کر آتا ہے۔ اسی طرح لباس کی تیار ہی میں کتنی مشینیں کتنا خام مال، کتنے انسانی دماغ اور ہاتھ کام کرتے ہیں۔ تب جا کر

زینت اور ستر پوشی کے لیے کپڑا مہیا ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ جس ملک الملک نے انسان کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے۔ اس کی روزی استعمال کر کے کیا اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا کہ کس قدر انصافی کی بات ہوگی۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں استعمال کرنے کے بعد اس کی فرمانبرداری نہ کرو۔

قرآن پاک میں دوسرے مقام پر آتا ہے: **كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ عَطَالٌ** اور طیب چیزیں کھاؤ جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں **وَاشْكُرُوا لِلَّهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ قَابِلُونَ** اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کے بندے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ناداروں کو محرم نہ رکھو۔ تم سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے تم ملک ہو مگر اس بات کی طرف غور نہیں کرتے کہ یہ نعمت آئی کہاں سے ہے۔ یہ کس کی عنایت ہے۔ یاد رکھو۔ اگر غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کو خرد در رکھو گے۔ ان کا حق ادا نہیں کرو گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور مستحقین پر زیادتی ہوگی۔ ہر صاحب استطاعت کا فرض ہے کہ وہ ناداروں کا خیال رکھے۔ اُسے دیکھنا چاہیے کہ سوسائٹی میں کوئی بھوکا یا تنگنا ہے۔ خاص طور پر سربراہان مملکت کا یہ فرض منصبی ہے کہ اپنے اپنے ملک میں عاجمندیوں کی خبر گیری کریں۔

صیار الدین بٹنی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بادشاہ یا حاکم حقیقت میں وہ ہے جس کی سلطنت میں کوئی شخص بھوکا، تنگنا نہ ہے۔ امور سلطنت اس طریقے پر سرانجام دینے چاہئیں کہ ہر شخص کو اس کی بنیادی ضروریات مہیا ہوں۔ بے شک اعلیٰ درجے کی ضروریات نہ بھی حاصل ہو سکیں۔ تو کم از کم ادنیٰ شعبے کی توہین چاہئیں۔ ہر شخص کے کھانے پینے، پہننے اور رہنے کے بے انتظام ہونا چاہیے۔ لہذا یہ انسانوں کا اجتماعی فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی استعمال کریں۔ اور اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں نیکی کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے۔ جس کے پاس ندادنی الارض دولت آتی ہے وہ اسے اپنے بوا کی سمجھتا ہے۔ نہ خدا کا حق نہ رسول کا حق ورنہ انسانیت کا حق کسی چیز کی پر دانی نہیں کرتا۔ مستحقین پر خرچ کرنے کی بجائے رسم و رواج پر خرچ ہوتا ہے۔ مشرکانہ افعال پر خرچ ہوتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی پر خرچ ہوتا ہے یہ ساری ناشکر گزاری کی

مات میں۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حساب نہیں لے گا یا اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔ ایک ایسا دن آنے والا ہے۔ جب ہر چیز کا محاسبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اسی لیے فرمایا کھارو اور پو اللہ تعالیٰ کی روزی سے وَلَا تَقْشُرُوا فِي الْأَرْضِ مِنْهُ مَنَافِعَ زَمِينٍ میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو۔ فساد سے مراد خدا تعالیٰ کے قانون، شریعت اور دین کے خلاف چلنا ہے۔ سائے فساد کی جڑیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا كُنُوا مَعًا فِي الْأَرْضِ حَلَّاءَ طَيِّبِينَ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ حلال اور پاک چیزیں کھاؤ مگر شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ شریعت کے خلاف قدم اٹھانا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ بدعت، شرک، معصیت وغیرہ خلاف شریعت ہیں۔ اور اسی کو فساد کہا گیا ہے۔ جہاں فساد ہوگا وہاں امن و چین نصیب نہیں ہو سکتا۔ نہ ہم خدا تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کر سکتے ہیں۔ نہ قانون شریعت کا احترام کر سکتے ہیں۔ اسلام کا نام کتنے زور شور سے دیتے ہیں۔ مگر عمل صفر کے برابر ہے۔ البتہ ظلم و ستم کا کوئی شمار نہیں۔

اس ماہ کی ابتدائی تاریخوں کی اخباری خبر ہے۔ کسی گھر میں نوجوان لڑکی اور بچہ تھا۔ ماں باپ کہیں گئے ہوئے تھے۔ رات کے وقت دو سپاہی دروازوں کو اٹھا کرے گئے۔ اور ایک مکان میں بند کر دیا۔ اور اس بچی کے ساتھ زیادتی کی۔ یہ تو ان سرکاری کارندوں کا حال ہے۔ جو خود لوگوں کی حفاظت پر مامور ہیں۔ جب ان کا یہ حال ہے۔ تو دوسرے لوگوں کا کیا ہوگا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مجرموں کی نشاندہی ہونے کے باوجود اگر ان تک قانون کا ہاتھ نہیں پہنچتا تو اس صورت میں کیا خدا تعالیٰ کا قہر نازل نہیں ہوگا۔ بہر حال اس قسم کے واقعات فساد فی الارض کے ہونے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم سب نے خدا تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان کے نقش قدم پر چلنا اسی کا نام ہے۔

الغرض فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روزی سے کھاؤ پو۔ مگر زمین میں فساد برپا نہ کرو۔



الہ

دعوتِ شیش

نقشہ ۱۰

(آیت ۶۱)

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نُّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامِ زُجْجٍ فَادْعُ لَنَا ذَبَابًا  
يَخْرِجُ لَنَا مِمَّا تُنْبِئُ الْأَرْضُ مِنَ الْغَنَاءِ وَقِشَابًا وَقُورًا مِمَّا  
وَعَدَ بِهَا وَبَصِيلًا قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي  
هُوَ خَيْرٌ أَهْبِطُوا مَصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَا سَأَلْتُمْ وَضُرِبَتْ  
عَلَيْهِمُ الذَّلِيلَةُ وَالْمَنُكَنَةُ وَبَاءَ وَبُغْضِبَ مِنَ اللَّهِ ذَٰلِكَ  
بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الشُّبُهَاتِ بِغَيْرِ الْحَقِّ  
ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

ترجمہ: اور جب کہ تم نے نے موسیٰ! ہم ہرگز صبر نہیں کریں گے ایک ہی قسم  
کے کھانے پر۔ پس اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے وہ  
چیزیں نکالے جن کو زمین اگاتی ہے۔ اپنی ترکاریوں سے اور اپنی کھڑیوں سے  
اور اپنے گندم سے اور اپنے سوسے اور اپنے پیاز سے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا  
تم بل میں بیٹے ہو اس چیز کو جو ادنیٰ ہے اس سے جو بہتر ہے۔ کسی شرم میں نہ  
جاء۔ بے شک تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا جو تم نے مانگا۔ اور ان پر ذلت اور  
مسکنت مسلط کی گئی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کاذاب یکرٹے اس وجہ سے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ  
کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے۔ اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ بات  
اس وجہ سے ہوئی کہ انہوں نے نافرمانی کی۔ اور وہ حد سے گئے نکل جاتے تھے ﴿۶۱﴾

رہنمائی

اللہ تعالیٰ کے بنی اسرائیل پر انعامات، ان کی سرکشی و تمرد اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کے  
قہر و غضب کا تذکرہ گزشتہ دوس سے چلا آ رہا ہے۔ فرعون کے مظالم، بنی اسرائیل کا مصر سے  
خروج، پھر چالیس سال تک صحرائے سینا میں سرگردانی، شام و فلسطین میں داخلہ، من و سلویٰ اور  
پانی کی فراہمی کے تمام واقعات تفصیلاً آپ کے ہیں۔ اب اس آیت میں جس واقعہ کی طرف

اشارہ ہے۔ وہ بھی بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں ہی پیش آیا۔

غلامی کے اثرات

در اصل مسلسل غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی اخلاقی قدریں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ ان میں طرح طرح کی کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی غلامی کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا تھا: غلامی میں بدل جاتا ہے۔ قوموں کا ضمیر

مقصود یہ کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی غلام بن جاتی ہے۔ تو پھر نہ ان کا جسم اپنا ہوتا ہے۔ اور نہ ان کا ذہن اپنا ذہن ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں غالب قوم کی تابع ہو جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں بھی موجود ہے: عَبْدًا مَّحْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ غَلَامٌ مَّملُوكٌ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کا ضمیر تک بدل جاتا ہے۔ اس کی ٹٹے اپنی ٹٹے نہیں رہتی۔ اس کے اخلاق کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل لمبے عرصے تک فرعون کے غلام رہ چکے تھے۔ لہذا مذکورہ ساری کمزوریاں ان میں پائی جاتی تھیں۔

بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ وہاں رہ کر ان میں جفاکشی پیدا ہو۔ بھوک پیاس اور مشقت برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو۔ لہذا غلامی کے دور کی کمزوریاں دور ہو جائیں۔ تاکہ یہ لوگ آئندہ زمانے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ کسی ملک کے دارش بن کر نظم و نسق چلانے کے اہل بن سکیں۔ پھر ستر سال تک یہ لوگ غلامی کے اثرات میں گرفتار رہے۔ اپنے اصل مقام سے غافل رہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے بار بار کہنے کے باوجود ذہنی غلامی کے خول سے باہر نہ نکل سکے۔

جب پرانی نسل ختم ہوئی تو نئی نسل نے کروٹ لی۔ خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع علیہ السلام نئی ہوئے۔ تو ان کی قیادت میں بنی اسرائیل کی نئی نسل نے شام و فلسطین کو فتح کیا۔ مَشْرِقَ الْأَمْرَيْنِ وَمَغَارِبَ الْفَلَاسِطِنِ اور مغرب کے سائے ملاتے اللہ تعالیٰ نے ان کو دلائیے۔

غلام کی تہذیب

ارشاد ہوتا ہے: اذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى اِنِّىْٓ اَخَذْتُكَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاجِدٍ اِنِّىْٓ اَسْرٰٓئِٖلَ اِسْمَ وَاَقَدَ كُوْنَا دُرُوْدًا۔ جب تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ کہ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ صحرائے سینا میں بلا مشقت من و سلویٰ کھاتے کھاتے بنی اسرائیل سے مزاج جو

ہکے تھے۔ اور وہ کھانے میں تبدیلی چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی کہ ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں من اور سلویٰ دو مختلف کھانے تھے مگر مسلسل یہی کھانا کھانے کی وجہ سے انہوں نے انہیں ایک ہی کھانا کہا کہ اب ہم زیادہ دیر تک اس کھانے سے شکم پر پی نہیں کر سکتے۔ اسرائیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہمیں تو مصر کی کھلی یاد آرہی ہے۔ وہاں ہمیں مختلف قسم کی ہنریاں اور ترکاریاں میسر آتی تھیں۔ اور یہاں پر ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر تنگ آچکے ہیں۔

اے موسیٰ علیہ السلام، فَأَدْعُ لَنَا رَبَّنَا اَب ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں۔

يُخْرِجْ لَنَا كَمَا كُنَّا نَخْرُجُ مِنْ مِصْرَ مِنْ مِثْلِ مَا نَخْرُجُ مِنْ مِصْرَ مِنْ مِثْلِ مَا نَخْرُجُ مِنْ مِصْرَ

اگاتی ہے۔ مِّنْ بَقْلِهِمَا اپنی ترکاریوں سے وَقْتُهَا اور اپنی لکڑیوں سے وَقْتُهَا اور گندم سے وَعَدَ بَهَا اور اپنی سور سے وَبَصَلِهَا اور پتے پیاز سے۔ یعنی اے موسیٰ! ہمیں تو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اپنے رب سے کہہ کر ہمیں یہ دلائیے۔ من و سلویٰ جیسی قوت بخش غذا سے ان کا جی بھر گیا تھا۔ اور وہ اس قسم کی چٹ پٹی چیزوں سے اپنے رزق کا ذائقہ بدلنا چاہتے تھے۔

بنی اسرائیل کی اس فرمائش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی سرزنش کی۔ قَالَ اور فرمایا

اَكْتَسَبَ لَوْ اَلَّذِي هُوَ اَذِي بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ يَا قَوْمِ اَيُّكُمْ اَدْنٰی اور گھٹیا چیز کو اعلیٰ اور بڑھیا چیز سے بدلنے کے خواہش مند ہو۔ تم کہتے ہو قوت ہو کہ اللہ تعالیٰ تو ہمیں من و سلویٰ جیسی بہترین غذا فراہم کر رہا ہے۔ اور تم ہنری ترکاری اور لہسن پیاز کے پیچھے پھر رہے ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل محنت من و سلویٰ سے رکھا تھا۔ اور پھر وہ حساب و کتاب سے بھی بری تھے۔ ان چیزوں کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ پھر ان کے مطلوب لہسن پیاز پر تو حساب کتاب بھی ہو گا۔ یہ بھی ان کے گھٹے کا سودا تھا۔ مگر وہ اُمی پڑھتے تھے۔

کاشفاری حقیقت  
طب کا سب سے

جب بنی اسرائیل کا امرامہ سے بڑھ گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے

کھلایا کہ اگر تم یہ چیزیں چاہتے ہو۔ اِھْبِطُوا مِصْرَ تو کسی شہر میں اتر جاؤ۔ وہاں جا کر کھیتی بڑی  
 کرو۔ ہَلْ جَلَاؤَ آبپاشی کرو۔ اور اپنے لیے اپنی مرضی کی چیزیں کاشت کرو۔ فَإِنَّ لَكُمْ مِمَّا  
سَأَلْتُمْ پس جو کچھ تم چاہتے ہو تمہیں مل جائے گا۔ البتہ ذرا محنت مشقت کرنی پڑے گی۔  
 بعض فرماتے ہیں کہ انگشٹ کی قراۃ میں اِھْبِطُوا مِصْرَ واپس مصر چلے جاؤ۔ وہاں  
 جا کر اسی طرح کھیتی بڑی کرو جس طرح فرعونی کرتے تھے۔ اور بنزریاں وغیرہ حاصل کرو۔ مگر  
 دوسری قراۃ یعنی مِصْرَ کی تئیں کے ساتھ زیادہ راجح ہے۔ یعنی کسی شہر یا قصبے میں  
 اتر جاؤ۔ اور کاشتکاری کرو۔ تم اپنی مطلوبہ چیزیں حاصل کر لو گے۔ تم ایک اعلیٰ چیز چھوڑ کر اس کے  
 بدلے میں معمولی چیزیں چاہتے ہو۔ یہ چیزیں تمہیں محنت و مشقت کے بعد حاصل ہوں گی۔

پیتے نماز  
 فضیلت

حضرت ابوامامہ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے کسی گھر میں لہ کا پھل دیکھا  
 تو فرمایا۔ یہ جہاں بھی ہو وہاں ذلت کا دورہ دہا ہوتا ہے کاشتکاری بذات خود ایک مشقت طلب  
 کام ہے۔ اس کے علاوہ یٰہ اَبِیَّانَ وغیرہ بھی یاد کرنا پڑتا ہے۔ شہری تہذیب سے لُھ انسان  
 بہت سی اچھی چیزوں سے محروم رہتا ہے۔

کاشتکاری ایک اچھا پیشہ بھی شمار ہوتا ہے۔ اس کی تعریف بھی آئی ہے۔ اس پیشے کو  
 فضیلت کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ بہترین پیشہ جاد ہے اس کے ذمے  
 حاصل ہونے والا مال پاکیزہ ترین ہوتا ہے۔ دوسرے نمبر پر تجارت کا پیشہ ہے۔ وَرِزْقُ کا زیادہ  
 حصہ اللہ تعالیٰ نے تجارت میں ہی رکھا ہے۔ اس کے بعد کاشتکاری چھٹی بڑی ہے۔  
 حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ کوئی شخص کوئی فصل کاشت کرتا ہے۔ کوئی دانہ بوتا ہے یا پودا یا  
 درخت لگاتا ہے۔ اس کے پھل میں سے اگر کوئی جائزہ وغیرہ کھائے گا۔ تو اپنے مالے کو صدقے  
 کا ثواب ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کاشتکاری کو فضیلت بخشی ہے۔ اس طرح فرمایا چوتھے  
 نمبر پر صنعت و حرفت کا پیشہ ہے۔ دینی نقطہ نگاہ سے مختلف پیشوں کی یہ درجہ بندی ہے۔

یہودیوں کی  
 ذلت و برائی

بنی اسرائیل کے جتنے بھی واقعات ذکر کئے جائے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ اسی ترتیب کے

ساتھ واقع ہوئے ہوں جس ترتیب کے ساتھ انہیں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا بیان محض عبرت اور تنبیہ کے لیے ہے۔ کہ نوحؑ انسانی ان واقعات سے سبق حاصل کرے۔ اور برائیوں سے اجتناب کرے۔ ان کے ضمن میں یہودیوں کو بار بار خطاب کیا جا رہا ہے۔ کہ دیکھ تمہارے اباؤ اجداد میں یہ یہ خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ ان سے عبرت حاصل کرو۔ اور ایسی برائیوں سے باز آ جاؤ۔ انہی نافرمانیوں کی وجہ سے وَضَعْنَاهُ عَلَىٰ ذُلٍّ أَلِيٍّ وَالْمَسْكَنَةُ أَنَّ پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی۔ مسکنت مال کی کمی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذلت و رسوائی کی لعنت ان پر اس وقت مسلط کی گئی جب وہ ہمیشہ قوم عادی مجرم بن گئے۔

یہ عام مشہور بات ہے۔ کہ یہودی دنیا میں امیر ترین قوم میں ہو کر یہ دست نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہودیوں میں بھی مال و دولت تھوڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ درنہ اکثریت ان کی بھی محتاج ہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہودی مالدار بھی ہوں تو پھر بھی ان کی حالت خستہ ہی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو مسکین ہی ظاہر کرتے ہیں۔

حکومت سے محرومی بھی ذلت و رسوائی کی نشانی ہے۔ یہ قوم دس ہزار سال تک حکومت سے محروم رہی۔ دنیا میں کسی جگہ ان کی سلطنت نہیں تھی۔ یہ لوگ اتنے لمبے عرصہ تک در بدر رہے پھر پھرتے رہے۔ ان کو کسی دوسری حکومت نے بھی ہر ذلت و کید جہنمی دے دی۔ ان کے دشمن۔ اٹلی ولسے ان کے دشمن۔ یہ سازشی ذہن کے لوگ ہیں۔ انہیں کوئی بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

آج اعتراض ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں کا دعوئے تھا۔ کہ دنیا میں یہودیوں کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ ان کا کوئی ملک نہیں ہوگا۔ مگر ان کی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ معاذ اللہ قرآن پاک کا دعویٰ غلط ہو گیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ چوتھے پائے میں موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قوم کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ مگر دشمنوں کے ساتھ إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلِ بَنِي إِسْرَٰءِيلَ یعنی یا تو اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑ لینے سے یا پھر لوگوں کی رسی کو تمام لینے کی وجہ

سے۔ ہاں قریب قیامت میں دجال کے ظہور کے وقت اُن کو عروج حاصل ہوگا۔ تو اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کے تریہ قریب بھی نہیں جاتے۔ البتہ انہوں نے لوگوں کی رسی کو پکڑ رکھا ہے۔ امریکہ برطانیہ فرانس وغیرہ کے دامن سے پٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کو وطن بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اور باقی دنیا کو آنکھیں بھی دکھانے لگے ہیں۔ ان کی سلطنت کا قیام محض امریکہ کی بے ایمانی کو نتیجہ ہے۔ آج امریکہ اگر اپنا ہاتھ اٹھائے تو یہودی سلطنت دو دن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ لغرض! اگر آج یہودیوں کو کسی خطہ زمین پر عروج حاصل ہے تو وہ بھی قرآن پاک کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہی ہے۔ ورنہ اس قوم کی حقیقت یہی ہے۔ وَبَاءُ وَيَغْضَبُ مِنَ اللَّهِ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مذاب ہی لے کر لوٹے۔

آیات النبی  
کا انوار

فرمایا ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ بنی اسرائیل کی ذلت و ہوانی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں جب کوئی انسان نافرمانی کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برپا ہوتی ہے۔ ایسے کا بھی یہی حال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "إِنِّ جَعَلْتُكَ لَعْنَتِي إِلَى يَوْمِ الدِّينِ" جاؤ تم پر قیامت تک میری لعنت برپا ہے اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ جو کفر کی حالت میں مر گیا أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْعَالَمِينَ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ان پر اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت مسلط ہوگئی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ کے احکام کو ٹھکراتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ذلت و ہوانی کے سوا اور کیا ہوگا۔

ابن عبد السلام  
کا قتل

بنی اسرائیل پر لعنت مسلط ہونے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں متا ہے کہ انہوں نے یرمیا نبی شعیان نبی حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے دیگر سینکڑوں نبیوں کو قتل کیا۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں خدا تعالیٰ کے تین سوا ابید علیہم السلام کو شہید کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں نے ایسا کرنے



سے منع کیا اور انہیں طعن و ملامت کی قرآن کو بھی شبیہ کر دیا گیا۔ یہ قوم اس قسم کی عادی مجرم بن چکی تھی جس کی وجہ سے یہ مغضوب اور ملعون ٹھہری۔

یہاں پر بَعَثْنَا لِحَقِّهِ پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ نبیوں کے ناحق قتل کا کیا مطلب ہے؟ جبکہ نبی کا قتل تو بلاشبہ ناحق ہی ہوگا۔ نبی کا قتل برحق تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تو مفسرین کریم اس اشکال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں پر ناحق کا لفظ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قاتل خود سمجھتے تھے کہ وہ غلط کام کر رہے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ سخت عذاب روز قیامت اس شخص کو ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہوگا جس کو کسی نبی نے قتل کیا ہوگا۔ دروں قسم کے اشخاص سخت ترین سزا کے مستحق ہوں گے۔ امیر بن خلف کی مثال موجود ہے کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنے ہنرے سے اس ملعون کو راتھا مشرکین مکہ میں سے یہ بڑا خزانہ قسم کا کاڑھ تھا؟

نور من! سابقہ بنی اسرائیل کی خرابیاں اور ان کی سزائیں بیان کر کے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے بنی اسرائیل کو سمجھا جا رہا ہے کہ اب بھی سمجھ جاؤ۔ خدا کا آخری نبی آگیا ہے: اَمِنُوا بِمَا اَنْزَلْتُ جو کچھ میں نے نازل کیا ہے۔ اس پر ایمان لے آؤ۔ معافی کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ اگر تم ٹھیک ہو جاؤ۔ اپنے اخلاق و اعمال درست کر لو۔ تو تم آج بھی عروج حاصل کر سکتے ہو مگر وہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی کو تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت مسلط کر دی گئی۔ انکار آیات اور قتل انبیاء کے بعد تیسری وجہ یہ بیان فرمائی۔ ذَهَبَ بِمَا عَصَوْا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ عصیان کا حنی اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ضائع کرنا ہے۔ وہ لوگ حقوق اللہ کی باطل پڑاؤ نہیں کرتے تھے۔ اس کے کسی حکم کی تعمیل کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ نیز یہ کہ وَكَانُوا يُعْتَدُونَ وہ مد سے نکل جاتے تھے۔ تعدی کا معنی انسانوں کی جانوں اور مالوں کا تلف کرنا ہے۔ بنی اسرائیل کا ذوق ہی بدل چکا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحیح مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی اور

سنت ابو سعید صلی اللہ علیہ وسلم، مظهری صلی اللہ علیہ وسلم

مذہب احمد صلی اللہ علیہ وسلم، ابن کثیر صلی اللہ علیہ وسلم، تفسیر عزیزی فارسی صلی اللہ علیہ وسلم

ہی میں تمیز کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ **ذُنُورُ تَنْتَ حَسَنَتُكَ وَسَاءُ تَنْتَ سَيِّئَتُكَ** جب تمہاری نیکی تمہیں پسینے لگے۔ اور بُرائی سے نفرت ہو۔ تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو اور اگر نیکی اور ہی میں تمیز پاتی نہیں رہی تو سمجھ لو کہ تمہیں روحانی بیماری لاحق ہو گئی ہے۔

اس کی مثال انسانی جسم کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔ جب آدمی تندرست ہوتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ درست ہوتا ہے۔ اسے میٹھی چیز میٹھی لگتی ہے۔ اور کڑوی چیز کڑوی لگتی ہے مگر جب جسم بیمار ہو جاتا ہے۔ تو اس کی زبان کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے۔ اسے میٹھی چیز بھی کڑوی محسوس ہوتی ہے۔ مقصد یہ کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے اور ہی میں تمیز کرتا ہے۔ تو وہ صحیح مومن ہے۔ ورنہ وہ بیمار ہے۔

بنی اسرائیل کے لوگ بیمار تھے۔ وہ تعدی کی بیماری میں مبتلا تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کا پاس رکھتے تھے۔ اور نہ بندوں کے حقوق کا خیال کرنے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے معصوم نبیوں کو قتل کیا جو خدا تعالیٰ کی رحمت اور انسانوں کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی، اس کے احکام کو خلیوں، بتانوں یا تادیبوں کے ذریعے نکرانا ان کا محبوب مشغلہ تھا ان کی برائیوں کی تفصیلات سورۃ بقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ نساء اور مادہ وغیرہ میں آ رہی ہیں۔ ان کی برائیاں بیان کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے۔ کہ کہیں تم بھی اسی قسم کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہو جانا۔ **وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ** تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا لیا۔ حالانکہ وہ انکار ہی کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! اگر تم بھی انیس لوگوں کی مددش پر چلو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری صحت ایمانی بھی جاتی ہے گی۔ اور ذائقہ ایمانی بھی تبدیل ہو جائے گا۔

رَبِّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَكَادُوا وَأَنصَرُوا وَالشَّابِثِينَ مِن  
أَمْنِ اللَّهِ وَالْيَوْمِ الزَّكِيِّ وَعَمَلَ حَسَنًا فَلَنَّمُ أَجْرَهُمْ عِنْدَ  
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

ترجمہ: جو لوگ مسلمان ہوئے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور جو نصرانی ہوئے

اور صابی، جو شخص بھی ایمان لایا۔۔۔ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر

اور اپنے نام کیسے پس ان کے لیے ان کا اجر ہے۔ ان کے رب کے پاس اور ان پر

کچھ خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ﴿۶۲﴾

اس سے پہلے آیت میں بنی اسرائیل کی نافرمانیوں، فساد فی الارض، اس کے نتیجے میں ان  
پر سزا دی جانے والی ذلت اور مسکنت کا ذکر تھا۔ آیت زیر درس کے بعد بنی اسرائیل کی یکے بعد دیگرے  
خرابیوں کا ذکر ہوگا۔ اس درمیانی آیت میں اللہ تعالیٰ نے وہ قانون بتا دیا ہے۔ جس کی پابندی  
نتیجہ کے اور جس پر عمل پیرا ہو کر ان کو نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ قانون کسی خاص فرقے  
بگروہ کے لیے نجات مختص نہیں کرتا، بلکہ جو بھی شخص اس میں دیے گئے اصول کی پابندی کرے  
گا۔ وہ نجات پا جائے گا۔ خواہ وہ کسی خاندان کسی نسل یا کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ اصل  
بنی اسرائیل کے نسبى تفاخر اور مذہبی فرقت کی تردید ہے۔ جس میں وہ مبتلا تھے۔ اور اسی نام  
بزدلی کی وجہ سے اپنے آپ کو نجات یافتہ سمجھتے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار گروہوں یعنی مؤمنین، یہود، نصاریٰ اور صابین  
کا ذکر فرمایا ہے۔ البتہ سورۃ حج میں پانچویں گروہ مجوسیوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ نزول قرآن کے  
وقت جو فرقے پائے جاتے تھے۔ ان میں مشرکین، یہود، نصاریٰ اور صابی ہیں۔ حضرت  
مولانا شیخ اسدؒ اپنی تفسیر کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت

کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کو کہتے ہیں البتہ صابی ایک ایسا فرقہ ہے جس نے مختلف ادیان سے بعض ایسی چیزوں کو اختیار کر لیا ہے جنہیں وہ اچھا سمجھتے ہیں۔ اس فرقہ کے پیروکار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ زبدہ پڑھتے اور کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بہت سی جائز باتوں میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

اس آیت میں جن مذاہب کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ ان میں سرفہرست اہل ایمان ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الْكَافِرِيْنَ اَمْسُوْا بِكُمْ شَكٌّ وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی مسلمان ہوئے صرف اَمْسُوْا میں وہ تمام لوگ آجیتے ہیں جو بظاہر ایمان لے آئے۔ اور ان میں منافقین بھی شامل ہیں۔ کیونکہ بظاہر تو وہ بھی کلمہ پڑھتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ نمازیں بھی ادا کرتے تھے۔ نبی علیہ السلام کی مجلس میں بھی بیٹھتے تھے۔ اور پھر آپ کی اطاعت کا دعویٰ بھی کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ اَمْسُوْا کی فہرست میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہاں اَمْسُوْا سے مراد وہ اہل ایمان ہیں۔ جو صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ پر اس کے رسولوں پر اس کی کتابوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس خطاب کے مصداق ایسے ہی لوگ ہیں، محض زبانی دعوائے ایمان سے نجات ممکن نہیں ہے۔

اہل ایمان

وَالَّذِيْنَ هَكَذَا اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے۔ یہاں پر مطلقاً یہودی نہیں فرمایا۔ بلکہ فرمایا جو یہودی ہوئے۔ اس میں امتیاز یہ ہے کہ یہودی ایک نسل مذہب سے یہ تبلیغی مذہب نہیں ہے۔ یہودی وہ ہیں جو نسلی طور پر بنی اسرائیل ہیں۔ اور یہودی ہونے سے مراد وہ لوگ بھی ہیں جو اگرچہ نسلی طور پر یہودی نہیں ہیں مگر انہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا۔ نزول قرآن کے وقت مدینہ کے گرد و زوات میں بنی قریظہ ایسے قابل تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور یا اس سے بھی پہلے جب بڑے بڑے عادات پیش آئے۔ تو یہ لوگ اپنے اس وطن سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ یہاں پر ان کے قلعے اور آبادیاں تھیں یہ لوگ صاحبِ علم کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اصل یہودی تھے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اسلانی عربی النسل تھے۔ مگر یہودیوں سے متاثر ہو کر اس مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔ انہیں کے

ہَاذُوْا  
كَافِرُوْا

متعلق کیا گیا ہے کہ جو یہودی ہوئے۔

یہودیوں کو یہود کہنے کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ مغترین کلام فرماتے ہیں کہ پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ نام حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یودا کے نام پر ہے۔ اس نام کی درستی توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ سورۃ اعراف میں آیت ”رَبَّنَا هَذَا فَالْيَكْتُ هَادًا هُوَ الَّذِي جَاءَ بِهٖ“ جمع کرنا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کا داماد ہے۔ جب بنی اسرائیل نے سخت گستاخی کی۔ اور کہا کہ ہم ہرگز اس کتاب کو نہیں مانیں گے۔ جب تک اللہ تعالیٰ خود ہم سے ہم کلام ہو کر اس کتاب کی تصدیق نہ کرے۔ تو موسیٰ علیہ السلام قوم کے شہر آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پر گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ان کا مطالبہ پر کر دیا۔ مگر یہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا قہر بجلی کی صورت میں نازل ہوا۔ اور وہ شہر آدمی دک ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام سخت رنجیدہ خاطر ہوئے۔ کہ مولا کریم! میں قوم کو جا کر کیا بتاؤں گا۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے آدمی وہاں لے جا کر مروا دیے۔ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت عاجزی کے ساتھ دعا کی تھی۔ اور عرض کیا تھا: اِنَّا هٰذَا فَالْيَكْتُ تَسْتَعِزُّنَا مَوْلَا كَرِيْمٍ! ہم تیری طرف رجوع کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا تھا۔ تو بعض فرماتے ہیں کہ یہودیوں کو یہود کہتے ہیں اس ہَذَا فَالْيَكْتُ کے ماننے سے دیا گیا تھا۔

اس وقت پوری دنیا میں یہودیوں کی تعداد دو کروڑ کے قریب ہے۔ برخلاف اس کے نصاریٰ کم و بیش دو ارب کی تعداد میں ہیں۔ یہودی اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر کابند کہتے ہیں۔ مگر ان میں ابتدائے زمانہ ہی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ ان میں سرکشی کا مادہ وافر مقدار میں موجود تھا۔ بعد میں یہ عادی مجرم بن گئے۔ عیسائی ان کی شرست میں داخل ہو گیا۔ اور یہ لوگ حقوق العباد کو ضائع کرنے لگے۔ حتیٰ کہ انبار علیہ السلام کو قتل کیا۔ یہ لوگ اپنے آباء اجداد کے شیعہ افعال پر نادم ہونے کی بجائے۔ ان پر فخر کرتے تھے۔ کہ وہ بہت اچھا کام کرتے رہے ہیں۔ ان کے عہد اعمال اور اخلاق میں بے شمار قبائح یہودیوں کے تھے۔ اور آج تک موجود ہیں۔

یہودیوں کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جسمانی صورت کے معتقد ہیں۔ اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کو جسمانیت سے متبرکات سمجھتے ہیں۔ مگر کہتے ہیں کہ اس کا تعلق جسم کے ساتھ بھی ہے۔ اس جسم کو وہ مثالی اور نورانی مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی جسمانیت شعاع کی طرح ہے۔ جو پھیل جاتی ہے۔ اور سکڑ جاتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے روایت النبی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ لَنْ تُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَرَى اللَّهَ جَهَنَّمَ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ اللہ تعالیٰ کو ظاہری طور پر نہ دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر گریہ، ہنسی، حزن اور غم کا بھی اطلاق کرتے ہیں۔

یہودی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں بھی بڑی بدگمانی رکھتے ہیں۔ بلکہ ان پر تمہیں لگاتے ہیں۔ تو راق کے مطالعے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام پر کیا کیا بدنامی کی ہے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ستم لگائی۔ کہ آپ ہارون علیہ السلام سے حد کرتے تھے اس لیے آپ نے حضرت ہارون علیہ السلام کو قتل کیا۔ والعیاذ باللہ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں سفارشی تھے کہ "وَأَشْرِكُهُ فِي آمْرِى" (۳۲) كَا نَبِيَّتِكَ كَيْفَ يَأْتِيهِ بِرَدِّكَ! میرے بھائی کو میرے ساتھ تبلیغ میں شریک فرما۔ آپ نے یہی تو دعا کی تھی: هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا۔ وہ مجھ سے زبان میں زیادہ فصیح ہے۔ اے اللہ میری زبان میں مکتب ہے۔ رَدَّ أَفْصَحُ قَبْنِي "اے میرا معاون بنائے جو میری تصدیق کرے۔ کہیں فرمایا اے میرا وزیر بنائے۔ ہم مل کر تیرے دین کی تبلیغ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَوْفَيْتَ سُؤْلَكَ يَمُوسَىٰ۔ اے موسیٰ تیرا سوال پورا کر دیا گیا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے مگر یہ بد بخت یہودی کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا۔

یہودیوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نبی نہیں مانتے بلکہ دلی مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ نبی تو محض اپنی ہوتا ہے۔ مگر دلی نبی سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس میں تقرب الی اللہ کا وہ زیادہ مقدّم میں پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔



ان بد بختوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سونے کا کچھڑا خود حضرت ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا یا انہوں نے بنانے کا مشورہ دیا تھا (العیاذ باللہ) اسی طرح انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ تہمت لگائی کہ انہوں نے اپنے کھانڈرا بچیف اور یا کو قتل کر دیا اور اس کی بیوی کو گھر میں رکھا (العیاذ باللہ) انہیں لوگوں نے سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا کہ یہ جادوگر اور طلسمات کا ماہر ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے بائے میں بہت بڑا محبوب ہے۔

یسودی یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت رومی ہے جو کبھی فروغ نہیں ہوئی۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی منکر ہیں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تو انہوں نے سخت مخالفت کی۔ اور انہو دجال تک کہ۔ ان بد بختوں نے ان کے منہ پر تھوکا اور انہیں سولی پر لٹکانے کی کوشش کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر زنا کی تہمت انہی ظالموں نے لگائی۔ (العیاذ باللہ) یودیوں کی یہ اخلاقی بد عقیدہ اور ان کی بڑی خصلتوں کی تفصیلات قرآن پاک میں موجود ہیں۔ بعض چیزیں تفاسیر میں ملتی ہیں۔ اور بعض تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔

نصاری کی  
وجہ تسمیہ

مومنین اور یود کے تذکرہ کے بعد تیسرے گروہ کے متعلق فرمایا: وَالنَّصَارَىٰ وَنَصْرَانِی جوں اپنے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لفظ نصاریٰ، نصرانی کی جمع ہے۔ اور نصرت کے معنی مدد کرنے کے ہوتے ہیں۔ مسخرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اذیت پہنچاتے تو آپ لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے: مَنْ أَنْصَارِی إِلَى اللَّهِ؟ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کون میرا مددگار ثابت ہوگا؟ قَالَ الْحَوَارِیُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ؟ تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں مدد کے لیے تیار ہیں چنانچہ اسی لفظ سے ان کو نصاریٰ کا نام دیا گیا۔ یعنی نصرت کرنے والے۔ مدد کرنے والے جنہو دوسرے مسخرین کرام فرماتے ہیں: کہ جس بستی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بستے تھے۔ اس بستی کا نام

۱۔ تفسیر غزینی قدسی ص ۲۶۸، ۲۔ تفسیر عزیزی قدسی ص ۲۶۸، ۳۔ تفسیر ابن کثیر ص ۱۴۱

۴۔ معالم التنزیل ص ۲، ۵۔ درمنثور ص ۴۵

نامرہ تھا۔ چنانچہ اس بیتی کی نسبت سے اس گروہ کو نصرانی کے لقب سے لقب کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مرینہ کی نسبت کر کے منی کہا جاتا ہے۔ یا کسی کو مکی یا شامی وغیرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نصاری کے  
عقائد باطلہ

نصاری بھی عجیب و غریب عقائد رکھتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کا عقیدہ بالکل جڑا چمکا ہے۔ آج کل کے کبھی پولس نامی ایک شخص کے بھاڑے ہوئے ہیں۔ یہ شخص مسیحیت کا مبلغ تھا۔ اس نے دین مسمیٰ کا بالکل طیرہ بگاڑ دیا۔ پولس نے بھی عیسائیت کو اس طرح خراب کیا جس طرح عمر بن لُحی نے دینِ ابراہیم کو بگاڑ دیا تھا۔ عرب اقوام تقریباً دو ہزار سال تک حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مذہب پر قائم رہے۔ انہوں نے عرصہ تک یہ توحید پرست رہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل اس شخص نے عربوں میں بت پرستی کا طریقہ ایجاد کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نازل قرآن کے وقت سارے عرب شرک میں غرق ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ خانہ کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔

پولس نے مسیحیت کے ساتھ بھی ایسا ہی سوچا کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بندہ اور رسول بننے والے لوگ آہستہ آہستہ ختم ہو گئے۔ اور ٹیلیٹ کا مسئلہ ان میں رواج پا گیا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آکر ہے کہ انہوں نے "إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ" کا عقیدہ بنالید اور اس طرح گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اُس وقت انہوں نے چار گروہ بنائے۔ مگر اس وقت کے کچھ تو تک اور پروٹسٹنٹ دونوں گروہ شرک میں۔ دونوں میں سے کوئی بھی توحید پر قائم نہیں رہا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا یا میسر خدا یا ابن اللہ کہا۔ انہوں نے یہ عقیدہ بھی قائم کر لیا کہ خدا عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کر گیا ہے۔ یہودیوں نے بھی یہی کہا تھا کہ خدا کچھ ٹرے میں حلول کر گیا ہے۔ اس طرح کا باطل عقیدہ عیسائیوں نے وضع کر دیا۔

سید علی ہجویری صاحب کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ صوفیائے کرام کے بارہ فرقے ہیں۔ ان میں سے دو فرقے مرذوب ہیں۔ اور باقی دس فرقے مقبول ہیں۔ دو مرذوب فرقے بنی طول

ہائے فرقہ ہیں۔ وحدت الوجود کا عقیدہ بھی انہی لوگوں کا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بندے کے اندر داخل ہو گیا ہے (العیاذ باللہ) تو بہ حال یہ لوگ بھی اس قسم کی بدعتیہ گئی کا شکار ہو چکے ہیں وَالصَّابِغِیْنَ اور صابی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ صابی کا عام فہم معنی بے دین ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص ایک دین چھوڑ کر دوسرے دین میں داخل ہو جائے تو اسے صابی کہتے ہیں۔ اسی بنا پر عرب کے مشرکین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہتے تھے۔ یعنی انہوں نے پرانا دین چھوڑ کر نیا دین اختیار کر لیا ہے تاہم اس مقام پر جس صابی فرقہ کا تذکرہ ہے۔ مفسرین نے اس کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں۔ شاد عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس فرقہ کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ نیک نیتی اور سعادت حاصل کرنے کے لیے انسان کسی نبی کا عذاب نہیں ہے۔ بلکہ اگر وہ روحانیات اور فرشتوں کے ساتھ رابطہ قائم کرے تو اس کے لیے یہی کافی ہے۔ انہیں سے انسان فیض حاصل کر سکتا ہے۔ یہ لوگ مختلف قسم کے بیکل بنائے ہیں۔ مثلاً آفتاب، مابتاب، ستاروں اور ملائکہ کے نام کے بیکل بنائے جاتے ہیں۔ جس طرح ہم لوگ قبل کی طرف منکر کے سجدہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ستاروں کو سجدہ جلاتے ہیں۔ اور انہیں قبل تصور کرتے ہیں۔

اس فرقہ کے متعلق یہ بھی محلہ ہے کہ یہ تین نمازیں پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں صابیوں کے جانشین پروردی اور چکراوی ہیں۔ چکراوی بھی تین نمازوں کے قائل ہیں۔ ان کے بعض لوگ دو نمازیں پڑھتے ہیں اور بعض صرف ایک۔ یہ سب گمراہ فرقے ہیں اسی طرح پروردی کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ نماز کی کوئی حقیقت نہیں۔ صحیح نماز وہ ہوگی جو حکومت معزز کریگی۔

صابیوں کی اور بھی بہت سی تفصیلات ملتی ہیں۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کو کوئی شخص ہاتھ لگاؤں۔ تو اس کے لیے غسل ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ گدھے اور گائے کے گوشت کو تو نہیں کھاتے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اونٹ اور بچے دار جانور کے گوشت کو بھی پیوریوں کی طرح حرام سمجھتے ہیں۔ یہ پیاز اور باقلی کو بھی حرام سمجھتے ہیں۔ مابوی۔ یا مہچلی یعنی سانپ کی مانند مہچلی بھی ان کے ہاں حرام ہے۔ یہ لوگ شراب کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں۔ مگر نئے کو حرام گردانتے

ہیں۔ طلاق کے متعلق ان کا شرعی مسئلہ یہ ہے کہ حاکم وقت کی اجازت کے بغیر طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں ایک سے زیادہ نکاح بھی جائز نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک عورت سے ہی نکاح ہو سکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے صابیوں کے مختلف بیطلوں کی شکل و صورت کا بھی تذکرہ کیا ہے مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ ملت اولیٰ (FIRST CAUCASE) یعنی تخیلیق پر بھی بیکل بندتے ہیں۔ عقل کا بیکل الگ ہوتا ہے۔ سیاست کا الگ۔ اسی طرح صورت کا بیکل بندتے ہیں۔ اور پھر نفس کا بیکل گول شکل کا بناتے ہیں۔ زحل سیارے کا بیکل مدس شکل کا ہوتا ہے۔ اور مشتری کا بیکل مثلث شکل کا۔ آفتاب کا بیکل مربع شکل کا ہوتا ہے۔ اور مریخ کا بیکل مٹھن یعنی آٹھ پہلو کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ قیامت کا بیکل انکار کرتے ہیں۔ اس کی بجائے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ چھتیس ہزار چار سو پچیس سال کا ایک دور ہوتا ہے۔ جب ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ تو پھر ہر ذی روح کا ایک ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً انسان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے وغیرہ ہر ایک کا ایک جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ جس سے آئندہ نسل ملتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ دور جب تک موجود ہے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہے گا۔ اس کے بعد یہ تناسخ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور پھر دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔ علیٰ ذہن العیاس۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں کلدانیوں کی ایک بہت بڑی تہذیب گندی ہے اس کا مرکز بابل شہر تھا۔ جو کہ کم و بیش ایک سویل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ شہر بغداد سے قریباً ستر یا سو میل دور تھا۔ اس سے پہلے آشوریوں کی تہذیب کا دور دورہ تھا۔ وہ ختم ہوئی ہو تو کلدانی تہذیب کو عروج حاصل ہوا۔ انہیں کے مقابلے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا تھا۔ آپ وہاں تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے۔ مگر مجبور ہو کر وہاں سے ہجرت کی اور شام و فلسطین کو مرکز بنایا۔ پھر خانہ کعبہ کی تعمیر کے لیے مکہ مکرمہ آئے۔ تو صابیوں کی طرح یہ کلدانی بھی ستاروں اور روحانیت کے قائل تھے۔ اور ان کو قبلہ بنا کر ان کی طرف سجدہ کرتے تھے۔

حنیفی بقاصابی

حضرت مولانا حبیب اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ دنیا میں دو قسم کے مذہب ہیں۔ ایک حنفی اور دوسرا صابی۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک صابی دور تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد دور حنفیت شروع ہو چکا ہے اب حنفیت کی آگے تین شاخیں ہیں۔ یعنی سکمان، سیود اور نصاریٰ۔ ان میں سے صرف سکمان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین (ملت) پر قائم ہیں۔ باقی دونوں گروہ اصل دین سے ہٹ چکے ہیں۔

دور ابراہیمی سے پہلے جو صابی گروہ تھا۔ وہ اب بھی موجود ہے۔ آگے اس کی بھی تین شاخیں ہیں۔ یعنی مجوس، برہمن اور جہ۔ مجوسیوں کو زیادہ تر طروج ایران میں ہوا۔ وہاں ان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔ تاریخ کی ایک مشہور کتاب ایران بعد ساسانیوں میں موجود ہے۔ کہ مجوس کی بھی دو توہمیں ہیں ایک کا نام ایرج ہے۔ اور دوسری کا طور۔ قدیم زمانے میں ایران کے بادشاہ فریدون کے دو بیٹے ایرج اور طور تھے۔ انہیں کے نام پر مجوس کی دو شاخیں پھیل گئیں۔ مجوسی بھی دراصل اہل کتاب تھے۔ مگر ہندوؤں کی طرح انہوں نے بھی مذہب کو بگاڑ دیا۔

حضرت علیؓ کی روایت میں آتا ہے کہ مجوسیوں کے کسی بادشاہ نے اپنی بہن کے ساتھ زنا کیا۔ اور پھر اسے جائز قرار دینے کے لیے وقت کے علماء کو ساتھ لایا۔ خود غرض مغیروں اور عالموں نے بادشاہ کے حق میں فتویٰ دے دیا کہ ایسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی شریعت میں بھی تو بہن کے ساتھ نکل جائز تھا۔ گو یہ جو سیت میں اس قسم کی بے حیائی بھی روا تھی حتیٰ کہ ماں کے ساتھ بھی جائز سمجھتے ہیں۔ مجوسیوں کی دوسری شاخ برہمن ہے۔ جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور تیسرے جہ ہیں۔ جو چین اور جاپان میں آباد ہیں۔ یہ سب کی سب صابی امتیں ہیں۔

ایمان بارش

ان چار گروہوں یعنی اہل ایمان، سیود، نصاریٰ اور صابی کا تذکرہ کر کے اب وہ اصول بتائے جا رہے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ تو فرمایا ان چاروں گروہوں میں سے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ثُمَّ تَخَصَّصَ بِحَدِّ الشَّرِّ تَعَالٰی پُر ایمان لایا۔ یعنی کوئی شخص کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ کتنا بڑا کافر اور مجرم ہو۔ بدترین قسم کا ظالم ہو۔ اگر اس نے صدقِ دل سے توبہ کر لی۔ اور

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آیا۔ تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ اور وہ نجات حاصل کرے گا۔ ایمان میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا کافی نہیں۔ بلکہ اس کی صفات۔ اس کی تقدیر و حد نیت۔ اس کے انبیاء علیہم السلام اور اس کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں: کہ جو شخص یہ غتیہ رکھتا ہو۔ کہ خدا بنی نہیں بھیجتا یا حکم جاری نہیں کرتا۔ تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اگر بغیر توبہ کے مر گیا۔ تو وہ جہنمی ہے۔ بنی بھیجتا۔ حکم جاری کرنا۔ شریعت دینا یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کا انکار بھی دوسرے معنوں میں اللہ تعالیٰ کی صفت کا انکار ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض پہنچانے والی مخلوق ہے۔ یہ لطیف اجسام وال نورانی پاک اور منزہ مخلوق ہے۔ ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بالآخرۃ

فرمایا ایمان حاصل کرنے کا دوسرا قانون ایمان بالآخرۃ ہے۔ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ یہ وہی دن ہے جو اس جہان کا آخری دن (LAST DAY OF THIS WORLD) ہو گا۔ پچیس سال کے اس دن میں تمام انسانوں کا حساب کتاب ہو گا۔ اور اس کے بعد دوسرا دور شروع ہو جائے گا۔ گویا قیامت کے دن کو ماننا بھی اتنا ہی لازم ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ جو شخص روز جزا کا انکار کرے گا۔ وہ بھی کفر میں داخل ہو جائے گا۔

اعمال صالحہ

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے بعد تیسرا قانون وَعَمِلْ صَالِحًا ہے۔ یعنی نجات کا حق دار وہ شخص ہو گا جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ بھی انجام دیتا ہو۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر اعمال صالحہ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج ہیں۔ چنانچہ کرام اللہ جہاد کو بھی بنیادی اعمال میں شمار کرتے ہیں۔ تو جو لوگ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ان بنیادی اعمال کو بھی انجام دیں گے۔ ان کے متعلق فرمایا فَتَمَرُ حَبْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ان کو ان کے رب کے پاس جلائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا وَرِثَوا۟ جَنَّٰتٍ عَلٰیہُمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ان پرستقبل میں کوئی خوف نہیں ہو گا۔ اور نہ وہ سابعہ اعمال



پر غمگین ہوں گے۔ جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے دن سب لوگ خوفزدہ ہوں گے۔ مگر یہ طبعی اور عارضی ہوگا۔ بالآخر وہ ہر قسم کے خوف سے بچ جائیں گے۔ بعض اوقات دنیا میں بھی بعض نیک لوگوں کو مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اور وہ ملال و حزن سے دوچار ہوتے ہیں مگر یہ عارضی چیز ہے۔ پیچھے کے اعتبار سے ایسے لوگوں کو خوف نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ حشر واسے دن کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا يَخْزِيهِمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ بڑے دن کی گھبراہٹ بھی انہیں خوفزدہ نہیں کرے گی۔ اللہ ان کے دل کو سکون کی دولت سے مالا مال کرے گا۔ رَسَلَتْهُمْ الْمَلَائِكَةَ فرشتے ملاقات کریں گے تو انہیں تسلی دیں گے۔ کہ گھبراہٹ اب تمہارے لیے امن ہی امن ہے۔ اور آئندہ بھی کوئی خوف نہیں ہوگا۔ کہ ہم سے کسی وقت کوئی نعمت چھین جائے گی۔ یا کوئی تھیف پسپا ہوگا۔ وہ لوگ دنیا میں انجام دیے گئے اپنے کسی عمل پر بھی غمگین نہیں ہوں گے۔

الغرض! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نجات کا یہ قانون سمجھا دیا کہ نجات کسی خاص فرد یا گروہ کے لیے مختص نہیں ہے۔ ایمان کا دعویدار ہو یا سہروردیت کا۔ کوئی عیسائی مذہب رکھتا ہو یا صابی۔ نجات کے لیے واحد قانون یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے آخرت کے دن پر ایمان لائے اللہ تعالیٰ کے فیروں کتابوں اور فرشتوں پر ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ انجام دیے۔ اس کے بغیر نجات نہیں ہے۔ ہر گروہ اپنے ہی فرقے کو افضل اور حق پر سمجھتا ہے مگر نجات کا دار و مدار اسی قانون پر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا۔ آگے قانون کی مزید تشریح آ رہی ہے۔

آلۃ  
درس بہت مہشت

المقۃ  
(آیت ۶۲ تا ۶۴)

وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٦٢﴾ تَتَوَلَّيْتُمْ مِمَّنْ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٦٣﴾

میں جبکہ یہ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد کیا۔ اور ہم نے تمہارے  
ہو پر طور کو بلند کیا۔ جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو۔ اور یاد کرو جو کچھ اس میں  
ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ ﴿۶۳﴾ پھر تم اس کے بعد پھر گئے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور

اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاتے ﴿۶۴﴾

ان آیات میں بھی بنی اسرائیل کی غریبوں کا ہی ذکر ہے۔ اس سے پہلی آیت میں قانون  
نجات کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ کہ نجات کسی خاص فرقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا  
دارومدار ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور اعمال صالحہ پر ہے۔ آیات ذریعہ میں بنی اسرائیل کی توجہ  
اس واقعہ کی طرف دلائی جا رہی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جو کتاب میں  
تمہیں دے رہا ہوں اس کے احکام کی پابندی کرو گے۔ مگر وہ کہنے لگے کہ یہ احکام تو بڑے مشکل  
ہیں ہم سے عمل نہیں ہو سکے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ڈرانے کے لیے ان کے سردوں پر کوہ طہ  
کو کھڑا کر دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ اس واقعہ کو یاد کرو جب  
ہم نے تم سے پختہ عہد کیا۔

بنی اسرائیل  
کا عہد

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات حاصل ہو گئی۔ فرعون اور  
اس کے تمام لشکر ہلاک ہو گئے۔ تو بنی اسرائیل نے خود ہی موسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کی کہ ہمارے  
لیے کوئی شریعت معطر کر دو۔ جس کی ہم پابندی کریں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان کو

تورات عطا فرمائی۔ مگر وہ طرح عرض کے جیسے یہاں سے اس کے احکام کو مٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ اور تو انہوں نے تورات کے منزل من اللہ ہونے پر شک و شبہ کا اظہار کیا۔ اور اعتراض یہ کیا۔ کہ ہم اس کتاب پر ایمان لے لیے تیار نہیں جب تک خود اللہ تعالیٰ اس کی تصدیق نہ کرے۔ کہ یہ اس کی عطا کردہ کتاب ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام شتر آدمیوں کو لے کر کوہ طور پر گئے۔ ان لوگوں نے اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا۔ مگر اس کے باوجود گستاخی کی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا دی۔ بجلی آئی اور سب کو خاکستر کر گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں زندگی عطا کی۔

مفسرین کرامہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود طور سے واپس آنے والے لوگوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہم سے جملہ کلام ہوا ہے۔ اور اس نے کہا ہے کہ یہ کتاب میں ہے ہی دی ہے۔ مگر اس کے تمام احکام پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جس قدر ممکن ہو۔ اس پر عمل کرنا اور باقی کو چھوڑ دینا۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی فصلہ کر دیا۔ کہ تورات کے جملہ احکام تو بہت مشکل ہیں۔ لہذا ہمیں ساری تورات پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور انہوں نے عیسٰی حکام کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اس کتاب پر عمل کرنے کا پختہ عہد کر لیا تھا۔ چنانچہ اسی کو فرمایا گیا ہے۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ فرمایا وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ اور ہم نے تمہارے اوپر طور کو بلند کیا جیسا کہ

الفاظ سے ظاہر ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طور پہاڑ کو اٹھا کر ان کے سروں پر سائے کی طرح کھڑا کر دیا تھا۔ اتنی خوفناک صورت حال تھی کہ پہاڑ کسی وقت بھی ان پر گر کر ان کو پکنا چور کر سکتا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پوچھا کہ تم تورات کے احکام پر عمل کرو گے یا نہیں۔ تو انہوں نے عہد کیا کہ مولا کریم! ہم سے یہ مصیبت ہالٹ ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے احکام پر عمل پیرا ہوں گے۔

معجزات کے بعض منکرین رَفَعْنَا کی مختلف تاویلیں کرتے ہیں۔ دو کہتے ہیں۔

کہ پیڑ کو بنی اسرائیل کے سردوں پر معلق نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ بنی اسرائیل کو پیڑ کے دامن میں اس طرح کھڑا کیا  
 تھا کہ پیڑ کا کچھ حصہ ان پر چھلکا ہوا تھا۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے سورۃ اعراف میں مَنَعْنَا کَاذِبًا مِّنْ جَعَلِیْہِمْ  
 کھڑا کر کے اور دنیا ہے اور عجز اور پرالیا ہو جانے کی وجہ سے۔ جو اللہ تعالیٰ نے پتھر سے پانی نکال سکتا ہے  
 منہ کو یہ ذکر اس میں بارود راستے بنا سکتا ہے۔ من اور ستوی نازن کر سکتا ہے وہ اگر کسی پیڑ  
 کو اٹھا کر سردوں پر معلق کرے تو کوئی سی بڑی بات ہے۔ بلکہ تورات میں قرۃ تفصیل بھی آتی ہے  
 کہ نہ صرف پیڑ معلق ہو گیا تھا۔ بلکہ ساتھ دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور آگ کے شعلے سامنے نظر آتے تھے  
 مفسرین ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے وہ عہد لیا۔ جس کا ذکر اس آیت میں آتا ہے  
 لغوی طور پر طور پر الے پیڑ پر بولا جاتا ہے۔ جو سر ہنر ہو۔ یعنی اس پر بکثرت درخت پائے  
 جائیں۔ خشک پیڑ کے لیے طور کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ یہاں پر جس پیڑ کا ذکر ہے یہ وہی  
 طور ہے۔ جو صحرائے سینا کے اطراف میں واقع ہے۔ اور اس کی ایک چوٹی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام  
 کو اللہ تعالیٰ سے شرفِ تکلم حاصل ہوا تھا۔ اسی پیڑ پر آپ کو تورات ملی تھی۔

دین میں جبر نہیں

بنی اسرائیل کے سردوں پر طور معلق کر کے عہد لینے میں یہ سوانہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ تو جبری  
 عہد ہو گیا۔ جو کہ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ یعنی  
 دین میں جبر نہیں ہے۔ مگر یہاں پر جبر عہد کرایا گیا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ خشک  
 دین میں جبر نہیں۔ مگر اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کو کوئی دین اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔  
 خواہ اس کا دل ماننے یا نہ ماننے۔ کم از کم اسلام میں تو ایسا نہیں ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے۔ کہ  
 تبلیغ کی جائے۔ اسلام کی خوبیاں بیان کی جائیں۔ اس کے معلق اگر کوئی غلط فہمیاں ہیں۔ تو انہیں  
 دور کیا جائے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ اور اسے اسلام کی دعوت دی جائے۔  
 اسلام کی پوری تاریخ اس بات کی شام ہے کہ مسلمانوں نے کسی بھی زمانے میں کسی پر جبر  
 نہیں کیا۔ نہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا۔ البتہ کیمونسٹوں اور عیسائیوں کی تاریخ واضح ہے۔ کہ انہوں  
 نے کیسے کیسے ظلم کئے۔ مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا۔ اور بعض کو تہ تیغ کیا گیا۔

کسی غیر مسلم کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے قلعہ جبر و داعیہیں۔ البتہ فی الجملہ اسلام میں جبر ہے۔ جو قانون ظلمی کا سر تکب ہو گا۔ اس پر جبر بھی ہو گا۔ بنی اسرائیل پر پیادہ سعلق کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ جو عہد کیا تھا۔ اس کی پابندی کرو۔ ورنہ یہ پیادہ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ تورات میں تو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اگر تم نے عہد کی پابندی نہ کی تو تمہارا مرنے میں ہے گا۔

اگر قانون کی پابندی کے لیے جبر کو جبر فی الدین سمجھ لیا جائے۔ تو سارا معاملہ ہی دہم برہم ہو جائے گا۔ حدود اور تعزیرات کا سلسلہ بند کرنا پڑے گا۔ جب کسی مظلوم کو سزا دی جائے گی۔ تو وہ جبر جبر کی دہائی دینے لگے گا۔ کہ اس پر زیادتی ہو رہی ہے۔ اُسے جبر کو ٹٹے لگائے جائے ہیں یا اُسے جبر اُقید میں ڈالا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ اس پر جبر نہیں ہو گا۔ بلکہ قانون کی خلاف ورزی پر تعزیر ہوگی۔ الغرض! اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ قانون کی پابندی کرانے کے لیے جبر سزا دی جاسکتی ہے۔

مسلمانوں کے انحطاط کے زمانہ میں سلطان سلیم ترک نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آکر حکم دے دیا کہ ترکی کی عکسہ میں تمام عیسائیوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے۔ اُس زمانے کے شیخ الاسلام کو اس حکم کی خبر ملی۔ تو فوراً سلطان کے پاس پہنچے اور اس سے اس حکم کے متعلق دریافت کیا۔ سلطان نے تسلیم کیا کہ اُس نے عیسائیوں کی سازشوں سے تنگ آکر یہ حکم صادر کیا ہے۔ تو شیخ الاسلام نے درازک الفاظ میں سلطان سے کہا کہ آپ کا یہ حکم اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ بکریاب غیر مسلموں پر جبر کرنا ہے۔ کہ وہ اسلام میں داخل ہوں۔ سلطان بات کو سمجھ گیا اور اپنا حکم واپس لے لیا یہ تاریخی واقعہ ساری دنیا کو معلوم ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ اور انہوں نے اس کی پابندی کا اقرار کیا تو اہتمکان بالکتاب اللہ تعالیٰ نے فرمایا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ جو کچھ ہم نے دیا ہے۔ اُسے مضبوطی سے پکڑ لو۔ اہتمکان بالکتاب کا مطلب یہ ہے کہ اُسے تسلیم کرو۔ اس پر ایمان رونا اور پھر اسی کے مطابق عمل کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں: نہ پورے کہ سنش اور جانفشانی کے ساتھ اس کا

پڑھنا پڑھنا۔ لیکن سچا، اس میں مندرج قوانین کی پابندی کرنا انسان کی ترقی اور حظیرۃ القدس کا فہم بننے اور عین تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ غرض کتاب کو مضبوطی سے پکڑنے کا مطلب مضبوط باتوں سے پکڑنا نہیں۔ بلکہ اس کے قوانین پر سختی کے ساتھ عمل درآمد کرنا ہے۔ محض خالی خالی وعدوں سے کام نہیں بنے گا۔

قوانین کی پابندی

استمک بالکتاب کے بعد دوسرے نمبر پر فرمایا وَإِذْ كُنَّا فِيهِ اور جو کچھ اس میں ہے اُسے یاد کرو۔ یعنی اس کو پڑھتے پڑھتے ہو۔ یہ قرآن پاک قانون خداوندی ہے۔ سنت رسول اس کی شرع ہے۔ مگر آج کتنے لوگ ہیں جو قرآن و سنت سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے بات میں سمجائی جا رہی ہے۔ کہ جو کچھ قرآن پاک میں قانون نازل ہوا ہے۔ اُسے یاد کرو۔ اس کو خود پڑھاؤ اور دوسروں کو پڑھاؤ۔ اس کی تشریح کرو۔ تاکہ قانون کی تفصیلات عوام الناس تک پہنچ سکیں۔ جس طرح ایک عام دینی حکومت کے قانون کی تشریح ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون قرآن پاک کو عام کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ حاکم وقت کو اپنی رعایا پر اس طرح مہربان ہونا چاہیے۔ جیسے کوئی باپ اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔ ایک باپ کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کرے۔ ہر شریف النفس باپ ایسا ہی چاہے گا۔ جتنے باپ تو یہ نہ کرے گا۔ کہ اس کا بیٹا اس سے زیادہ ترقی کرے۔ اسی طرح حاکم کو بھی اپنی رعایا کی تربیت اولاد کی طرح کرنی چاہیے۔ اور اپنے قانون کی خوب تشریح کرنی چاہیے۔ تاکہ رعایا کا کوئی فرد اس سے ناواقف نہ رہے۔ اور قانون پر عمل پیرا ہو جائے۔ اب اگر حاکم خود اپنے قانون کی پابندی کرے گا۔ تو رعایا بھی اس پر کاربند ہوگی۔ اور اگر وہ خود پابندی نہیں کرتا تو وہ دوسروں سے کیسے پابندی کر دے گا۔ جو شخص خود فاسق و فاجر ہو رہا ہے وہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا کیا درس دے گا۔ جو خود جوار کھیتا ہے۔ وہ دوسرے جواروں کو کیسے سزا دے گا۔ شرابی حاکم شرابیوں سے کیسے



نہیں لگا۔ لہذا ضروری ہے کہ حاکم پہلے خود قانون کی پابندی کرے اور پھر دوسروں کے سختی کے ساتھ پابندی کروائے۔ اس کے بعد جو کوئی قانون شکنی کرے اسے سخت ترین سزا دے۔

فرمایا وَإِذْ كُنَّا مَا فِيهِ اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ اسے یاد کرو۔ اور اس کے پڑھانے کے لیے دس سال بھی مہیا کرو۔ ہر سے قلم کرو۔ علم مقرر کرو تا کہ ہر خاص و عام اس کی تعلیمات سے مستفید ہوں۔ اسے علم ہونا چاہیے کہ ہمارا قانون بہترین قانون ہے۔ اس دستور سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دستور نہیں۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ میں تہ شریف منہوڑ اور دوسرے غیر مسلموں کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ خود کرینگے تو اسلام سے بہتر کوئی قانون نہیں پائیں گے۔ لہذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ جس طرح میں نے اس دستور کو قبول کر لیا ہے۔ آؤ تم بھی اسے لے لے لو۔ اور فلاح پا جاؤ۔ کہ اس سے بڑھ کر کوئی ضابطہ حیات نہیں ہے۔ وَإِذْ كُنَّا مَا فِيهِ کا یہی مطلب ہے۔

وہ کون سے جرائم ہیں۔ جو اس دنیا میں نہیں ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توفیر دیا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزَّوْجَ کہ زنا کے قریب تک نہ جاؤ۔ مگر آج آپ کے سامنے کیا کیا واقعات پیش ہو رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ زنا بالجبر اور پھر انہیں ہلک کر دنیا ایک عام معمول بن چکا ہے جس سرزمین پر اس قسم کے واقعات پیش آتے ہوں۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کیسے نازل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا غضب ہی آسکتا ہے، ۹۱ء میں روس میں کیا ہوا۔ پوتے دو کروڑ انسانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ بڑے بڑے مالداروں کو مائٹوں سے باندھ کر کسی کسی میل تک ٹھسٹا گیا۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ سرمایہ داروں کی طرف ذری کرتے تھے یہ لوگ انسانیت کے دشمن تھے۔ جس معاشرے میں اس قسم کے ظلم ہوتے ہوں اور ان کے انسداد کا کوئی بندوبست نہ ہو۔ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب کچھ عنقریب دنیا کے سامنے آجائے گا۔

فرمایا جو کچھ اس کتاب میں موجود ہے اسے یاد کرو۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا لَعَلَّكُمْ تُتَّقُونَ کہ تم متقی بن جاؤ گے۔ اگر ان کا عقیدہ صحیح ہو۔ قرآن پاک کو پڑھتا پڑھتا ہے۔ ذہینہ تبلیغ انجام دیتا ہے۔ تو متقیوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔ اور تقویٰ ایک ایسی چیز ہے۔

جس کو اختیار کرنے سے شریعت کے احکام کی تعمیل انسان کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک کو هُدًى لِلْمُتَّقِينَ کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی عیشی

فرمایا اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کرنے کے بعد ثُمَّ تَوَّابٌ مُّؤْمِنٌ یعنی پھر بھی تم پر مہربانی کی اور تمہیں موقع دیتا رہا کہ تم اپنے عہد کی پاسداری کرو۔ حتیٰ کہ یہ آخری موقع بھی دیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک بھی نازل ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا آخری نبی علیہ السلام بھی آپکا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ ایفائے عہد کرتے ہوئے وَمِنُوا بِمَا أُنْزِلَتْ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اس چیز پر ایمان لے آؤ جو میں نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک جو کہ اس چیز کا تصدیق کرتا ہے۔ جو پہلے سے تمہارے پاس ہے۔ یعنی توراۃ اور دیگر کتب کا وہ یہ۔ لہٰذا اب بھی موقع ہے کہ ایمان لے آؤ وَلَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ اور اس کے ساتھ اولین کفر کرنے والے نہ بنو اگر ایسا کرو گے تو آئے والی نسلیں بھی تمہارے ہی نقش قدم پر چل کر زورِ راست سے بھٹکی رہیں گی۔

فرمایا اس کے باوجود فَكُونُوا قُضُّوا لِلّٰهِ عَذَابُكُمْ وَرَحْمَتُهُ اِذَا ارَادَ اللّٰهُ كَافُلًا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی لکن تَدُومُنَا لِخَيْرٍ وَرَحْمَتُهُ اِذَا ارَادَ اللّٰهُ كَافُلًا اور اس کا خاص فضل ہے کہ وہ تمہیں بار بار موقع دے رہا ہے۔ کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راستہ پر آ جاؤ۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف دیکھے تو فوراً ہلاک کر دے اور توبہ کا موقع بھی نہ مل سکے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُفُّوا قِرْدَةً خَاسِبِينَ ﴿٦٥﴾ فجعلناها نكالا لما بين يديها وما خلفها وموعظة للمتقين ﴿٦٦﴾

تو سمجھ رہے تھے اور البرہہ تحقیق تم جانتے ہو۔ ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے ہفتے کے دن یا دلی کی تھی۔ پس ہم نے ان کو کما کر ذیل بندہ بن جاؤ ﴿۶۵﴾ اور بنا دیا ہم نے اکی لوگوں کو عبرت ان کے لیے جو اس وقت موجود تھے۔ اور جو پیچھے آنے والے تھے۔ اور متقیوں کے لیے نصیحت بنا دیا ﴿۶۶﴾

یہود کا مقدس  
دن ہفتہ

گذشتہ آیات میں اس عہد و پیمان کا ذکر ہوا جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ کہ وہ تورات پر عمل پیرا ہوں گے۔ اب ان آیتوں میں خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا وہ واقعہ یاد دلایا ہے۔ جس میں ان نافرمانوں کو سزا دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ یعنی اے اسرائیلیو! تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی و زیادتی کی تھی ہفتے کے دن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تورات میں حکم نازل فرمایا تھا کہ اس دن کوئی شخص کوئی کام نہ کرے۔ نہ تجارت کرے نہ ذراعت کرے، نہ مزدوری کرے اور نہ کوئی دوسرا کام انجام دے، حتیٰ کہ گھر میں کھانے پکانے کی بھی ممانعت کر دی۔ اور حکم دیا کہ اس روز صرف عبادت کی جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ کیا جائے۔ اور ساتھ تنبیہ کر دی کہ جو کوئی ہفتے کے روز اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرے ہوئے۔ کوئی بار بار کرے گا۔ وہ جک ہو جائے گا۔

جموں نصیحت

یہودیوں کے لیے ہفتہ اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا دن مقدس ہے۔ مگر اہل اسلام کے لیے جمعہ کا دن مبارک ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی

امتوں کو بکا دیا کہ وہ جمعہ کا دن نہ پاسکیں۔ بلکہ یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے آخری امت کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ کیونکہ جمعہ تمام الہم سے زیادہ فضیلت والا دن ہے۔ آپ نے فرمایا اَلْبَهْؤُودُ عِنْدَ اٰیْمَنِ یَّوْمِنِیْ عَمَّوْیَ الْکَلْدَانِ اَخْتِیَارِکِیَا وَالتَّصْنِیْ بِعَدَ عَقِدِ اَوْنِصَارِیْ نے اس کے بعد یعنی توار کا دن منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی حد تک اختیار دے دیا تھا کہ وہ اپنے لیے بہتر دن منتخب کر لیں۔ اور انہوں نے یہ ایام پسند کیے۔ اور جمعہ کو منتخب کیا۔ جو کہ مسلمانوں کے مقدس میں تھا۔ یہودیوں نے ہفتے کا دن اس لیے اختیار کیا کہ کائنات کی تخلیق ہفتہ کے روز شروع ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے ہاں یہ سب سے بڑا دن سمجھا گیا۔

یہودی قانون  
شکنی

جیسا کہ بیان ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ نے ہفتے کا دن خاص عبادت کے لیے مقرر کیا تھا اور اس روز دیگر ہر قسم کے کام کی ممانعت کر دی تھی مگر یہود نے اس حکم کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اس خلاف ورزی کی تفصیل قرآن پاک میں کئی ایک مقامات پر آئی ہے۔ تاہم سورۃ الاعراف میں ایک پورا کوع اسی موضوع پر ہے۔ وہاں پر ہفتے کے روز تعہدی کرنے والوں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ بکھرے قلمزم کے کنارے واقع بستی میں بستے تھے۔ تورات کے مطابق اسی بستی کا نام ایلم تھا۔ جسے آج کل عقبہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ساحلی لوگ تھے۔ ان کا پیشہ عام طور پر ماہی گیری تھا۔ تاہم انہیں ہفتہ کے علاوہ باقی چھ دنوں میں مچھلیاں پکڑنے کی عام اجازت تھی۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا امتحان لینا چاہا کہ یہ لوگ کس حد تک میرے حکم کی پابندی کرتے ہیں۔ لوگوں نے مشاہدہ کیا کہ ہفتہ کے روز بہت زیادہ مچھلیاں نظر آتی تھیں۔ جب کہ باقی دنوں میں خال خال ہی پکڑی جاتی تھیں۔ تو انہوں نے زیادہ تعداد میں مچھلیاں حاصل کرنے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی کہ سمندر کے کنارے حوض بنائے۔ جن میں ہفتے کے روز سمندر کا پانی چھوڑ دیتے۔ جب بہت سی مچھلیاں ان حوضوں میں جمع ہو جاتیں۔ تو تھکے بند لگاتے تاکہ یہ مچھلیاں واپس سمندر میں نہ چلی جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ ہفتہ کے روز واقعہ مچھلیوں کو نہ پکڑتے بلکہ انہیں حوض میں جمع کر کے اگلے روز یعنی توار کو پکڑ دیتے۔ گویا اس طرح وہ حیلہ سازی سے احکام الہی کی خلاف ورزی کرتے جب ان سے کہا جاتا کہ بھائی! اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے روز مچھلیاں پکڑنے سے منع کر

رکھا ہے۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ تو وہ کہتے کہ ہم ہفتے کے روز نکار نہیں کرتے بلکہ اگلے روز کرتے ہیں۔ لہذا یہ کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔

شاہ عبدالغفور اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ کافی عرصہ تک یہ حیلہ استعمال کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ آیا۔ تو انہوں نے لوگوں کو کھیتی سے منع کیا اور بتایا کہ اس روز شکار کرنا حرام ہے۔ یہ حیلہ سازی بہت بڑی بات ہے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ کام تو ہم اپنے آباؤ اجداد سے کرتے چلے آئے ہیں۔ اس میں کوئی بُرائی کی بات نہیں ہے۔ کفار مکہ بھی یہی کہتے تھے کہ جس چیز کو تم شرک بتاتے ہو۔ یہ کام تو ہم خدا بعد نبی کرتے چلے آئے ہیں۔ اگر یہ واقعی بُرائی کا کام ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور ہمیں روکنے کے لیے ہمارے ہاتھ بند کر دیتا۔ چونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ لہذا یہ کوئی بُرا کام نہیں۔

الغرض! حضرت داؤد علیہ السلام نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ انہیں نیکی کی تلقین کی اور بدایوں سے منع کیا۔ انہوں نے اچھی طرح توبہ کی۔ کہ اگر تم اپنی بُری خصلتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ آپ کی اس تبلیغ سے تقریباً بارہ ہزار لوگ نہ صرف خود اس غلط کام سے باز آ گئے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کو بھی روکنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جو ایک گروہ فاسقین کا تھا۔ تو ان کے منصب میں صابین کا ایک گروہ بھی بیجا ہو گیا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ آیا تھا۔ جو خود تو بُرائی کا ارتکاب نہ کرتا تھا۔ مگر دوسروں کو روکتا بھی نہ تھا۔ آگے قرآن پاک میں آتا ہے کہ یہ گروہ بُرائی سے منع کرنے والوں کو کہتا تھا کہ تم انہیں کیوں روکتے ہو۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ مگر صابین کا گروہ انہیں جواب دیتا مَعْرِضَةً إِلَىٰ رَبِّكَ ۚ وَلَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کہ بھائی! اللہ تعالیٰ کے سامنے مذہبی کے لیے انہیں روکتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھ لیا کہ تم نے انہیں بُرائی سے کیوں نہ روکا تو ہمارا کیا جواب ہوگا۔ قیامت کے روز نہ امت اٹھانی پڑے گی۔

اہل علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اور اس کی عطا کردہ شریعت

لوگوں تک پہنچا میں۔ اور تبلیغ کا حق ادا کریں۔ جو کتبہ ہے کہ ان کی تبلیغ سے کوئی شخص روزِ ست پر جائے  
 اسی واسطے بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے: **لَا يَكُ حَبِيبَ الْكَفَرَةِ صَلَّيَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ** نے حضرت علیؓ  
 کو مجھڑا اٹھایا اور جہاد کے لیے روانہ کیا تو فرمایا: **لَا يَكُ يَلْدِيَّ اللَّهُ بِكَ رَجُلًا وَاحِدًا خَيْرًا لَّكَ**  
**مِنْ أَنْ تَكُونَ لَكَ حُصْرَ النَّاسِ** اگر ایک آدمی نے بھی تمہاری وجہ سے ایمان  
 قبول کر لیا۔ تو یہ تمہارے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت سے بھی بستر ہو گا۔ جہاد کا اصل مقصد  
 جنگ و جدال نہیں بلکہ اس کا مقصد فتنہ و فساد کو مٹانا اور دوزخ و صفت لوگوں کو راستے سے ہٹانا ہے  
 وقت گزرتا گیا۔ اور یہ تینوں گروہ اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ آخر کار صاحبین نے سوچا  
 کہ ہم ان نافرمانوں کے ساتھ کب تک گزار کریں گے۔ کیوں نہ ہم ان سے الگ ہو جائیں۔  
 کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے اور ہم بھی اس میں مبتلا ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے  
 باقی دو گروہوں کا بائیکاٹ کر دیا اور قریب ہی پہنچے علیحدہ علاقے میں مستقل ہو گئے۔ ان دونوں  
 علاقوں کے درمیان دیوار یا کوئی اور آڑ تھی جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔  
 البتہ ایک دوسرے کی آوازیں سن سکتے تھے۔

انسان بندہ  
 بن گئے

ایک دن ایسا ہوا کہ صاحبین کے گروہ نے دوسرے گروہ کے کسی آدمی کی آواز نہ سنی۔ اور  
 نہ ہی ان کی کوئی حرکت وغیرہ محسوس کی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد جب انہوں نے جھانک کر دیکھا۔  
 تو اللہ تعالیٰ کا حکم آچکا تھا **فَقُلْتُ لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ** پس یہ کہنے کے بعد کہ تم سب  
 ذیل بندہ بن جاؤ۔ چنانچہ صاحبین نے دیکھا کہ اس گروہ کے بڑے بڑے خنزیروں کی شکل میں اور  
 نوجوان طبقہ بندروں کی صورت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ غلیں تبدیل ہو چکی ہیں بگڑے ہوئے۔ پٹنے  
 کے پر نام ہیں اور زار و قطار دوڑ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں کہ یہ جیسے فلاں رشتہ دار  
 ہیں۔ اور یہ فلاں رشتہ دار ہیں۔ اس مقام پر صرف بندوں کا ذکر ہے۔ تاہم دوسرے مقام خنزیر بھی آتا  
 ہے۔ **فَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ** کہتے ہیں کہ یہ لوگ اس شکل و صورت  
 میں تین دن تک زندہ رہے۔ اس کے بعد ہلاک ہو گئے۔



بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان بندہ اور خنزیر یکے بن گئے۔ حالانکہ اس زمانے میں ذروں کی تیسویں کا بھی ماہر چاہے جو کہتے ہیں کہ موجودہ انسان بندروں کی ترقی یافتہ نسل ہے پہلے سب بندہ ہی تھے مگر ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے۔ اس کا دعویٰ اس دلیل پر مبنی ہے کہ بندہ کی شکل انسانی شکل کے مشابہ ہے۔ حالانکہ حیقت یہ ہے کہ انسان بندہ یا خنزیر کی نسل نہیں ہے۔ اور نہ بندہ انسان کی نسل سے ہیں۔ بلکہ یہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ بندہ اور انسان پہلے ہی علیحدہ علیحدہ نسلیں تھیں اور آج بھی ویسی ہی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ معترضین ذروں کی تیسویں کو تسلیم کرنے میں تو کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے مگر جب قرآن پاک کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بندروں کی شکلوں میں تبدیل کر دیا۔ تو انہیں یقین نہیں آتا۔

بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا لعن اللہ الیہود والنصارى۔ یہود و نصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منع کیا تھا کہ تمہارے لیے چربی کا استعمال جائز نہیں۔ خواہ حلال جائز ہی کی ہو۔ مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم میں اس طرح حید سازی کی کہ چربی خود تو نہیں کھاتے تھے۔ مگر اسے پگھلا کر فروخت کر دیتے تھے۔ اور اس کی قیمت کھا جاتے تھے۔ جب الی سے کہا جاتا کہ تمہارے لیے چربی حرام ہے تم اسے کیوں کھاتے ہو۔ کہہ دتے کہ ہم چربی تو نہیں کھاتے۔ بلکہ اسے فروخت کر دیتے ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے لَا تَرْتَكِبُوا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُودُ اے ایمان والو! اس چیز کا ارتکاب نہ کرو۔ جس کا یہود کرتے تھے۔ فَتَسْجَلُوا مَحَارِمَ اللّٰهِ بِاَذْنِ الْخَيْلِ کہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو جیسے بھانے سے حلال کر دیتے تھے۔ کیسے تم بھی ان کی پیروی کر کے مفسوب علیہ بن جانا۔

یہود بعض برائیاں کھیلے عام کرتے تھے۔ مثلاً سود علی الاعلان کھاتے تھے اسی طرح دوسروں کا مال ناحق کھا جاتے تھے مگر ان برائیوں پر اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں مسخ نہیں کیں۔ ایسا کیا ہے۔ کہ ان جرائم پر جن کا ارتکاب انہوں نے جیسے بھانے سے کیا۔ معلوم ہوا کہ ناجائز

حید سازی بہت بڑی خصلت اور بہت بڑا جرم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیروں اور بندوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم حید سازی سے خدا تعالیٰ کے قانون کو نہ توڑنا اور نہ بڑا سخت جرم ہے ایسا کرنے والوں کی اگرچہ اب شکلیں تو تبدیل نہیں ہوں گی۔ مگر ان کا باطن بالکل ایسا ہی ہو گا۔ اب کیا کچھ نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حید سازی کی جاتی ہے۔ سود اور رشوت کی آمدنیوں کی جاتی ہیں۔ اور اس کے جواز کا فتویٰ لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ حید سازی اور حرام ہے۔

جائز حید سازی

اگر نیت نیک ہو اور حید سازی حرام سے بچنے کے لیے کی جائے تو یہ جائز ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض امور میں خود حید سازی کا طریقہ بتلایا ہے۔ مثلاً حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہؓ سے بہت اعلیٰ قسم کی کھجوریں لائے۔ آپ نے دریافت فرمایا اَکُلُ قَمَیْرَ خَبِیْثٍ فَکَذٰکِیَا خبر کی سب کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضور! بعض گھٹیا اور ناقص قسم کی کھجوریں بھی وہاں پائی جاتی ہیں۔ آپ کے مزید دریافت کرنے پر صحابہؓ نے بتایا کہ ہم ادنیٰ قسم کی دو صاع کھجوروں کے عوض اعلیٰ قسم کی ایک صاع کھجوریں لے لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ذٰلِکَ الرَّیْبُ یہ تو سود ہو گیا۔ ایک ہی جنس کا لین دین تو بڑا بری کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ نہ کہ کم و بیش۔ ایسا نہ کرو۔ یہ حرام ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اُسے منہ کا حل یہ ہے کہ پہلے ادنیٰ قسم کی کھجوروں کو کسی دوسری جنس مثلاً گندم، جو کے عوض بیچ ڈالو یا ان کی نقد قیمت وصول کر لو۔ اور پھر اُس سے اعلیٰ درجے کی کھجوریں خریدو۔ یہ حید جائز ہے۔

اس قسم کی مثالیں قرآن پاک میں بھی ملتی ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام کسی معمولی بات پر ناراض ہو گئے۔ تو قسم کھائی کہ تندرست ہو گیا۔ تو بیوی کو سولاٹھیاں یا کوڑے مار دیں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تمہاری بیوی نیک خاتون ہے۔ اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ بلکہ اپنی قسم پوری کرنے کے لیے تو چھڑیوں کا ایک گٹھلی لے لو۔ اور ایک ہی دفعہ بیوی کو ضرب دگا دو یہ کافی ہے۔ گویا سو کڑوں کی سزا سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ حید سازی بتلائی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بھی جیل سازی کا ذکر آتا ہے۔ کہ آپ اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے مگر اس ملک کے قانون کے مطابق وہ انہیں نہیں روک سکتے تھے اور اسرائیلی قانون کے مطابق جو شخص چوری کا ارتکاب کرے اُسے سال بھر غلامی کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائی کو روکنے کے لیے اسرائیلی قانون کا سہارا لیا۔ اور اس کے لیے جیل یہ بنایا کہ اس کے سامان سے پیمانہ برآمد کر لیا۔ اسی جیل سازی کو قرآن پاک نے اس طرح بیان فرمایا: **كَذَلِكَ كُنَّا لِيُوسُفَ نُهَمِّنُ** ہم نے یوسف علیہ السلام کو ایسا کرنے کی تدبیر بتائی تھی۔ البتہ ناجائز جیل سازی بہر حال حرام ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے ذیلوریوں کے نام بہہ کر دیا۔ جب اس کے پاس سال پورا ہونے لگا۔ تو بیوی نے خاندان کے نام بہہ کر دیا۔ گویا نہ کسی کے ہاں زلیہ پورا سال گزرے اور نہ اُس کی زکوٰۃ دینی پڑے۔ یہ جیل سازی ناجائز ہے اسی طرح کسی بھی فرعن، روزہ، نماز، جہاد وغیرہ سے بچنے کے لیے کوئی جیل سازی کرے گا تو مجرم محض ہے گا۔

تبیلی شال  
کے ترجیہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان، فرانوں کو جانوروں کی شکل میں اور خاص طور پر خنزیروں اور بندروں کی شکل میں کیوں تبدیل کیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک قانون مقرر کیا تھا کہ ہفتے کے دن سوائے عبادت کے کوئی کاروبار نہیں کریں گے۔ مگر انہوں نے حکم خداوندی کو توڑ کر پھیل کا شکار شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا کے طور پر خنزیر اور بندر بنا دیا۔

محققین فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ انسان قانون کی پابندی کرتا ہے۔ اور جانور اس سے مستثنیٰ ہے۔ اب اگر انسان بھی قانون کی خلاف ورزی شروع کرے تو ظاہر ہے کہ وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے درجے پر آگیا۔ اور ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے انسان بندر سے زیادہ مشابہ ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ شکل و صورت کے علاوہ بندر جس اور شخصہ میں

بھی انسان سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ بڑا نقل جانور ہے۔ جس طرح انسان کو کرتے ہوئے دیکھتے  
اسی طرح کرنے لگتا ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے اُن جانوروں کو جانوروں کی اس قسم میں تبدیل  
کیا جو اُن سے زیادہ مشابہ ہیں۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ جب اکیلا آدمی کسی ضابطے کی پابندی کرتا ہے۔ تو اسے اخلاق کا نام  
دیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی دو افراد آپس کوئی معاملہ کرتے ہیں۔ تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ قانون  
کی ادنیٰ ترین صورت میاں بیوی کے درمیان نکاح کا ضابطہ ہے۔ جس کی پابندی دونوں فریقوں پر  
لازم ہے۔ اگر کوئی فریق اس قانون کو توڑے گا۔ تو وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت  
کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ اس کی مزید وضاحت یوں سمجھیں کہ عقد نکاح کے قانون کے  
مطابق کوئی عورت ایک ہی مرد کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ یہ ایک معاملہ یا (AGREEMENT)

————— ہوتا ہے۔ جسکی پابندی ضروری ہے۔ اگر اسی ضابطے کی خلاف ورزی  
کرتے ہوئے عورت ایک مخصوص مرد کی بجائے کسی دوسرے مرد کی خلوت میں بھی چلی جائے۔ تو  
ظاہر ہے کہ وہ جانور کی سطح پر آجائے گی۔ جس پر کسی ایسے قانون کی پابندی لازم نہیں۔ اسی  
طرح مرد اگر اپنی منکوحہ عورت کی علاوہ کسی دوسرے عورت کی طرف نظر بڑھے دیکھتا ہے۔ تو  
وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔

اب نکاح کی بھی شرائط ہیں۔ نکاح ایسے مرد اور عورت کے درمیان ہو سکتا ہے۔ جو  
آپس میں محرمات میں سے نہ ہوں۔ اگر محرم ہوں گے۔ تو نکاح جائز نہیں ہوگا۔ اگر ایسا کریں گے  
تو قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ اہم شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ کہ ان تمام شرائط کے ساتھ جو  
کام ہوگا وہ درست ہوگا۔ ورنہ قانون شکنی کی زد میں آجائے گا۔ اسی طرح مباشرت کے لیے  
بھی بعض شرائط ہیں۔ کہ کوئی شخص اپنی عورت کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے مرد کے  
ساتھ جائز نہیں۔ جب مرد اور عورت آپس میں ملیں گے۔ وہ بھی فطری طریقے سے۔ غیر فطری  
رستے سے استغناء بھی خلاف قانون ہے۔ جو کسی طرح جائز نہیں۔

قانون شکنی پر خنزیر اور بندر کی سزا اللہ تعالیٰ نے اس واسطے دی ہے۔ کہ یہ دونوں جانور اخلاقی طور پر دوسرے جانوروں کی نسبت زیادہ گرسے ہوئے ہیں۔ خنزیر ایک ایسا جانور ہے۔ کہ اس کی دہکے ساتھ کئی کئی نزدیک وقت چھٹی کرتے ہیں۔ یہ اس قسم کا بے غیرت جانور ہے۔

اور بندر کی ایک بہت بڑی خصلت یہ ہے۔ کہ یہ اپنے ہی ہم جنس بندر کے ساتھ بھی قتائے شہوت کرتا ہے۔ خنزیر قانون کی ایک شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ تو بندر دوسری شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سور کا گوشت کھانے والے لوگ بے غیرت سمجھے جاتے ہیں۔ انگریز اور سکھ جو خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں بے غیرتی کا وہ کثرت سے پایا جاتا ہے۔ الغرض جب یہود نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو ٹوڑ ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں ان جانوروں میں تبدیل کر دیں۔ جو خود قانون شکن ہے۔

نماز کا ایک اہم قانون ہے۔ کہ مقتدی اہم سے آگے نہ نکلے۔ رکوع، سجود، قنوت، اللہ۔ ہر مقام پر اہم کی اقتدار میں ہے۔ اور اگر کوئی نمازی اہم سے آگے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس کی مثال گھر کے ساتھ دی گئی ہے۔ جو کہ بڑا بوقوت جانور ہے۔ گویا جو شخص نماز کے قانون کو توڑتا ہے۔ وہ گھر کے مانند ہے۔ یہ تو اس کی باطنی صورت ہے۔ فرمایا اہم سے آگے نہ جانے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ أَوْ بِهْوَٰلٍ أَوْ غَيْرِهِ وَلَكُمْ نَجَاةٌ وَلَوْ أَنْتُمْ لَمْ تَعْلَمُوا** یعنی کہیں ظاہری طور پر بھی قانون شکن گھر کا ہی نہ بن جائے قانون شکنی پر سخت وعید آئی ہے۔

فرمایا بنی اسرائیل! تم جانتے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے ہفتے کے دن تعوی کی اور حکم بجانہ لائے۔ بلکہ حیلہ سازق سے اس کی عمر مت کوڑا۔ تو ہم نے انہیں کہا۔ کہ ذلیل و خوار بندر بن جاؤ۔ پھر جب وہ بندروں کی شکلوں میں تبدیل ہو گئے۔ تو باقی دنیا کیلئے وہ نشان عبرت بن گئے۔ **فَجَعَلْنَاهَا نَكَارَةً لِّمَنْ يَذَّكَّرُ بِهَا وَلِلَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ** ہم نے انہیں موجودہ اور آئندہ آنے والے لوگوں کے لیے عبرت کا نشان بنادیا۔ اور ان کی باروں پر اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔ کہ فساد قوم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیر اور بندر

بنادیا۔ یہ اس لیے کہ اس واقعہ کو یاد کر کے آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں۔  
 فرمایا تبدیل اشکال محض عبرت کے لیے ہی نہیں بلکہ اے وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ بھی  
 بنادیا۔ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے اس واقعہ میں نصیحت ہے۔ کہ اگر آئندہ بھی  
 کسی نے اللہ تعالیٰ کے قانن کو توڑا۔ تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائیگا۔ اللہ تعالیٰ  
 نے متقیوں کے لیے اس واقعہ کو نصیحت بنادیا۔

---



التَّوَّابِينَ  
مَدِينَةٍ

المقصود  
(آیت ۱۶)

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً  
قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوعًا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ①

توجہ توجہ! اور جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا  
ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ تو انہوں نے کہا۔ کیا تو بتاتا ہے ہم کو ٹٹھکیاں بولاموسیٰ  
علیہ السلام نے کہا۔ چاہے بھلا۔ اس بات سے کہ میں جاہلوں میں سے ہوں ①

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی جلد سازی کا تذکرہ بیان فرمایا تھا۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ  
کے قانون کو کس طرح توڑتے تھے۔ اس جرم کی پاداش میں ان کی شکلوں کو تبدیل کر دیا گیا۔ اور بالآخر وہ  
ہلاک ہو گئے۔ آیت زیر دس میں بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس میں اس  
قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ مگر انہوں نے اس حکم کو ٹان چاہا۔ اور اس ضمن میں طرح طرح  
کے سوال کئے۔ گویا بال کی کھال اتار رہے ہیں۔ من حیث القوم یہ خرابی بھی بنی اسرائیل میں موجود تھی۔  
اس آیت میں اسی بات کا ذکر کیا گیا ہے۔

در اصل گائے ذبح کرنے کا حکم ایک خاص مقصد کے تحت دیا گیا تھا۔ جس کا ذکر اگلے رکع  
کی پہلی آیت میں ہے: وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأَتْكُمْ فِيهَا جَبْتُمْ لَهَا  
شَخْصًا كَرِهَ اللَّهُ مُخْرِجَ مَا كُنْتُمْ  
تَكْتُمُونَ۔ اور الزام ایک دوسرے کے سر نہ پہنے گئے۔ وَاللَّهُ مُخْرِجُ مَا كُنْتُمْ  
كَاتِبِينَ۔ اور اللہ تعالیٰ ظاہر کرے والا ہے۔ جس کو تم چھپاتے ہو۔ قتل کر ہو گیا۔ مگر قاتل  
کو پتا نہیں چلتا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ کہ تم ایک گائے ذبح کرو اور اس کا ایک ٹکڑا  
مقتول کے جسم پر مارو، تو وہ زندہ ہو کر خود بتا دے گا۔ کہ اس کا قاتل کوئی ہے، چنانچہ قاتل  
کا ہتہ چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ جس کا تذکرہ آیت زیر دس  
میں ہو رہا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جس مقصد کی خاطر گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا۔

اس کو بعد میں بیان کیا ہے۔ مگر اس حکم کا تذکرہ پہلے کر دیا گیا ہے۔ گویا واقعات کے مقدم و تاخر کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ اس کے متعلق مغتربین کرام بیان کرتے ہیں: کہ قرآن پاک کا اسلوب بیان یہ ہے کہ جو چیز زیادہ مزید می ہوتی ہے اُسے پہلے بیان کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے درجہ اربعہ میں ایک اصل قتل جس میں مقتول کا حق ضائع ہوا۔ اور دوسرا جزو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اِنَّ لِلّٰہِ یَا مُسْرِکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَعَثَ اللّٰہُ تَعَالٰی حُکْم دیتا ہے کہ گھٹے ذبح کرو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم بندوں کے حق پر مقدم ہے اس لیے گائے ذبح کرنے کے واقعہ کو مقدم رکھا اور اصل واقعہ قتل کو مؤخر کر دیا۔ قرآن پاک میں بعض دوسری مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں مقتول کے حق کو بندوں پر مقدم رکھا گیا ہے مثلاً وَتَقْسِ رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلٰہًا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ذِیْرَی رِبِّیْ فِیْصَلٰہُ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنا حق پہلے بیان کیا اور والدین یعنی بندوں کا بعد میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح سورۃ لقمان میں آتا ہے: وَ اِنْ جَاہَدْکَ عَلٰی اَنْ تُشْرَکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِزٌّ فَاَصْرِہُ فَکَ تَعْلَمُہَا کہ اس باب اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع کرنا چاہیں یعنی تمہیں شرک پر آمادہ کریں تو ان کی اطاعت مت کرو۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کو والدین کے حق پر مقدم رکھا اس واقعہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذبح گائے کو مقدم رکھا۔ کہ یہ اس کا اپنا حق ہے اور مقتول کے حق یعنی ویت یا قصاص وغیرہ کو مؤخر کر دیا۔

اس واقعہ سے حیات بعد الممات کا مسئلہ بھی حل ہوتا ہے: کَذٰلِکَ یُحْیِ اللّٰہُ الْمَوْتٰی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر اُس مردہ کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اور اس نے اپنے قاتل کی نشاندہی کر دی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔ اور پھر حساب کتاب اور جزا و سزا کے تمام واقعات پیش آئیں گے۔

ملا علی قارئی دسویں صدی کے بڑے پائے کے محقق گندھارے ہیں آپ کا اصل وطن ہرات تھا۔ مگر مکہ میں آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے عربی میں مرقعات کے نام سے مسکوۃ شریف کی جلد پہ شریعت لکھی ہے۔ اپنی اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک بڑا دولت مند

درجہ قتل

شخص تھا جس کی ایک مینی غمی کسی نے اُسے نکاح کا پیغام بھیجا مگر اس شخص نے قبول کیا جسی وجہ سے اُسے قتل کر دیا گیا۔

عام طور پر مفسرین کراہ وجہ قتل یہ بیان کرتے ہیں کہ عاقل نامی ایک دولت مند شخص تھا جو کہ لادہ تھا۔ اُس کے بھائی کے لڑکے اس کی جائیداد کے وارث تھے۔ چنانچہ اس کے بھتیجے اس تاک میں تھے کہ یہ مرے تو اس کی جائیداد پر قبضہ کریں۔ نہ، عید العزیزہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ اُس شخص کے بھتیجے مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ آخر ایک دن اُسے کسی کام کے سائے میں دوسری جگہ سے لے گئے اور دیرانے میں جا کر قتل کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے خود ہی ذنا پشنا شروع کر دیا کہ کسی نے اُن کے چچا کو قتل کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ قریبی بستی والوں پر قتل کا الزام لگایا۔ اور اُن سے دیت بھی طلب کی۔ مگر بستی والوں نے اس قتل میں موثر ہونے کی نفی کی۔ اور کہا کہ ہم اس معاملہ میں بالکل بے گناہ ہیں؛ خاذِرَةُ تُخْرِيفُہَا میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ قتل کا الزام ایک دوسرے پر لگا ہے تھے۔

قانون قات

قانون قات یہ ہے کہ اگر کسی مقتول کے قاتل کا پتا نہ چلتا ہو۔ تو قتل سے قریب ترین بستی کے لوگوں سے قتل کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اگر وہ انکار کریں تو ان میں سے پہلی بستی کے قسم دلائی جائے گی۔ کہ نہ انہوں نے خود قتل کیا ہے۔ اور نہ وہ قاتل کو جانتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ لوگ قتل کے الزام سے تو بڑی بوجہ جائیں گے۔ تاہم انہیں مقتول کے وراثہ کی دیت یعنی خون بہا دینا پڑے گا۔ اس واقعہ کے متعلق مفسرین کراہ کی مختلف آراء ہیں بعض کہتے ہیں کہ قتل کے اس واقعہ کے وقت بنی اسرائیل میں قات کا قانون رائج تھا جس کا ذکر تورات میں بھی موجود ہے۔ اور یہ ہماری شریعت میں بھی موجود ہے۔ بنی اسرائیل کا قانون قات یہ تھا کہ قاتل نامعلوم ہونے کی صورت میں قتل کی قریبی بستی سے معترین کو نکالا جائے گا۔ اور وہ لوگ بچیا (دہائے) لیں جس نے نہ اصل چلایا ہو۔ بلکہ درمیانی عمر کی ہو۔ اور بے عیب ہو۔ وہ لوگ بچیا کو باس بننے والی ندی پر بچا کر

اس کی گردن توڑ دیں۔ اور پھر لاوی خاندان کے کاہن اس پر کچھ پڑھیں پڑھائیں۔ یہ لوگ اس ندی پر پہنچے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ اے پروردگار ہم اس خون سے بری ہیں۔ نہ ہم کو ملے ہے کہ یہ خون کس نے کیا ہے۔ جب وہ ایسا کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے گا۔

بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ جس وقت قتل کا یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تک توراۃ نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ ان کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی تھے اور ظاہری طور پر حکومت بھی موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ چنانچہ آپ نے ان لوگوں کو فرمایا کہ بھائی! ایک گائے ذبح کر دو تو تمہارے مسئلہ کا حل نکل آئے گا۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اگر بنی اسرائیل اس وقت بیت دعل نہ کرتے بلکہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو بات بن جاتی۔ مگر ان کی طبیعتوں میں تعمق تھا۔ وہ بال کی کھال اتارنا جانتے تھے۔ انہوں نے پیغمبر کا حکم ماننے کی بجائے طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں سوال کرتے گئے۔ توں توں سختی بڑھتی گئی حتیٰ کہ بیچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ اور وہ مجبور ہو گئے۔ مگر اس حیلہ سازی میں کافی عرصہ گزر گیا۔ اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم پر عمل نہ کیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ تعمق اچھا نہیں ہر بات میں بال کی کھال نہ اتارو بلکہ حکم پر عمل کرو۔ جس قدر زیادہ باریکی میں جاؤ گے۔ اسی قدر سختی میں مبتلا ہو گے۔ اور آخر مجبور ہو جاؤ گے۔

قاتل کی تلاش کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ایک مبارک اختیار کیا۔ کہ اس طرح گائے ذبح کرنا اور پھر اس کے جسم کا ایک ٹکڑا مقتول کی لاش پر اور توراۃ خود اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ انہیں بذریعہ وحی بھی قاتل کی خبر مل سکتی تھی اور وہ ان کو بتا سکتے تھے۔ اس کے تعلق مفسرین فرماتے ہیں کہ اسرائیلیوں کے دماغوں میں تعمق بھرا ہوا تھا۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام براہ راست قاتل کی نشان دہی کر دیتے تو قوم بگڑ جاتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی عادات کو خوب سمجھتے تھے۔ جب وہ توراۃ لے کر آئے تھے۔ تو اس وقت بھی اسرائیلیوں

کثرت سوال  
سے بچو

نے سے اللہ تعالیٰ کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر مجبور ہو کر انہوں نے اسے تسلیم کیا۔ پھر انہوں نے عہد و پیمان کو بھی توڑا۔ اور جب ان پر جبر کیا گیا کہ وہ طور ان کے سروں پر متعلق کر دیا گیا۔ پھر وہ راہِ راست پر آئے۔ اور تورات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔

ام شاد ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ اس قسم کی بیئیں نبی کے عملِ کامل سے عہد کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ ایہ نبی سے قطعِ تعلقی تین وجوہ سے ہوتی ہے۔ اول بے خبری یعنی اُمتی کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ نبی کا عمل اور عقیدہ کیا ہے۔

نبی سے  
قطعِ تعلقی

ثانیاً یہ کہ طبیعتوں میں جاڑ پیدا ہو جائے۔ اُمتی اصل راستے سے ہٹ جاتی تو بھی نبی سے قطعِ تعلقی ہو جاتا ہے۔

تیسری وجہ ماحول کا اثر ہے۔ جب لوگ معاشرے کے دیگر لوگوں سے متاثر ہو کر ان کا طریقہ اختیار کر لیں۔ تو پھر بھی اپنے نبی سے قطعِ تعلقی پیدا ہو جاتی ہے۔ بنی اسرائیل میں یہ تینوں بیماریاں موجود تھیں جن کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بات بات میں حذر کرتے تھے۔ حجت بانی مدحیہ بازی کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بیماریاں آج امتِ محمدیہ میں بھی موجود ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا تَشْبَعَنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكَ یعنی سنی میری امت! ایک وقت آئے گا۔ جب تم بھی پہلی قوموں کی طرح ہی ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ان کمزوریوں سے محفوظ رکھے۔ اور نبی علیہ السلام کی صمیم اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

ارشاد ہوتا ہے وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَسْجُدُوا لِلشَّجَرَةِ ۚ س واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اسے ذبح کرو۔ بقدرہ لفظِ عربی زبان میں عام طور پر کائنات پر اُتاتا ہے۔ مثلاً یہ لفظ سمجھنے کے طور پر بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی نر اور مادہ یا گائے اور بیل دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جس جانور کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ گائے نہیں بلکہ بیل تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے قوم کو کھایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیکر تمہارے منہ کا حل فرمایا ہے۔ تم حکم کے مطابق گائے یا بیل ذبح کر کے اس کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کے جسم پر لگاؤ۔ تو یہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کا نام بتائے گا۔ مجرورہ ظالم قوم تعیل حکم کی بجائے کہنے لگی۔ اے موسیٰ علیہ السلام قَالُوا اَتَنَجِدُ فَاَهْزُوا کیا آپ ہمارے ساتھ ٹھٹھا (ذائقہ) کرتے ہیں۔ بھلا ایسا بھی کہی ہو اسے۔ کہ مرہ دوبارہ زندہ ہو جائے اور اپنے قاتل کی نشاندہی کرے۔ یہ تو آپ ہمارے ساتھ ذائقہ کر رہے ہیں۔

هٰذَا مصدر مبنی مفعول ہے۔ غلطی معنی یہ ہے کہ کیا تو ہمیں ٹھٹھا کیا ہو یا تب ہے۔ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا عظیم اور صاحب کتاب نبی ہے۔ مگر قوم اس قدر بڑی ہوئی ہے۔ کہ معجزہ کا انکار کر رہی ہے۔ حالانکہ تصور اعرصہ قبل ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخر پر کسی ایک معجزات کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلائی پھر یہ چالیس سال تک صحرائیں سرگرداں پھرتے رہے۔ من و سلویٰ کھاتے رہے۔ پانی کے لیے بارہ چٹے جاری ہوئے۔ اس کے باوجود مزاج فاسد ہیں۔ صاف کہہ دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے ٹھٹھا ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس بات پر سخت غصہ آیا قَالَ فَرَغْتُ اَعُوذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہت ہوں۔ اس بات سے کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ اے نادانوں! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں خدا تعالیٰ کا نبی ہو کر خدا تعالیٰ کا حکم سن رہا ہوں۔ تم کہتے ہو کہ مخول کر رہا ہوں۔ یہ تو جاہلوں کا کام ہے۔ اسی لیے ہماری شریعت میں ٹھٹھا حرام ہے۔ سورۃ حجرت میں آتا ہے لَا يَخْفَرُ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ قَوْمٌ كَوْنٌ قَوْمٌ کسی قوم سے ٹھٹھا نہ کرے۔ یہ منہ ذائقہ جس سے دوستی کی تحقیر ہوتی ہو۔ سمجھت منع ہے۔ ہاں ایسا ذائقہ جس سے دوستی کی تحقیر کا پہلو نہ نکلتا ہو جائز ہے۔ تاہم اس کی زیادتی بھی مناسب نہیں۔

صحاہ پر کراہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ خوش طبعی بھی فرمایا کرتے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہو کر خوش طبعی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں میں خوش طبعی کرتا ہوں۔ ترمیزی خوش طبعی اور عام لوگوں کی خوش طبعی میں بنیادنی طور پر فرق ہے۔ اَنْ لَا اَقُولَ اِلَّا حَقًّا میں حق کے بغیر کچھ نہیں کہتا۔ خواہ خوش طبعی ہی ہو۔ حدیث شریف میں موجود ہے

خوش طبعی  
جائز ہے



کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا: حضور! میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میرے پاس سواری نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: تمہیں اونٹ کے بچے پر سوار کر دیں گے۔ اُس نے سمجھا کہ شاید حضور اونٹ کا کوئی چھوٹا بچہ عنایت فرمائیں گے۔ کہنے لگا مگر میں اس پر سواری کیا کروں گا۔ اُس کی توقعات مرنی پڑ گئیں۔ معلوم کئے سال بعد وہ بچہ سواری کے قابل ہو گا۔ اُس کی یہ بات سن کر حضور علیہ السلام مسکرائے۔ اور فرمایا کہ تم نے اونٹ کے بچے کو بالکل چھوڑا بچہ کیوں سمجھ لیا۔ بڑا اونٹ بھی تو کسی اونٹ کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ میں تمہیں اونٹ کا وہ بچہ دوں گا۔ جو سواری کے قابل ہو گا۔

اسی طرح ایک بڑھیا حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اللہ عرض کیا: اللہ تعالیٰ کے نبی! میرے لیے جنت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اے اُمّ فڈ! کوئی بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہو سکتی۔ وہ بیچارہ پریشان ہو گئی۔ جب وہ روتی ہوئی جاتے ہی۔ تو حضور علیہ السلام نے اُسے واپس بلوایا اور فرمایا کہ میں نے صحیح بات کی ہے۔ جنت میں بڑھیا عورت نہیں جائے گی۔ بلکہ جو بھی جائے گی۔ جوانی کے عالم میں جائے گی۔ جنتی مرد اور عورتیں سب تیس چھتیس سال کے پینے میں ہوں گے۔ جب وہ جنت میں جائیں گے۔

الغرض! حضرت مومنہ صلیہ السلام نے فرمایا پناہ بخدا کہ میں ٹھٹھا رکے جاہل بن جاؤں یہ شانِ نبوت کے خلاف ہے۔ میں تو تمہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا رہی ہوں۔ اس کا حکم سنا رہی ہوں اور تمہارے ٹھٹھے پر محمول کر رہی ہوں۔ اب وہ سمجھے کہ یہ تو بخیرہ بات ہے۔ چنانچہ انہوں نے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

الْعَمَاءُ

درس کی دیت

البقرة

آیت ۶۸-۶۹

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ ۚ عَوَانٌ بَيْنَ ذَلِكَ ۚ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْثُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءٌ فَاقِعٌ لَوثُهَا تِكْرُ النَّظِيرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ ۚ إِنَّ الْبَقَرَ تَشْبَهُ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُكَلَّمَةً لَا تَشْبَهُ فِيهَا ۚ قَالُوا لَوْ أَنِ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبْحُوهُمْ وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ وَلَاقَتْنِي نَفْسًا فَادْرَأْنِي فِيهَا ۚ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَلِكَ يُخَيِّ اللَّهُ الْمُرْتَدَّ وَيُذَرِّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

ج

ترجمہ: انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے دعا کر، ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ عمر خوردہ (بڑھی) اور نہ بچیا (نوجوان) ہو، بلکہ اس کے درمیان میں ہو۔ پس کہ ڈالو جو تم کو حکم دیا جاتا ہے ﴿۶۸﴾ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے ہمارے لیے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ اس گائے کا رنگ کیا ہے (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ زرد رنگ کی گائے ہے، اس کا رنگ گہرا ہے جو دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے ﴿۶۹﴾ ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہے، بیشک وہ نہ ہم پر

مشتبہ ہو گئی ہے۔ اور بیشک اگر اللہ نے چاہا تو ہم راہ پائیں گے ﴿۴۰﴾ (موسیٰ علیہ السلام) کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ فرمائے کہ وہ ایسی کائے ہے جو کہ نہ محنت کرنے والی ہو جو جوتی دچھاڑتی ہو زمین کو اور نہ سیراب کرتی ہو کھیتی کو۔ صحیح سلامت ہو۔ اور اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ ب آپ ٹھیک بات لائے ہیں۔ پس انہوں نے اس کائے کو ذبح کیا۔ اور وہ ایسا کرنے کے قریب نہیں تھے ﴿۴۱﴾

پھر (سے بنی اسرائیل) اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ۔ جب تمہارے ایک جان کو قتل کر ڈالا۔ اس میں تمہیں بھڑکانے لگے۔ (ایک اور شے کے سر پر دم نہ لگے) اللہ اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے، اس چیز کو جس کو تم چھپاتے تھے ﴿۴۲﴾ پس ہم نے کہا کہ مارو اس مردہ کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا۔ اور اسی طرح وہ تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائے گا۔ تاکہ تم سمجھو اور اللہ

عز و جل کو ﴿۴۳﴾

گذشتہ درس میں بنی اسرائیل کی جلد سازی کا ذکر ہو چکا ہے۔ انہوں نے احکام الہی جیلے بدلنے سے منہ کی کوشش کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے تعمق اختیار کیا۔ اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ پھر جوں جوں سوالات کرتے گئے۔ تو ان کی سختیاں بڑھتی گئیں۔ آخر انہوں نے مجبور ہو کر گائے کو ذبح کیا۔ اور اس کا ایک ٹکڑا مردہ کے جسم کے ساتھ لگایا۔ تو وہ زندہ ہو گیا۔ پھر اس نے بتایا کہ میں اس کے بھتیجوں نے دولت پر قبضہ کرنے کے لیے قتل کیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی مخفی بات کو ظاہر کر دیا۔

قاتل کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ مقتول چچا کی لڑکی کو حاصل کرے گا۔ کیونکہ اس کی جائیداد کی وارث تو وہی تھی۔ نیز وہ اس لالچ میں تھا کہ مقتول کی لاش کو جس علاقے میں پھینکا گیا ہے۔ اس کی قریبی بستی کے لوگوں سے مقتول کی دیت بھی وصول کرے گا۔ یہ تمام باطل خیالات اس کے دل میں جاگزیں تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس چیز کو تم چھپاتے ہو۔ اس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ چنانچہ ان کی ساری تدبیر ناکام ہو گئی۔ جب وہ قتل کا یہی عہد و عہدت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے کر گئے۔ تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے۔ کہ گائے ذبح کر دو۔ یہ سن کر پہلے تو وہ بھڑکے۔ کہ میں موسیٰ علیہ السلام کی آپ ہم سے نھانے کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے نبی نے کہا کہ میں ٹھٹھا نہیں کرتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ جو تمہیں پسپا رہوں بٹھٹھا کرنا تو

جاؤں وہ ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس بات کو بخیر گئی سے لیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر نبی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمائشیں رتبہ سے روک دیتی تھیں تو ان کا منہ جل جہنم میں ملتا۔ چنانچہ وہ بیت و صل کرنا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ خود ہی پابندیوں میں جکڑے گئے۔

مفسرین کرم فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے رب کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے جس قسم کی گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تشریحات ہونی وقت گذریا۔ تاہم اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مصلحت یہ تھی کہ اس طریقہ سے ایک غریب آدمی کی پرورش مقصود تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک پرہیزگار آدمی فوت ہو گیا۔ بننے بیچے ہوئے ایک بچہ اور ایک بچہ چھوڑ گیا۔ اس کے مدد اس کی کوئی جائیداد نہیں تھی۔ مرنے سے قبل اس شخص نے دعا کی تھی کہ مرنے کے بعد میرے بچے کے لئے اس بچہ سے میری برکت ڈال دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔

اس بچے کی نیک نیتی اور سعادت مندی کے متعلق روایات آتی ہیں۔ امام ابن کثیرؒ نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ اس کا باپ مر گیا۔ اس نے باپ کے لئے دعا کی کہ میرا فرزند کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بچے کو اتنی ہزار میں ہیرا فروخت کر کے ان میں سے ایک ہزار بچے کے لئے دیا کہ میں اپنے باپ کی اجازت کے بغیر اسے سو دن نہیں کر سکتا۔ جب وہ اٹھنے لگا تو بات کریں گے۔ تب بچہ نے کہا کہ باپ کو جہنم میں لے کر قیمت پر جی ہیرا بیچ دوں گا۔ مگر لڑکھاپ کے آگے میں محفل ہونے پر رضا مند نہ ہوا۔ تاہم کمرے کے قیمت لینے پر جی تیار ہو۔ مگر لڑکے نے کہا کہ میں اتنی ہزاروں بچے کے ایک لاکھ روپیہ دینا پسند کروں گا۔ مگر باپ کو بے آرام نہیں کر دے گا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس لڑکے کی نیت کی بدولت اللہ تعالیٰ نے اسے برکت سے نوازا۔

یعنی دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ان فی شعل میں اس بچے کے پاس

۱۔ تفسیر درمنثور ج ۱، تفسیر ابن کثیر ج ۱، ۲۔ تفسیر غزالی فارسی ج ۱، ۳۔ تفسیر غزالی فارسی ج ۱، ۴۔ تفسیر غزالی فارسی ج ۱

۵۔ تفسیر ابن کثیر ج ۱، ۶۔ تفسیر غزالی فارسی ج ۱، ۷۔ معالم التنزیل ص ۱۲۱

آیا اور پھر اس کی قیمت دریافت کی۔ اور پھر وہ دنیا کی بیشکیش بھی کر لی۔ لڑکے نے کہا۔ کہ میں اپنی والدہ سے پوچھے بغیر قیمت طے نہیں کروں گا۔ جب والدہ سے دریافت کیا تو وہ اتنی قیمت پر رضامند نہ ہوئی۔ فرشتے نے زیادہ قیمت مانگی۔ پتہ نہ چل رہا کہ میں اپنی والدہ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ مگر والدہ نے پھر نہ سمجھا کر دیا۔ غرض! فرشتہ قیمت بڑھا کر دیا۔ اور لڑکا بار بار والدہ سے مشورہ کرتا رہا۔ مگر والدہ کسی قیمت پر اپنی بچہ نہیں بیچنے پر راضی نہ ہوئی۔ لہذا بچے نے کہا کہ حق جواب دیدے گا۔ اب فرشتے نے کہا کہ تم بڑے سادہ مند بیٹے ہو جو اپنی والدہ کی نشت کے بغیر ایک قدم نہیں بڑھتے۔ تو سزا میں بکھڑے کو غزوہ کرنے کے لئے تمہارے پاس لڑائی کے جوہر تو کوئی قیمت پر بکھڑا فروخت نہ کرنا یہ تمہیں والدہ کر رہے ہیں۔

دوسری اسرائیل کو ایسے بکھڑے کی تلاش ہوئی جو اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ نشانوں پر پورا اترے پھرتے پھرتے انہیں اپنی بکھڑا مل گیا جس میں بیان کردہ تمام صفات پائی جاتی تھیں۔ جب انہوں نے قیمت پٹا چاھی، تو سوداگر بن رہا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آکر بتایا کہ طلبہ بکھڑا تو مل گیا ہے۔ مگر اس کا ایک مناسب قیمت پر پیش کر دیا نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس شخص کو روک دیا۔ اور پھر نہ دینے کی وجہ دریافت کی۔ اس نے عرض کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپ جی بتائیں۔ جب کہ میں اس کا ایک سون کیا میں اپنی مرضی کے مطابق اس کو تصرف میں لے لے گا مجاز نہیں ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں تجھے اپنی مرضی کے مطابق تصرف کی اجازت دیتا ہوں۔ تو اس نے کہا کہ میں اس بکھڑے کے بارے میں اس کا ہم وزن ہونا چاہتا ہوں کہ اس سے کم قیمت پر مرضی نہیں ہوتا۔ بعض دوسری روزنوں میں آتے تھے کہ اس سے بکھڑے کی یہ قیمت سے دس گنا زیادہ قیمت حسب کی۔ تاہم ہم وزن ہونے والی روایت زیادہ مشہور ہے چنانچہ بنی اسرائیل نے وہ بکھڑا اس کے وزن کے برابر ہونے کو حاصل کیا اور چھڑے لے کر اس کے حکم کے مطابق وزن کیا۔

الغرض! بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں فوراً حوہ پر کرنی دے دی۔ نتیجہ اس کے کہ

ذبح نہ کیا۔ بلکہ اس کے متعلق سوالات کرنے شروع کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں سوال و جواب کی تفصیل بتائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ تو کہنے لگے قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّنَا يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں تفصیل سے بتائے کہ جس گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ کیسی ہو۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہے۔ إِنَّهَا بَقَرَةٌ تَذَرُ صَوْتًا يَكُونُ وہ گائے نہ تو بڑھئی ہے۔ اور نہ نو عمر بلکہ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ دونوں عمروں کے درمیان ہو۔ فَاذْكُوهَا مَآ تُمْسُونَ پس کر ڈالو جس چیز کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ بمعصیہ تھا کہ اب بھی زیادہ سوال و جواب کے چکر میں نہ پڑو۔ بلکہ درمیان عمر کی کوئی گائے نہ کہ گائے ذبح کر دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جس کی نفی تعمیل ہونی چاہیے۔ مگر وہ بہ بخت تو یہ بھی تعمیل عمر پر آمادہ نہ ہوئی۔ بلکہ دوسرا سوال کر دیا قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّنَا یعنی اے موسیٰ علیہ السلام ہمیں اپنے رب سے یہ پوچھ دیں يُبَيِّنْ لَنَا وہ ہمیں واضح طور پر بتائے مَا كُونَتْ کہ اس گائے کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر اللہ تعالیٰ سے دریافت کر کے انہیں بتایا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ بیشک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقْ کونٹھا وہ گائے نہ نہ رنگ کی صفت ہے۔ کہ وہ زرد بھی ہو اور گہرا بھی ہو۔ یہ رنگوں کے مختلف نام ہیں۔ اور پھر آگے ان کی صفات ہیں۔ صَفِيَّةٌ زُكَاةٌ اور سرخ کو عمر کہتے ہیں تو اس گائے کے رنگ کے متعلق فرمایا کہ وہ گہرا نہ ہو۔ تَكُونُ الشَّظِيرَةُ جو لوگوں کا دل بھرنے والا ہو۔ جسے دیکھ کر لوگ خوش ہو جائیں۔

بنی اسرائیل کے دل و دماغ میں تعین کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے قیصر سوال کر دیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّنَا اے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے دعا کریں يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ إِنَّ الْبَقَرَةَ كَثِيرَةٌ عَلَيْكَ بیشک گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے۔ یعنی ہم ابھی تک اس کی ٹھیک ٹھیک نشانیاں نہیں جان سکے۔ اگرچہ اس کی پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے وَبِنَا أَنْ شَاءَ اللَّهُ لَمْ هَتَدُ وَنْ تَرَبَّ شَكَّ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم زود پائیں گے۔ اس دفعہ انہوں نے اپنے مطالبہ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کیا کہ یہ آخری بات تھی جو انہوں نے دریافت کی۔ عام قانون بھی ہے کہ وَلَا تَقُولُوا لِمَا كُنَّا



رَفِئًا عَلٰی ذٰلِكَ عَذَابُ ۙ اِنَّ اِنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ ۖ يَمُنَّ بِسَبْعِ مِائَةِ سَنَةٍ اَوْ اَكْثَرَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَظَنُّوْنَ  
 کہو کہ کل یہ پورے عذاب کردوں گا۔ بلکہ اس فعل کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ خلق کرو۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ  
 نے چاہا تو یہ کہ دوں گا۔ مومن کی یہی شان ہے۔ کہ وہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا و مسرت کی توفیق  
 کا طلبگار ہوتا ہے۔

اس آخری سوال کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے کہا اِنَّ اللّٰهَ يَقُولُ مَا يَؤْتِيهِ  
 سَبْعًا اَوْ اَكْثَرَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَظَنُّوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَظَنُّوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَظَنُّوْنَ اِنَّ اللّٰهَ لَظَنُّوْنَ  
 جس اونٹنی کو سواری کے لیے ہمارا کیا گیا ہو۔ اسے ناقۃ ذلک کہتے ہیں۔ اور ہمارا کرنے کے لیے  
 محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو یہاں ذلک کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس سے محنت نہ کرانی گئی  
 ہو۔ کہ تَشْرِيرُ رُؤُوسِہُمْ کہ وہ زمین اٹھا دیتی ہو۔ یعنی وہ کبھی ہل میں بھی نہ جوتی ہو۔ وَلَا تَقْطَعُ اَلْجَمْرَۃَ  
 اور اس نے کبھی کبھیتی کو سیراب نہ کیا ہو۔ یعنی کبھی اس سے پانی کھینچنے کی محنت بھی نہ لی گئی ہو۔ بلکہ  
 گائے ایسی ہونی چاہیے۔ مَلَكَمَةً جو بالکل صحیح سلامت ہو۔ لَا يَشِيْءُ فِيْہَا اس میں کوئی  
 عیب نہ ہو۔ بالکل بے داغ ہو۔

یہاں خبر  
 ہو گئی

الغرض! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو ان کے تمام سوالات کے جوابات  
 دیے۔ کہ مطلوبہ گائے کس عمر کی ہو۔ اس کا رنگ کیا ہونا چاہیے۔ اور پھر وہ ایسی ہونی چاہیے۔  
 جس سے محنت کا کوئی کام نہ لایا گیا ہو۔ بلکہ صحیح سلامت اور بے داغ ہونی چاہیے۔ اب ان  
 کے لیے فرار کا کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ آخر مجبور ہو کر کہنے لگے۔ قَالُوْا اَلَا لَنَا جَنَّتٌ بِالْحَقِّ ۚ اِنَّ  
 موسیٰ علیہ السلام اب آپ نے ٹھیک بات کہی ہے۔ حالانکہ بات تو انہوں نے پہلے بھی درست ہی  
 بتائی تھی۔ مگر ان کے چہنے داغ خراب تھے۔ جو علمہ آمد میں ریت و مصل کر رہے تھے اب انہوں  
 نے سرچا کہ تعمیل حکم کرنی ہی پڑے گی۔ فَذَجَّجُوْهَا اَوْ مَطْلُوْہَا ۚ اِنَّہُمْ لَمِنَ السَّاجِدِیْنَ ۚ  
 قیمت ادا کرنے کے بعد اسے ذبح کر ہی دیا۔ وَمَا کَاذُوْا یَفْعَلُوْنَ حَقِیْقَتِیْنَ ہے۔ کہ وہ  
 ایسا کرنے پر تیار نہیں تھے۔ مگر اب مجبور ہو گئے تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل خود اپنے آپ پر پابندیاں عائد کر کے مجبور ہو گئے۔ یہ  
 اصول آج بھی جاری ہے۔ کہ جو شخص خود اپنے آپ پر کوئی پابندی نہ لگائے گا۔ وہ خود ہی تنہا ہو گا۔ بھلا  
 ہاں!

فصل رسومات میں کیا ہو رہا ہے۔ جو لوگ بڑی رکھیں اپنے اوپر عابد کہتے ہیں۔ ان میں جڑے جاسے ہیں۔ نہ خدا راضی اور نہ اس کا رسول راضی اور نہ خود ہی راضی رہ سکتے ہیں۔ یہی چیز کی رقم کو لے لیں۔ اس نے کس حد تک طول پڑا ہے۔ فلاں چیز چاہیے۔ فلاں چیز چاہیے۔ لڑکے والے خود بظاہر کہتے ہیں۔ کبھی تیویشن کی ذمہ داری کبھی پیر پٹر چاہیے۔ کبھی کوٹھی اور کار کا مطالبہ۔ یہ سب کچھ کیسے۔ ایک ایک کر کے اشیاء میں اضافہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ ایک آدمی کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ یہ سب اپنی ہی عائد کردہ پابندیوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

واقو قتل

فَرِیَا وَذَقْتُمْ فَلَانَ فَذَرْتُمُوهَا حَبْلَ مَنَیْ لِّیْ جَانِ کَوْتَلِیْ یَہْرَ اَیْکَ دَسْتِ  
کے سرخوتے تھے۔ یہ ہے وہ اصل واقو جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ اور جسے بظاہر مقدمہ آنا چاہیے تھا۔ مولانا غالی کے حکم کو پسے رکھا گیا اور اس واقو کو نوٹریا کیا یہ واقو بھی میں نے عرض کر دیا ہے۔ کہ بنی اسرائیل کے ایک دو تئمہ میل نامی آدمی کو اس کے جیتوں نے۔ ال و دولت اور اس کی بیٹی کے حصول کی خاطر قتل کر دیا۔ اور پھر خود میت وصول کرنے کے لیے قریبی بیٹی کے لوگوں پر قتل مت مقدمہ دائر کر دیا۔ مزید اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو قادر مہربان اور مخفی چیزوں کو جانتا ہے۔ اس پر بدو گارنے ان کا مذبح کر دیا اور یہ حد بتایا کہ گائے ذبح کر کے اس کے جسم کا ایک حصہ مقتول کو لگاؤ تو وہ زندہ ہو کر خود اپنے قاتل کا نہ بتائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی چیز کو بیان فرماتے ہیں۔ کہ تو حقیقت کو چھپاتے تھے۔  
وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ مولانا اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا ہے۔ اس چیز کو جو تم چھپاتے ہو۔

نذر زین اور زمین کی۔ غلام بستر اور قتل و غارت ہر زمانے میں سہولت رہا ہے اور آج بھی موجود ہے۔ مگر یہ چیز ہر خوشہ روزہ انسان سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے کہ وہ کسی کو کس طرح عطا کرتا ہے۔ یہاں تو بڑی بڑی مخلوق کے خود مر رہ جاتے ہیں۔ اور بڑی بڑی تہاہیف اٹھاتے ہیں مگر بس حق آدمی ضرورت سے کھیل رہا ہوتا ہے۔ یہ تو مشائخ یزنی ہے کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں۔

اجتہاد مرقی  
مجلد دوم

الغرض! قاتل کا پتا چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ رد فرمایا





ثُمَّ قَتَلْتُمْ قُلُوبَكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَمِنْ أَجْلِ الْحَجَارَةِ أََوَّاشَةٌ  
قَسْوَةً وَإِنْ مِنَ الْحَجَارَةِ لَمَّا يَتَفَتَحُ مِنْهُ الْفُتُورُ وَإِنْ مِنْهَا  
لَمَّا يَشْقُوقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنْ مِنْهَا لَمَّا يَهْبِطُ مِنْ  
خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۷۷﴾

ترجمہ: پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ پس وہ پتھروں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے  
بھی زیادہ سخت ہیں اور ٹپکتے بعض پتھروں میں سے بہتہ وہ ہیں کہ جن سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور ٹپکتے  
ان پتھروں میں سے بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے۔ ان سے پانی نکلتا ہے اور ٹپکتے ان پتھروں میں  
سے بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ان

کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو ﴿۷۷﴾

بنی اسرائیل کی بہت سی برائیوں کا ذکر گذشتہ آیات میں آچکا ہے۔ اور بعض کا ذکر آگے  
بھی آئے گا۔ آیت زیر دوس میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام برائیوں کا نتیجہ بیان فرمایا ہے بنی اسرائیل  
کی طرف سے کتان حق بکھڑے کی پرستش، قانون کی خدو و رزن، قتل انبیاء علیہم السلام وغیرہ  
یہ تمام ایسی بیماریاں تھیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کے دل سخت ہو گئے۔ سورۃ اندہ میں  
بنی اسرائیل کی قدرتِ قہری کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ  
لَعَنَهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ كَلِمَتهَا مِنْ مَوَاضِعِهَا لِيُزِيلُ  
سے ہم نے ان پر لعنت بھیجی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس  
قسم کے کام کرتے تھے کہ ”يُحَرِّفُونَ كَلِمَتهَا عَنْ مَوَاضِعِهَا“ اللہ تعالیٰ کے کام کو  
اپنے مقام سے تبدیل کر دیتے۔ گویا آسمانی کتاب میں تحریف کے مرتجب ہوتے تھے۔ جس کی وجہ  
سے قدرتِ قہری ہمیں لعنت میں گرفتار ہوئے۔ بعد ان کے ذرا بھی الٹ گئے۔ ان میں ضعفِ ہمت  
کی بیماری بھی پیدا ہوئی۔ جس کی وجہ سے وہ جہاد کے لیے بھی آمادہ نہ ہوئے۔ بلکہ کہنے لگے کہ اے







الْقَبْدُ مِنْ رَبِّهِ فَهُوَ سَاجِدٌ یعنی جن حالتوں میں اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے۔ ان میں حالت سجدہ سب سے اولیٰ ہے، اس حالت میں جس قدر غمزداری ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی اتصال کی بدولت انسان کی حالت درست رہ سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ جو شخص پتھروں جیسے اوصاف کا حامل بھی نہیں ہے۔ یعنی نہ تو اس سے مخلوق کو عام فائدہ پہنچتا ہے۔ نہ وہ شخص ممد و دہیانہ پر مغیہ ہے۔ اور نہ ہی اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتصال ہے۔ تو پھر ایسا انسان بلاشبہ بد بخت لگتی ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ انہیں قدرتِ خداوندی کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔ بلکہ جو ان کے ساتھ چلنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس نعمت کے محروم نہیں رہتے اور پھر ان کی وجہ سے بڑی بڑی باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔

ہم اے بعض ایسے اکابر قریبی زمانہ میں ہوئے ہیں جو یقیناً مقربینِ الہی میں سے ہیں یہ تو شیعہ بریلوی سادات کے خاندان میں سے حسنی تھے۔ دکن مالوٹ تک پہنچے تھے۔ دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیعت کی اور علم حاصل کیا۔ شاہ صاحبؒ نے مزید تربیت کے لیے اپنے برادرِ خرد شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کر دیا۔ سنوں نے تین سال تک یہ احمد شہید بریلویؒ کی تربیت کی۔ یہ وہی شاہ عبدالقادرؒ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا۔ صاحب کشف بزرگ تھے ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی شیخ نظروں نے جانچی یا کر تیار احمد شہید بریلویؒ عظیم صلاحیت کے مالک ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں سے بہت اہم کام لے لیتا ہے۔ چنانچہ تین سالہ تربیت مکمل کر لینے کے بعد شاہ صاحبؒ نے یہ احمد شہید کو لوٹ کر فوجی تربیت حاصل کرنے کا حکم دیا۔ بعد ازاں آپ نے چھ سال تک فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ گویا یہ احمد شہیدؒ شاہ عبدالعزیزؒ کے تربیت یافتہ اور ان کے مجاز تھے۔

خود شاہ عبدالعزیزؒ برصغیر میں اپنے باپ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بعد بہت بڑے عالمِ اہل فقیہ تھے۔ آپ محدث اور مفسرِ قرآن تھے۔ آپ کے داماد مولانا عبدالحیؒ بھی بڑے پڑے

بہنشاہ کابر  
دین

کے بزرگ تھے۔ آپ سید صاحب سے زیادہ عالم تھے۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ: شاہ عبدالغنیؒ کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے پوتے تھے قرآن پاک کے علاوہ تفسیر و تراجم میں زبانِ یاد تھیں۔ صبح کی نماز پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتے اور سورج نکلنے تک ختم کر دیتے۔ اور عصر کے بعد شروع کرتے تو مغرب کی اذان کے ساتھ ختم کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قدر انعام فرمایا تھا۔

ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ میں شیخ عبدالحق محدثؒ کا وہ رسالہ آگیا جس میں نماز کی ترکیب لکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس طریقے کے مطابق ہی نماز پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ رات کے وقت دو رکعت ایسی نماز پڑھنے کی توفیق میسر آجائے جس کے دوران کوئی دوسرا نہ آئے۔ ایسی کوشش میں رات بھر میں تو نہ رات نماز ادا کی۔ مگر مقصد حاصل نہ ہوا اس بات کا ذکر آپ نے سید احمد شہید بریلویؒ سے کیا۔ کہ شیخ عبدالحق محدثؒ کے رسالہ میں مذکور طریقے سے نماز پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ محض کتاب میں طریقہ پڑھ کر مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ آؤ میرے ساتھ دو رکعت نماز ادا کر لے۔ چنانچہ جب سید صاحب کی اقتدار میں نماز پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور قلب عطا کیا۔ ان مطلوبہ کیفیت حاصل ہو گئی۔ اس واقعہ کا ذکر آپ نے حضرت مولانا عبدالحقؒ کے پاس بھی کیا۔ کہ حضور قلب کے لیے انہوں نے کتنی کوشش کی مگر یہ چیز سید احمد شہیدؒ کے ساتھ نماز پڑھنے سے حاصل ہوئی۔ یہ سن کر مولانا عبدالحقؒ کو بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ سید صاحب سے عرض کیا۔ تو انہوں نے نہیں بھی اپنے پیچھے نماز پڑھائی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی وہی کیفیت عطا کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں صاحبان یعنی شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحقؒ ہمیشہ سید احمد بریلویؒ کے ہمراہ رہے۔ شاہ اسماعیلؒ کو تو اللہ تعالیٰ نے شہادت کا مرتبہ عطا کیا۔ مگر مولانا عبدالحقؒ کی سرکے دوران سر کے علاوہ بیچ تار میں جا کر بیاہرے اور وہیں پہنچ کر بیٹھ کر بارگاہِ کوٹ کی تاریخی جنب میں شاہ اسماعیل شہیدؒ فوت کے سال۔ تھے اور مولانا عبدالحقؒ سید احمد شہیدؒ کے شہر میں تہہ و قضا پہ فائز تھے۔ اس اسلامی فوج کے امیر سید احمد شہید بریلویؒ تھے۔ سرمد میں ان کی قائم کردہ اسلامی حکومت تین سال تک چلی۔ اس کے بعد ملتانوں کی نالائقی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اسی دوران مولانا عبدالحقؒ بیمار ہوئے جب ان کی زندگی کی ٹیہ باقی نہ رہی تو سید صاحب

نے پوچھا کوئی خواہش ہو تو بتائیں کہنے لگے خواہش کو شہادت کی موت کی تھی جو پوری نہیں ہو سکتی۔ چاہتا ہوں کہ اس آخری وقت میں آپ کا قدم میرے سینے پر ہو۔ یہ صدمہ سب سے بڑا ہے ان کی خواہش کو پورا کیا۔ اور آپ نے اس کے بعد اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

مسلمانوں کی ناکامی کی بڑی وجہ ان کی اپنی غزنی ہے۔ یہ غزنی ابن عسکری کے دور کے بعد ساتویں صدی میں شروع ہوئی۔ اسی وجہ سے سلطنتیں تباہ ہوئیں۔ اور مسلمان مدبر زوال ہی بنے۔  
پھر یہ اپنے قدموں پر تہمت لگے۔

تو بہر حال میں عرض کر رہا ہوں کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا اتصال نصیب ہوتا ہے۔ حقیقت معنوں میں وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں میں پتھروں والی تین صفحات جی نہیں دانی جاتی وہ بہ بخت اور شغلی ہوتے ہیں۔ ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ جگہ پتھروں سے بھی زیادہ کھنکھاتی ہیں اسلئے کہ مثال واضح ہے۔ یہ پتھروں سے بھی گئے گئے گئے ہیں۔ ان کا وجود غیر مفید ہے۔ انسان کے لیے مفید ہے گریہ سارے اسلئے بیوں کی غریبوں کا ذکر ہے۔

فَرِّيَا وَمَا اللّٰهُ بِغَفَّارٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ يَا دُرُّ كَحُو لِقَدِّ تَعَالَى تَسَاءَلُ كَيْ فَعَلْ غافل نہیں ہے۔ تمہاری تمام برتوتیں اس کی نگاہ میں ہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے۔ جس وقت اللہ میں شانہ تمہارے اعمال کا انجام تمہارے سامنے رکھ دے گا۔ یہ سارا اپنی اسلئے کہ خطا ہے کہ اب جسی سمجھ جاؤ اور زہراست پر آجاؤ۔ تو اپنے انجام کو پہنچ جاؤ گے۔ ورنہ تم اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

فَتَصْمُومُونَ ۚ إِن يُبَدِّلُوا كَلِمَتَكُمْ فَعَدَّ كَانَفِرًا مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ  
 كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يَنصَرِفُونَ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ  
 ۝۴۵ وَرَدَّ نَفَرٌ مِّنْهُم مَّاتًا وَآخَرًا بَعْضُهُمْ إِلَى  
 بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُخَاجِبَكُمْ بِهِ  
 عِندَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝۴۶ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ  
 مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝۴۷ وَمِنْهُمْ أَفْئِسُّونَ لَآ يَعْلَمُونَ  
 لِكِتَابِ اللَّهِ أَمَّا لِي وَدَن هُمْ لَا يَفْهَمُونَ ۝۴۸ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ  
 لِكِتَابِ بَآئِدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيُشَارَكُوا  
 بِهِ ثَمَنٌ قَلِيلٌ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ  
 وَوَيْلٌ لَهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝۴۹

ترجمہ: (۴۵) اہل ایمان کیا تم توقع رکھتے ہو کہ (اہل کتاب) ایمان لائیں گے تمہاری  
 بات پر حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سننے سے بچتا تھا۔ پھر اس کو  
 جس نے ڈالتے تھے۔ بعد اس کے کہ انہوں نے اُسے سمجھ لیا تھا۔ اور وہ جانتے بھی یہی  
 (۴۶) اور جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم بھی ایمان لائے۔ اور جب  
 اللہ ہرے میں (۴۷) ان میں سے بعض، بعض کے پاس، تو کہتے ہیں، کیا تم ان (مکملان)  
 کے پاس ایسی چیزیں بیان کرتے ہو جو اللہ نے تم پر ظاہر کی ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعے  
 تمہارے ساتھ تمہارے رب کے ہاں تمہارا کریں، کیا تم سمجھتے نہیں (۴۸) کیا یہ  
 وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس چیز کو یہ چھپاتے ہیں  
 اور جس کو ظاہر کرتے ہیں (۴۹) اور ان میں سے بعض ان پر عمل نہیں کرتے جو نہیں جانتے  
 کتاب کو مرنے والے تھوڑے آدمیوں اور انہیں میں وہ لوگ مان کر تے (۵۰) پس ہمارے

ایسے لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں کتابِ نو پانچ ہاتھوں سے پھر کتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ تاکہ خریدیں اس کے ذریعے عظیمی قیمت۔ پس ہلاکت ہے ان کے لیے جو کھاتے۔ ان کے ہاتھوں نے۔ اور بدلتے ہیں ان کے لیے جو کھاتے۔ انہوں نے (۴۹)

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی بہت سی باتوں کا تذکرہ ہو چکا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بہت سی نشانیاں دیکھنے کے بعد بنی اسرائیل کے دل سخت ہو گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ منہ دیا بعض پتھر بھی مضمیہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ قوم تو ان پتھروں سے بھی بہتر ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے غافل ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ ان کے سب کام اس کے علم میں ہیں۔ آیاتِ زبور میں بھی یہودیوں کی بعض دوسری خرابیوں کا ذکر ہے۔ مگر یہاں روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔

رب آیات

ارشاد ہوتا ہے اَفْطَحُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ مَعْنٰی اے اہل ایمان! کیا تم توقع کرتے ہو کہ یہود مذہب سے کہنے پر ایمان لے آئیں گے فرمایا ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ یہ بڑی بد بخت قوم ہے۔ یہ تباہی بات کی ہرگز تصدیق نہیں کریں گے۔ یہ لوگ دین اسلام کو قبول کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ بات سمجھا دی کہ گمان مت کرو یہ تمہارے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ کیونکہ شرکت دو وجود کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ یا تو کوئی شخص دوسرے کا معتاد بن کر ساتھ چلے یا اس کا تابع ہو جائے۔ جب تک کہ وہ میں سے کوئی ایک چیز شامل نہ ہو۔ بل کر چنا محال ہوتا ہے۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ یہودیوں میں نہ معتاد بننے کی اہمیت ہے اور نہ تابع بننے کی صلاحیت یہ لوگ معتاد اس لیے نہیں بن سکتے کہ ان کی فوجِ خراب ہو چکی ہے ذہنیت بگڑ چکی ہے۔ ان کا دین تبدیل ہو چکا ہے اسی طرح تابع وہ شخص ہو سکتا ہے جو منفعت مزاج اور بے لوث ہو۔ مگر یہودی ان تمام صلاحیتوں سے محروم ہیں۔ اس لیے ان کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اے ایمان والو! تم ان کے پیچھے نہ پڑو۔ بلکہ ان کو ذرا راست پر لانے کی اگر کوئی امید تمہارے دل میں ابھی تک موجود ہے۔ تو اسے منقطع کر دو۔ یہ لوگ انتہائی درجے کے متعصب، غامی اور غندی ہیں۔ جلد سادہ اور فریب دہندہ لوگ ہیں۔ دنیا کی خاطر دین کو بھڑا دینا ان کا کام مشغلہ ہے۔ لہذا ان سے کسی بھی عہدنی کی توقع نہ کرو۔

یہود کی طرف سے  
نا اُمیدی



فرمایا ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ اِنْ  
میں سے بعض لوگ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ ثُمَّ يُخَوِّفُونَهُ مِنْ اَمْرِ غَيْبٍ عَقَبُوهُ  
پھر اُسے سمجھنے کے باوجود بدل دیتے تھے۔ وَهُمْ يَعْلَمُونَ اور وہ جانتے تھے کہ کیا کرتوت  
کر رہے ہیں۔ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ میں بیان برہم کر تحریر کرتے تھے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر تحریر سے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا مراد  
ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سربراہوں کو ساتھ لے کر کوہ طور پر گئے تھے۔  
تاکہ وہ خود اللہ تعالیٰ کا کلام سُنیں۔ کہ یہ کتاب واقعی اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا  
کی۔ مگر ان لوگوں نے تحریر یہ کی کہ کما بیشک یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ مگر اس کے  
احکام پر سختی سے عمل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ کہا ہے کہ جب قدر آسانی سے عمل ہو کر دینا۔ باقی  
کو چھوڑ دینا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سربراہوں کو بجلی کے ذریعے خاکستر کر دیا تھا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام  
کی دعا سے انہیں پھر زندگی عطا کی۔ مقصد یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ان لوگوں نے یہ وہ دانستہ تحریر  
کی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل دیا۔

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے کے اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی تحریر کی بھی  
واضح مثالیں موجود ہیں۔ آگے آئے گا کہ یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ یَعْلَمُونَ اَنَّكَ الْخَقُّ وَہ جانتے  
تھے کہ نبی آخر الزمان کا دین سچا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو پیشین گوئیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
کے متعلق توراۃ میں بیان کی ہیں۔ وہ سب کی سب آپ پر پورا اترتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود لوگوں  
کو صحیح بات بتانے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کر دیا  
تھا تو انہیں کو چھپاتے تھے۔ کہ لوگوں کو انہی یہودی باتیں بتا کر آپ پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔  
سورۃ مائدہ میں آئے گا کہ ان لوگوں نے توراۃ کے احکام میں بھی تحریر کی۔ توراۃ میں  
برہم کا حکم موجود تھا کہ شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جائے۔ مگر یہودیوں نے یہ حکم چھپایا۔ توراۃ میں  
حضور علیہ السلام کا علیہ مبارک موجود تھا کہ آپ خوش شکل ہوں گے۔ آپ کے بال گھنٹریہ لے لے اور

آنکھیں میاں ہوں گی۔ قدر میاں اور رنگ گندمی ہو گا۔ مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لے آئے۔ اور آپ نے اپنی نبوت کا اعلان فرادیا۔ تو یہودیوں نے قرآن میں آپ کے بیان کردہ جیسے کو بدل دیا۔ اور لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ بنی اسرائیل (علیہ السلام) جسے قدر دے ہوں گے آپ کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ اور بال سیاہی سے ہوں گے۔ اس طرح انہوں نے لوگوں کو آپ پر ایمان لانے سے روکنے کی کوشش کی۔

یہودی بددھرمی

الغرض! اہل ایمان کو گھایا جا رہا ہے۔ کہ یہود سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمہاری تبلیغ سے یہ لوگ ایمان سے آئیں گے۔ یہ تو سخت قسم کے ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی یہ باہرست سے دور ہی رہیں گے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت یہودیوں کے دس بڑے عالم موجود ہیں۔ اگر یہ دس آدمی ایمان قبول کر لیں تو کوئی بھی یہودی باقی نہیں رہے گا۔ سب ایمان سے آئیں گے۔ مگر یہ عالم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ ان میں سے صرف ایک آدمی نے ایمان قبول کیا۔ باقی سب اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ نصاریٰ کا بھی یہی حال ہے۔ حضور علیہ السلام کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ مگر انہوں نے آج تک انہیں تسلیم نہیں کیا۔ آپ ارشاد ہے: ”نصاریٰ اسی طرح دنیا میں موجود رہیں گے۔ حتیٰ کہ جب مسیح علیہ السلام قرب قیامت میں نازل ہوں تو اس وقت ان کی سرکوبی ہوگی۔ اور پھر یہ دنیا سے ختم ہو جائیں گے۔“

یہود کے ساتھ  
موافقت اور  
ان کی مخالفت

ابتداءً زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے ساتھ موافقت کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ انہیں ترغیب ہو۔ اور یہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں اس قسم کے احکام ملتے ہیں آگے دیکھیں۔ یہودیوں کے لیے قرآن پاک میں بھی آئے ہیں کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم یہودیوں کی ترغیب کے لیے ہی تھا۔ خود حضور علیہ السلام نے سر کے بالوں کے بنانے میں اہل کتاب کا طریقہ اختیار کیا۔ اس زمانے میں سر میں ہانک نکالا کرتے تھے۔ مگر یہود ہانک نہیں نکالتے تھے۔ بلکہ ویسے ہی بالوں کو پیچھے کی طرف ڈال دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے موافقت کی خاطر ان کا طریقہ اپنایا۔ لہذا آپ ہانک نہیں نکالا کرتے تھے۔

یہودی سخت متعصب تھے۔ ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ لہذا بعد میں آپ نے ہائم نہ نہ شروع کر دیا۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ کسی طرح راجہ راست پر آنے کے لیے تیار نہیں۔

اس کے بعد آپ نے دوسرے طریقے اختیار فرمایا۔ اور انشاء اللہ میں اہل کتاب کی مخالفت شروع کر دی۔ چنانچہ ایسے کسی ایک سائل ہیں۔ جن میں اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی مخالفت کا حکم ہے۔ یہودی محکمہ خدام کی دسویں تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: تم ان کی مخالفت کرو اور دسویں تاریخ کے ساتھ نویں تاریخ کا روزہ بھی رکھ کر دو۔ اسی طرح یہودی حیض والی عورت کو گھر میں نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ طہارہ کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: تم عورت کو بر حالت میں اپنے گھر میں رکھو۔ فرمایا: حیض والی عورت گھر کے سامنے کار انجام دے سکتی ہے۔ ہوائے اس کے کو اس کے ساتھ مباشرت جائز نہیں۔ میاں بیوی اکٹھے بیٹھ سکتے ہیں ایک برتن میں کھانا کھا سکتے ہیں تاہم مباشرت نہیں کر سکتے۔

اہل کتاب ہلوں کو زنا ناجائز سمجھتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے اس کام کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ ان سے مخالفت کی بنا پر تھا۔ اسی طرح یہود تہ بند نہیں باندھتے تھے۔ آپ نے شعور پہننے اور تہ بند باندھنے کا حکم دیا۔ مقصد یہ کہ شروع شروع میں مدینہ کے یہودیوں کی خاطر ان کی موافقت میں بعض امور انجام دیے۔ مگر جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ بڑے ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ تو آپ نے ان کے بعض امور کی مخالفت کا حکم دیا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ اسی بات کو بیان فرماتا ہے۔

کہ اے اہل ایمان! تم اہل کتاب سے کسی موافقت کی امید نہ رکھو۔ بلکہ تو سخت عناد ان لوگ میں یہ کبھی تمہاری بات ماننے پر تیار نہیں ہوں گے۔ بلکہ ان کا دھیرہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سننے کے بعد اس پر عمل نہ کیا۔ بلکہ اس میں تحریف شروع کر دی۔

اہل کتاب میں سے تو ایک گروہ ایسا تھا۔ جو عنیدہ طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ رکتا تھا۔

اور آپ کی مخالفت کرتا تھا۔ البتہ ایک مختصر گروہ یہ بھی تھا۔ جو بظاہر تو دوازہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ مگر درپردہ ان کی ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ تھیں۔ غیبت میں ایسے ہی لوگوں کی ذمہ داری

کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَإِذْ آتَيْنَا آلَ إِبْرٰہِیْمَ الْإِسْلَامَ۔ اور جب اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں وَإِذَا أَخَذَ بَعْضُهُمْ أَمْرًا۔ بعض اور جب یہ اگلی بات کہتے ہیں اہل ایمان کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ تو کہتے ہیں أَتُخَذُ لَكُمْ آلِهَةٌ۔ فتح اللہ علیہم کہتے ہیں کیا تم مسلمانوں کو ایسی باتیں بتاتے ہو۔ جو اللہ تعالیٰ نے تم پر ظاہر کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ لِيُخَاجِبَكُمْ بِدَعْوَةِ رَبِّكُمْ۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بات میں تمنا ہے ساتھ مجبور کریں گے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تم مسلمانوں کو تورات کے احکام سے کیوں آزاد کرتے ہو۔ جن میں یہ تھا کہ نبی آخر الزمان کی یہ نشانیاں ہیں۔ اور یہ کہ تورات قرآن پاک کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسی باتیں اہل ایمان کو نہ بتاؤ۔ یہ آخرت میں اسی سے تمنا ہے عَذَابٌ دَلِيلٌ قَائِمٌ کریں گے۔ کہتے تھے کہ یہ ایسی گہری بات ہے۔ جو ہم سے عذاب جاتی ہے أَفَلَا تَتَّقُونَ کیا تم نہیں سمجھتے۔ یعنی تمہیں اس نکتہ کی کیوں سمجھ نہیں آتی کہ یہ چیزیں ہمارے حق میں نہیں ہیں۔

اہل کتاب کی ان تمام تر چالوں کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ کہ ان کی ہوشیاری کسی کام نہیں آئے گی۔ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُكْسِدُونَ وَمَا يُغْلِبُونَ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ہر اس بات کو جانتا ہے۔ جو یہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں وہ سمجھتے تھے کہ منافقت کا یہ چکر چلا کر وہ اہل کتاب اور اہل ایمان دونوں کے ساتھ تعلقات برقرار رکھ سکیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا پردہ فاش کر دیا۔ اور فرمایا کہ یہ لوگ جو بے ایمانی کر رہے ہیں۔ احکام کی غلط تفسیر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ان کی کوئی چال کامیاب نہیں ہوگی۔

یہودیوں کی  
موجوم آندہ نہیں

فرمایا تم صرف کلمہ اور منافقت۔ تو عام لوگوں کی بیماریاں تھیں۔ یعنی یہ خصائل ان لوگوں کے تھے۔ جو عورتوں پرست علم نہ تھے۔ ان کے عذر وہ بعض لوگ ایسے بھی تھے وَجَنَّتْهُمُ أَهْمِيَّتُهُمْ۔ لَا يَدْلَعُونَ ان کے جو باطل ان پر چڑھتے انہیں کتاب کا باطل علم نہیں تھا۔ فرمایا ایسے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ اہل ایمانی سوائے چند خود ساختہ آندہ دوز کے جن کا ذکر آئے ہیں۔ یعنی بہ نسبت صوفیوں کے یہ وقت ہے۔ یا یہ کہ سخت ابراہیم علیہ السلام

دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہوں گے، اور قیامت کے دن کسی یہودی کو جس نے غنہ کی ہوگی اس میں نہیں گرنے دیں گے۔ یا اگر بنی اسرائیل دوزخ میں پہلے جی گئے، محمدؐ سے منہ ایام کے لیے جتنے دن ان کے آباؤ اجداد نے پکھڑے کی پوجا کی تھی، اس کے بعد پھر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے بابل اور ان پر اس قسم کی آرزوئیں لیے بیٹے تھے، مگر ان کا عقیدہ یہاں تک تھا کہ عربوں کا دل بخیر کرنے میں کون کنا نہیں ہے۔ سود کو بدل کرنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کئے تھے شریعت کو بائز قرار دیتے تھے وَإِنْ فَعِمَ إِلَّا بَصْنًا اور یہ کہ یہاں پر وہ کام کرتے۔

تورہ میں  
تحریریت

تحریریت فی الکتاب کے تعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کا حال یہ ہے کہ اس جرم کی بنا پر نوید اللذین یکتسبون الکتاب باید یفسدوا ہلاکت ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اپنے ائمہ سے کتاب عن توراة لکھتے ہیں ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ گویا اپنی تحریر کو اللہ تعالیٰ کی تحریر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس قدر ظالم لوگ ہیں۔ اللہ یہ تحریریت اس لیے کرتے ہیں لیست تذبذب لثَمًا قَلِيلًا تاکہ اس کے ذریعے حقیرا معاد صواب لریں۔ مذبذب کسی زانی کو جہم کی نر سے بچنا مقصود ہوتا تو کمرہ بیت تھے کہ توراة کا حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کا منہ کالا کر دو اور گوسے پر سوار کر کے شہر چھوڑ دو یا زیادہ سے زیادہ کوئی جہنم نہ کر دو۔ اس طرح زانی کی جان بچا لیتے۔ اس کے علاوہ ان کے اور بھی بے شمار من گھڑت مسائل تھے جنہیں توراة کی طرف منسوب کرتے تھے۔ تحریریت کی دونوں صورتیں ان میں پائی جاتی تھیں۔ یا تو ان کا وہی بدل دیتے تھے جیسا کہ بیان ہوا۔ یا پھر الفاظ تو نہیں بدلتے تھے۔ مگر ان کی تاویل غلط کر کے اپنا مقصد پورا کر لیتے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے نبی اسرائیل کی یہ قیامت بھی بیان کر دی کہ وہ کتاب الہی میں تحریریت جیسی قبیح حرکت کے مرتکب ہوتے تھے۔

تحریریت کا دائرہ مشافہوں تک وسیع ہو چکا ہے۔ آج کے دور میں انصاف کی نظر سے دیکھیں گے۔ تو پتا چلے گا کہ اکثریت کے عقیدے خراب ہو چکے ہیں۔ کتنے خود ساختہ اور جھوٹے عقیدے ہیں جنہیں آج کل کے نام نہاد علماء قرآن و سنت کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ تحریریت فی الکتاب و سنت نہیں تو اور کیا ہے آج کے داعی قہر پرستی رسومات نامیہ و دھرم

ہمات سے متعلق کتنی بنا دنی مدیشیں لوگوں کو سناتے ہیں۔ یہ بالکل یودیوں کا طریقہ ہے۔ جو سمجھانوں نے بھی اختیار کر لیا ہے۔ اس دور میں نیکی کا وہ معیار کہاں ہو گیا ہے۔ جو کتاب اللہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا اقوال صحابہ کا تھا۔ اصل دین کہاں چل گیا۔ دور حاضر میں دین چند رسومات اور مجھوٹے عقائد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن و سنت کی عزت کو نہ جوع کرتا ہے۔ نہ نئے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ در نہ عمل کرنے کی دشواری و بہت پر دین کا دار و مدار ہے۔ اس کی تبلیغ کرنے والے وہ لوگ ہیں۔ جو مجھوٹے قہقہے کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ یہی چیزیں فتنوں میں ہیں اور غیروں میں ہیں اور انہیں یہ عمل ہو رہا ہے۔ بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ آج چند سوئم کو دین کا نام لے دیا گیا ہے۔ اور لوگ حقیقت سے بہت دور جا چکے ہیں۔ دین کو سمجھنے والے لوگ بالکل قلیل تعداد میں ہیں۔ آج کہنے لوگ ہیں جو مغسورین، فقہاء اور ائمہ دین کی عزت پر دیر سرج کا بیڑا اٹھائیں۔ اور دین کو اس کا صحیح مقام و دائرہ جھوٹا سلام کا رشا دکھائی دے۔ قرب قیامت میں فتنوں کا دور آئے گا۔ اس وقت دین کو ہاتھ میں پکڑنا اس قدر مشکل ہو جائے گا۔ جیسے جتنے ہوئے کو غلوں کو پکڑنا۔ آج آپ کی بقیہ دھم کی تردید کر کے دیکھیں، ساری برادری اور خاندان، راض ہو جائے گا۔ شادی بیاہ کی رکھیں دیکھ لیں۔ یہ انش اور فتویٰ کی رسوم کی طرف نگاہ ڈالیں۔ میلوں اور عرسوں کی طرف دیکھیں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ قبروں پر چادریں چڑھانی جا رہی ہیں۔ میسے لگانے جا رہے ہیں۔ قزایاں ہو رہی ہیں۔ خواجہ نظام الدین ادویا کی قبر پر دو جزاء روپے کی چادر لے کر ایک آدمی گیا، یہ کون سا دین ہے؟ مسٹر جناح کی قبر پر بیش قیمت گنبد کی تعمیر کون سی شریعت ہے؟ ہر جگہ عرسوں کی بھر مار ہے۔ قبروں کو غسل دیا جا رہا ہے۔ یہ کس شریعت کی باتیں ہیں؟ کیا یہ یود کا طریقہ نہیں ہے؟

دین کی بعض چیزیں ایسی ہیں جنہیں ہمارے لئے لوگ غلام کو مجبور کرتے ہیں اور پھر دین فروش بن کر ان کی سب خرابیوں کو خیریت کے ذریعے پرز کرتے ہیں۔ اس ضمن میں نکاح و طلاق کے مسئلہ کی مثال واضح ہے۔ جلد بازی میں طلاق دے دیتے ہیں جب اپنے کیے پر نہ اامت ہوتی ہے تو اس کے لیے راستہ تلاش کرنے لگتے ہیں۔ طلاق کے کتنے ہی ایسے معاملات ہیں جن میں لوگ غلط فتوے حاصل کر بیٹے ہیں۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ طلاق جیسی اجماع اور دوہیں چیز کو عائد کرنے سے پہلے اس پر



پھر طرہ غلط کی جاتا، کسی صاحبِ لڑائی عام سے شورو مچا جاتا۔ طلاق ٹینے اور پھر اس کے اثرات کے متعلق پوچھا جاتا، مگر ہائے حاشیہ کے اصول یہ ہے کہ طلاق ٹینے کے بعد اس کے اثرات کے لیے فتویٰ حاصل کرنے آتے ہیں کہ جی غلطی ہو گئی ہے لڑکے نے غصے میں آکر طلاق ٹینے دی ہے۔ اب اس کا کوئی حل بتائیں۔ ہم چوبیس سال سے یہی کچھ دیکھ رہے ہیں اتنے عرصے میں صرف ایک آدمی نے طلاق ٹینے سے پہلے شورو کیا ہے کہ میرا بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے بلکہ می کوکشش کے باوجود نباؤ کی صورت نظر نہیں آتی۔ آپ ہمیں طلاق ٹینے کا صحیح طریقہ بتائیں۔ اور نہ باقی سب طلاق ٹینے کے بعد ہی آئے ہیں۔ کہ اب کسی طرح حلال کر دو۔ یہ دین میں تحریم نہیں اور کیا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تحریم کرنے والوں کے متعلق ارشاد فرمایا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيهِمْ پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے کچھ عینی خود کچھ کر اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا اور تحریم کے مرتکب ہوئے فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ اور ہلاکت ہے ان کے لیے جو انہوں نے کیا ہے یعنی غلط فتویٰ دیے اور تحریم کر کے جو دنیا انہوں نے کمائی وہ ان کے لیے باعثِ ہلاکت ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حلال کی بجائے حرام کیا ہے۔ اور حرام کیا ہے تو اس کی قیمت میں تاہی ہی آئے گی اسی بات کو درستہ مقدم پر یوں بیان فرمادیا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْوَحَّابِ رَاٰ مَوْحٰبًا مِّنْ اَمْوَالِ الْاَنْسِ بِالْبَاطِلِ عِلٰلٍ یعنی ستنے ہی پیرائہ عالم ہیں جو لوگوں کا مال باطل طریقے سے کما جاتے ہیں۔ یہ باطل طریقے ہی ہیں۔ جو شرکیہ اور بدعتیہ رسوم کو اپنا کر اختیار کئے جاتے ہیں۔ جھوٹی کمائیاں سنا کر اور باطل اختیار سے پھیلا کر لوگوں کا مال مضمر کیا جاتا ہے۔ اور ان کے ایمان ضائع کئے جاتے ہیں۔ تو فرمایا اس قسم کی کمائی پر بھی لعنت آتا ہے اور یہ باری ہے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کے باطل عقائد کی تفصیل آرہی ہے۔ اور قانونِ نجات کا دوبارہ تذکرہ ہو گا۔ جیسا کہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً قُلْ أَتُخَذُ تُعْمَدُ  
اللَّهُ عَهْدًا أَفَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا  
تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَنْ كَبَّ سَيْفَهُ وَأَعَابَتْ بِهٖ خَطِيئَتُهُ  
فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨١﴾ وَالَّذِينَ  
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ  
فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٨٢﴾

تَعْمَدُ

خَالِدُونَ

ترجمہ اور (یہودی) کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں چھوٹے گی ہم کو (دوزخ کی) آگ  
مگر چند دن کے لیے۔ (اے پیغمبر) آپ فرمادیجئے کیا تم نے پوچھا ہے اللہ تعالیٰ کے  
پاس کوئی عہد پس ہرگز نہیں غلات کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے عہد کا۔ بلکہ تم اللہ تعالیٰ  
پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے ﴿۸۰﴾ کیوں نہیں جس شخص نے بُرائی کائی اور گھیر لیا  
اس کو اس کے گناہوں نے، وہی لوگ دوزخ واسے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے  
﴿۸۱﴾ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے۔ وہی لوگ جنت واسے

ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ﴿۸۲﴾

یہودیوں کے  
باطل عقائد

اس رکوع میں اہل کتاب کی ضربیوں کا ذکر ہوا ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ  
نے کافروں سے امید قطع کرنے کا حکم دیا کہ یہ بڑے متعصب لوگ ہیں۔ آپ ان سے  
ایمان لانے کی امید نہ رکھیں۔ اس کے بعد ان کے دو طبقوں یعنی اہل طہ اور ان پر ہمارے  
لوگوں کا ذکر ہوا کہ ان جابل گوروں سے پاس دین نہیں۔ بلکہ چند محبوبی آرزوئیں ہیں مثال کے طور  
پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی ایک تمہونی آرزو یہ ہے کہ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ  
وہ کہتے ہیں کہ ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے۔ اَلَا اَيُّهَا مَعْدُودَةُ مگر چند دن کے لیے  
جنت تو ہمارے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ دوسری جگہ ان کی بات کہ یوں بیان فرمایا لَنْ يَدْخُلَ



فَلَنْ يَخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ اور اللہ تعالیٰ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی وعدہ تم سے نہیں کر رکھا ہے۔ اَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ بلکہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ البتہ ایمانداروں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر رکھا ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں سکھایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح کا کر دے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعْلَمُ اَنَّكَ فِیْ هَذِهِ الْحَیْوَةِ الدُّنْیَا یَعْنِیْ اے اللہ! میں تیرے سامنے اس دنیا کی زندگی میں عہد کرتا ہوں۔ بِاَنَّكَ وَحْدَكَ لَا شَرِیْكَ لَكَ یہ کہ تو ایک ہے۔ اور تیرا کوئی شریک نہیں دَنْ مُّحَمَّدٌ عَبْدُكَ ورسولؐ تُوں اور بے شک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے بندے اور تیرے رسول میں وَ اَلَا تَوْفِیْ اِلَّا بِرَحْمَتِكَ اور مجھے صرف تیری رحمت پر ہی عبور دے گا۔ اِنْ تَبْکُلْنِیْ اِلَیْ نَفْسِیْ اگر تو مجھے میرے نفس کی طرف سوئپ دے گا۔ تَقْرِبْنِیْ مِنَ الشَّیْءِ تَوْجَعْتُ مِنْهُ شَرٌّ قَرِیْبٌ کر دے گا۔ وَ تَجَاعِدُنِیْ مِنَ الْخَیْرِ اَوْ نِیْیْ اور جہاد سے دور کر دے گا۔ فَلَجَعَلَ فِیْ عِمْدَتِکَ عَهْدًا تَوْفِیْئِیْدًا یَوْمَ الْقِیَمَةِ پس تو میرے لیے عہد بنا دے کہ اس کو قیامت والے دن پورا کر دے۔ اِنَّکَ لَا تَخْلِفُ اَیُّعَادَ بے شک تو وعدے کو خلاف نہیں کرتا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا جو شخص اس دعا کو دنیا میں پڑھے گا۔ تو اس کو قیامت والے دن اس کا بدلہ ملے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر کوئی عہد کرنا ہو تو وہ ایمان کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے ایمان کے بغیر کوئی عہد نہیں ہو سکتا جو انسان کے لیے دوزخ سے نجات کا ذریعہ بن سکے۔ مگر اے بنی اسرائیل تمہارے پاس تو ایمان موجود نہیں۔ لہذا تم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہو کہ ہم ادا دل تو دوزخ میں جائیں گے نہیں۔ اور اگر گئے بھی تو چند روز سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ بلکہ جنت میں آجائیں گے۔ یہ تو تمہارا عقیدہ بالکل فاسد ہے

فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں بنی اسرائیل کے عقائد باطلہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے جنت میں پہنچنے اور دوزخ سے نجات کا قانون تو آگے آیا ہے۔ جس چیز کو بنی اسرائیل

باطل عقائد  
کی بنیاد

بیان کر رہے ہیں۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب امت کا رشتہ علم و عمل نبی سے منقطع ہو جاتا ہے۔ تو آرزوئیں اور خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ یہی حال یہودیوں کا تھا۔ ان کے تمام افعال نبی سے قطع تعلقی پر دلالت کرتے ہیں۔ انہوں نے نبی کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کے عقیدے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور انہیں من گھڑت عقیدوں جگہ خواہشات کی بنا پر وہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں روزِ نوح سے بچالیں گے۔

سناؤں کے  
باعل عقائد

اس قسم کے غلط عقیدوں کا دائرہ یہودیوں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ سکناؤں تک وسیع ہو چکا ہے۔ شفاعت کا مسئلہ ہی سے میں۔ یہاں پر يَا شَيْفِيعَ الْمَذْنِبِينَ کے نعرے مانے جاتے ہیں۔ کہ ہم جو چاہتے ہیں۔ چھوڑ دینا۔ ہمارے شفاعت کر دیں گے اور ہم نجات پا جائیں گے۔ حالانکہ شفاعت کا مسئلہ قرآن پاک نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ شفاعت لوگوں کی خواہش پر نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ تو اللہ جل جلالہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لَا يَتَفَعَّلُونَ وَلَا لِمَنْ أَرَادُوا اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تو کسی بھی سفارش نہیں کر سکتا۔ تم کس زعم میں مبتلا ہو۔ یہ عقیدہ کہ خداوند ضرور ہماری سفارش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اسے ضرور ہی قبول فرمائے گا۔ یہ تو یہودیوں والا عقیدہ ہے محض میلاد منفعہ کرنا۔ جلد سے نکال لینا یا گیارہویں مائینا کافی سمجھ رکھا ہے۔ بس شفاعت کے حقدار ہو گئے۔ شیعوں میں یہ کہتے ہیں حضرت حسین کا نام لے لو۔ ماتم برپا کرو۔ بس نچنے جاؤ گے کسی نماز روزے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے باطل عقیدے اس وقت پیدا ہوتے ہیں۔ جب علم و عمل کا تعلق نبی سے کٹ جاتا ہے۔ پھر خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ اور ساری عمر لوگ اسی اصول کو پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ یہودیوں والے عقائد ہیں۔ سفارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ جو لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ کہ خدا چاہے۔ مٹی ہو یا ناراض۔ جی۔ ولی۔ جبری سفارش کریں گے۔ اور ہمیں بچالیں گے یہودیوں نے بھی یہی ٹھوکر کھائی۔ اور ہم جی اسی راستے پر چل سکے ہیں۔ ان میں اور ہم میں کیا فرق ہے

قانونِ نجات

فرمایا ہے بنی اسرائیل! نجات کا قانون وہ نہیں ہے۔ جو تم نے بنا رکھا ہے۔ کہ جنت میں پہنچنے کے لیے صرف یہودی ہونا کافی ہے۔ سبکی بلکہ قانونِ نجات یہ ہے کہ مَنْ كَسِبَ سَيِّئَةً وَآخَاَصَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ جس شخص نے بھی گناہ کیا۔ اور اس کے گناہوں نے اسے گھیر لیا۔ فَأُولَٰئِكَ مَتَّحَبُ النَّارِ یہی لوگ دوزخ میں۔ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ جو

بیشتر اس میں رہیں گے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہی گناہ انسان کو گھیرے گا جو سب سے بڑا ہوگا۔ اور چاروں طرف چھایا ہوگا۔ اور یہ گناہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آدمی بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر وہ گناہوں سے گھرا ہوا نہیں ہوتا۔ جب تک کفر و شرک کا ارتکاب نہ کرے۔ قرآن پاک میں آتا ہے: **وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ**۔ سب سے بڑے ظالم کافر ہیں۔ نیز فرمایا: **إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ**۔ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ فیصلہ کر دیا: **إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ**۔ شرک کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ **وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ**۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے، معاف فرمائے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو بغیر توبہ کے بھی کسی کو معاف فرمائے۔ وہ مالک ہے مگر شرک اور کفر جیسے عظیم گناہوں کو معاف نہیں کریگا۔ یہ اس کا اہل فیصلہ ہے۔ ہاں اگر سزا موت طاری ہونے سے پہلے پہلے اُس نے توبہ کر لی، تو وہ معاف کر دے گا۔ کیونکہ توبہ کا دروازہ اس وقت تک کھلا ہے۔ جب تک کسی پر موت کے آثار ظاہر نہ ہو جائیں، فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغْزِغُوا** انسان کی توبہ غرغره طاری ہونے سے پہلے مقبول ہے اس کے بعد نہیں۔

کافر و شرک  
داعیِ جہنمی ہیں

اسی لیے فرمایا: **وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** جس شخص نے اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کیا **فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا عَظِيمًا** ایسا شخص گمراہ ہو کر دوڑ جا پڑا۔ اور اب وہ جہنمی ہے اس کے لیے دوزخ سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔

یہ ایسے شخص کی مثال ہے۔ جسے ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ کلمہ نکلا کفر پر اڑا رہا۔ البتہ ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر اور دوسری چیزوں پر ایمان لائے۔ اور ساتھ ساتھ شرک کا ارتکاب بھی کرتا جائے۔ یعنی اُس نے اپنے ایمان کو شکوک و شبہات سے لایا ہے۔ اور اپنے ایمان کو خراب کر دیا ہے۔ قرآن پاک نے اس مضمون کو بڑی تاکید کے ساتھ



بیان کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام منادی کرتے تھے۔ اے لوگو! خوب اچھی طرح سن لو۔ اُعْبُدُوا رَبِّي وَرَبَّكُمْ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے۔ اور تمہارا بھی رب ہے۔ اپنی حاجتوں میں غیر اللہ کو مت پکارو، اور نہ ان کی ایسی تعظیم کرو جو اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ در نہ شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور نجات سے محروم ہو جاؤ گے۔ اِنَّهُ مَنْ يَشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هَضَمَ اللّٰهُ عَظْمَهُ الْجَنَّةَ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، اللہ تعالیٰ نے اُس پر جنت حرام کر دی ہے۔ وَمَاؤُمُهُ لَذَّةٌ اور اس کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔

اسی طرح کافروں کے متعلق فرمایا کہ ان کے لیے آسمانوں کے دروازے نہیں کھلیں گے۔ لَا تَقْعَمَنَّ لَهُمُ ابْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی يَكْلِمَ الْجَمَلُ فِيْ سَعَةِ الْجَنَّةِ یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناک میں گزر جائے نہ دھنٹ سوئی کے ناکے میں گزرے اور نہ کفار کے لیے جنت کے دروازے کھلیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر جنت حرام کر دی ہے۔

جس طرح کفر اور شرک عظیم گناہ ہیں۔ اسی طرح ایمان عظیم ترین نیکی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا اُمّی اِنَّكَ اَفْضَلُ بِرَکْرَکُنْ اَمَلُ اَفْضَلُ تَرِینُ ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ یہ ایمان لانا۔ یہ تمام اعمال کی جڑ اور بنیاد ہے۔ سی لیے فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُوَ رُکْنُ اِيْمَانٍ لَّسَّ وَتَعَمَّلُوا الصَّالِحَاتِ اور نیک اعمال کئے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ادا کیا۔ اس کے بعد جہاد اور نیکی کے دیگر کام انجام دیے، ان کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ ہر سی رُکْنُ جَنَّتٍ وَاٰتِیْنَ ہر جنت کی چابی ان کے پاس ہے۔ اور یہ کوئی عارضی مقام نہیں ہوگا، بَلْ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا قانونِ نجات ہمارے پاس ہے۔ تم کفر اور شرک کا ارتکاب کرتے ہو۔ دنیا کی دیگر برائیوں میں غوث ہوتے ہو۔ اس کے باوجود اس غوثِ فہمی میں مبتلا ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں نہیں گرنے دیں گے۔ یہ باطل باطل خیال ہے۔

آلة

دس سی وچ ۲۵

البقرة

(آیت ۸۳)

وَلَا تَأْخُذْ بَعِثَاتِ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَبِالْوَالِدَيْنِ  
إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَ  
أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ  
وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾

مترجمہ: یہ اور اس واقعہ یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ خدایا کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ان باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور قرابت داروں کے ساتھ۔ اور یتیموں کے ساتھ اور مساکین کے ساتھ۔ اور کمزوروں کے لیے نیک بات اور فائدہ کو قائم رکھو۔ اور زکوٰۃ دیتے ہو۔ پھر چہ گئے تم دے بنی اسرائیل کو بہت تھوٹے

تم میں سے اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۱۷﴾

بطاكت

ان آیات میں بنی اسرائیل کی مختلف خرابیاں بیان ہو رہی ہیں۔ پچھتے دس میں ان کے ان غلط عقائد کا رد تھا کہ یہودیوں اور نصاریٰ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص جنت میں نہیں جاسکتا یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ البتہ خود اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں جو وعدہ بنی اسرائیل سے لیا تھا۔ اس کا ذکر ہے۔ اور وہ ایسا وعدہ تھا۔ جو کہ نہ صرف توراۃ میں تھا۔ بلکہ متہم نفا انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں بھی موجود تھا اور اس کی تمام باتیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں بھی آئی ہیں۔

توجہ کے  
دوست

مِثْقَ بَتْنِ آسَافَیْلَ اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد یدِ ميثاق پختہ عہد کر گئے ہیں۔ جو بڑا مضبوط اور پکا ہو۔ اور وہ عہد یہ تھا کہ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ تَمْلِكُ لَكُمْ السَّمْعُ

کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ایسی بات کو خبر کی شکل میں ذکر کرنے کا مقصد اس میں زور پیدا کرنا ہے۔  
 اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دو پہلو ہیں۔ مثبت پہلو تو پہلے گزرتا ہے۔ اور وہ یہ ہے  
 کہ اَعْبُدُوا رَبَّكُمْ اپنے رب کی عبادت کرو۔ اس کی توحید کو تسلیم کرو۔ وحدانیت کا دوسرا  
 پہلو منفی ہے۔ یعنی لَا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ جہاں تک  
 پہلے حصے کا تعلق ہے۔ وہ تو واضح ہے۔ اور اس میں اختلاف بھی یہ نہیں ہوتا کہ بھی اپنے رب  
 کی عبادت کرو۔ مگر توحید کے دوسرے حصے میں جا کر اکثر بڑا پیدا ہوتا ہے۔ اور لوگ شرک یا مبتدا  
 ہو جاتے ہیں۔ اور یہ صورت حال اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب لوگ حقیقی رب کی عبادت کے  
 ساتھ ساتھ غیر اللہ کی عبادت بھی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بائبل میں اگرچہ بہت کچھ تحریف ہو چکی  
 ہے۔ مگر توحید کا مسئلہ آج بھی اس میں موجود ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ آسمان کے نیچے ارض میں  
 کے اوپر خدا کے غیر کی عبادت نہ کرو۔ بحدہ نہ کرو۔ صرف خداوند جو بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ اس کی  
 عبادت کرو۔ مقصد یہ کہ توحید ایک مسئلہ ہے۔ جو تمام انبیاء علیہم السلام کی شرائط میں قدر مشترک کے  
 طور پر موجود رہا ہے۔ آیت زیر درس میں بھی یہی مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے مختلف اوقات میں مختلف عہد لیے۔ پہلا ان کے تورات  
 میں یہ عہد تھا۔ جسے قرآن پاک نے بیان کیا وَ إِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا ذُرِّيَّتَكُمْ  
 الطُّورَ یعنی اے بنی اسرائیل اس بات کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا۔ اور تمہارے  
 سروں پر کوہ طور کو معلق کر دیا تھا۔ نیز یہ بھی کہ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ جو کچھ ہم نے عطا کیا  
 ہے۔ اس کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اور اس کے مطابق عمل کرو۔

اور پھر یہ بھی لکھا تھا وَ اذْكُرُوا مَا فِيْهِ جَوْ كَافٍ ہم نے تورات میں نازل کیا ہے اس کو یاد کرو  
 تورات میں یہ عہد بھی لیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب لوگوں کے سامنے ظاہر کر دے گی چھپاؤ  
 گے نہیں۔ یہ لوگ اصل احکام کو چھپا بیٹھے تھے۔ اور ان کی جگہ خود ساختہ مسائل لوگوں کو بتاتے تھے۔  
 اللہ تعالیٰ کے حکم لَتُبَيِّنَنَّ لِلنَّاسِ رَدَّائِكُمْ مِّنْ دُونِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَعْلَمُونَ پر عمل نہیں کرتے تھے۔

الغرض! اس مقام پر جس عہد کا ذکر ہے وہ یہ تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔  
 نہ کرنا۔ بلکہ صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرنا۔ عبادت کے لیے ضروری ہے۔

ہے کہ جسکی عبارت کرتا ہے۔ اس کی صحیح پہچان بھی ہو۔ اسی لیے سب سے پہلے رب تعالیٰ کی پہچان کرانی گئی ہے: **الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** (۱) **الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ** (۲) **مَلِكٌ يَوْمَ الدِّينِ** (۳) یہ سب اللہ تعالیٰ کی پہچان ہی تو ہے۔ یعنی رب وہ ہے جو ان صفات کا مالک ہے: **الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ** وہی تمہارا بھی خالق ہے۔ اور تمہے پہلے آنے والے لوگوں کا بھی وہی مالک ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ علم محیط کا مالک ہے۔ اُسے فتنے دے کا علم ہے: **اِنَّهُ يَنْذِرُ كُلَّ شَيْءٍ مَّحِيطٌ بِاَسْوَافِ السَّيِّئَاتِ** اس صفت کی پہچان ہوگئی تو ترجیح مجھ میں آجائے گی۔ اسی طرح قادر مطلق ہوتا بھی اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ میں سے ہے: **اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ** وہ قادر مطلق ہے۔ جو چاہے کرتا ہے۔ اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی صفت یہ ہے کہ وہ واجب الوجود ہے۔ اُس کا وجود اپنی ذات سے ہے۔ باقی تمام چیزوں کا وجود استعار ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ وہ خالق ہے۔ کسی چیز کا حکم دینا یا کسی چیز سے منع کرنا بھی اس کی صفت ہے۔

اس کے علاوہ ان چیزوں کی پہچان بھی ضروری ہے۔ جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ عاجزی اور جہالت سے پاک ہے۔ رافضیوں کا عقیدہ باطل ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہر بھی ہوتا ہے۔ یعنی پہلے وہ کام کر لیتا ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کام نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یا جس طرح یہودیوں کا باطل عقیدہ ہے کہ بعض کام کر کے اللہ تعالیٰ نادم بھی ہوتا ہے۔ قرآن کے پہلے باب میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے خود پکھٹایا۔ تو ایسی یہودہ باتوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو مین کا گورنر بنا کر بھیجا۔ نو دستہ ہوا۔ بھائی اس سے پہلے ان لوگوں کو ترجیح اور رسالت کی دعوت دینا: **فَاِذَا عَزَمْتَ اللّٰهُ تَرٰ جِبْنَ** جب وہ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح سے پہچان لیں، تو پھر انہیں خدا تعالیٰ کے احکام یعنی نماز، روزہ

ذکوٰۃ اور حج وغیرہ کے احکام بتلانا کہ اس خدا تعالیٰ نے تم پر یہ فرائض عائد کیے ہیں۔ انہیں احکام دینا لازم ہے۔

والدین سے  
حسن سلوک

بہر حال عہد کا پہلا حصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اس کے سوا کسی دوسٹر کی عبادت نہ کرو۔ عہد کا دوسرا حصہ فرمایا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنا صرف بنی اسرائیل کی شریعت میں ہی ضروری نہیں تھا۔ بلکہ یہ تو شریعت محمدیہ کا بھی ایک لازمی جزو ہے: وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا یعنی خدا تعالیٰ کا یہ اہل فیصلہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حق کا ذکر کیا۔ اور پھر ساری مخلوق میں والدین کو سب سے اول نمبر پر شمار کیا۔ یہ احکام تمام انبیاء علیہم السلام کے شرائع میں موجود رہتے ہیں۔ توراۃ اور قرآن پاک میں بھی موجود ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حسن سلوک کے سلسلے میں والدین کو کیوں مقدم رکھا ہے۔ مفسرین کرام بیان کرتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ خالق اور حقیقی مربی ہے اسی طرح والدین بھی اس مادی دنیا میں اولاد کی پرورش میں حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا حق مقدم رکھا ہے۔ والدین جو احسان اولاد کے ساتھ کرتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ساتھ ملتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کسی پر مہربانی فرما کر اس سے معاوضہ طلب نہیں کرتا اسی طرح والدین کے اپنی اولاد پر بے مثال احسان ہوتے ہیں۔ لہذا ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں پر فوقیت دی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ماں اور باپ میں سے کون مقدم ہے۔ تو اس کے متعلق حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ میں کس کے ساتھ اچھا سلوک کروں۔ آپ نے فرمایا أُمَّكَ یعنی اپنی ماں کے ساتھ۔ اس شخص کے تین بار کے سوال کے جواب میں آپ نے ماں کا ذکر کیا۔ حتیٰ کہ چوتھی دفعہ پوچھنے پر آپ نے فرمایا

اَبَاكَ یعنی اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ گویا خدمت کے سلسلے میں ماں کو باپ سے بھی مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کی پیدائش اور پرورش میں ماں زیادہ تکلیف برداشت کرتی ہے۔ لہذا خدمت کی زیادہ حقدار بھی وہی ہے۔ قرآن پاک نے ماں کے متعلق فرمایا: **حَمَلَتْهُ اُمُّهُ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ** یعنی ماں نے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر بچے کو پیٹ میں رکھا۔ اسی لیے محدثین عظام فرماتے ہیں: اگر ماں اور باپ دونوں کو یہاں تک مٹی ہوئی ہو۔ تو پہلے ماں کو پانی پلاؤ۔ کہ خدمت میں اس کا حق فائق ہے۔ مگر جہاں ادب و احترام مقصود ہوگا تو دہاں باپ مقدم ہوگا۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ایک صورت ترک ایند ہے۔ ماں باپ کو قول سے یا فعل سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ کیونکہ یہ احسان کے خلاف ہے۔ بلکہ اولاد کا فرض ہے کہ اپنے جسم اور مال کے ساتھ ماں باپ کی خدمت کرے۔ اگر والدین مالی طور پر ضرر مند ہیں۔ تو ان کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ورنہ جسمانی طور پر تو اولاد ان کو راحت پہنچائیں۔ مثلاً ان کی کھٹی چائی کریں۔ ماں کو کھلائیں پلائیں۔ ان کو نسلانیں دھلائیں وغیرہ۔ جو ماں باپ کی ذمہ داری کے بعد ان کے لیے بخشش کی دعا کرنا بھی ان کی خدمت کے مترادف ہے۔ ان کے لیے استغفار کرو۔ صدقہ و خیرات کرو۔ تاکہ ان کے لیے آخرت میں راحت کا سبب بنے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: کہ اگر ماں باپ نے کوئی وصیت کی ہے۔ تو اولاد کو چاہیے کہ اُسے پورا کریں۔ حتیٰ کہ ماں باپ کے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک بھی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سمجھا جائے گا۔

مسلم اور ترمذی شریفین کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ گدھے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک بڑا دھلا۔ آپ نے اپنا گدھا اس بڑے کو کھڑے دیا۔ آپ کے سر پر چڑھائی تھی۔ وہ بھی بڑے کو کھڑے رکھ دی۔ ساتھیوں نے عرض کیا: حضرت! آپ کے پاس یہ ایک گدھا تھا۔ جو سواری کے کام آتا تھا۔ مگر آپ نے اس کو دیاتل کو کھڑے دیا۔ دیا تلی لوگ

۱۔ کتب الدرر ص ۲۱۱ ۲۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۱۳

۳۔ ابو داؤد ص ۲۴۴ ۴۔ ابن ماجہ ص ۲۶ ۵۔ مسلم ص ۳۱۴ ۶۔ مجمع الفوائد ص ۱۶۹ ۷۔ بحوالہ مسلم ترمذی، ابو داؤد



تو معمولی چیز پر بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی قیمتی سواری تک مٹے دی۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بھائی! اس کا باپ میرے والد کا دوست تھا۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ باپ کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا باپ کے ساتھ نیکی میں شریک ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بعض حدود بھی متعین ہیں۔ سورۃ لقمان میں واضح ہے: وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ جِلْعَلٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبُكُمْ فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا۔ اگر ماں باپ تمہیں شرک پر آمادہ کریں تو پھر ان کی اطاعت نہیں کرنی البتہ دنیا میں ان سے اچھا سلوک کرو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر والدین ترکِ فرض پر مجبور کریں، تو ان کی بات نہیں ماننی چاہیئے۔ مثلاً کسی پر حج فرض ہو گیا ہے۔ مگر ماں باپ روکتے ہیں۔ تو ان کی بات کی پروا نہیں کی جائے گی۔ قربانی واجب ہے۔ اگر والدین اس سے روکیں تو نہیں رکن۔ البتہ اگر سنتِ مرکہ کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالیں۔ تو ان کے کہنے پر ایک درود فغاٹا جاسکتا ہے تاہم سنتِ مرکہ کی ادائیگی کرنی بروکِ بغلِ عبادت کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اگر ماں باپ روکتے ہیں، تو قطعاً طہ پر رک جاؤ۔ ماں باپ کی بات مانو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص مسجد میں جا کر نفل پڑھنا چاہتا ہے۔ اور والدین کہتے ہیں کہ ان کو تنہائی میں وحشت ہوتی ہے۔ لہذا نوافل کے لیے مسجد میں نہ جاؤ۔ تو ماں باپ کی خدمت مقدم ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے۔ کفر و شرک پر آمادگی تو کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں۔ اس کے علاوہ اگر ماں باپ بدعات پر آمادہ کریں۔ تو ان کی اطاعت نہیں کرنا ہوگی۔ مثلاً وہ کہیں کہ قبر پر سجدہ کرو۔ یا داتا صاحب بجا چڑھاؤ۔ فلاں جگہ نیاز دے کر آؤ۔ تو ایسی باتوں کو نہیں ماننا۔ بلکہ ایسی چیزوں کی مخالفت ضروری ہو جاتی ہے۔ تاہم ان تمام تر حدود و تسیود کے باوجود والدین سے حسن سلوک ہر حالت میں لازم ہے۔ رَبَّالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا کا یہی مطلب ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک کے بعد فرمایا وَذِي الْقُرْبَىٰ یعنی قرابتداروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ قرابتداروں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم محرم قرابتداروں کی ہے۔ یعنی دو قرابتدار۔

ذاتہ الیہ کے  
مترق

جو آپس میں محرم ہوں اور جن کو آپس میں نہت ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ مثلاً بھائی بہن چچا بھتیجی بھوچھی بھتیجی وغیرہ۔ قرابتہ اردوں کی دوسری قسم غیر محرموں کی جیسے اموں زاد، خالہ زاد، چچا زاد وغیرہ۔ فرمایا ان سب کے ساتھ اچھا سلوک کرو کسی کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ رضاعی ماں کی خدمت کرو۔ دودھ واسے رشتہ داروں کی مال خدمت زیادہ کمزور ہے۔ ایک والدہ شخص اپنے محتاج عزیزوں کی خبر گیری نہیں کرے گا۔ تو مجرم ٹھہرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے گا۔ فرمایا: **وَاتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ**۔ قرابتہ اردوں کو ان کا حق ادا کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے۔ تو ان کی امداد کرو۔ یہ ان کا حق ہے۔ اس کے بعد فرمایا **وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ** یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو۔ یتیم وہ نابالغ بچہ ہوتا ہے جس کے سرپر والدین کا سایہ نہ ہو۔ اس کی پرورش کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اس کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم ہے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

یتیم، مسکین  
اور فقیر

کہتے ہیں کہ جانوروں میں یتیم وہ سمجھا جاتا ہے جس کی ماں موجود نہ ہو۔ باقی چیزوں میں یتیم وہ چیز ہے جس کی نظیر نہ ہو۔ اور وہ نادار چیز ہو۔ جیسے **ذُرِّيَّةَ يَتِيمٍ**۔ نادہ قسم کا نمدہ ہیشمال ہوتی۔ مسکینوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسکین اس شخص کو کہتے ہیں جس کا خرچ اس کی آمدنی سے پورا نہ ہوتا ہو۔ بیچارہ کثیر العیال، محنت، مشقت کرتا ہے مگر جو کچھ کاتا ہے۔ اس میں گذر اوقات نہیں ہوتی۔ ایسا شخص بھی حسن سلوک کا مستحق ہے۔ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ محتاجوں میں ایک قسم فقیر کی بھی ہے۔ اور فقیر ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو بالکل ہی نادار ہو، اور جس کے پاس در وقت کاکھانا بھی میسر نہ ہو۔ ایسا شخص بھی محتاج ہے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يَا بَنِي إِسْرَءِيلَ**! اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ماں باپ کے حسن سلوک سے ہمیشہ آؤ۔ قرابتہ اردوں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

الْعَمَّ

البقرة

درس ہیڈنگ

آیت ۱۲۴

وَإِذَا خَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ تَعَالَى  
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا  
لِلنَّاسِ حُسْنًا وَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ  
إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنتُمْ مُّعْرِضُونَ ﴿١٢٤﴾

ترجمہ: اور اس واقعہ کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد کیا کہ تم اللہ تعالیٰ  
کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ اور قرابتداروں  
کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور مسکینوں کے ساتھ۔ اور لوگوں سے نیک بات  
اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر چہرے کے قدام بنی اسرائیل مکر بہت  
بھڑے تم میں سے۔ اور تم اعراض کرنے والے ہو ﴿۱۲۴﴾

ان آیات میں بنی اسرائیل کی خرابیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے ان کی جلد سازی  
کے ذریعے احکام شریعت سے اعراض کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی مغضبت باتوں اور انبیاء علیہم السلام  
کی ایذا رسانی کا ذکر بھی آیا ہے۔ بنی اسرائیل نے آزادی حاصل کرنے کے بعد غرض شریعت کا مطالبہ کیا  
تو اللہ تعالیٰ نے توراۃ عنایت فرمائی۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ تم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ  
نے ان سے عہد کیا تھا۔ جب انہوں نے بیعت و صل کیا۔ تو ان کے سروں پر وہ طوق ملتی کر کے انہیں  
ڈرایا گیا۔ اس عہد کی تفصیلات سورۃ اسراف میں آئی ہیں۔

جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا تھا کہ یہ دوسرا عہد ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے تورات کے  
ذریعے بنی اسرائیل سے کیا۔ اور وہ یہ تھا کہ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا  
کبھی کی عبادت نہ کرنا۔ اور ماں باپ اقربتداروں یتیموں اور مسکینوں سے حسن سلوک سے پیش  
آنا۔ اس سلسلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ حضرت!

قَدْ ارْتَضَا اَفْضَلُ زِيَادَةٍ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللهُ مِنْهُ . تو آپ نے ارشاد فرمایا اَلْقُلُوْبُ لِرُؤُوفِهِمْ  
یعنی نمازیں دفت پر ادا کرنا۔ اس شخص نے دوبارہ عرض کیا۔ حضور! اس کے بعد کون سا عمل افضل  
ہے۔ تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔  
کہ یہ بنیادی چیز ہے۔ اُس شخص نے دوبارہ پوچھا کہ اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے، تو آپ نے  
فرمایا جہاد فی سبیل اللہ۔

تہذیب اخلاق

اصل بات یہ ہے کہ علم سے دو چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ تہذیب اخلاق اور اجتماعی حقوق۔  
اخلاق میں آگے دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ یعنی اصلاح عقیدہ اور اعمال صالحہ، جب تک عقیدے کی  
اصلاح نہیں ہوگی کوئی بھی عمل مقبول نہیں ہوگا۔ لہذا سب سے پہلے اصلاح عقیدہ ضروری ہے۔ اور  
اس میں بنیادی چیز توحید ہے۔ جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ لَا تَقْبَلُوا دِیْنََ اِلَّا مِمَّا اَشْرَفَ تَعَالٰی  
کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو۔ جب عقیدہ درست ہو جائے تو پھر اعمال صالحہ بھی مقبول ہوں گے۔  
تہذیب اخلاق کا دوسرا جزو اجتماعی حقوق ہیں۔ ان کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اور اس میں  
والدین کے ساتھ حسن سلوک کو اولیت حاصل ہے۔ ماں باپ کو اپنے بچوں کی اچھی تربیت کا صلہ  
دینا چاہیے۔ اولاد کی پرورش کے لیے والدین کو بڑی تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اس کی بھانت  
یہ ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ قرآن پاک کی بیشتر سورتوں میں والدین کے ساتھ  
حسن سلوک کے احکام موجود ہیں۔

اجتماعی حقوق میں قربتداروں کا حق بھی ہے۔ اس کے بعد یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ  
حسن سلوک کی ہدایت ہے۔ یہ لوگ اپنے گھر کے ہوں۔ گلی محلے یا شہر ہانگ کے۔ سب کے سب  
اجتماعی حقوق میں آتے ہیں۔ چونکہ یہ بھی انسان کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ اس لیے اجتماعی طمہ  
پر اس کا بدلہ دینا بھی ضروری ہے۔ اس کو بدلہ کتے ہیں۔ عدل اور احسان تقویٰ کے درجہ میں  
لہذا یہ سب چیزیں تہذیب اخلاق میں آ جاتی ہیں۔ یہ ایک بنیادی تعلیم ہے۔ جو محض بنی اسرائیل  
کے لیے خاص نہیں ہے۔ بلکہ ہماری اُمت کے لیے بھی یکساں طور پر قابل عمل ہے۔

حسن کلام

الغرض! آیت ذیل میں کے پہلے حصے کی تشریح گذشتہ درس میں پیش کر دی تھی جس میں  
دو چیزوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ والدین، قربتداروں •

یقینوں و یسینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ آج آیت کے دوسرے حصہ کا ذکر ہے۔ وَلَوْلَا رَحْمَةُ اللَّهِ لَفَسَّ فِي حُشْنًا اور کو لوگوں کے لیے اچھی بات، مفسرین کرام فرماتے ہیں: کہ کوئی فرد عام لوگوں کے ساتھ نہ بدنی نیکی کر سکتا ہے۔ اور نہ مالی نیکی کر سکتا ہے۔ ایسے افعال و عمدہ و لوگوں کے ساتھ ہی انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً والدین کی خدمت، مالی اور بدنی دونوں طریقوں سے کر سکتا ہے۔ اس طرح قرابتہ اردوں اور دوستوں کی مالی اعانت کر سکتا ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں عوام اناس کے لیے انجام دنیا ممکن نہیں ہوتی۔ چنانچہ اجتماعی نیکی حاصل کرنے کے لیے قَوْلُ الرَّحْمَنِ فِي حُشْنًا کا حکم دیا۔ کہ اگر تم بدنی اور مالی خدمت نہیں کر سکتے۔ تو عام لوگوں کو اچھی بات ہی کہہ دو۔

اچھی بات کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً حضور علیہ السلام فرماتے ہیں: جب آپس میں ملو۔ تو ایک دوسرے کو سلام کرو۔ اور پھر اچھا کلمان دو ہے جو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے۔ عَلٰی مَنْ عَرَفْتُمْ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفُوا جس کو پہچانتے ہو اس کو بھی سلام کرو۔ اور جس کو نہیں پہچانتے اس کو بھی سلام کرو۔ بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایتوں میں آتا ہے۔ کہ سلام جو ہے۔ یہ مِنْ خَيْرِ خَصَالٍ اَوْ يُعَايَنُ اَوْ قَالَ رَسُوْلُهُ اَيَّانَ كِي بَسْرَتِي خَسَلَتِي مِنْ سَعِيءٍ۔ یا دیا گیا سلام کی بترین خصلتوں میں سے۔ سلام کرنے کی حکمت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ ایسا کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں مقام عطا کرے گا جب کوئی سلام کرے تو اس کو اچھے طریقے سے جواب دو۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ رُدُّوْهُا سَلَامًا کا جواب دینے ہی لوٹا دیا اُس سے بستر لوٹاؤ۔ فرمایا اُرَاَيْتُمْ شَخْصًا تَمِيْسُ السَّلَامَ عَلَيْكُمْ کَمَا هُوَ تَوَقُّعُ سَعَرَتِ لُوْطًا اَوْ اَوْ كُوْ وَ عَلَیْكُمْ السَّلَامُ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَکَاتُہُ صِرَتِ السَّلَامُ عَلَیْكُمْ کہنے والے کو دس نیکیاں ملیں گی اور وَ عَلَیْكُمْ السَّلَامُ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَکَاتُہُ کہنے والے کو تیس نیکیاں حاصل ہوں گی۔

کسی کی نیکی کی طرف راہنمائی کرنا اور بڑائی سے روکنا یہ بھی حسن کلام میں داخل ہے جب

۱۔ تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۱۱ پر ما ۲۔ ترمذی ص ۲۸۵ ابو داؤد ص ۲۸۵ ۳۔ بخاری ص ۹۲ مسلم ص ۳۸

۴۔ بخاری ص ۹۲ مسلم ص ۳۸ ۵۔ ترمذی ص ۲۸۵ ابو داؤد ص ۲۸۵

دو ٹھکان آپس میں تو نرمی کے ساتھ نیکی کی دعوت دیں۔ آپس میں دوستی کا اظہار کریں۔ اور ایک دوسرے کی خیر و مافیت دریافت کریں۔ جب ایک مسلمان دوسرے کو پکارتے، تو اچھے لقب سے پکارے۔ قرآن پاک میں موجود ہے: وَلَا تَسْمُرُوا بِاللَّعَابِ ایک دوسرے کو بُرے القاب سے مت پکارو۔ یہ سب باتیں قول اللہ میں حُسنِ داخل ہیں۔

اسی طرح فرمایا کسی غیر حاضر بھائی کا ذکر کر دو اچھے طریقے سے کرو۔ اس کو برائی کیساتھ یاد نہ کرو۔ اگر کوئی مسلمان تم سے مشورہ طلب کرے۔ تو اس کو صحیح صحیح مشورہ دو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے: الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ جس سے مشورہ طلب کیا جائے اُسے امین سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ غلط مشورہ دے گا۔ تو خائن متصور ہو گا۔ اگر کسی کو دیکھو کہ وہ نادانستہ طور پر سڑات میں پڑا ہوا ہے۔ تو اُسے حُسنِ اخلاق کے ساتھ روکنے کی کوشش کرو۔ مگر اس سلسلے میں سختی نہیں کرنی چاہیے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ سختی اور نرمی دونوں اپنے اپنے مقام پر روا ہیں تبلیغ و تعلیم کے لئے وقت ہمیشہ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کیجئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجا۔ تو فرمایا: فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا اس سے نرم لہجے میں بات کرنا۔ لَعَلَّهُ يَظْهَرُ كُذُوبًا وَيُخَشِّي شَايِدًا کہ وہ نصیحت پکڑے یا اس کے دل میں خوف خدا پیدا ہو جائے۔ خود حضور علیہ السلام کے متعلق قرآن پاک نے بیان کیا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ نرم مزاجی میں نہ لوگوں کو سخت قف غلیظ القلب اگر آپ سخت مزاج ہوتے تو لافضولاً من حولہ نہ لوگ آپ کے ارد گرد سے پھر جاتے۔ کیونکہ سخت مزاج شخص سے لوگ دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آپ کو نرم مزاج بنایا۔ آپ کو حُسنِ کلام کی توفیق بخشی اور اس طرح لوگوں کو آپ کے گرد جمع کیا۔

جب کسی کے ساتھ بحث و تمحیص کی نوبت آجائے۔ تو فرمایا: ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ حَسَنٌ تو اچھے طریقے سے دفع کرو۔ مناظرے کے وقت بھی اخلاق کا دامن نہ چھوڑو۔ اخلاق سے گری



ہوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ نہ ہی کالی کھوج تیسرے نوبت پہنچی چاہیے۔ بلکہ نہایت احسن طریقے سے گفتگو ہونی چاہیے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد کرامی ہے مَا دَخَلَ الْوَفْقُ فِي شَيْءٍ إِلَّا دَانَهُ جِسْمٌ خَيْرٌ زَمِيٍّ أَمْسَ كِيٍّ۔ دوسرے زینت نختے کی۔ اور جس چیز میں شق آئے گی۔ وہ اسے غیب وار کر دیگی۔ (مَا دَخَلَ الْحَرَقُ فِي شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ)

فرمایا سر جگہ زری ہی سے ہر نہیں چلے گا۔ بلکہ بعض مقامات پر سختی کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً تفریق کے طور پر منظر مطلوب ہو یا جہاد میں کفار سے مقابلہ ہو تو دہاں پر سختی کرنا پڑے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو حکم دیا جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ آپ کافروں کے ساتھ جہاد کریں۔ وَخُلُوفُ عَلَيْهِمْ سَوْءٌ اور ان پر سختی کریں۔ کفار کے ساتھ جہاد تو راستہ ذریعہ ہوگا اور منافقوں کے ساتھ زبان طور پر۔ یعنی ان کے نفاق کو کھول کر بیان کریں تاکہ دوسرے مسلمان ان سے بچ سکیں۔ یہ درزن طریقے سختی کے ہیں۔

بیاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ زری ملحوظ رکھتے ہوئے۔ شریعت کی حدود کا بھی خیال رکھا جائے۔ زری بھی اس وقت تک ہی گوارا ہے۔ جب تک شریعت کی حدود کے اندر ہو۔ اگر ایسی زری برتنے سے شریعت کے اتباع میں فرق آتا ہو۔ تو ایسی زری جائز نہیں۔ اگر ایسا کرنے لگ جائیں گے۔ تو شریعت کے احکام پر عمل ناممکن ہو جائے گا۔ ایسی زری جس سے دین میں مہنت پیدا ہوتی ہو تو وہ حرام ہے

اہم ممبر باقرہ تَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ اس حُتًّا کا معنی یہ کرتے ہیں کہ لوگوں سے ایسی اہم بات کہو، جو تمہیں خود بھی پسند ہے۔ جو خود پسند نہیں کرتے وہ بات دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ فہمے ہیں کہ اچھی بات میں دعوت الی اللہ۔ دعوت الی التوحید۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شامل ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد الہی ہے: وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ طرز نیک عمل کرتا ہے اور زبان سے یوں کہتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار ہوں۔ گویا یہ سبکے آپس بات ہے۔ اسی کو فرمایا: قُولُوا لِلّٰہِ حُسْنًا  
 جب بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں مجنّد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ میں  
 دیا تو فرمایا: قُولُوا لِلّٰہِ لَآ اَنْ یَّہْدِیَ اللّٰہُ بَیْنَ رَجُلًا وَاحِدًا خَیْرٌ لَّکَ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ لَکَ  
 حُمْرَ النَّعَمِ۔ یعنی اے علی! اگر تمہاری وجہ سے ایک آدمی کو بھی ہدایت نصیب ہو جائے  
 تو یہ بات تمہارے لیے عمدہ قسم کے اونٹوں سے بہتر ہے۔ مقصد یہ کہ لڑائی اصل مقصود نہیں بلکہ  
 اس کے ذریعے اسلام کے راستے میں روپیش رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ یعنی "وَقَتْلُوهُمْ  
 حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِیْہُمْ فِئْیَۃٌ کُفْرًا" سے اس وقت تک جنگ کرو جب تک تمام فتنے فخر و برہان  
 گویا لوگوں کو ایمان کی رحمت دینا بھی قُولُوا لِلّٰہِ حُسْنًا میں داخل ہے۔

نماز اور زکوٰۃ

بنی اسرائیل کے عہد کا اگلا حصہ یہ تھا: اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَآتُوا الزَّکٰوۃَ۔ یعنی  
 نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ نماز بنی عبادت ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ نماز اَقْرَبُ الْعِبَادَاتِ  
 لِمُقَرَّبَۃٍ ہے۔ یعنی جو عبادت انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب تر کرنے والی ہے۔ ان  
 کی بنیاد اور جڑ نماز ہے۔ نماز کے ذریعے تعلق باللہ استوار ہوتا ہے۔ انسان دن میں پانچ مرتبہ اپنا  
 تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ نماز کو قائم کرو اس میں کوتاہی نہیں کی جائے  
 مالی عبادتوں میں زکوٰۃ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس میں پاکیزگی اور طہارت کا مفہوم  
 پایا جاتا ہے۔ زکوٰۃ بخل کو دور کر کے غبار اور ماسکین سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ جو کہ  
 تہذیب اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اتفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت قرآن پاک کی اس آیت  
 سے واضح ہوتی ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْتُمْ اُسْ  
 وقت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو۔ اور یہ مقصد زکوٰۃ سے  
 سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ مال کمانے اور اس کے خرچ کرنے میں حلال و حرام کی تمیز روا  
 رکھی جائے۔ اگر یہ تمیز اٹھ جائے تو ردعایت کیسے آئے گی۔ ہمارے ملک میں ساز و سامانی نظام  
 سرمایہ دارانہ ہے۔ جس میں سود کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سود کی موجودگی میں تقویٰ کیسے حاصل



وَلَا تَأْخُذْ بَاِمْشَاقِكُمْ لَا تَنْفِكُوْنَ بِمَاءِكُمْ وَلَا تَخَرُجُوْنَ  
 اَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرُرْكُمْ وَاَنْتُمْ تَتَشَفَّدُوْنَ  
 ۸۴) ثُمَّ اَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتَرْجُوْنَ  
 فَرِيْقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ تَظْهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِاَنْتُمْ  
 وَالْعُدُوْا اِنْ يَأْتُوْكُمْ اُسْرٰى تَقْتُلُوْهُمْ وَهُمْ مُحَرَّمٌ  
 عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ  
 بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ  
 فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَوْنٌ فِي الْعِزَّةِ يُرَدُّوْنَ اِلَى اَشَدِّ الْعَذَابِ  
 وَمَا لِلّٰهِ بِمَا فِىل عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۸۵) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُشْتُدُّ  
 الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يَخَفَتْ عَنْهُمْ الْعَذَابُ  
 وَلَا هُمْ يُنصَرُوْنَ ۸۶

ج

تس جبرہ اور اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے پختہ عمل دیا تھا۔ کہ آپس  
 میں خونریزی نہ کر دے گے۔ اور نہ ایک دوسرے کو اپنے شروں سے نکال دے۔ پھر تم  
 نے اقرار کیا۔ اور تم اس پر گواہ ہو ۸۴) پھر تم وہی ہو۔ جو ایک دوسرے  
 کو قتل کرتے ہو۔ اور نکالتے ہو تم ان کو وطنوں سے۔ تم چڑھائی کرتے ہو ان پر گناہ اور  
 زیادتی کے ساتھ۔ اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آئیں۔ تو نہ یہ دیکھو ان کو پھر لیتے  
 ہو۔ حالانکہ ان کا تھکانا بھی تم پر حرام ہے۔ کیا تم کتاب کے بعض حصے پر ایمان لائے  
 ہو۔ اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو۔ پس جو کوئی ایسا کرتا ہے تم میں سے۔ تو  
 اس کا بدلہ سوائے اس کے نہیں ہے۔ کہ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں سزا ہے۔  
 اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان باتوں

سے بے خبر نہیں ہے۔ جو تم کرتے ہو (۸۵) یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے میں خریدا ہے۔ پس ان سے عذاب جلا نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی (۸۶)

بنی اسرائیل کی غمہ نشینیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ اس سے پیشتر اس عہد کا بیان ہو چکا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اجتماعی حقوق اور انسانی حقوق سے متعلق بنی اسرائیل سے بذریعہ توراۃ لیا تھا۔ مگر انہوں نے اس عہد کو پورا بھی نہ کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ پھر چند آدمیوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے۔ اور تم تو اس امر حق کرنے والے ہی ہو۔

خون ناحق اور جلا وطنی بڑے گناہوں میں سے ہیں۔ ان دو باتوں سے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے توراۃ میں عہد لیا تھا۔ کہ ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ مگر یہ قوم اس عہد پر بھی قائم نہ رہی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ذَٰلِکُمْ فَاصِیَّتًا وَکُنُوْا جِبْمٌ لِّمَنۢ لَّمۡ یَکُنۡ بِہِمْ عٰہِدٌ یعنی اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہم مذہب اور اپنی ہی ملت والوں کا قتل ناحق نہیں کرو گے۔ جس طرح یہ حکم آج تک بائبل میں موجود ہے۔ یہی حکم قرآن پاک میں موجود ہے۔ آگے سورۃ نساء سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ فرقان میں آئے گا کہ ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ۔ یہ قطعی حرام ہے اور اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔

توراۃ میں دوسرا حکم یہ تھا وَلَا تَحْبِرْ جُؤُنَ الْفُسُکَہٗ قَبْرِ دِیَارِکُمْ یعنی تم اپنے ہم ملک لوگوں کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ مگر تم نے اس عہد کا بھی پاس نہ کیا۔ فریاضۃ اقراؤتہ یہ الفاظ توراۃ میں موجود ہیں کہ اے بنی اسرائیل! تم نے اقرار کیا کہ وعدہ کو یاد کریں گے۔ اور توراۃ کے حکام کی پابندی کریں گے۔ وَأَنْتُمْ فَشَّہَکُمْ دُؤُنَ اور تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ تم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا کہ تم اپنے بھائیوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہ ہی انہیں جلا وطن کر دو گے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! تم ان تمام توراتی وعدوں کے باوجود فَشَّہَکُمْ دُؤُنَ الْفُسُکَہٗ یہ تمہیں ہی ہوا جو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو

ناحق خون بہاتے ہو۔ وَتَحْرِجُونَ قُرُوفًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے بھی نکالتے ہو۔ یہی نہیں بلکہ تُظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْأَشْجِرِ وَالْعُدُوتِ ان پر چڑھائی کرتے ہو گناہ اور تعدی کے ساتھ کسی پر حملہ کرنا انہیں جالی اور مال نقصان پہنچانا گناہ بھی ہے۔ اور مظلوموں کے ساتھ زیادتی بھی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے گناہ کے مرتکب ہوئے۔ اور خلق خدا کے حقوق ضائع کر کے زیادتی کا ارتکاب کیا۔ یہ اتم اور مردان میں آتا ہے۔

فرمایا تمہاری عجیب ذہنیت ہے کہ جن لوگوں کو تم جلا وطن کرتے ہو وَأَنْ يَأْتُواكُمْ اسلوی جب یہی لوگ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے ہیں تَفْدُوهُمْ تم انہیں فدیہ دیکر چھڑا دیتے ہو۔ پہلے خود ہی انہیں گھروں سے نکال کر اور پھر ان کا معاملہ دیکر انہیں واپس لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَهُوَ مُحَرَّرٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ان کا جلا وطن کرنا ہی تم پر حرام تھا تمہیں ایسا کام کرنا ہی نہ چاہیے تھا جس کی وجہ سے تمہیں فدیہ کا مالی بوجھ بھی برداشت کرنا پڑا۔ دراصل بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں قیدیوں کی رہائی کی نصیحت کی تھی۔ اور یہ اچھی بات تھی مگر جہاں یہ لوگ اس حکم پر عمل کرتے تھے وہاں دوسرے در احکام یعنی قتل ناحق اور جلا وطنی کے معاملہ میں عمل نہیں کرتے تھے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا أَفْتَوْا مِنُونُ بَعْضُ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُ وَأَن يَبْعُثُوا کیا تم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کر دیتے ہو؟

فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں کہ جس حصے پر چاہیں عمل کریں۔ اور جس کو چاہیں چھوڑ دیں۔ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلْ ذَلِكَ مِنكُمْ تم میں سے ایسا کرنے والوں کا جزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ إِنَّا نَحْزَنُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا دنیا میں انکی جزا ذلت ہوگی۔ وَلَيُؤْتِيَنَّهُم بُرْءُونًا إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ اور قیامت کے روز سخت عذاب کی طرف رہائے جائیں گے۔ چنانچہ تاریخ شہد ہے کہ یہودیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ یہود بنو قریظہ، بنو نعیر اور خیبر واسے سب ذلیل و خوار ہو کر مغلوب ہوئے۔ بنو قریظہ سخت سازشی قسم کے لوگ تھے۔ ان کا شر بہت بُرا ہوا بعض قتل ہوئے اور بعض کو جلا وطن کیا گیا۔ اسی طرح قبیلہ بنو قینقاع والوں نے بھی ذلت و رسوائی کا منہ دیکھا۔ اس کا ذکر سورۃ حشر میں



تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تو ان کی زندگی میں مذاب ہوا۔ فرمایا آخرت کا مذاب تو سخت ترین ہوگا۔ اور یہ لوگ اس میں بھی مبتلا ہوئے۔

یہودیوں کی  
بامبی لڑائیاں

ان آیات میں یہودیوں کی جس بامبی جنگ و جدل اور جلا وطنی کا ذکر ہے۔ اس کے متعلق حضرت شیخ السنہ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ مدینہ کے دروازے قبیلے اوس اور خزرج تھے۔ جو اکثر آپس میں دستہ گریبان بستے تھے۔ ان کی آبادی ہزاروں کی تعداد میں تھی۔ جب مدینہ میں اسلام کی شمع روشن ہوئی تو انصار مدینہ کی اکثریت بھی انہیں در قبال میں سے تھی۔ اب بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حامی تھے۔ اور بنو نضیر قبیلہ خزرج کے طرفدار تھے۔ گویا یہودی اس طریقے سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے ان میں اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب ایک قبیلہ دوسرے پر غلبہ آتا، تو وہ مغلوب کو جلا وطن کر دیتا یا ان کو قتل کر دیتا اور ان کے مکانوں کو گرا دیتا۔ یہ سب ہم مذہب تھے۔ مگر دوسرے قبیلے کے ساتھ منکب ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے بانی دشمن تھے۔ پھر یہی لوگ جنہوں نے انہیں جلا وطن کیا تھا، ال اکٹھا کرتے اور ان کا معاوضہ ادا کر کے انہیں قید سے رہائی دلاتے۔ یہ لوگ قیدی کو پھڑانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ مگر کشت و خون اور جلا وطنی کے احکام کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مفسرین کرام مشرکین کی ایک دوسری لڑائی کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ جسے حرب بعاث کہا جاتا ہے۔ یہ لڑائی چالیس سال تک جاری رہی۔ اس لڑائی میں بھی یہودی مختلف گروہوں میں منقسم تھے۔ یہودیوں کا ایک قبیلہ ایک فرقہ جنگ کے ساتھ تھا۔ جب کہ دوسرا قبیلہ دوسرے کے ساتھ تھا۔ اس جنگ میں بھی یہودیوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ اگر کوئی ہم مذہب بھی سامنے آگیا تو اسے بھی مار ڈالتے تھے۔

امام ابن کثیرؒ نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مکان ایران کی طرف کسی جہاد میں مصروف تھے۔ اسلامی فوج میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ بھی شامل تھے۔ جو ایک یہودی عالم تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت سے مشرف کیا تھا۔ جب جہاد میں مکانوں

کرفع مائل ہوئی۔ تو بہت سے قیدی بھی لے آئے۔ جن میں دو یہودی بھی شامل تھے۔ جو کہ مجوسیوں کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں ایک یہودی عورت لڑائی میں کرنی۔ جسے حضرت عبداللہ بن سلامؑ نے نو تودہ ہم میں خرید لیا۔ جب آپ کوفہ میں واپس آئے۔ تو وہاں کے ایک مشہور و معروف یہودی، اس المجلوت سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے یہودی کو وہ لڑائی فرخت کرنے کی پیش کش کی۔ وہ رضامند ہو گیا۔ اور قیمت دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے سسے نو سو درہم میں خریدا ہے۔ مگر اب میں چار ہزار درہم سے کم پر نہیں دوں گا۔ پہلے تو اس المجلوت اتنی بڑی رقم لینے پر تیار نہ ہوا۔ پھر حضرت عبداللہ بن سلامؑ نے اس کے کان میں توراۃ کی وہی آیت پڑھی **وَإِنْ يَأْتِوكُمُ اسْرٰی تَغْنَمُ** یعنی جب تم مارا کوئی ہم مسلک قیدی بن کر آئے تو اسے چھڑا لو۔ یہ سُن کر یہودی مجبور ہو گیا۔ اور اُس نے چار ہزار کے بدلے میں ہی خریدنا منظور کر لیا۔ مگر حضرت عبداللہ بن سلامؑ نے دو ہزار درہم سے لیے اور باقی دو ہزار واپس کر دیے۔ اور اس طرح لڑائی اس کے پاس فرخت کر دی۔ معتبر کہ یہودی قیدیوں کو چھڑانے والے حکم پر سختی سے کاربند تھے۔ اگرچہ در سکرا احکام کی پروا نہیں کرتے تھے۔

مسلمانوں کی  
حالتِ ذل

یہودیوں کے جزوں ایمان کا جو نقشہ قرآن پاکؑ نے ان آیات میں کھینچا ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو آج کل مسلمانوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں۔ آج مسلمانوں کی حالت بھی یہی ہے۔ کہ قرآن پاکؑ کے کسی حصہ پر بیان لاتے ہیں۔ اور بعض احکام کو نہیں مانتے۔ اسی لیے تو دنیا میں رسوا ہوئے ہیں۔ غلامی سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے تہذیب مٹ جانے ہے۔ دیکھیے کابل والوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ افغانستان پر غیر کا قبضہ ہو چکا ہے۔ یہی حال اس سے پہلے بم قند اور بجی۔ کویت فلسطین میں کیا ہو رہا ہے۔ بکائیروں کو کون سی عزت نصیب ہو رہی ہے۔ یہ سب ذلت اور سوانی نہیں تو اور کیا ہے۔

دجبری ہے کہ مسلمانوں نے بھی یہودیوں کا طریقہ اختیار کیا۔ جو جہنم ان کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ اُسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ معاملہ نکاح و طلاق کا سو یا کسی نوعیت کا سو۔ اپنی مرضی کے مطابق عمل کر سکتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے قانون کی پروا نہیں کرتے۔ اسرائیل اور عقوبی کو فراموش کر دیا ہے۔

محسن انسانی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کا شرعی حدودوں سے مختلف نہیں۔  
 جب انگریزوں نے ہندوستان میں تسلط قائم کیا، تو انہوں نے مسلمانوں سے بھی پوچھا تھا کہ  
 تم اپنے ذاتی معاملات میں شرعی قوانین کا اطلاق چاہو گے۔ یا مقامی رواج کے مطابق اپنے مسائل کا حل  
 کرنا چاہو گے؟ یہ مسلمان ہیں جنہوں نے کھڑے کر دیے تھے کہ ہمیں شریعت کا قانون درشت منظور نہیں  
 ہے۔ ہمارا فیصلہ رواج کے مطابق کیا جائے۔ حالت آج بھی یہی ہے۔ دعویٰ یہی ہے کہ ہر قسم  
 قرآن و حدیث کو برحق مانتے ہیں۔ مگر ان کے احکام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ عبادت  
 تو تھوڑی بہت کر لیتے ہیں۔ مگر تعزیرات کے قانون پر کیوں عمل نہیں کرتے۔ جہاد جیسی اہم  
 چیز کو نہیں اپناتے۔ جس کے لیے قرآن و حدیث کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ حقیقت  
 یہ ہے کہ اس معاملہ میں یہودی اور مسلمان برابر ہیں۔ نہ ان کا اپنی شریعت پر عمل ہے۔ اور نہ مسلمانوں  
 کو احکام کا پاس ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی دروغی کا نتیجہ سوائے تباہی و بربادی کے اور کیا ہو گا۔  
 فرمایا وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اُس سے  
 غافل نہیں ہے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں میں مخفی  
 ارادوں تک سے واقف ہے۔ اُس لیے وہ اسی کے مطابق جزائے گا۔ جب خدا تعالیٰ کی  
 گرفت آئے گی۔ تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيٰوةَ  
 الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے آخرت کی دائمی زندگی کے  
 بدلے دنیا کی عارضی اور حقیر زندگی کو خرید لیا ہے۔ اُس لیے لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ جب وہ عذاب میں  
 جکڑے جائیں گے فَلَا يَخَفُّ عَنْهُمْ الْعَذَابُ تو پھر ان کے عذاب میں تخفیف  
 بھی نہیں ہو گی وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ اور نہ ہی کسی طرف سے انہیں امداد پہنچ سکے گی۔

اللہ تعالیٰ  
 عالم غیب ہے

الْعَمَاءُ

درستی و درستی

البقرة ۲

(آیت ۸۷-۹۰)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَفَعَلْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا  
 عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ  
 رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمْ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِقْنَا كَذِبُكُمْ  
 وَفَرِقْنَا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ  
 بِكُفْرِهِمْ هُمْ نَقَلُوا مَا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمْ  
 كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ  
 يَسْتَفْهِمُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ أَفْلَحُوا هُمْ هُمْ عَرَفُوا  
 كَذِبَ آيَاتِهِ فَطَعَنَهُ اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾ بِسْمَا أَشْرُوا بِهِ  
 أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَقِيًّا أَنْ يُنَزَّلَ اللَّهُ  
 مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُ وَبِغَضَبٍ عَلَى  
 غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿٩٠﴾

ترجمہ: اور اب اسے تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اور ہم نے ان کے  
 پیچھے بہت سے رسول بھیجے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بیانات و واضح اور کھلی باتیں  
 دیں۔ اور ہم نے ان کو پاک روح کے ساتھ تائید کی۔ کیا جب بھی تمہارے پاس رسول  
 کوئی ایسی چیز لے کر آیا، جسے تمہارے نفس نہیں چاہتے تھے، تو تم نے غم کیا پس  
 ایک فرقہ کو تمہارے مٹا دیا، اور ایک کو قتل کر دیا ﴿۸۷﴾ اور انہوں نے کہا: ہمارے  
 دل غلافوں میں ہیں۔ نہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے۔ ان کے کفر کی وجہ سے  
 پس بہت تھوڑے ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ  
 کی کتاب آئی، اس چیز کی تصدیق کرنے والی، جو ان کے پاس ہے۔ اور اس سے  
 پہلے وہ کافروں پر فتح مانتے تھے۔ اور جب ان کے پاس وہ چیز آئی، جسے

انہوں نے پہچان لیا تو اس کے ساتھ کھڑا کیا، پس کھڑے کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے (۸۹) وہ بری چیز ہے جس نے بڑے انہوں نے اپنی سنوں کو بچا ہے۔ کہ کھڑے کرتے ہیں اس چیز پر جس کو اللہ نے تار ہے۔ سرکشی کرتے ہیں اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ پناہ سے بندوں میں سے جس پر چاہے تار ہے۔

پس یہ لوگ غضب پر غضب سے کھڑے ہوئے اور کافروں کے لیے ذلت ناک خدایہ (۹۰)

اس سے پہلے بنی اسرائیل کے فحش حصہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ جن کی پابندی کرنے کا تبار رسول

سے یہ قوم قاصر رہی۔ اب بعض دوسرے نفات کا ذکر ہو رہا ہے۔ جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے کیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ مجھ ان نفات کے ایک یہ بھی تھا کہ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ یعنی بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تورات عطا فرمائی تاکہ بنی اسرائیل اس کے ذریعے ہدایت اور راہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور پھر یہ صرف کتاب پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ کتاب میں مذکور احکام کی یاد دہانی کے لیے وَقَفْتُ مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد پہلے درپے رسول بھیجے۔ جو تورات کی تعلیم کو تبلیغ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر کا مبعوث ہونا بنی نوع انسان پر اللہ تعالیٰ کا خاص مہربانی اور شفقت ہے۔ انبیاء علیہم السلام لوگوں کی مشکلات کا حل پیش کرتے ہیں۔ اور ان کی راہنمائی فرماتے ہیں جنہیں موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس قدر پیغمبر بھیجے ان میں سے بعض کا نام بھی قرآن پاک نے ذکر کیا ہے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام سلیمان علیہ السلام یونس علیہ السلام زکریا علیہ السلام یحییٰ علیہ السلام اور پھر سلسلہ بنی اسرائیل کے آخری رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اسی طرح تورات اور یہودیوں کی دھڑکب میں بھی بہت سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر ملتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ مجموعی طور پر تقریباً چار پیغمبر بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے سلسلہ بنی اسرائیل کے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ اب صاحب کتاب در اللہ تعالیٰ کے عظیم المہرت رسول میں چنانچہ آپ کے معلق ارشاد تو ماسبہ

وَتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيْتَاتِ اور ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عطا  
کیں۔ اور ان سے مراد وہ معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے۔ اور جو قرآن پاک میں مذکور  
ہیں مثلاً مڑوں کو زندہ کرنا، کوڑی کو تہہ بست کر دینا۔ اور مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارنا اور  
اُسے ہوا میں اڑا دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ قیامت سے احکام اور دلائل بھی مراد لیا جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ  
نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کام چابی دیے تھے اور دلائل بھی دیے تھے۔

عیسیٰ خبری زبان کا لفظ ہے۔ عیسیٰ۔ یسوع یا یسوع کا معنی مبارک ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ  
کی والدہ کا نام مریم رضی اللہ عنہا تھا۔ آپ کی نالی نے تدریسی معنی کہ اگر اللہ تعالیٰ اُسے عطا  
کر لیا۔ تو وہ اُسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقت کر دیگی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ اُس نے  
بیٹے کی بجائے بیٹی عطا کی۔ آپ کو پیشانی لاحق ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں بیٹی  
عطا کی ہے۔ ہم نے اُسے بہت برگزیدہ اور پاکیزہ بنایا ہے۔ بیٹا اس کی برابری نہیں کر سکتا۔  
حضرت مریمؑ کی فضیلت اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں بیان فرمائی ہے: يٰعَسَىٰ  
اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی اے  
مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا۔ اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھے برتری عطا کی۔  
یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوگا۔ عموماً عیسیٰ ابن  
مریم کا نام ہوگا۔ آگے سورۃ مائدہ میں آئے گا۔ کہ آپ کے خواری بھی آپ کو عیسیٰ ابن مریم کے  
نام سے جانتے تھے، اور اسی نام سے خطاب کرتے تھے۔ وہ ابن اللہ کے نام سے یاد نہیں  
کرتے۔ نہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود خدا تصور کرتے تھے۔ بلکہ یہ غلط عقیدہ تو بعد میں ایک  
عیسائی پادری پولس کا پیدا کردہ ہے۔ کہ حضرت مسیح علیہ السلام خود خدا، خدا کے بیٹے یا تینوں  
میں سے تیسرے ہیں۔ یہ بالکل کفریہ عقیدہ ہے۔

روح القدس

فرمایا ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عنایت کیں۔ اور اس کے ساتھ  
وَاٰتَيْنَاهُ الْبُحْرٰی الْفُجْدٰی اس کی تائید مجھے پاک روح سے کی۔ مفسرین کرام فرماتے  
ہیں کہ روح القدس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ یعنی ہم نے جبرائیلؑ کے ذریعے حضرت  
عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی۔ اس بات کی تائید قرآن پاک کے دوسرے مقام پر بھی ہوتی ہے۔





ذکر تہا ہے جنہیں اسرائیلیوں نے قتل کیا۔ کیونکہ وہ ان کی مرضی کے خلاف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے تھے۔ جو بنی اسرائیل کے نواقض نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک لوگ غنائی خواہشات کی اتباع اور مذہبی قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں گے، انہیں فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ الغرض! اسرائیلیوں میں یہ دو بیماریاں یعنی اتباع خواہشات اور تکبر پائی جاتی تھیں۔ جن کی وجہ سے انہوں نے بعض نبیوں کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا۔

یہودیوں کو ایک اور غلط ذمہ تھا۔ کہ وہ صاحب علم ہیں۔ ان پر کسی بیرونی تبلیغ کا اثر نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک کے الفاظ میں ان کا دعوے تھا وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَبِّئَانَا غُلْفًا کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں، یہ ان کی خود ساختہ نشی تھی۔ کہ صاحب کتاب ہونے کی وجہ سے وہ ہر قسم کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لہذا وہ اپنے دین پر پختہ ہیں۔ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں کر سکتا۔ مقصد یہ کہ جس طرح غلاف میں بند کوئی چیز بیرونی اثرات اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے دل بھی غلاف میں بند ہیں۔ اور ان کے اعتقاد میں کہ وہ دین میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہیں کیا جاتا۔ ان کا یہ نظریہ واقعی بلند پایہ تھا۔ بشرطیکہ ان کے پاس صحیح علم ہوتا، ان کے عقائد درست ہوتے اور وہ اپنے صحیح دین کو محفوظ کر سکتے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ تو خود اپنا دین بگاڑ پکے تھے۔ غلط عقائد اختیار کر چکے تھے اور پھر ان پر الزام کرتے تھے۔ جب بھی ان کے پاس حق بات ملے کہ انجیل علیہم السلام آئے۔ وہ اسیں جھٹلاہٹ یا قتل کر دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ ان کے دل محفوظ ہیں۔ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ حَذَرًا۔ مسواں کے گھر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے۔ اور انہیں اپنی رستہ سے روک دیا ہے۔ ان کے قلب مُحَوَّلُونَ ہو چکے ہیں۔ اور فہم الٹ کے ہیں۔ یہ حق بات کو نہ سمجھتے۔ یہی وجہ ہے فَقِيلَ مَا يَكُونُ مَسِيرًا۔ ان کی بہت قلیل تعداد ایمان لائی ہے۔ سورۃ مذہب میں کسی چیز کو فرمایا وَأَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ یعنی تم میں سے اکثر نیک نہیں ہیں۔ اگرچہ سب کے سامنے تافران نہیں تھے۔ مگر انہیں اللہ تعالیٰ نے نہیں چھوڑا۔ لَيْسُوا سَوَاءً مگر اکثریت طعون ہی تھی۔ ایمان کی بدولت چننے والوں کے پاس

یہودیوں کا  
ذمہ باطل

یہودیوں پر اللہ تعالیٰ  
کی لعنت

یہودیوں اور  
نزول قرآن

یہ تذکرہ تو یہودی کی اپنی کتاب تورات کا تھا کہ انہوں نے اس کے احکام کو اس مذہب پابندی  
کی۔ اب اس بات کا بیان ہے کہ جب قرآن پاک کا نزول ہوا تو اس کے یہودیوں نے  
کیا رویہ اختیار کیا۔ ارشاد ہوا ہے۔ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِندِ رَبِّهِمْ تَحْتِ  
کِی طَرَفٍ سَتَانِ کَے پاس وہ کتاب آگئی۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ جَوْنِ کتابوں کی تصدیق  
کرتی ہے۔ جو ان کے پاس موجود ہیں۔ مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے۔ اور سابقہ کتاب  
میں زبور، تورات، انجیل اور دیگر صحائف کا یہ ہیں۔ یعنی جب قرآن پاک نازل ہوا، کفر کو واپس  
تو بنی اسرائیل نے اس کا بھی انکار کر دیا۔ یہ قرآن پاک ان کے پاس موجود سابقہ کتابوں کی حقیقت  
کر رہا ہے۔

فَقَدْ كَفَرُوا بِهٖ بَعْدَ مِیٔتٍ ۚ اَتَاہُمْ سِتْرٌ ۚ یُؤْمِنُوْنَ ۚ اٰیۡہِ  
وہ بات کا ذکر ہے۔ وَكَانَ مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیۡنَ كَفَرُوْۤا ۚ یعنی  
نزول قرآن سے پہلے وہ کفار پہ فتح مانگتے تھے۔ مغربین کہتے ہیں کہ کُفَرُوْۤا یعنی  
کیے ہیں۔ فتح کے معنی کھولنے کے ہوتے ہیں۔ تو اس کا درست تفسیر یہ ہے۔ بنی اسرائیل  
کفار پر اس بات کو کھولتے تھے۔ یعنی بیان کرتے تھے کہ تمہاری بنی اور اللہ تعالیٰ کی کتاب آنے  
والی ہے۔ اُس پر بیان دنا۔ سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ الَّذِیۡنَ یُحٰدِثُوْنَ ذٰلِکَ مَكْتُوْبًا  
عِنْدَہُمْ فِیۡ نُوْرٍ ۙ وَ اِذْ یُخِیْلُ ۙ یعنی وہ اپنی کتابوں تورات اور انجیل میں سے جو  
پاتے تھے۔ کہ کفری بنی آنے والے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے قصہ میں بھی بشارت ہے  
کہ میں تمہارے میں آتی بنی بھیجوں گا۔

یَسْتَفْتِحُوْنَ کا دوسرا معنی فتح یا کامیابی ہے۔ مغربین کو امہ بیان کرتے ہیں کہ یہ  
لوگ اللہ تعالیٰ سے کافروں کے مقابلے میں فتح یا کامیابی طلب کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے۔  
یا اللہ ہمیں اس آئے نبی کی برکت سے کافروں کے مقابلے میں فتح نصیب فرما۔  
تاکہ جب وہ نبی آئے تو ہم اس کی اتباع کر سکیں۔ گویا بنی آخر الزماں کے ترسل سے مانگتے تھے

نظریہ توسل

نظریہ توسل جمائے مذہب میں بھی روا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے کی برکت سے یا اس کے طفیل سے کوئی دعا مانگی جائے اس میں کوئی عوج نہیں۔ کیونکہ مانجی تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ صاحب وسیلہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے اس نے ہمیں راہ راست کی تعلیم دی ہے۔ ہمیں اس سے محبت ہے۔ لہٰذا اس کے طفیل یا اس کی برکت سے خدا تعالیٰ ہماری دعا قبول کرے۔ ہاں شرک اس وقت ہوگا جب اس کے توسل کی بجائے خود اسی سے مانگنے لگے یا اس کو مشرکوں کی طرح شمع سمجھے یا اس کو مختار مطلق سمجھے کہ اسے دعا کے قبول کرنے یا کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

بہر حال پہلے تو یہ لوگ اس قسم کی دعائیں مانگتے تھے۔ اور وعدہ کرتے تھے کہ آئندہ نبی پر ایمان لائیں گے۔ فَلَمَّا جَاءَهُمْ پس جب وہ چیز آگئی جس کے وہ منتظر تھے۔ مَا عَرَفُوا اور اسے انہوں نے پہچان بھی یا کفر و آپہ اس کے باوجود اس کا انکار کر دیا ان کی اس بیٹ و صرمی اور کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْعَنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ایسے منکرین پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

نبی آخر الزمان  
صلی اللہ علیہ وسلم  
سے نہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان ظالموں نے ایسی بڑی عداوت کر کے کیا کہ یہ۔ بِشْمَا اسْتَقُوا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ انہوں نے نہایت ہی بڑی چیز کے بدلے اپنی جانوں کو بیچا وہ کون سی چیز ہے جو انہوں نے جان کے بدلے خریدی اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب، شریعت اور وحی کا انکار کر دیا۔ اور یہ محض اس لیے بغی و شرارت کرتے ہوئے۔ کہ نبی آخر الزمان دوسری قوم میں کیوں آگیا۔ وہ تو ہماری قوم بنی اسرائیل میں آنا چاہیے تھا۔ وہ بنو اسماعیل میں کیسے آگیا۔ چنانچہ قرآن پاک نے جگہ جگہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہاں کہاں کہ ہے کہ آخری نبی ضرور بنی اسرائیل میں آئے گا۔ فرمایا حقیقت یہ ہے اَنْ يُّنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ اللہ تعالیٰ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ اتار دیتا ہے۔ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی بھیجے۔ مگر نبی آخر الزمان کی بعثت بنی اسماعیل میں مقدر ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ وہیں تشریف لائے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے آخری نبی کا کوئی وعدہ نہیں کر رکھا تھا۔ اب جب کہ آخری نبی آگئے ہیں۔ تو بنی اسرائیل کا

فرمنا تھا کہ وہ اسے سینے سے باطن تک سمجھتے ہوئے اس پر ایمان لاتے اور ان کا اتباع کرتے۔ اس کے برخلاف انہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا اور اپنے خاندانی تفوق کا دم بھرنے لگے، جو ان کے لیے مناسب نہ تھا۔

بنی اسرائیل کی سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ **فَبَاءَدُ وَبَغَضِبٍ عَلَى غَضَبٍ** وہ غضب پر غضب لے کر روٹے۔ ان کا پہلا غضب تو یہ تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ بادشاہ نے انہیں سولی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ منہ پر پتھر کا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو معاذ اللہ و **قَالَ كَلَّا** انہیں یہ اپنی پائی کتب کا دیہ میں تحریف کا ارتکاب کیا۔ اور جیلے بانوں سے خدائی احکام کو مٹا دیا۔ اور پھر اس غضب پر دوسرا غضب یہ تھا کہ جب بنی آخر الزمان علیہ السلام تشریف لائے اور آخری کتاب نازل ہوئی تو ان کا انکار کر دیا۔ یہ گویا غضب پر غضب ہو گیا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **الْيَهُودُ مَغْضُوبٌ وَالنَّصَارَى مَذَلَّةٌ** یعنی یہود مغضوب علیہ ہیں اور نہ ماری گمراہ۔

مغضوب اُسے کہتے ہیں جو دیدہ دانستہ احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ آج کا مسلمان بھی جانتا ہے کہ شریعت برحق ہے۔ مگر اس پر عمل نہیں کرتا۔ یہی خرابی بنی اسرائیل میں بھی پائی جاتی تھی۔ وہ پہچانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور یہ آخری نبی اور آخری کتاب ہے۔ مگر ایمان نہیں لانے۔ علاوہ ازیں **مُضِلَّ** وہ ہے جسکے فہم میں خرابی آجائے۔ اور وہ جھٹک جائے۔ **نَصَارَى مُضِلَّ** میں یہ غلطی کرنے والے ہیں۔ **فَرَاوْا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ** یاد رکھو! انکار کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں دردناک عذاب تیار ہے اگر اس عذاب سے بچنا ہے تو آج بھی راہِ راست پر آجاؤ۔ ورنہ وہ تو تمہارے متہ میں ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ یہودیوں کے حالات منکشف کر کے مسلمانوں کو بھی تنبیہ کر رہا ہے۔ کہ تم بھی یہودیوں کی روش اختیار نہ کر لینا۔ بلکہ ان کی خرابیوں کا ذکر سن کر اپنی اصلاح کر لینا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا تَوُفُّ مِنْ بِنَا أَنْزَلَ  
 عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَدَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ  
 قَدْ قِيمَ ثَقَنُوتُ نَبِيِّ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ  
 ⑨۱ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَى بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اخْتَلَفْتُمْ إِلَيْهِ مِنْ  
 أَمْسِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ⑨۲ وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا  
 فَوْقَكُمْ الطُّورَ اخْذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا  
 وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ  
 بِسْمَايَا مُرْكُمُ بِهِ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ⑨۳ قُلْ  
 إِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ  
 النَّاسِ فَمَتَمَنُوا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ⑨۴ وَلَنْ  
 يَتَمَنَّوهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ  
 ⑨۵ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاتِهِ وَمِنَ الَّذِينَ  
 أَشْرَكُوا يَوْمَ أَحَدُهُمْ تَوَيْعَمَرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ  
 بِمُرْجَحِزٍ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا  
 يَعْمَلُونَ ⑨۶

مع  
 الذی  
 یزید  
 فی  
 العزیز

تو جبرہ اور جب ان راہل کتاب سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس  
 چیز پر جس کو اللہ تعالیٰ نے اتا رہے۔ (یعنی قرآن) تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس چیز  
 پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی۔ (یعنی توراۃ) اور اس کے سوا  
 کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ برحق ہے۔ اور تصدیق کرنے والے ہیں اس کی جو  
 ان کے پاس ہے۔ آپ فرمادیکھئے، پس تم کیوں قتل کرتے تھے اللہ تعالیٰ



کے خیال کو اس سے پہلے اگر تم ایمان دے ہو (۹۱) البتہ تحقیق تمہارے پاس  
 موسیٰ (علیہ السلام) کبھی نشانیاں نہ آئے۔ پھر اس کے بعد تم نے کچھ بڑے کو معبود بنالیا۔  
 اور تم ظلم کرنے والے تھے (۹۲) اور جب ہم نے تم سے پختہ عمل لیا۔ اللہ ہم نے  
 تمہارے ذور کو وہ طور کو اٹھایا۔ غرر جو ہم نے دیا ہے تم کو مضبوطی کے ساتھ اور سنو۔  
 سنو نے کہا کہ ہم نے سنا اور نہ مانا اور ان کے دو درجہ کچھ بڑے کی محبت پڑی  
 گئی ان کے کوئی رحمت۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ بھی ات ہے جس کے لیے تمہارا  
 ایمان تمہیں حکم دیتا ہے۔ اگر تم ایمان دے ہو (۹۳) آپ فرم دیجئے کہ اگر اللہ  
 کے نزدیک موت کا ٹھکانہ ہو تو لوگوں کے سوا صرف تمہارے لیے خالص ہے  
 پس تم موت نہ مارتے اگر تم چتے ہو (۹۴) اور وہ اس موت کی ہرگز تمنا نہیں  
 لیں گے کبھی بھی۔ اس رحمت کہ جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ  
 تعالیٰ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو (۹۵) اور البتہ تم ان لوگوں کو زندگی پر  
 زیادہ عرصے پادے لوگوں سے بھی اور ان سے بھی زیادہ عرصے جنہوں نے شرک  
 کیا ان میں سے ہر کوئی پسند کرتا ہے کہ اسے ہزار سال عمر دے دی جائے۔ حالانکہ  
 عمر اسے خدا کے غضب سے دور کرنے والی نہیں ہے اگر اس کو اتنی عمر دے  
 دی جائے۔ اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ یہ کام کرتے ہیں (۹۶)

گزشتہ پیر

یودیوں کی قباحتیں اور ان کی سزائیں بیان ہو رہی ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں  
 یودیوں کی بازیوں اور ان کے کفر پر اصرار کا ذکر تھا۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ غلام البینین صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی آمد سے پہلے یودی ان کے منتظر تھے کہ جب وہ بنی آخر الزمان آئے گا۔ تو اس کا ساتھ دیں  
 گے۔ یودی لوگ آپ کی بکت سے شرمین پر غلبہ حاصل کرنے کی تم بھی کرتے تھے۔ اور اس کے  
 لیے دعائیں بھی کرتے تھے۔ مگر جب وہ رسول آیا جس کا انتظار تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی آفندی نہ آ  
 بھی آگئی۔ وہ ان لوگوں نے پہچان بھی لیا، تو پھر انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے دوبرے غضب  
 میں مبتلا ہونے۔

ان آیات میں بھی یودیوں کی ہٹ دھرمی کا ذکر ہے۔ البتہ یہاں ان کو قرآن پاک دعوت بیان

اور ایمان کی دعوت دے گا۔ ارشاد مولا سب وَاِذَا قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ  
 جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ۔ جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ یعنی قرآن پاک  
 کو اللہ تعالیٰ کی فرستادہ کتاب تسلیم کرو۔ قَالُوْا نُوْمِنُ بِمَا اَنْزَلَ عَلَيْنَا اِنْ كُنَّا عَرٰبٍ  
 ہوتے نہ تھے تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی ہے۔ یعنی توراہ۔ کہتے ہیں کہ ہم  
 تو صرف توراہ کو ماننے میں دیکھتے ہیں بِمَا دَرَّوْا اِلَيْهِ اس کے علاوہ ہر چیز کا انکار کر دیتے ہیں۔  
 مَا نَحْنُ وَهٗوَ الْحَقُّ قُرْآنِ پاک برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور مُصَدِّقًا لِّمَا  
 مَعَهُمْ جو کچھ ان کے پاس ہے۔ یعنی توراہ۔ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا  
 توراہ پر ایمان لانے کا دعوے بھی جھوٹا ہے۔ اگر ان بدعوتوں کا توراہ پر ایمان ہوتا تو یہ حضرت  
 عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لگتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ لہذا  
 یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ جب تک کوئی فرد یا قوم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تمام کتابوں  
 پر ایمان نہیں دے گی اور وہ مومن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تمام کتب سماویہ کی بنیادی تعلیم تو ایک ہی ہے  
 یعنی ایمانیات اور عبادت کے معاملہ میں تمام کتابیں ساری میں شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّیْنِ  
 مَا وَصَّی بِہٖ نُوْحًا یعنی تمہارے لیے بھی وہی دین مقرر کیا گیا ہے۔ جو حضرت نوح علیہ السلام  
 اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ہاں البتہ مختلف زمان و مکان کے  
 لحاظ سے شریعت میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہے۔ جیسے فرمایا: بِکُلِّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ  
 شَرْعًا وَرِیَاسًا

قتل نبی  
 علیہم السلام

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے جھوٹے ہونے کی ایک اور دلیل بیان فرمائی ہے۔  
 ان سے پوچھے کہ اگر توراہ پر تمہارا ایمان ہے قُلْ فَلِمَ قَتَلُوْا اَنْبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ  
 قَبْلُ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ تو تم نے اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا  
 ہے۔ قبل انبیاء علیہم السلام تمہاری کون سی کتاب جائز قرار دیتی ہے۔ یہ تو میری کتاب ہے  
 اظہار کی بات یہ ہے کہ بعد میں آنے والے بنی اسرائیل قتل انبیاء اپنے اباؤں پر فخر  
 کرتے تھے۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر ایسا کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ اپنے نبیوں کے

جرم میں تم بھی شریک ہو۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت یہودی جی سینے  
 اباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے دہشتے تھے۔  
 اس سلسلہ میں مدینہ کے یہودیوں نے کتنی سازشیں کیں۔ حتیٰ کہ حضور علیہ السلام کو زہر بھی دیا گیا۔ اسی  
 لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا تمنا: دعویٰ ہے کہ تورہ پر تمنا: ایمان ہے۔ اگرچہ یہ بتاؤ کہ قتل  
 انبیاء علیہم السلام تورہ میں کیا ہے۔ تمنا: دعوت ایمان باطل ہے۔ اگر تم ایمان دالے ہو  
 تو قتل انبیاء علیہم السلام میں کیوں موٹا ہوتے ہیں۔

فرمایا تمنا: یہ دعویٰ درست نہیں کہ تورہ پر ایمان رکھتے ہو اس کا ثبوت یہ ہے کہ وَلَقَدْ  
 جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ إِنَّكَ كَرِيمٌ  
 تَقَرُّمُ ان پر ایمان لائے کہجئے۔ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا  
 بَاطِلًا پھر تم نے جو تم پر بھی شرک تھا جو تمہارا آسمانی کتابوں کے مطابق گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے  
 وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ اور تم یا تمنا: سے اباؤ اجداد ظلم کرنے والے تھے۔

دیکھو! تم نے بار بار وعدہ کیا کہ تورہ: از خود شریعت کا مطالبہ کیا اور پھر جب قانون تمہارے پاس آیا تو جیسے ممانے گئے  
 ٹانپا ہا اور کر دیا کہ اس پھل ٹھک نہیں۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ وَلَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ  
 اور جب ہم نے تم سے پختہ ہو گیا۔ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمْ الطُّورَ اور تمہارے سروں پر کوہ طور  
 کو معلق کر دیا۔ اور حکم دیا خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا جو کچھ ہم عطا کر رہے ہیں  
 اُسے مضبوطی سے ختم لو اور سنو۔ یعنی اس پر کما حقہ عمل کرو۔ مگر تم نے اُن ہی جواب دیا فَالْوَا  
 سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا بظاہر تو عمل کا وعدہ کیا۔ مگر باطن میں کہا کہ سمعنا سن لیا مگر ہم نے  
 اُسے تسلیم نہیں کیا۔ یعنی زبان سے اقرار تو کرتے ہیں۔ مگر ہم سے اس پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اسی  
 وجہ یہ بھی وَأَشْرِكُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ان کے دلوں میں پھرے کی  
 محبت پھر کر چلی گئی یہ ان کے کفر کی وجہ تھا کہ وہ شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ لہذا انہیں  
 یہ دعویٰ کہ تورہ کو منستے ہیں۔ غلط ہے۔

فرمایا قُلْ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمائیے بِشْمَا يَا مُرْكُمُ سَبَّ  
 بِضَانُكُمْ دوست ہی بڑی چیز ہے جس کے لیے تمنا: ایمان تمہیں حکم دیا ہے۔

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم واقعی مومن ہو۔ اور محمد کو سالہ پرستی بھی کرتے ہو۔ یہ تو بہت ہی  
 بری بات ہے۔ ظاہر ہے کہ خالص ایمان بھی قتل انبیاء علیہم السلام کا حکم نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی  
 پھر اسے کی پرستش پر آمادہ کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن پر مبنی ایمان ہی نہیں ہے۔ ورنہ  
 اس قسم کی بڑی حرکات کے مرتکب نہ ہوتے۔

موت کی آرزو

پہلے آیت گزشتہ ہے۔ اور آگے بھی آئی۔ یہود و نصاریٰ دونوں اس زعم باطل میں مبتلا  
 تھے کہ جنت صرف انہیں کے لیے مخصوص ہوئی ہے۔ کوئی دوسری قوم اس میں داخل نہیں  
 ہوگی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ رَاۤءِ مَنْ كَانَ هُودًا  
 اَوْ نَصْرٰی اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ لَكُمْ  
 الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ الْاٰوَّلٰی لَیْسَ لِبَنیٓ اٰدَمَ اِلٰهٍ اِلَّا هُوَ اَلَّذِیْ  
 اللہ تعالیٰ کے نزدیک آخرت کا ٹھکانہ محض تمہارے ہی لیے ہے۔ تمہارا یہ یقین ہے کہ تم  
 ضرور جنت میں جاؤ گے۔ فَتَمَتُّوْا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ تو پھر ذرا موت  
 کی تمنا کرو۔ تمہاری سچائی کا پتا چل جائے گا۔ ظاہر ہے جسے آخرت میں اپنی کامیابی کا یقین  
 ہوگا۔ وہ تو چاہے گا کہ کب موت آئے اور کب وہ دائمی آرام و راحت سے مستفید ہو۔ البتہ  
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سب ان کے زبانی دعوے ہیں۔ کہ ہم جنتی ہیں۔ جنت میں پہنچنے کے  
 لیے جس ذریعہ یعنی موت کی ضرورت ہے۔ اس کی کبھی تمنا نہیں کریں گے۔ وَلٰكِنْ يَتَمَنَّوْنَ  
 اَبَدًا لِّیَكُوْنُوْا فِیْهَا وَہ جنت میں رہیں۔ کہ یہاں پر وہ کس قسم کی کرتوتیں کر رہے ہیں۔ بِمَا قَدْ مَتَّ  
 اَبَدًا لِّیَكُوْنُوْا ان کے ہاتھوں نے آگے کیا بھیجے ہے۔ اگر اپنی کامیابی پر انہیں یقین ہوتا تو  
 ضرور موت کی تمنا کرتے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ لہ تعالیٰ  
 ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ کہ یہ کیا ظہر کر رہے ہیں۔ اور ان کے باطن میں کیا پڑ رہا ہے۔  
 حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن پاک کو چھیڑیں  
 کر کے جھوٹا موت بھی موت کی تمنا کر بیٹھتے تو ہلاک ہو جاتے۔ اس لیے انہوں نے ایسا نہیں







قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ  
 اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ  
 ۹۷ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ  
 فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ۹۸ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ  
 وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۹۹ أَوُكَلِّمًا عَهْدًا وَعَهْدًا تَبْذُرُ  
 فَرِيقٌ مِنْهُمْ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۱۰۰ وَلَمَّا جَاءَهُمْ  
 رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ نَبَأَ فَرِيقٌ مِنَ  
 الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ أَنَّ كُتِبَ اللَّهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَانَهُمْ  
 لَا يَعْلَمُونَ ۱۰۱

تو جیسے آپ کہہ دیجئے جو شخص جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے۔ پس بے شک یہ  
 (قرآن پاک) اُسی نے آپ کے دل پر نازل کیا، اللہ کے حکم سے یہ نصیحت کرنے  
 والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے ہیں۔ اور یہ اہل ایمان کے لیے ہدایت  
 اور خوشخبری ہے ۹۷ جو شخص دشمن ہو، اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے  
 رسولوں کا اور جبرائیل کا اور میکائیل کا۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ کافروں کے ساتھ  
 دشمنی رکھنے والا ہے ۹۸ اور ابہر تحقیق ہم نے آپ کی طرف واضح نشانیاں نازل  
 کیں۔ اور اس کے ساتھ نہیں کفر کرتے مگر افران لول ۹۹ کیا جب بھی انہوں نے  
 کوئی عہد کیا۔ اس کو ان میں سے ایک گروہ نے عیناً دیا۔ بلکہ ان میں سے اکثر  
 ایمان نہیں لائے ۱۰۰ اور جب ان کی طرف اللہ کی طرف سے رسول آیا۔ جو  
 تصدیق کرتا ہے۔ اُس چیز کی جو اُن کے پاس ہے۔ ثواب یافتہ لوگوں میں سے  
 ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے ڈال دیا۔ کہ یا کہ وہ جاننے ہی نہیں ۱۰۱

یہودیوں کی خرابیوں کا تذکرہ تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ آیات زیر درجہ کے شان نزول کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت نبی علیہ السلام کی ہجرت مدینہ کے وقت مدینہ کے گرد و نواح میں بہت سے یہودی آباد تھے۔ یہودی علماء میں سے صرف ایک عالم حضرت عبد اللہ بن سلامؓ ایمان لائے باقی سب محروم ہی رہے۔ ان میں سے ابن صویہ ایک چشم تھا۔ وہ بعض درستی یہودیوں کے ہمراہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے آیا۔ اور آپ سے مختلف سوال کیے۔ اُس نے کہا کہ آخری نبی کے خواب سے متعلق ہماری کتابوں میں بعض نشانیاں موجود ہیں۔ آپ اپنے خواب کی کیفیت بیان فرمائیں۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا اِنَّ عَيْنِي تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي یعنی میری آنکھیں تو جھپک سکتی ہیں۔ مگر دل کبھی نہیں سوتا۔ اس کی اُس نے تصدیق کی کہ آپ ٹھیک فرماتے ہیں۔ ہماری کتابوں میں بھی نبی آخر الزمان کی یہی نشانی بتائی گئی ہے۔

اس شخص نے دوسرا سوال کیا کہ رحمہ در میں جنس کی تفریق کیسے ہوتی ہے۔ یعنی بچے اور بچی کی پیدائش میں کون سے عوامل کار فرما ہوتے ہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مرد کا مادہ مؤثر مغنیہ رنگ کا ہوتا ہے۔ اور عورت کے رحم کی رطوبت زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ فرمایا با شریعت کی بات جس مادہ کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ بچے کی شکل و صورت اس کے موافق ہوتی ہے۔ باقی یہی بات کہ جنس سے کیا مراد ہے۔ مقدار میں غلبہ ہوتا ہے یا فروغ میں سبقت ہوتی ہے۔ یا کسی صفت میں غلبہ ہوتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی بتایا کہ مرد اور عورت میں سے جس کے مادہ میں غلبہ ہوتا ہے۔ وہ شاہد بہت میں بچے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہودیوں نے کہا کہ یہ بھی آپ نے درست جواب دیا۔ ہماری کتابوں میں بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

حضور علیہ السلام نے ان یہودیوں سے فرمایا کہ جب تم میرے جوابات سے مطمئن ہو تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ کہنے لگے۔ ہم ایک اور سوال پر تمہیں گے۔ حضرت! یہ فرمائیے۔

کہ جو لوگ بہشت میں داخل ہوں گے، انہیں سب سے پہلے کوئی خوراک پیش کی جائیگی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جنتیوں کی اولین خوراک مچھلی کے بچڑ کا زائذ حصہ ہوگا، اور پھر دوسرے نمبر پر ان کو بیل کا گوشت پیش کیا جائے گا۔ جو جنت کے اطراف میں چرتا ہے یہودیوں نے کہا: کہ یہ بھی آپ نے درست فرمایا ہے۔

اب حضور علیہ السلام نے فرمایا: کہ جب تم نے آخری نبی کی تمام علامتیں پہچان لی ہیں، تو پھر ایمان کیوں نہیں لاتے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا ایک بات اور بتائیے، کہ آپ کے پاس وحی کون لاتا ہے، آپ نے فرمایا، مجھ پر جبریل علیہ السلام وحی لاتے ہیں، وہ کہنے لگے جبرائیل تو ہمارا دشمن ہے، اگر وہ وحی لاتا ہے تو ہم اس کو نہیں مانتے، ہاں اگر میکائیل وحی لاتا تو ہم مان لیتے، کہنے لگے جبرائیل کو دو وجوہات کی بنا پر ہم تسلیم نہیں کرتے، اول یہ کہ یہ قومیں پرہیزگار لاتا ہے، اور دوسرا یہ کہ اس نے ہمارے دشمن بخت نصر کی حمایت کی تھی، اس کی تفسیل انہوں نے یوں بیان کی، کہ ہمارے پیغمبروں نے ہمیں بتایا تھا، کہ بخت نصر ہامی بادشاہ تھا، وہ ہمارے گھر سے گھر لے لے کر دینا، پیغمبروں سے اس کی نشانیاں بتائیں، یہ ہمیں بتایا کہ وہ اس عمر میں فلاں جگہ پر بیٹے گا، اور فلاں کام کرتا ہوگا، چنانچہ ہمارے سرور نے بخت نصر کی تلاش میں چاروں طرف آدمی بھیج دیے، اور انہوں نے شہر بابل میں انہی نشانوں کے ساتھ بخت نصر کو تلاش کر لیا، جب اُسے ہلاک کرنے لگے تو جبرائیل علیہ السلام سامنے آکر اُسے بھونے اور کہنے لگے تم اس کو کیوں مانتے ہو، ہم نے کہا کہ یہ ہمارا قاتل ہے، اور ہماری تباہی کا باعث بنے گا، تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اگر یہ واقعی قاتل ہے، تو تم اُسے ہلاک نہیں کر سکو گے، اور اگر یہ تمہارا قاتل نہیں ہے، تو خود بخود خواہ مخواہ خون ناحق کے متکب ہوتے ہو، اس طرح جبرائیل علیہ السلام نے بخت نصر کو ہلاک ہونے سے بچا لیا، وہی بخت نصر جب بڑا ہوا، تو اس نے شام اور فلسطین کے علاقوں میں بڑی تباہی مچائی، اور بیت المقدس کو گرا دیا، توراہ کو جلایا، یہودیوں کو قتل کیا اور ان کو غلام اور لونڈیاں بنایا، چنانچہ یہ لوگ سو سال تک غلامی میں مبتلا رہے اور بڑی ذلت و رسوائی اٹھائی۔

یہودیوں نے کہا، کہ جبرائیل علیہ السلام پر ہمارا اور اعتراض یہ ہے، کہ یہ آپ کے

ہماری چٹیاں کھاتے ہیں۔ ہماری ساری باتیں آپ کو بتا دیتا ہے۔ لہذا اس کے ذریعے نازل ہونے والی وحی کو ہم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہودیوں کے ان اعتراضات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور ان کی گندمی ذہنیت کا رد فرمایا۔ اور بتایا کہ جبرائیل علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ہیں۔ وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے ہیں۔ لہذا ان کے ساتھ دشمنی رکھنا کفر کے مترادف ہے۔

جبرائیل، سرفراز ان تینوں لفظوں کا معنی عہدہ بندہ یا مردِ خدا ہے۔ اور ایل عبرانی زبان میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ مگر اردو زبان لفظ ایل کو عہدہ اللہ کا معنی دیتے ہیں۔ اس طرح جبرائیل میکائیل اور اسرافیل کا معنی اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوا۔ ان میں عزرائیل کا نام شامل نہیں ہے۔ بعض کتبوں میں مذکور ہے کہ عزرائیل ملک الموت کا لقب ہے۔

الغرض! جب یہودیوں نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اپنا دشمن قرار دیا۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَکَ اَنَا عَدُوًّا لِّمَنْ یُّدْبِرُ اَمْرًاۗ فَاَنْزَلْنٰہُ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ اِنَّکَ عَلٰی قَلْبٍ مَّہۡرَبٍ ۚ (مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے۔ اس کے ساتھ کسی کی دشمنی کا کیا جواز ہے۔)

نزدول وحی کی مختلف صورتیں ہیں۔ عام صورت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتے تھے۔ تو حضور علیہ السلام کے قلب کے ساتھ رابطہ قائم ہو جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل ٹیلیفون کا کنکشن مل جاتا ہے۔ یہ خاص قسم کی رو ہوتی ہے جس کے ذریعے پیغمبر علیہ السلام اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے۔ اور اسے خوب سمجھتے تھے۔ اور اس کے الفاظ کو جانتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ خواب بتا دیتی جاتی تھی یا بعض دفعہ فرشتہ کسی شکل میں متشکل ہو کر آتا تھا۔ اور کلام الہی پیش کرتا تھا۔ تاہم عام طور پر پہلی صورت میں یعنی قلب مبارک سے رابطہ قائم ہوتا تھا۔

نزدول وحی کی  
مختلف صورتیں

ایک دفعہ حضور علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا: کہ مجھ آپ کی آمد کے منتظر رہتے ہیں۔ آپ کثرت سے کیوں نہیں آتے تو جبرائیل علیہ السلام نے وہاں سے نازل ہوا: لَا يَأْتِيكَ تِيمٌ تَوْسِفُ آپ کے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ ہم حاضر ہوجاتے ہیں ہم اپنی مرضی سے نہیں آسکتے۔

حدیث شریف میں آتا ہے: کہ ایک دفعہ جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپ کو بتایا کہ اب کی دفعہ میں اللہ تعالیٰ کے بہت ہی قریب پہنچ گیا۔ آپ نے دریافت کیا کہ جبرائیل یہ تو بتاؤ کہ تم اللہ تعالیٰ کے کس قدر قریب پہنچ گئے عرض کیا کہ میرے اور اللہ کے درمیان صرف شجر ہزار پردوں کا حجاب رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے اتنا قریب پہنچ گیا۔ اسی لیے ان کو اللہ تعالیٰ کے مقربین فرشتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے: کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبرائیل علیہ السلام کو ہر روز اجازت ہوتی ہے کہ جنت کی سرکوں میں غوطہ کھائیں۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام ہر روز ایسا ہی کرتے ہیں جس کی وجہ سے غیر محدود روحانیت حاصل ہوتی ہے۔ آپ کے مختلف الغائب میں ناموس عظمیٰ روح عظمیٰ روح القدس اور روح الامیں وغیرہ شامل ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رب کے مقرب فرشتے ہیں۔ تمام انبیاء علیہم السلام پر ان حضرت جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے ہی آتی رہی ہے۔

میکائیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دو سکر تکوینی امور کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ جیسے بنی نوع انسان کی روزی رسانی اور بارش کا نزول وغیرہ اسی طرح حضرت اسرافیل علیہ السلام عالم کے فتنے کے لیے جل بجانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور عزرائیل علیہ السلام جن کا لقب ملک الموت ہے وہ جانداروں کی روح قبض کرنے پر مامور ہیں قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي ذُكِّرَ بِكُمْ اُسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ رفیع الدین محدث دہلوی فرماتے ہیں: کہ

۱۔ بخاری ص ۶۹۱۔ ۲۔ زجاجة المصابیح ص ۲۵۹۔ مشکوٰۃ ص ۲۵۹ تغیر عزیزی ندوی ص ۲۵۹

۳۔ تغیر عزیزی ندوی ص ۲۵۹۔ ۴۔ مجمعہ رسائل حضرت شاہ رفیع الدین ص ۳

حیث میں جن چار مائیں مرش فرشتوں کا ذکر ہے۔ وہی فرشتے ہیں۔ قیامت کے دن مرش الہی کر  
تھانے والے آٹھ فرشتے ہوں گے۔ ان چار کے ساتھ چار اور معاون ہو جائیں گے۔

حضرت جبریل علیہ السلام  
سے دشمنی

الغرض فرمایا۔ حسین اسرائیل، جبریل علیہ السلام کے ساتھ تھانے کی دشمنی بلا وجہ ہے  
قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِيلَ اَنتِمْ فَرَانِيكُمْ۔ جو جبرائیل کا دشمن ہے۔ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ  
عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ اُس نے قریہ کلام الہی تمہارے قلب مبارک پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نازل  
کیا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لاتا ہے۔ خواہ وہ چیز تمہاری موافقت میں جائے یا مخالفت  
میں جائے۔ اور پھر یہ کلام بھی ایسا ہے۔ جو قطعاً تمہاری مخالفت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ تو مصدقاً  
لِعَابِئِن مَّيَّةٍ دِہنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اس لحاظ سے یہ سبقت  
کتاب کی تعلیمات کی مخالفت کا ذریعہ ہے۔ دوسرے مقام پر مَقْبُحَاتُ کا لفظ آتا ہے۔  
قرآن پاک سابقہ کتب کا مصدق ہے۔ ان کا بخیر اس آئینہ کتاب میں آگیا ہے۔ اسی طرح  
پہلی کتابوں میں جو حروف جوڑی ہیں۔ ان کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ لہذا ایسی پاک کتاب کا کار  
اور اس کے ماننے والے سے دشمنی رکھنا کیسے جائز ہے۔ بلکہ یہ تو نہایت ہی قیمتی فصل ہے۔  
یہ تو ایسی عظیم الشان کتاب لاتا ہے۔ جس کے لیے نوح ان ہمیشہ دعا گو رہا ہے۔ کہ  
اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ اے اللہ! ہم کو راہِ راست دکھا دے اور اس پر چلا دے  
فرمایا یہ کلام ایسا ہے۔ جو کہ وَهْدَى وَبَشَّرَ لِلْمُؤْمِنِينَ سب اس کے ذریعے

اہل ایمان کے  
لیے بشارت

اللہ نوح انسان کو بہایت بخشتا ہے۔ اور پھر اس بہایت کی روشنی میں جو لوگ ایمان قبول کر  
لیتے ہیں۔ ان کے لیے دائمی کامیابی کی بشارت بھی سناتا ہے۔ قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے  
بَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اهل ایمان اور اعمال صالحہ کرنے والوں  
کو خوشخبری دے دیں۔ مگر کن نعمتوں کی؟ شہری اس کا ذکر قرآن پاک نے بار بار کیا ہے۔ کہیں  
فرمایا اَنْ لَّكُمْ جَنَّاتُ جَارِدَاتٍ مِّنْ جُتْنٍ اَلَا تُفْرِحُونَ ان کے لیے باغات ہیں جن  
کے نیچے نہریں رواں رواں ہوں گی۔ کہیں فرمایا فِي مَقْعَدِ صَدِّقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ  
مَّقْعَدِ وہ اللہ رب العزت کی جنت میں یعنی اس کے حضور میں بیٹھے ہوں گے، دوسری  
جگہ بشارت اس طرح ہے "فَاِنْ تَطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا" اگر اطاعت



کر دے، تو اللہ تعالیٰ بہترین اجر عطا فرمائیں گے۔ بہر حال اہل ایمان کو اصلاح اور کامیابی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ اب بتاؤ ایسا پاک کلام لائے دے جس پر انیل علیہ السلام سے دشمنی کا کیا معنی ہے۔

فرشتوں سے  
دشمنی اللہ تعالیٰ  
سے دشمنی ہے

فَرِيَا مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ  
فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتوں جبرائیل، میکائیل وغیرہ سے  
دشمنی رکھنا تو خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی ہے۔ گویا یہ لوگ فرشتوں کے دشمن نہیں بلکہ خدا تعالیٰ  
کے دشمن ہیں۔ فرمایا اگر ایسی بات ہے۔ تو پھر سن لو کہ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ اللہ تعالیٰ  
بھی کافروں کا دشمن ہے۔ ظاہر ہے کہ ملائکہ یا انبیاء علیہم السلام تو عالم بالا یعنی خطیرۃ العرش  
کے ترجمان ہیں۔ ان کے ساتھ دشمنی بڑی مسئلہ پڑے گی۔ کیونکہ یہ خدا تعالیٰ سے دشمنی کے مترادف ہے۔  
لفظ ملائکہ ملائکہ یا ملائکہ سے مشتق ہے۔ اور ملائکہ عربی میں پیغام کو کہتے ہیں۔ اس کا ثبوت  
عرب کے قدیم شاعر عدی بن زید عبادی کے کلام سے ملتا ہے۔ اُسے نعمان شاہ عاق نے کسی  
بات پر خفا ہو کر قید میں ڈال دیا۔ بادشاہ اس کا رشتہ دار بھی تھا۔ بہر حال اس نے اپنے شعروں  
میں نعمان کو پیغام بھیجا تھا۔

۱۔ أَبْلَغَ النُّعْمَانَ نَحْنُ مَا نَمْلِكُ إِنَّكَ قَدْ طَلَّ حَبْنِي وَأَنْفَكَ رِي

نعمان کو میرا پیغام پہنچا دو۔ اس نے بلا وجہ مجھے بے قید میں ڈال رکھا ہے۔ میں اس کے  
حکم کا منتظر ہوں۔ کہ کب رہائی ملتی ہے۔ یہ کافی لمبا قصیدہ ہے۔

عرب کے ایک شاعر کے کلام میں بھی ایسا ہی ملتا ہے۔ عربوں میں بہت مشہور نثار  
اور اسے عربوں کا ہاتھ کا جاتا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا شعر بہت شہرت حاصل کرتا تھا۔ اور  
پورے عرب میں فروزا پھیل جاتا تھا۔ اُس نے حضور علیہ السلام کا زمانہ نبیاً ہے۔ وہ شخص ایمان  
نے کے لیے حضور علیہ السلام کی خدمت میں آ رہا تھا۔ کہ کفار نے مدینہ کے ذریعے اُسے راستے  
میں ہی روک لیا۔ وہ اپنے گاؤں میں بھی واپس نہ پہنچ سکا۔ بلکہ دورانِ سفر ہی اونٹ سے گر کر  
جاگ ہو گیا۔ وہ بھی کتبہ ہے۔

۲۔ أَبْلَغَ مِزِيدَ بَنِي شَيْبَانَ مَا لَكُ يَا شَيْبُ أَمَا تَعْلَمُ أَنَّكَ تَكِلُ

یہ بنی شیبان سرور قبیلہ تک میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ اے ابو شیبیب کیا تو ہمیشہ غلط بیانی ہی کرتا ہے گا۔ مطلب یہ کہ انکا یا انکو کہ یا انکو کہ کا معنی پیغام ہے۔ اور طالع بھی اسی کے مشتق ہے۔ جس کا معنی پیغام لانے والے کے ہیں۔

مقربین کا عذری  
مشتق ہے

الحرض! جو کوئی اللہ تعالیٰ کے فرشتوں اور اس کے رسولوں سے دشمنی رکھتا ہے۔ وہ گویا اللہ تعالیٰ سے دشمنی مول لیتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے مقربین سے عداوت رکھنے والا معنی ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ مقربین الہی اور صالحین سے عداوت رکھنے والا شخص ہمیشہ سبکدستی میں مبتلا رہتا ہے۔ گویا وہ ہمیشہ جنابت کی سی حالت میں ہے۔ اور یہ چیز موجب لعنت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ السلام کی زبان مبارک سے کسوا یا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا جَوَّيْرُ كَيْسٍ وَلِيَّ يَدْرُسْتِ سے دشمنی رکھتا ہے۔ اُسے میرا چیلنج ہے۔ کہ وہ میرے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ کون جنگ کر سکتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ایسا شخص ملعون ہے۔

واضح ثنائیں

جس وقت حضور علیہ السلام مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔ تو اُس زمانے میں مدینہ کے قریب جواریں یودیوں کے دس بڑے عالم تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہ عالم ایمان لے آئیں۔ تو کوئی یودی باقی نہ رہے۔ سب ایمان لے آئیں۔ ان میں سے صرف عبد اللہ بن سلام ایمان کی دولت سے مشرف ہوئے۔ باقی سب بے ایمان ہی رہے۔ انہی میں ایک کا ابن صوریہ تھا۔ اُس نے حضور علیہ السلام سے کہا کہ آپ نبی آخر الزمان ہونے کے دعویدار ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں آپ ہمیں کوئی واضح ثانی بتائیں جسے ہم پہچانتے ہوں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَقَدْ اَسْرَلْنَا اَيْتَ كَبِيْرًا مِّنْ اٰیٰتِنَا لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُوْنَ اس کی طرف واضح ثنائیں نازل کی ہیں جس شخص میں ذرہ بھر بھی انصاف ہوگا۔ وہ ان ثانیوں کا انکار نہیں کر سکے گا۔ فرمایا وَمَا يَكْفُرْ بِهٖمْ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ان کھلی ثنائیں کا انکار صرف نافرمان لوگ ہی کریں گے۔

کتاب اللہ  
سورہ مدثر

فرمایا ان کتبوں کی فطرت: نہ بن چکی ہے کہ اَوَّلُ کَلَمًا عَلَیْہَا وَاعْتَدَا ان میں سے جب  
 بھی کسی نے کوئی عہد کیا فَبِذَہِ فَرِیقٌ مِّنْہُمْ ان میں سے ایک فریق نے اس عہد کو توڑ  
 دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ان کی اکثریت ایمان لانے سے  
 قاصر رہی ہے۔ حقیقہ کہ وَلَمَّا جَاءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ جب ان کے پاس  
 رسول عظیم، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَہُمْ جو  
 اس چیز کی تصدیق کرنے والے ہیں جو ان کے پاس ہے یعنی زبور، توراۃ، انجیل۔ دیگر تمام  
 صحف سماویہ۔ شرائع الیہ وغیرہ۔ تو پھر یہ ہوا کہ فَبِذَہِ فَرِیقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اَوَّلُوا الْکِتٰبَ  
 بل کتاب میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا۔ کَتَبَ اللّٰہُ اللہ کی کتاب کو وَوَدَّ اَظْہَرُہُمْ  
 پس پشت۔ یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ سے روگردانی اختیار کر لی۔ اگر یہ لوگ  
 اللہ تعالیٰ کی کتاب کو کسی درجے میں بھی تسلیم کرتے۔ تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے  
 اور قرآن پاک کو بھی مان لیتے۔ مگر انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یعنی اس میں تحریر  
 کے مرتب ہوئے۔ اس کے الفاظ کو تبدیل کر دیا یا الفاظ کے معنی الٹے اور یہ سب کچھ  
 انہوں نے اس طرح کیا کَا تَہْمُ لَا یَعْلَمُوْنَ مگر وہ جانتے ہی نہیں کہ کتاب اللہ میں کیا  
 پیش گوئیاں ہیں۔ اور کون سی علامتیں بتائی گئی ہیں۔ جن کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب  
 اور آخری رسول علیہ السلام کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اگر ان میں کوئی بھی منصف مزاج آدمی ہوتا تو وہ  
 مدنوں چیزوں کو بلا شک و شبہ پہچان لیتے۔ اس کے بعد یہودیوں کے مکر وغیرہ کا ذکر آئے گا۔

وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمٍ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ  
وَلَكِنَّ الشَّيْطَانَ كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ السَّحَرَةَ وَمَا نُزِّلَ عَلَى  
الْمَلَكَيْنِ بِبَابِ هَارُوتَ وَمَا نُزِّلَ وَمَا يَعْلَمُ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى  
يَقُولَا إِنَّمَا خُنْ فِتْنَةً فَلَا تَكْفُرْ فَيَعْلَمُونَ مِنْهُمَا مَا يَفْتَرِقُونَ  
بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ  
إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَعْلَمُونَ مَا يُضْرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ  
عَلَّمُوا الْعِمَّ اشْتَرَاهُ مَا آتَى فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَدَقٍ يَبْسُ  
مَا شَرَّ رَايَةٍ أَلْفُهِمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ ۱۰۲ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا  
وَأَتَقُوا لَمَثُوبَةً مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ لَخَيْرٌ لَّكَ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ ۱۰۳

۱۰۲  
۱۰۳

ترجمہ :- اور انہوں نے اُس چیز کا تابغ کیا جو شیاطین سیمان دھیرہ السور

کی بادشاہی میں پڑھتے تھے۔ اور سیمان دھیرہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ بلکہ شیاطین  
کفر کرتے تھے۔ اور لوگوں کو جادو دکھاتے تھے۔ اور وہ چیز جو تارہ کی قبی بابل کے  
مقام پر دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر۔ اور وہ کسی کو نہیں سکھاتے تھے۔ یہاں  
تک کہ دونوں کہتے تھے۔ بیشک ہم تو آزمائش ہیں۔ پس تم کفر نہ کرنا۔ پس لوگ  
ان دونوں سے ایسی چیزیں سیکھتے تھے۔ جس کے ذریعے مرد اور عورت کے درمیان  
مہائی ڈالتے تھے۔ اور وہ اس سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ مگر اللہ  
کے حکم سے۔ اور وہ ان سے ایسی چیزیں سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ورنہ وہیں پہنچتی  
ابستہ تحقیق انہوں نے جان یا اس شخص کو جس نے اس (سحر) کو خریدنا ہے۔ اُس  
کے لیے آفت میں کچھ حصہ نہیں اور وہ بڑی چیز ہے۔ جس کے بارے میں سنوں  
نے اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ اگر ان کو سمجھ جاتی ۝ ۱۰۲ اگر یہ لوگ ایمان لاتے

اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ثواب اور بہتر اجر تھا۔ اگر

بجھتے (۱۳)

شیطان کا  
اتباع

ان آیات میں بنی اسرائیل کی انتہائی پستی اور ان کے انحراف کا ذکر ہو رہا ہے۔ گمراہی  
آیت میں یہ بات بیان کی گئی تھی کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اس طور پر پشت  
ڈال دیا کہ اُس سے بالکل راتعلق ہو گئے۔ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کتاب اللہ کی تلاوت اور  
اس پر عمل درآمد کی بجائے وَاشْبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكٍ سَلِيمٍ انہوں نے  
اس چیز کی پیروی کی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ حضرت  
سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جنوں اور انسانوں کا اختلاط ہوتا تھا۔ کیونکہ جن بھی آپ کے ماتحت  
تھے۔ لہذا اس دور میں جو کلام یا دیکھ چیزیں بن پڑھتے تھے۔ بنی اسرائیل نے ان کا اتباع کیا۔ اس  
طرح کمر یا جادو انسانوں تک پہنچ گیا۔ اسی بات کو اس آیت میں یوں بیان فرمایا کہ بنی اسرائیل  
شیاطین یا جنوں کی تلاوت کی۔ وہ چیزوں کی پیروی کرنے لگے۔ گویا جادو میں ملوث ہو گئے اور  
کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام  
پہ جادوگر بنوینا الزام

جادو کو شیعیان کھیل جان کر کھیتے بہتے تو اور بات تھی مگر بنی اسرائیل نے ستم بالائے  
ستم یہ کیا کہ اس جادو کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ سحر پر اعتقاد رکھنا اور  
اس پر عمل کرنا صریحاً کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی برأت کا اظہار کرتے ہوئے  
فرمایا وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ سَلَامًا سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ یعنی انہوں نے یہ جادو وغیرہ  
نہیں نہیں سکھایا۔ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا بلکہ یہ ترشیطانوں نے کفر کا ارتکاب کیا۔  
جنہوں نے لوگوں کو جادو سکھایا ہے۔

سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا بنی اسرائیل کو قبیح فعل ہے وہ تو  
اللہ تعالیٰ کے نبی اور صاحب طہریت رسول تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جن اور شیاطین کو آپ  
کے مٹھ کر دیا تھا۔ اور جو آپ کے سحر کر دیا تھا۔ فَسَحَرْنَا سحر کئے آپ ان چیزوں  
سے سب فساد کام لیتے تھے۔ وہ کسی جادو کی سکتے تھے۔ اور بن جریر نے ایک روایت

نہ تفسیر طبری ص ۲۵۴

بیان کی ہے۔ قَالَ بَعْضُ أَحْبَادِ الْيَهُودِ يَسُودُونَ كَافِرِينَ كَمَا لَا تَقْبَلُونَ مِنْ مُسْتَقْبَدِيهِ لَوْ كُنَّا قَوْمًا يَتَعَبُّونَ نَفْسَهُمْ أَنْ يَنْزِعَهُمْ عَنْ دَاوُدَ كَانَ بَيْتًا جَوِيًّا كَتَبَ فِيهِ كَلِمَاتٌ لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا سَاحِرًا۔ کہ ابن داؤد (سیمان علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ حالانکہ ماکان (الاساحرا) وہ تو جادوگر تھے۔ گویا یہودیوں کا حضرت سیمان علیہ السلام کے متعلق یہ اعتقاد تھا۔ اس لیے فرمایا کہ سیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا۔ بلکہ شیاطین نے کفر کیا۔ جو کہ يُعَلِّمُونَ النَّاسَ الْخَفْرَ لَوْ كُنَّا قَوْمًا يَتَعَبُّونَ كَلِمَاتٍ لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا سَاحِرًا۔ اس بات کو حضرت سیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا صریح کفر ہے۔

مفسرین کرم فرماتے ہیں۔ کہ جادو دوزخ سے دنیا میں آیا۔ اس کا پہلا ذریعہ تو جنت میں۔ یعنی حضرت سیمان علیہ السلام کے زمانے میں جادو شیاطین سے انسانوں میں رائج ہوا۔ جادو کا دوسرا ذریعہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے دنیا پر بھیجا۔ اسی کے متعلق فرمایا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الصَّانِكِينَ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ۔ عام مفسرین نے یہی لکھا ہے۔ کہ ہاروت اور ماروت دو فرشتے تھے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے لیے بابل کے مقام پر اتارا۔ یہ بابل شرابی ہے۔ جو کلدانیوں کا دارالسلطنت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جہنم پیدائش ہے۔ وہاں سے ہجرت کر کے آپ شام اور فلسطین پہنچے۔ اور پھر حمجاز میں خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ بہر حال لفظ مَلَكَيْنِ سے مراد دو فرشتے ہی ہیں۔ کیونکہ مَلَكٌ فرشتے کو کہتے ہیں۔

جادو کے  
ذرائع

ہاروت اور  
ماروت کون تھے

تفسیری راہنما میں آتا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام کسی اور نبی کے زمانہ میں دنیا پر معصیت عام تھی۔ لوگ فسق و فجور میں مبتلا تھے۔ تو آسمان پر فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کی کہ مولا کریم! تو نے یہ کیسی مخلوق پیدا کی ہے جو اس قدر گناہ میں ملوث ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے انسان میں مختلف قوتیں پیدا کی ہیں جیسے قوت شہوانیہ، قوت بہیمیہ اور قوت غضبیہ وغیرہ اور ان کے ساتھ ساتھ نیکی کرنے کی طاقت بھی عطا کی ہے اس لیے



تم دیکھتے ہو کہ کچھ لوگ اگر گناہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو کچھ نیکو کار بھی ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر ساری  
 قوتیں موجود ہیں۔ برخلاف اس کے فرشتوں کو میں نے قوتِ ملکوتی سے نوازا ہے۔ اگر تم تجربہ  
 کرنا چاہتے ہو تو میں تم کو زمین پر بھیجتا ہوں۔ تم اپنے میں سے دو فرشتے منتخب کرو۔ پھر دیکھیں گے  
 کہ وہ کس طرح گناہ سے بچتے ہیں۔ ان غرض فرشتوں نے اس آزمائش کے لیے ہاروت اور  
 ادوت کو منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں قوتِ شہوانیہ بھی رکھ دی۔ اور پھر انہیں بابل کے  
 مقام پر اتار دیا۔ انہیں خاص طور پر نصیحت کی گئی کہ بڑائی سے باز رہنا۔ زنا اور دیگر معصیت سے  
 اجتناب کرنا اور عدل و انصاف سے وقت گزارنا۔

ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا۔ کہ ایک خوبصورت عورت ایک چھڑے پر سوار جا رہی  
 تھی۔ اُس نے کسی ضرورت کے تحت سڑک سے کپڑا ہٹایا۔ تو اُسے دیکھ کر فرشتے بے قابو  
 ہو گئے۔ یہ ان کی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ انہوں نے اُس عورت سے فرصت میں ملاقات کی  
 خواہش کی۔ جسے اُس نے منظور کر لیا۔ بوقت ملاقات فرشتوں نے اُس سے نفسانی خواہش  
 کی تکمیل کی درخواست کی۔ اُس عورت نے اس خواہش کی تکمیل کے لیے یہ شرط پیش کی کہ  
 مجھے وہ اسمِ عظمیٰ سکھ دو جسے پڑھ کر تم آسمانوں پر چلے جاتے ہو اور پھر واپس آجائے ہو۔  
 فرشتوں نے اسمِ عظمیٰ اُس عورت کو سکھ دیا۔ پھر اس نے کہا کہ میرے ساتھ یہ لڑکا ہے۔ اس کو قتل  
 کر دو۔ ورنہ یہ ہمارا زنا فاش کر دے گا۔ فرشتوں نے ایسا کرنے سے معذرت کی۔ عورت نے  
 کہا۔ اچھا یہ شراب ہی پی لو۔ یہ بڑی لذیذ چیز ہے۔ فرشتوں نے شراب پی لی۔ پھر نٹے میں آکر  
 انہوں نے لڑکے کو بھی قتل کر دیا اور زنا کے مرتکب بھی ہوئے۔ گویا سڑے معاصی میں مبتلا ہو گئے۔  
 عورت تو اسمِ عظمیٰ پڑھ کر اوپر چلی گئی کہتے ہیں کہ زبردتاً سڑے میں جا کر نابود ہو گئی اور فرشتے سڑے میں  
 مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ ان گناہوں کی سزا دنیا میں بھگتنا چاہتے ہو یا آخرت میں  
 انہوں نے دنیا کی سزا کو پسند کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں کسی تاریک  
 اور عقیق کنوئیں میں اٹا لٹکا دیا۔ آج تک وہ اُسی میں لٹکے ہوئے ہیں ان کے نیچے سے دھواں  
 اُٹھ رہا ہے اور وہ سخت اذیت پہن رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی۔ تو اس وقت وہ اس  
 عذاب سے نجات پائیں گے۔ دیگر اسرائیلی رشتہوں کی حرم یہ بھی ایک اسرائیلی مذیت ہے

تاجم اس کی سچائی پر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ماروت اور روت  
کی معنی شادیت

ام بن منذر نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک موقع پر ایک بوڑھا آدمی عبدالملک بن مرداس کے ساتھ تھکے پر بیٹھا تھا۔ نووارد نے تعجب کیا کہ یہ کون آدمی ہے۔ جو خلیفہ کے ساتھ بیٹھا ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ یہ آدمی ماروت اور روت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ لہذا اس کی عربت افزائی کی گئی ہے۔ اُس شخص نے آگے بڑھ کر بزرگ آدمی کو سلام کیا اور عرض کیا حضرت ماروت اور روت سے ملاقات کا کچھ حال مجھے بھی سناؤ۔ اس پر اس شخص کے آنسو جاری ہو گئے۔ اور اُس نے واقعہ یوں سننا شروع کیا کہ بھائی! میں ابھی بچہ تھا۔ گھر میں مال و دولت کی فراوانی تھی۔ جسے میں فراخ دلی سے خرچ کرتا۔ جب باپ فوت ہو گیا۔ تو ماں سے دولت حاصل کرتا اور خوب اڑتا۔ ایک دن میں نے ماں سے دریافت کیا کہ ماں یہ تو بتائیں کہ ہمارے پاس یہ مال و دولت کہاں سے آیا تھا۔ جو اتنا خرچ کرنے سے بھی کم نہیں ہوتا۔ ماں نے کہا بیٹا تم جتنی چاہو دولت ڈاڑ یہ ختم ہونے والی نہیں ہے۔ پھر اُس نے مجھے دولت سے بھرے ہوئے گھرے دکھائے۔ لڑکے میں شور پیدا ہو چکا تھا۔ اُس نے دوسرے سوال کیا کہ میرے باپ نے یہ مال کس طریقے سے کمایا تھا۔ ماں نے بتایا کہ تیرا باپ ساحر تھا اور اس نے یہ ساری دولت سحر کی وجہ سے کمائی۔ لڑکے کو خیال آیا کیوں نہ میں بھی وہی چیز سیکھ لوں جس کی وجہ سے میرے باپ نے اتنا مال پیدا کیا۔ اُس نے سوچا کہ سحر کا علم اس کے باپ نے اپنے کسی شاگرد کو بھی سکھایا تھا۔ اس کا پتہ کر کے اُس سے یہ علم سکھنا چاہیے۔ چنانچہ تلاش کرنے پر اُسے ایک شخص مل گیا۔ جو اُس کے باپ کا شاگرد تھا۔ لڑکے نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو وہ کہنے لگا یہ بڑا خطرناک علم ہے۔ اسے نہ ہی سیکھو تو بہتر ہے لڑکے نے اصرار کیا تو اُس نے کہا کہ اچھا اگر تم ضرور ہی یہ علم سیکھنا چاہتے ہو۔ تو میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ۔ بٹیر یاد رکھو۔ جہاں ہم جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر خدا کا نام نہ لینا۔ لڑکا بیان کرتا ہے کہ میں اپنے باپ کے شاگرد کے پیچھے ہوں۔ حتیٰ کہ ہم ایک غار پر پہنچے اور اس میں اتر گئے۔ ہم تین سو بیڑھیاں نیچے اترے تو وہاں ایک کنواں نظر آیا۔

کنوئیں کے اندر دو شخص نظر آئے۔ جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے اُٹے ٹک رہے تھے، ان کی شکلیں عجیب  
 غریب تھیں، ان کی آنکھیں ڈھال کی طرح بڑی بڑی اور بڑی چمکدار تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل  
 میں خوف پیدا ہوا۔ اور میری زبان سے بے ساختہ کلمہ: **اللہ اَرَادَ اللہُ نَعْلَیْکَ** یہ کلمہ سن کر وہ شخص  
 اور زیادہ مضطرب ہوئے۔ میں پھر گھبرایا اور میرے منہ سے پھر وہی کلمہ نکلا۔ دو تین دفعہ ایسا ہی ہوا  
 تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ میں نے ان سے اپنا تعارف کیا۔ پھر میں نے ان سے  
 پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور اس حال میں کس وجہ سے ہو؟ \_\_\_\_\_ اس پر  
 انہوں نے بتایا کہ ہم اردت در اردت ہیں۔ اور یہاں سزا جگت ہے ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا  
 کہ تم کس امت میں ہو۔ تو میں نے بتایا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہوں۔  
 انہوں نے دریافت کیا کہ کیا آخر نبی کا ظہور ہو گیا ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔  
 انہوں نے کچھ علامتیں بھی دریافت کیں۔ جو میں نے ان کو بتائیں۔ وہ دونوں بعض علامات  
 پر خوش ہوئے۔ اور بعض پر ناراض ہوئے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ ہم ان  
 علامات پر خوش ہوئے ہیں، جو قرب قیامت سے متعلق ہیں۔ کیونکہ قیامت برپا ہونے پر  
 ہم اس عذاب سے رہائی پائیں گے۔

الغرض! وہ لڑکا اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی وجہ سے سحر سے تو محروم ہو گیا، تاہم  
 اُسے حقیقت معلوم ہو گئی۔ اور وہ اردت در اردت کا معنی شاہد بن گیا۔

اردت اردت  
 کے دوقوعے نکال

بعض مفسرین کرم فرماتے ہیں: **وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِ هَٰؤُلَاءِ**  
**وَمَا رُودَتْ** میں لفظ **ہا** نافہ ہے۔ یعنی بابل کے مقام پر اردت در اردت پر کوئی چیز نہیں  
 اُتری گئی۔ یہ سب جھوٹے قعے ہیں۔ جو بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ ان مفسرین کی ذاتی تحقیق ہے۔  
 بعض اصحاب یہ بھی کہتے ہیں: کہ اردت در اردت کا سارا قصہ کہانی محض ہے چنانچہ  
 بشار ابن برد شاعر سے کسی نے پوچھا کیا آپ نے آل سیمان سادات خاندان کے متعلق بھی  
 کوئی قصیدہ لکھا ہے؟ یہ اپنے درجے کا شاعر تھا۔ کہنے لگا۔ اُس خاندان کے متعلق کچھ زیادہ

ترتیب بھی صرف یہ دو شرکت ہیں:

وَيُنَادِ اِلٰى سُلَيْمَانَ وَدَرَاهِمُهُمْ  
كَأَنَّهُمْ يَلْبِسُونَ خُفًا بِالْعَفَا رِيَّتِ  
لَا يُرْجِيَانِ وَلَا يُرْجِي لَوْلَاهُمَا  
كَأَنَّهُ سَمِعَتْ بِهَارُوتَ وَمَارُوتَ  
اَل سُلَيْمَانُ بڑے کنجوس لوگ ہیں۔ ان کے درہم و درہم دینا دیکھتے ہیں۔ جیسے دو بابلیوں کے درہم و درہم  
بست سے بھرت جمع ہوں۔ اور وہ کسی کو نظر بھی نہ آئیں۔ اس طرح اَل سُلَيْمَانُ کامل و دولت  
بھی کسی کو نظر نہیں آتا۔ نہ ان سے کسی عیب کی توقع ہے۔ اور نہ ان کے درہم و درہم کو دیکھنے  
کی امید۔ ان کی دولت ایسے ہی ہے جیسے تم نے ہاروت و ماروت کا نام تو سن رکھا ہے۔  
مگر ان کی حقیقت کچھ نہیں۔ غرضیکہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو ہاروت و ماروت کے قصے کو  
افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں مانتے۔

سحر کی ہے

آہم اگر مفسرین کہتے ہیں کہ ہاروت و ماروت فرشتے تھے۔ اگرچہ زہرہ والا واقعہ  
مصدقہ نہیں ہے۔ مگر ان فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے سحر کا علم دیکر نازل کیا تھا۔ تاکہ سحر اور  
موجزے میں فرق قائم کیا جاسکے۔ لغوی اعتبار سے سحر کا معنی لطیف اباریک یا مخفی ٹی ہے۔  
سحر میں چونکہ کوئی چیز ظاہری طور پر نظر نہیں آتی۔ اس لحاظ سے اُسے سحر کہتے ہیں۔

سحر کا دوسرا معنی غذا ہے۔ جب انسان کوئی بھی غذا کھاتا ہے تو ہضم ہو کر باریک باریک  
لوگوں کے ذریعے جسم کے ہر حصہ میں پہنچتی ہے۔ یہ لطیف بھی ہوتی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ گویا  
اس میں اختار اور پیچیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ زمانہ جاہلیت کے ایک مشور شاہ عمار القیس کا کہنا ہے  
اَرَاْنَا مُؤَصِّنِينَ لَا مُرِغِيْبَ وَنَحْنُ بِالطَّعَامِ وَبِالشَّرَابِ

ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنی سواریاں دوڑاتے ہیں مگر کسی ایسی منزل کی طرف۔ جس کا ہمیں علم  
نہیں۔ یعنی پردہ غیب میں ہے اور اُدھر ہم پہنچنے کے ذریعے سحر کیا جاتا ہے۔ یعنی  
خود اک کھا کر ہم غافل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ جسم میں تیز رفتاری سے سواریاں دوڑا رہے ہیں۔  
جسم کی شینری اتنی تیزی سے کام کر رہی ہے گویا ہزاروں میل کی رفتار سے چلنے والے ہوئی جہاز

سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے۔ لیکن یہ سب کچھ پر وہ غیب میں ہے۔  
اسی طرح ایک شخص یوں کہتا ہے۔

لے فَإِنْ تَنبَيْتُنَا فَيُنَبِّئُنَا عَنْ صَافِيٍّ مِنْ هَذَا الزَّانِمِ الْمُسْتَعْرِ

اگر تو ہم سے پوچھے کہ ہم کس حال میں ہیں۔ تو میں کہوں گا کہ ہم تو عمر زدہ مخلوق میں سے چڑیوں کی  
مانند ہیں۔ جو کھانے پینے کے ذریعے اڑتے پھرتے بستے ہیں۔

عربی زبان میں سحر کا ایک معنی پھینچنا بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی مخفی ہوتا ہے۔ نظر نہیں آتا۔ لہذا  
اس لحاظ سے بھی سحر میں اخفا کا معنی پایا جاتا ہے۔

کیا ہر دور  
انسان تھے؟

بعض فرماتے ہیں کہ ہر دور تاروت فرشتے نہیں۔ بلکہ انسان تھے اور نیک آدمی تھے  
ان کے متعلق رَبُّكَ يُدْخِلُ فِي السَّالِكِينَ كَلِمَاتٍ تَعْلَمُهَا هِيَ۔ وہ بابل میں بستے تھے۔ اور سحر کا  
علم جانتے تھے۔ تاہم جب وہ لوگوں کو یہ علم سکھاتے تھے۔ تو انہیں خبر دیا بھی کرتے تھے کہ یہ علم  
اچھا نہیں ہے۔ اس سے بچ جاؤ تو بہتر ہے۔ ورنہ ایمان ضائع کر بیٹھو گے۔ کیونکہ سحر پر اعتقاد رکھنا  
اور اس پر عمل کرنا کفر میں داخل ہے۔ تاہم اس علم کے نزول میں کوئی خاص قباحت نہیں ہے۔ یہ  
ایک علم ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ہر دور تاروت مُنْكَيْنِ (فرشتے) نہیں۔ بلکہ مُدْكَيْنِ یعنی بارش  
تھے۔ اور بڑی عظمت کے مالک تھے۔ ان کے پاس یہ علم تھا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مَلَكٌ  
کا اطلاق فرشتوں کے علاوہ نیک آدمیوں پر بھی ہوتا ہے جیسے سعدہ یوسف میں مَلَكٌ کا لفظ  
یوسف علیہ السلام کے لیے بھی بولا گیا ہے اِنْ هَذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ "وہ انسان نہیں  
بلکہ بزرگ فرشتہ ہے۔

امام ابو منصور ماتریدیؒ اور ابوالحسن اشعریؒ تیسری چوتھی صدی کے مند پائے نام گذارے ہیں۔  
یہ اہم عظیم کئے شاگردوں کے شاگرد ہیں۔ آپ بڑے حکم ہیں اور علم کلام میں آپ کو بڑا مرتبہ  
حاصل ہے۔ امام ابو منصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ سحر کو مطلقاً کفر کا درجہ نہیں۔ کیونکہ اسکی

کیا سارا بار  
کفر ہے





ساحر کو پکڑنا مشکل کام ہے۔ کیونکہ جب تک مکمل ثبوت نہ ہو کسی پر جادو کرنے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ تاہم اگر ایسا ممکن ہو یا ساحر خود اقرار کر لے تو پھر مذکورہ سزا کا مستوجب ہوگا۔ بشرطیکہ ثبوت بھی اسلامی ہو۔

اہم ابو حنیفہؒ کے مسلک کے مطابق اگر ساحرہ عورت ہو تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مرتدہ عورت کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی۔ بلکہ اُسے قید میں رکھا جاتا ہے اسی طرح ساحرہ کو بھی قید کر دیا جائے گا۔ البتہ بعض ائمہ عورت کو بھی قتل کرنے کے حق میں ہیں۔ اگر ان فی جان کے قتل سے کم تر نقصان ہو رہا ہے۔ یعنی نقصانِ اذیاء رسانی کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ تو ساحرہ کو وہی سزا دی جائے گی۔ جو ذکیہ کے مقدمہ میں دی جاتی ہے۔ قرآن پاک نے ڈاکو کے لیے چار قسم کی سزائیں مقرر کی ہیں۔ یعنی سولی پر شکانا، قتل کرنا، اٹلے سیہے اٹھ اور پاؤں کاٹنا اور جس میں قید میں ڈال دینا۔ لہذا ساحر کو بھی اس کے جرم کے مطابق اسی قسم کی سزا دی جائے گی۔

میاں بوری  
میں جہانی

بہر حال اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَا يَكْفُرُ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَ اِنَّمَا غَنِيْتُ فِتْنَةً فَلَا تَكْفُرُ وہ دو فرشتے باروت اور باروت جب کسی انسان کو جادو کا علم سکھاتے تھے۔ تو اُسے واضح کر دیتے تھے کہ ہم تو آزمائش ہیں۔ تم یہ کفر نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو ایمان ضائع کر بیٹھو گے۔ مگر اس کے باوجود لوگ اُن سے جادو کا علم سیکھتے تھے۔ جن میں اہل کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا اور وہ ان فرشتوں سے ایسی چیزیں سیکھتے تھے مَا يُفَرِّقُونَ بَيْنَ الْمَكْرِ وَكَذِبِهِ جن کے ذریعے وہ میاں بوری میں جہانی ڈال دیتے تھے۔ یہ ایسا برا عمل ہے۔ جس پر شیطان بہت زیادہ خوش ہوتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے۔ تاہم کھر بھی ایک فن ہے۔ جس طرح دیگر فنون ہیں جیسے سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ وغیرہ وغیرہ۔

نافع اور  
ضار علم

فرمایا اگر تم جادو اذیاء رسانی کا ذریعہ ہے۔ مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ وَمَا هُمْ بِعَسَاةٍ يَنْبَغِي لَهُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ایسا عمل کرنے والے ساحر

اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر از خود کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تاہم جادو کرنا، اس پر یقین رکھنا، چونکہ قیامت سے خالی نہیں۔ یہ معزز ہے۔ مفید نہیں۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَلَمٍ لَا یَنْفَعُ اِنَّ اللّٰہَ اَمْرٌ یُّنْفَعُ بِہِ الْغَیْبُ۔ جو نفع منور ہو۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ عَلَمٌ مِّنْ مَا یَنْفَعُنِیْ اِنَّ اللّٰہَ اَمْرٌ یُّنْفَعُ بِہِ الْغَیْبُ۔ وہ علم عطا کر جو نفع بخش ہو۔ دنیا میں بھی اس سے فائدہ اٹھاؤں اور آخرت میں بھی فائدہ مند ہو۔ اسی بات کو فرمایا وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یُضُرُّہُمْ وَلَا یَنْفَعُہُمْ یَہْدُوْنَ اِلَیْہِ اِلٰہٌ یُّہْدِیْ سَبِیْلَہُمْ۔ جو نفع کی بجائے انہیں نقصان پہنچاتا ہے۔

فرمایا وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْکَرْتُمْ مَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ انہوں نے اس علم کے ذریعے کیا عزید ہے۔ یہ لوگ یاد رکھیں کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے۔ کہ آخرت میں ساحر کو اس علم کا کیا فائدہ ہوگا وہ تو اٹل عذاب میں مبتلا ہوگا۔ خاص طور پر اگر اس نے ایسا جادو کیا ہے۔ جس میں کفر و شرک پایا جاتا ہے۔ تو وہ یقیناً آخرت سے محروم ہے گا۔ اُسے فرمایا وَلِبِشْرِ مَا شَرُّوا بِہِ اَنْفُسُہُمْ۔ انہوں نے بہت ہی بُری چیز کے بدلے میں اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ ان کا یہ سودا بہت ہی خسارے کا سودا ہے۔ لَوْ کَانُوا یَعْلَمُوْنَ اگر ان میں کچھ بھی سمجھ ہوتی تو ایسا کام نہ کرتے۔

یہودیوں سے  
موافقت

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہودیوں کی بد اعمالیوں کا ذکر فرمایا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امت محمدیہ کا حال بھی اُن سے زیادہ مختلف نہیں ہے جب لوگ اللہ تعالیٰ کے دین سے غافل ہو جائیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کر دیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تنہی دامن ہو جائیں۔ تو پھر ہستی کی طرف ہی جانا ہوگا۔ آج انڈوپاک میں دیکھیں۔ دیگر ممالک پر نظر ڈال لیں۔ ہر طرف گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب الہی کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور دین کے لیے سچی وجہ کو ترک کر دیا گیا ہے۔ دین کا دار و مدار

عملیات پر رہ گیا ہے۔ اس کام کے لیے یہ عمل کر لو۔ اس کام کے لیے وہ وظیفہ کافی ہے  
علم و عمل ختم ہو چکا ہے۔ علمائے حق کا ایک مدہم سارا ٹھمکا ہوا ہے۔ دوزخ ساری دنیا کفر و  
ضلالت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اہل کتاب کی طرح ہماری امت میں بھی حق و باطل غلط ملط ہو چکا ہے۔ صحیح اور غلط  
کی پہچان ایک عام شخص کے لیے مشکل ہو چکی ہے۔ دیات میں حالات اور بھی خراب ہیں  
جہاں کے اہم کے فرائض میں نماز پڑھنا بھی ہے۔ اور مرنے کو غسل دینا بھی۔ بچے کی پیدائش  
پر کان میں اذان بھی دینی کہتے ہیں۔ حقیقت کے لیے جانور ذبح کرنا ہو۔ تو اہم صاحب کو بلایا جاتا  
ہے۔ اور اگر تعویذ گنڈے کی ضرورت پڑ جائے تو بھی میاں صاحب دیں گے۔ ان کا علم خطہ  
مجموعہ تعارفی مسائل تک ہوتا ہے۔ دین کے علم سے بچے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ غرض یہ  
حالات یہودیت سے مشابہت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت بھی  
پیلے لوگوں کے نقش قدم پر بالکل اسی طرح چلے گی۔ جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مشابہ  
ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

بعض علاقوں میں چار چار بکروں کا ایک ہی اہم ہے۔ جگہ ہم نے خود سفر میں ملاحظہ کیا۔ کہ  
ایک علاقہ میں پندرہ سات گاؤں کا ایک ہی اہم تھا۔ کہیں نکاح کرنا ہو۔ جنازہ پڑھنا ہو۔ وہی  
مولوی مستحب انجام دیں گے۔ تعویذ گنڈے کا کاروبار چل رہا ہے۔ نقش سیماں والی کتابیں ہیں۔  
لکھنؤ والے کی کتاب نفع المخلاتی ہے۔ یہ تعویذ گنڈے والی دہلوی کی کتاب۔ فائدہ ہے۔  
کسی مسئلہ کا حل مطلوب ہو۔ کتاب کھول کر معلوم کر لو۔ حتیٰ کہ چوری تک کی تفتیش عملیات کے  
ذریعے ہوتی ہے۔ یہ کالا علم حجاز چھوٹا وغیرہ عملی عملیات ہیں۔ یہ چیزیں یہودیوں میں سب  
تھیں اور آج ہم میں بھی یہی پائی جاتی ہیں جس میں صحیح و غلط بھی ہیں۔ جیسے سورۃ یسین کا ورد  
ہے۔ سورہ منزل کی روزانہ تلاوت ہے۔ رزق کی فراوانی کسی جائز چیز کے حصول یا کسی  
میں بہت سے رہائی کے لیے کسی کو کوئی اچھی بات بتادی۔ مگر عام طور پر یہ گنڈے تعویذ  
یہودیوں والے ہیں۔ ذرا کھوم پھر کے دیکھ لیں۔ ماہرین عملیات کے ہاں غورتوں کی جہاز ہے  
کوئی نہیں دیکھا کہ مقصد جائز ہے۔ یا ناجائز۔ کھر بے یا شرک۔ سب ایک ہی گاڑی میں

سوار چلے جا رہے ہیں۔ یہی یہودیت کی موافقت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوا وَاتَّقَوْا لَآ اَكْرَهُكُمْ عَلَيْهِمْ  
 كُنْ بِمَكَائِلِ اِيْمَانِ لَاتِے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔ شرک و بدعات سے اجتناب کرتے  
 لَمْثُوبَةٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ تُوَدَّ اللّٰهُ تَعَالٰی كے بتر اجر و ثواب کے مستحق  
 ہوتے۔ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ اگر انہیں علم ہوتا۔

---

البقرة

آیت ۱۰۴ تا ۱۰۷

انعام

درس چہل و دو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا  
وَلِكُفْرَيْنَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝۱۰۴ مَا يَوْذَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ  
الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ  
رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصِرُ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ  
الْعَظِيمِ ۝۱۰۵ مَا نَسَخَ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا  
أَوْ مِثْلَهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۱۰۶  
أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ  
مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝۱۰۷

ترجمہ: اے ایمان والو! امت کو راعی نہ کہو بلکہ کو نظرنا اور سنو اور کفر کرنے

والوں کے لیے دردناک عذاب ہے ۝۱۰۴ اہل کتاب اور مشرکین میں سے

جنہوں نے کفر کیا، وہ نہیں پسند کرتے، کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی

بھلائی اتاری جائے، اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ میں

کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ۝۱۰۵ جو ہم کسی آیت کو

منسوخ کرتے ہیں یا بھلائی دیتے ہیں تو ہم اس سے بہتر یا اس جیسی

آتے ہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۝۱۰۶

کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی

بادشاہی ہے اور تمہارے لیے اس کے سوا کوئی حمایتی ہے اور نہ مددگار ۝۱۰۷

رابطہ آیات

گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کی پستی اور غلطی کا ذکر تھا، کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی

کتاب کو پس پشت ڈال دیا، دین کی سر بلندی کے کام کو ترک کر دیا، جہاد سے منہ موڑ گئے

اور سحر جادو کرنے لگے جیسے سفلی اعمال کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا، انہوں نے ان برائیوں

خاص طور پر مکر کو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کیا جو کہ ان کی ذات کا انتہائی درجہ تھا۔  
 ان آیات میں اللہ جل شانہ نے بنی اسرائیل کی اخلاقی پستی کا ذکر فرمایا ہے جس کے  
 ذریعے وہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء علیہم السلام کو ذہنی تعصیف پہنچاتے تھے۔ یہودیوں نے اپنی  
 اس ذلیل حرکت کا ارتکاب نہ صرف سابقہ انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں کیا بلکہ حضور  
 خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں بھی اس حرکت سے باز نہ آئے۔ اور آپ  
 کو مختلف طریقوں سے ایذا پہنچائی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس حرکت کا تذکرہ کر کے  
 اہل اسلام کو خبردار کیا کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے معاذ اللہ نبی علیہ السلام کی تہ میں  
 کا پھلو نکلتا ہو۔

بنی اسرائیل کی  
 اخلاقی پستی

اس مقام پر جس خاص بات کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب یہودی آپ کی  
 مجلس میں آتے تھے تو آپ کی توجہ بند دل کرانے کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے  
 جو کہ اَنْظُرْنَا کا ہم معنی ہے مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری رعایت کریں یعنی ہماری طرف  
 توجہ فرمائیں۔ اَنْظُرْنَا کا معنی بھی یہی ہے آپ ہماری طرف نہ دیکھیں، نظر کریں۔ ہماری بات  
 غور سے سنیں۔ بظاہر دونوں الفاظ کا معنی ایک ہی ہے مگر یہودی اپنی گندی ذہنیت کے  
 اظہار کے لیے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اور پھر اس لفظ کو کھینچ کر اور گھما کر رَاعِنَا  
 بولتے تھے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: لَيْتَا يَا لِسِتِّهِمْ زَبَانٌ مِّنْ بَرٍّ يَحْمِلُ كَرَّ لُفْظِهِ  
 کرتے تھے جس کی وجہ سے رَاعِنَا کہتے یعنی ہمارا چہرہ واہ۔ مزید برآں یہودیوں کی زبان میں  
 یہ لفظ گال کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا جس کا معنی احمق اور بیوقوف ہے۔ گویا اس طرح یہ  
 لوگ اپنی گندی ذہنیت کا اظہار کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا کہ تم اہل کتاب کی پیروی نہ کرنا۔ ارشاد ہوتا ہے  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا ایمان والو! جب تم نبی علیہ السلام کی توجہ  
 اپنی طرف مبذول کرنا چاہو تو رَاعِنَا کا لفظ استعمال نہ کرو کیونکہ اس سے نفوذ باللہ نبی علیہ السلام

یہودیوں کی  
 عادات



کی توہین کا پہلا نکتہ ہے۔ اور نبی کی قربان کفر کے مترادف ہے۔

سورۃ مجادلہ میں یہودیوں کی ایک اور قبیح حرکت کو بھی ذکر آتا ہے جب یہ بد بخت حضور علیہ السلام کی مجلس میں آتے تھے تو السلام علیکم کی بجائے السلام علیکم کہتے تھے۔ سلام کا معنی موت یا ہلاکت ہے۔ گویا السلام کا لفظ بجا کر السلام کہتے تھے۔ اسی سے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب یہودی سلام کریں ان کے سلام کا جواب دیکم السلام کی بجائے صرف دیکم دیا کرو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ تم نے کہا۔ وہ تم پر ہی ہو یعنی اگر السلام کی بجائے السلام بولا جائے۔ تو یہ ہلاکت تمہیں نصیب ہو۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اسی حرکت کے متعلق فرمایا حَتَّىٰ لَا يَمْلَأَ لَكُمْ صِحْيُكُمْ بِمَا اللَّهُ يُهْدِي لَكُمْ سُبُلَ الْغَيْرِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ۔ جو اللہ تعالیٰ نے نہیں دی ہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو متنبہ فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کریں۔ جس سے آپ کی شان اقدس میں فرق آنے کا احتمال ہو۔ وَقُولُوا انظُرْنَا اور رَاعِنَا کی بجائے انظُرْنَا کہو۔ یعنی ہماری طرف نظر کر رہے ہیں۔

اہل ایمان  
کو خطاب

سورۃ بقرہ میں یہ پہلا موقع ہے جس میں اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے عام لوگوں کو خطاب ہوتا رہا ہے۔ جیسے يَا أَيُّهَا الْمَسَاكِينُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ۔ اے نفع انسان! اپنے رب کی عبادت کرو۔ یا بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا يٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ یعنی اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی۔ اب یہاں سے اہل ایمان سے خطاب ہوتا رہا ہے۔ اور پورے قرآن پاک میں اٹھائی مرتبہ اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے۔ شاد عبد العزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ سابقہ کتب سماویہ میں اہل ایمان سے براہ راست خطاب نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام سے خطاب ہوتا تھا۔ جو آئے اپنی اپنی امت تک۔ ختم الہی کو پہنچاتے تھے یہ صرف آخری امت کو شرف حاصل ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے براہ راست اہل ایمان کو خطاب کیا ہے۔

زولمزمند احمد میں یہ رویت ہے۔ اور امام بیہقی نے اسے شعب الایمان میں بھی بیان کیا ہے۔  
 کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور! مجھے کوئی نصیحت  
 فرمائیں۔ آپ نے فرمایا۔ اے عبداللہ! جب تم قرآن میں یہ خطاب پڑھو **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا**  
 تو پورے دل کے ساتھ توجہ ہو جایا کرو۔ یہ مجھ لیا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم سے براہ راست خطاب فرمے  
 ہیں۔ اس سے بڑی نصیحت اور وصیت کیا ہو سکتی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ یہ ایسی اہل چیز ہے کہ  
 پوری توجہ کے ساتھ ہر تن گوش ہو کر سنا کر کہ اللہ تعالیٰ کیا حکم فرما رہے ہیں۔ کس چیز کے کرنے کا  
 حکم ہے۔ اور کس چیز سے رک جانے کی بات ہے۔

الغرض! اس خطاب میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ حضور علیہ السلام کی توجہ بند دل کرنے  
 کے لیے **رَاعُوا** کا لفظ استعمال نہ کرو **كَيْدَ أَنْ تَطُوعًا** سے خطاب کیا کرو اس خطاب میں  
 امر اور نہی دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاکید فرمادیا **وَأَسْمَعُوا** یعنی جو حکم ہو  
 رہا ہے۔ اسے خوب غور سے سنو۔ کیونکہ یہ ایک بڑا اہم حکم ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ عام گفتگو میں مشتبہ الفاظ استعمال نہ کرو۔ کوئی شخص اپنے  
 غلام یا لونڈی کو عیندی اور اعمتی کہہ کر نہ پکارتے۔ لفظ **عَبْدٌ** سے شہرہ بدہم ہوتا ہے۔ کہ  
 پکارنے والا شاید اپنے آپ کو مجبور سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ مجبور تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے  
**عَبْدٌ** کا لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر معاملہ بالکل واضح ہونا چاہیے۔ کسی قسم کا شبہ نہیں رہنا  
 چاہیے۔ اسی طرح لونڈی کو بندی کہہ کر نہ پکارتے کی بجائے لونڈی کہہ کر پکارو۔ غلام اور لونڈی کو  
 فتائی اور فتاة کہہ کر بھی بلایا جاسکتا ہے۔ یعنی اسے جوان یا اسے لونڈی۔ حضور علیہ السلام نے  
 فرمایا۔ عبد کا لفظ اس لیے مناسب نہیں کہ **كُلُّكُمْ عَبْدٌ لِلَّهِ** کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندے  
 ہو۔ اسی طرح ساری عورتیں اللہ تعالیٰ کی بندیاں ہیں۔ یہ کسی انسان کے بندے یا بندیاں نہیں ہیں۔  
 لفظ **مَوْلَىٰ** بھی مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کو بلا تخصیص ہر جگہ استعمال کرنا  
 اشتباہ پیدا کر سکتا ہے۔ مولا کے کئی معنی ہیں جیسے دوست، صاحب، آقا، غلام، غلام

مشتبہ الفاظ کے  
 استعمال کی ممانعت

آزاد کرنے والا وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سمجھائی کہ اس لفظ کو غلط طور  
 مت استعمال کرو۔ جس سے شبہ پیدا ہوتا ہو۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام  
 نے فرمایا لَا تَقُولُوا لِلْعَنْبِیِّ الْكَرِّمِ یعنی انگوڑ کو کرم مت کہو بلکہ عنب کہو۔ یا جلد کہہ سکتے ہو۔  
 اس کی وجہ یہ ہے کہ کرم تو مومن کا بدلہ ہے۔ جس میں ایمان پایا جاتا ہے۔ اور جس میں اخلاق حسنہ  
 ہوتے ہیں۔ ایسی چیز کو انگوڑ کے معنوں میں استعمال کرنا درست نہیں۔ انگوڑ سے عام طور پر شراب  
 تیار کی جاتی ہے۔ جب لوگ شراب کی تعریف کرتے ہیں۔ تو اس میں جب کرم کا نام آتا ہے  
 تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شراب کرم یعنی بخشش اور فیاضی سے کشیدہ کی گئی ہے۔ لہذا اس  
 لفظ سے بالواسطہ شراب کی تعریف ہوتی ہے۔ لہذا انگوڑ کے لیے کرم کا لفظ استعمال کرنے  
 سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم  
 کے لیے لفظ انگوڑ  
 کا استعمال درست  
 نہیں

لہذا یہ لفظ انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی راہنمائی کرنے والا ہے۔ بلاشبہ پیغمبر بھی امت  
 کی راہنمائی کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ ہے جو ہر قسم کے راہنما کے لیے استعمال ہوتا ہے۔  
 عام طور پر اس کا اطلاق سیاسی لوگوں پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ اخلاقی اقدار اور دیانتداری سے بے بہرہ  
 ہوں اور خواہ ان کی فکر بھی فاسد ہو۔ اہل اسلام میں سے ہوں یا غیر مسلم۔ متقی ہوں یا فاسق۔ غرض  
 یہ لفظ سب کے ساتھ یکساں طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور بین الاقوامی طور پر یہ لفظ چرچل برٹین  
 ڈیگال۔ آئین وغیرہ قسم کے لوگوں پر بولا جاتا ہے۔ لہذا اس قسم کا مشتبہ لفظ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ  
 وسلم کے ہرگز شایان شان نہیں۔ ہمارے زمانے کے بعض مفسرین نے اپنی تصانیف میں یہ لفظ  
 حضور علیہ السلام کے لیے استعمال کیا ہے۔ جو قطعاً نامناسب ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا  
 کہ مشتبہ لفظ کسی عام چیز کے لیے بھی استعمال نہ کیا جائے چہ جائیکہ خود حضور والامفات علیہ السلام  
 کی ذات اقدس کے لیے ایسا لفظ بولا جائے۔ پیغمبر کے لیے انگریزی کے متبب دل الفاظ

MESSSENGER پیغمبر پر اُفٹ (PROPHET) وغیرہ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

الغرض فرمایا کہ نبی علیہ السلام کی ذات کے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کرے جو آپ کی شان کے خلاف ہو بلکہ

کوئی ایسا کہ جسے زیادہ کمزور لکھتے ہیں عَذَابٌ أَلِيمٌ کہہ کر کہنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب

تیار کر رکھا ہے۔

فَرِادَ مَا يَعْبُدُونَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَزْيُتُونَ  
 عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ هَا اہل کتاب میں سے جو یا مشرکین میں سے وہ  
 نہیں پسند کرتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی بہتری کی چیز آ رہی ہو۔ یہ کہ  
 میں ابو جہل، ابوسب، عبیدہ اور شیبہ جیسے بڑے بڑے سردار تھے۔ وہ حضور علیہ السلام سے حسد  
 کرتے تھے کہ اگر وہ آپ کو نبی تسلیم کر لیتے تو ان کی سرداری حضور علیہ السلام کو منتقل ہو جاتی تھی۔ اور وہ  
 بزعیم خویش ناپسند ہو کر رہ جاتے تھے۔ دوسری طرف اہل کتاب تھے جو امید لگائے بیٹھے تھے کہ نبی  
 آخر الزمان بنی اسرائیل میں آئے گا۔ جب آخری نبی ہونے کا دعویٰ بنو اسماعیل کے قبیلہ قریش  
 میں سے ہوا۔ تو وہ بھی حسد کی آگ میں جلنے لگے لہذا انہوں نے آپ کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبی تسلیم  
 کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی رکوع میں آگے آئے گا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ  
 انہوں نے حسد کیا اور ایمان کی دولت سے محروم ہے اسی لیے فرمایا کہ اہل کتاب اور مشرکین  
 نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک آپ پر نازل ہو۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہاں پر تمہاری خواہشات اور  
 توقعات کی بات نہیں بلکہ واللہ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ اللہ تعالیٰ  
 جسے چاہے اپنی رحمت کیلئے ناس لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے اس نے یہ پسند کیا کہ اپنی رحمت  
 خاصہ بنو اسماعیل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر نازل فرمائے۔ اس سے پہلے  
 اللہ تعالیٰ بنو اسماعیل پر بے شمار رحمتیں نازل کر چکا ہے۔ اس قوم میں بڑے بڑے بادشاہ اور  
 جلیل القدر مول بھیجے۔ اِذْ جَعَلْنَا فِيكُمْ رَحْمَةً وَجَعَلْنَاكُمْ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا  
 تفصیل تذکرہ کسی گزشتہ درس میں گزر چکا ہے۔ اس قوم میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں نبی  
 مبعوث فرمائے۔ اور کتنوں کو بادشاہت بھی عنایت کی۔ ایسی حکومت اور بادشاہت  
 جو دنیا میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ تو اب کیا اللہ تعالیٰ نے کوئی وعدہ کر رکھا ہے۔  
 کہ نبوت بنو اسماعیل سے باہر نہیں جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اسی میں ہے کہ سلسلہ نبوت

کو بنو اسماعیل پر ختم کرنا تھا۔ لہذا سن میں بڑا سختی کے لیے حسد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے

تشیخ نبات  
کی وجوہات

بنی اسرائیل اور سترکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ جب قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ پہلی کتابوں کا مصدق بھی ہے۔ تو پھر یہ سابقہ کتب کے احکام کو منسوخ کر کے نئی تربیت کیوں نافذ کرتا ہے۔ نیز پہلے ہی احکام کو بعض اوقات تبدیل کر دیتا ہے۔ بقول ان کے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ معاذ اللہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو معطلے کا پوری طرح علم نہیں ہوتا تو حکم جاری کر دیتا ہے۔ مگر جب اس کا پوری طرح علم ہو جاتا ہے۔ تو حکم میں ترمیم کر دیتا ہے۔

دیانندہ سرسوتی ہندوؤں کی آریہ سماج تنظیم کا مشور لیڈر ہوا ہے۔ اپنی نوعیت کا شہرت پسند آدمی تھا۔ یہی اعتراض — اُس نے اپنی کتاب میں بھی کیا تھا کہ کسی پہلے ہی حکم کو منسوخ کر دینا جہالت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا جواب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیا تھا کہ احکام کی تشیخ جہالت کی بنا پر نہیں بلکہ حکمت کی بنا پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ عظیم و حکیم ہے۔ اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر حکم حالات کے تقاضوں کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ جب حالات متغیروں ہوتے ہیں۔ تو پہلا حکم منسوخ کر کے دوسرا جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح بیان کی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر یا حکیم کسی مریض کو صبح کے لیے اور دوا دیتا ہے اور شام کے لیے دوسری۔ یا ایک ہفتہ ایک دوا استعمال کراتا ہے تو دوسرے ہفتے کے لیے کوئی اور تجویز کرتا ہے۔ کیا ڈاکٹر یا یو فون ہے یا جابل جو مختلف اوقات کے لیے مختلف دوا تجویز کرتا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر مریض کے حالات کے مطابق دوا کو منسوخ کر دیتا ہے یا تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی کسی قوم کے حالات کے تقاضے کے مطابق احکام نازل فرماتے ہیں۔ جیسا کہ ضرورت ہوتی ہے۔ بعض احکام کو تبدیل کر دیتے ہیں یا اپنی حکمت کی بنا پر احکام میں ترمیم کرتے ہیں۔ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو کہ تمام اقوام کے لیے خیال طور پر نافذ العمل ہے۔ لہذا اس نے

پہلے مترائع کو منسوخ کر کے بعدی احکام نافذ کر دیے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ دین تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ یہ کبھی منسوخ نہیں ہوا۔ البتہ مختلف مترائع میں بعض اختلافات رونما ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً کسی شریعت میں اونٹ کا گوشت حرام تھا۔ ہماری شریعت میں حلال ہے۔

\_\_\_\_\_ کسی شریعت میں درگاہ نہیں ایک نسخ میں آئی تھیں یہاں  
اں حرام ہے: اَنْ يَّجْمَعُوا بَيْنَ لَوْحَتَيْنِ الْبَتَّ دین کے بنیادی اصول کبھی منسوخ نہیں ہوئے  
تین آیت کو ایک دوسری مثال سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ کوئی نئی امور میں جوں جوں  
حالات بدلتے ہیں۔ احکام بھی بدلتے جاتے ہیں جب انسان بچہ ہوتا ہے۔ تو اس کی ضرورت  
اس کی عمر اور اس کے حالات کے مطابق ہوتی ہیں۔ جب جوان ہوتا ہے۔ تو اس پر دوسرے  
احکام نافذ ہوتے ہیں۔ پھر جب بوڑھا ہو جاتا ہے۔ تو حالات کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ اسی  
طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بھی اتمام عالم کے حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہوتے  
رہتے ہیں۔ یہ ایسی اعتراض والی بات نہیں ہے۔

الغرض ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا لَكُمْ كَيْتٌ كَوْنٍ  
منسوخ نہیں کرتے یا اسے نہیں بھلا دیتے۔ نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا مَكْرُمٍ اس سے بہتر  
آیت یا حکم لے آتے ہیں اور مثلاً یا کم از کم اُس جیسا ہی لے آتے ہیں۔ نیا حکم بہر حال پہلے  
سے بہتر ہوتا ہے۔ بکتر نہیں ہوتا۔ بہتر سے مراد یہ ہے کہ نیا حکم پہلے کی نسبت اجر میں بہتر ہوتا  
ہے۔ آیت یا حکم بھلا دینے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کے ذہن سے ایسی آیت فراموش کر دی جائے  
آیت کا یاد کرنا یا بھلانا اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے۔ سورۃ اعلیٰ میں فرمایا سَنُقَرِّئُكَ  
فَلَا تَنْسَىٰ ہم عنقریب آپ کو اس طرح پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں گے نہیں اِلَّا مَا شَاءَ  
اللہ اُن جس کو اللہ بھلانا چاہیں۔ وہ آپ بھول جائیں گے یہاں یہ بھی نَسِیَہَا کا مطلب  
یہ ہے کہ جس حکم کو تبدیل کرنا مقصود ہوتا ہے اُسے نکلتا منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ یا اُسے



پھر پیر علیہ السلام کے ذہن سے محو کر دیا جانتے۔ فَرَايَا اَلْوَقْتُكُمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنی محنت اور فشار کے مطابق آیت نازل کرتا ہے۔ بعض کو قائم رکھتا ہے۔ اور بعض کو منسوخ کر دیتا ہے پھر اُن سے بہتر یا اُن جیسی اور اُن سے آگے۔ ایسا کرنا محض و نقل کے خیالات نہیں ہے۔ بلکہ اس پر اعتراض کرنا حماقت کی نشانی ہے۔

پھر فرمایا اَلْوَقْتُكُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اے مخاطب! کیا تم جانتے نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔ جب وہ مالک الملک ہے۔ تو کیا اُسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ کسی حکم کو منسوخ کر دے یا تبدیل کر دے۔ معاذ اللہ کیا وہ مجبور ہے کہ ہر حالت میں ایک ہی حکم کو جاری رکھے۔ اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی حاکمیت کو ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لہذا وہ تین ہی احکام پر پورے ہی طرح قادر ہے۔ اور یہ اس کا حق بھی ہے۔

فرمایا اور کھو! کہیں جبکہ نہ جانا وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ وَلٰىٍ وَلَا نَصِيرٍ اس کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور مددگار نہیں ہے۔ ولی کا معنی عام طور پر سرپرست ہوتا ہے۔ اب بیضاوی فرماتے ہیں کہ بعض اوقات سرپرست کمزور بھی ہوتا ہے۔ جو کہ مدد کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ مگر نصیر وہ ہوتا ہے۔ جو فی الواقع مدد کے قابل ہو۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ مدد دے گا۔ جو نہ بانی طور پر مدد کرتا ہے۔ در نصیر وہ ہے جو عملی طور پر مددگار ثابت ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ ان دونوں صفات کا مالک ہے۔ وہ اپنی مخلوق کا ہر طرح مددگار ہے۔ وہ قادر مطلق بھی ہے نور عظیم کل بھی ہے۔ جو اس حکم چاہے نافذ کر دے اور جسے چاہے منسوخ کر دے اس کے ارادہ اور قدرت میں کوئی دوسرا مغل نہیں ہو سکتا۔ وہ خود ہی احکام جاری کرتا ہے۔ اور اپنی ہی مشیت سے بعض کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس پر اعتراض ناممکن ہے۔

أَمْ تَرْيَدُونَ أَنْ نَكْفُرَ بِرُسُوفِكُمْ كَمَا سَبَلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ  
وَمَنْ يَتَّبِعْ ذُلَّ الْكُفْرِ يَأْتِ بِإِيمَانٍ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ  
⑩ وَكَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ  
إِيمَانِكُمْ كَفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ أَفْكَرٍ  
مَّا بُكِنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرٍ  
إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ⑪ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ  
وَمَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَحَدُّهُ عِندَ اللَّهِ  
إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ⑫

ترجمہ: کیا تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ اپنے رسول سے ایسی طرح سوال کرو جس  
طرح اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا۔ اور جو شخص ایمان کے بدلے میں کفر  
اختیار کرے گا، وہ میدانِ راستے سے گمراہ ہو گیا ⑩ اہل کتاب میں سے بہت  
سے پسند کرتے ہیں کہ مومن ہونے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پلٹدیں۔ اپنے  
نفوس میں حسد کرتے ہوئے۔ بعد اس کے کہ ان کے لیے حق ظاہر ہو گیا ہے۔  
پس درگزر کرو، اور معاف کر دو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ  
ہر چیز پر قادر ہے ⑪ اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے ہو اور بھلائی میں سے  
جو کچھ تم اپنے نفوس کے لیے اگے بھیجو گے۔ اس کو اللہ کے پاس پارو گے۔  
اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام کو دیکھنے والا ہے۔ ⑫

ربط آیات  
بنی اسرائیل کی غزالیوں کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ  
نے اہل ایمان کو راعیٰ کا لفظ استعمال کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس کی بجائے اُنھوں نے  
استعمال کرنے کا حکم دیا تھا۔ کیونکہ یہودی دید و راستہ راعیٰ کا لفظ بولتے تھے۔ جس سے

معاذ اللہ یہ غیر علیہ السلام کی توہین کا بیونہ تھا۔ لہٰذا دریں میں اس بات کا انکشاف بھی کیا گیا تھا کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کوئی نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان پر کوئی بہترین نازل فرمائے۔ یہ لوگ نبی کے ساتھ حسد کرتے تھے۔ پھر انہوں نے قسح آیات کا مسئلہ بھی اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ ایک حکم جاری کرنے کے بعد اُسے منسوخ کیوں کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ایسا کسی لاعلمی یا جہالت کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ جس طریقے پر نزع انسانی کی بھلائی چاہتا ہے۔ اس کے مطابق شریعت نازل فرماتا ہے۔ اسکی مثال ایسے ہی ہے۔ جیسے ایک ڈاکٹر کسی مریض کو مختلف اوقات میں مختلف دوائیں دیتا ہے۔ کسی کو منسوخ کر دیتا ہے۔ کسی کو تبدیل کرتا ہے اور کسی کو جاری رکھتا ہے۔ یہ مریض کے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی لوگوں کے حالات کے مطابق شریعت میں رد و بدل فرماتے ہیں۔ وہ ملک الملک جس طرح چاہتا ہے حکم نازل فرماتا ہے۔ اس کے کسی حکم پر اعتراض کرنا اس کے قادر مطلق ہونے پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔

یہودیوں کے  
سورۃ

ان آیات میں یہودیوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم نبی آخر الزمان سے ایسے سوالات نہ کرتے جو جیسے تمہارے آباء اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے۔ ارشاد ہوتا ہے اَفَرَأَيْتُمُودُ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۚ فَمَنْ كَرِهَ فِئْتِ  
ہیں یعنی کہ اس آیت میں روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہی ہے۔ یہی لوگ حضور علیہ السلام سے طرح طرح کے یہودہ سوالات کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ان سے سوال کرتی ہے۔ اُن کے سورۃ ناریں اس کی تفصیل آئے گی ۚ يَكُذِّبُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُلْقِيَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَاءِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَأَلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ أَنْ يُخْرِجُوا مِنْ دَارِهِمْ ۚ قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِمَا نُهَىٰ نَبِيُّكُمْ عَنْ ۚ فَمَنْ كَرِهَ فِئْتِ  
کہ آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب بیک وقت اکٹھی کیوں نہیں لاتے۔ جیسا کہ تورۃ منجمل طور پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ آپ ان کے سوالات کو رد فرمادیں نہ ایسے ۚ فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرُ مِنْ ذَلِكَ ۚ إِنَّ يَهُودِيَّ

نے تو نبی علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا سوال کیا۔ کہنے لگے اَرِخَا اللّٰهُ جَهَنَّمَ اَبَشْرَ تَعٰلٰی سے ہماری بالمشافہ ملاقات کرانیں۔ تب ہمارے منہ سے نکلا اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب انا ہی ہے سورۃ بقرہ میں بھی اس قسم کے سوالات گزر چکے ہیں۔

مشرکین کے  
سوالات

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت کے مخاطبین اہل کتاب کے علاوہ مشرکین بھی ہیں۔ ان کے یہود و سوالات کا تذکرہ بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات میں موجود ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل کے مطابق انہوں نے نبی علیہ السلام سے فرشتہ کی کر آپ یسریٰ لگا کر ان پر چڑھ جائیں۔ اور پھر وہاں سے کتاب لائیں۔ مکے کی سرزمین کو باغات میں تبدیل کر دیں۔ آپ کے ارد گرد فرشتوں کی جماعت ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ خود ہمارے سامنے آکر آپ کی رسالت کی تصدیق کرے وغیرہ وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے تمام سوالات کا ایک ہی جواب دیا۔ قَدْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلُكَ یعنی میں انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ میں نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ میں قادر مطلق ہوں اور جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہے۔ وہ جو چاہے کرتا ہے۔ مقصد یہ کہ یہود کی طرح مشرکین بھی طرح طرح کے سوال کرتے تھے۔ اس قسم کے سوالات کا مقصد محض ختمہ چینی ہوتا ہے اور کسی بات کو تسلیم نہ کرنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے

صریح کفر ہی

فرمایا اس طرح کے بے معنی سوالات نہ کیا کرو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہوگا۔ وَمَنْ يَتَّبِعْ اِلَ الْكَفْرِ يَنْتَهِ اِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ اِيْمَانٌ كَيْفَ يَكْفُرُ بِمَا كَفَرَ يَكْفُرًا عَظِيْمًا۔ فَتَدْخُلُ سِوَاءَ السَّبِيلِ۔ دوسرے راستے سے بٹک گیا گمراہ ہو گیا۔ کیونکہ اعتراض برائے اعتراض اور وہ بھی ایذا رسانی کے لیے کھلی گمراہی اور کفر ہے۔ یہاں پر اگر یہ روئے سخن اہل کتاب اور مشرکین کی طرف ہے۔ تاہم بات اہل ایمان کو بھی سمجھائی جا رہی ہے۔ کہ جو بھی اس قسم کے یہود و سوالات کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام کے احکام کو تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ بہر حال راستے سے بٹک جائے گا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اَمْرٌ شَرِیْعٌ دُونَ کَسَے مخاطب اہل ایمان میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو یہود و اور مشرکین کی روش سے خبردار کیا ہے کہ تم ان کے طریقوں کو نہ اپناؤ یعنی تم بھی اپنے نبی آخر الزماں علیہ السلام کے علاوہ سوالات نہ کرنا جس طرح اس سے پہلے اہل کتاب نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے اور ان سوالات کی وجہ سے انہیں طرح طرح کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ غزوہ جین کے موقع پر حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ مشرکین ایک خاص قسم کے بدست کو تبرک خیال کرتے ہیں۔ اس بدست کے ساتھ اپنے اکلہ بات نکالتے تھے۔ اس کو ذات اوطا کہتے تھے۔ یہ دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضرت! اجْعَلْ لَنَا ذَاتَ الْاَوْطَا آپ ہمارے لیے ایسی کسی بدست کو ذات اوطا مقرر فرمادیں جس پر ہم اپنے بتیاریں لٹکایا کریں۔ جیسا کہ مشرک کرتے ہیں۔ آپ یہ سن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا سُبْحَانَ اللَّهِ یہ تو اس قسم والی بات ہوگئی۔ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں بکروں کا قلم جو کیا تو ان میں ایک قوم کو یہاں یَعْلَمُونَ عَنْ اَصْنَابِ لَهْمٍ حُرٌّ جَوینے معبودوں پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی پوجا کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بنی اسرائیل نے بنی حضرت موسیٰ علیہ السلام

سے عرض کیا یَمُوسٰی اجْعَلْ لَنَا اِلَهًا کَمَا لَہُمْ اِلٰہَةٌ جس طرح ان لوگوں نے اپنے معبود بنائے تھے میں اسی طرح ہمارے لیے بھی معبود مقرر کر دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے ناراض ہوئے اور کہا ہے یہ قوت قوم! یہ لوگ تو کفر میں مبتلا ہیں۔ کیا تم بھی اسی طاقت میں پڑنا چاہتے ہو؟ ابھی اللہ تعالیٰ نے تمہیں طاقتور دشمن سے آزادی دلائی ہے۔ تو پھر کفر و شرک میں مبتلا ہونا چاہتے ہو۔ بلا وجہ ناجائز سوال نہ کیا کرو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ بہت کم سوال کیا کرتے تھے۔ کیونکہ سورۃ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے کثرت سوال سے منع فرمادیا۔

لَا تَسْأَلُوهُنَّ عَنْ شَيْءٍ اِنْ سَبَدَ لَكُمْ تَسْأَلُوهُنَّ فَانْ كَسَلُوا عَنْهَا حَتَّىٰ يُبَيِّنَ  
 الْقُرْآنُ شَيْءًا لَّكُمْ ۚ يَعْنِي نَزُولَ وحی کے زمانے میں سوال نہ کیا کرو۔ اگر بعض چیزوں  
 کے متعلق سوال کرو گے، تو وہ ظاہر کر دیں گے گا۔ اور تم کو ناگوار گزرتے گا۔ مگر اس سے  
 بنامی کا باعث ہوگا۔ اس میں صیغہ کثرت سوال سے اجتناب کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے صحابہ کرم  
 صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال نہیں کیا  
 کرتے تھے۔ یہاں کرنے سے ڈرتے تھے۔ ان کی خواہش ہوتی تھی کہ باہر کا کوئی اغرابی سوال  
 کرے تو وہ بھی مستفید ہوں۔ خود سوال کرنے میں بہت محتاط ہوتے تھے۔ قرآن پاک میں کل  
 بارہ سوالات کا ذکر آتا ہے۔ جو صیغہ کثرت نے حضور علیہ السلام سے کیے۔ ان میں یَسْأَلُونَكَ  
 عَنِ الْخَمْرِ اور یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَمَنِ یَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ وغیرہ ایسے  
 سوالات شامل ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رشا دگر می ثبت۔ اسے لوگوں نے  
 اور بے مقصد سوال نہ کیا کرو۔ کیونکہ پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کَثْرَةُ مَا يَسْأَلُونَ  
 فَخَرَجَتْ مِنْهُمْ عَلَىٰ اَنْ تَسْأَلُوا كَثْرَتِ سَوَالِ كِی وجہ سے انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے  
 اختلاف کیا اور ہلاک ہوئے۔ لہذا کثرت سوال سے بچو۔ ہاں کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے یا کسی  
 کام کے جواز یا عدم جواز کے لیے سوال کرنے کی ممانعت نہیں۔ زیادہ سوال کرنے میں قباحت  
 یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا جواب تمہیں ناگوار گزرتے یا بنامی کا باعث ہو۔ اکثر  
 سوال محض نکتہ چینی یا ایذا رسانی کے لیے کیے جاتے ہیں۔ اس سے منع کیا کہ اے اہل ایمان! تم  
 یہودیوں کی روش پر نہ چلو اور کثرت سوال سے اپنے آپ کو بچنا

مسلمانوں کو سوالات کی ممانعت کی ایک وجہ تھی کہ اہل کن بے عملانوں کو اکستے تھے  
 کہ اپنے نبی سے یہ سوال پوچھو، اور اس سے ان کا مقصد فتنہ پردازی ہوتا تھا۔ اہل ایمان کو  
 یہ بھی نصیحت ہے کہ وہ یہودیوں کی باتوں پر اعتماد نہ کریں۔ پسے گزرتے ہیں کہ لوگ



سحر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی فضول باتیں کرتے تھے جس سے مسلمانوں کے دلوں میں  
شہ ڈالنا مقصود تھا۔ تاکہ اہل ایمان اسلام سے دستبردار ہو جائیں۔ اس کی سازشوں سے محفوظ  
رہنے کے لیے فرمایا کہ ان پر اعتماد کرتے ہوئے ایسے معنی سوال نہ پوچھ کر دو۔

اہل کتاب کے  
باطنی انداز

مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے اردو سے بڑے خدناک میں وَذَّكَشْتُو  
مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كَغَارِجُ النَّحْلِ سَتَعْلَمُ اہل کتاب  
چاہتے ہیں کہ تمہیں پھر ایمان سے کفر کی طرف لوٹا دیں۔ وہ ہر وقت اسی کوشش میں لگے  
ہوتے ہیں کہ کسی طرح مسلمان کمزور ہو جائیں۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں۔ وہ بھی اپنے سابقہ دین  
پر پلٹ جائیں۔ یہ تو نزول قرآن کے زمانہ کی بات ہے۔ کہ اہل کتاب مسلمانوں کو پھٹا چھوڑنا  
نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی یہ کوششیں بجز ناکام جاتی رہیں۔ کہ کسی طرح مسلمانوں کو دوبارہ  
کفر کی طرف لوٹا دیا جائے۔ دنیا میں جتنی مشنریاں کام کر رہی ہیں۔ یہ سب اسی کام کے لیے  
ہیں۔ دوسرے مقام پر آئے ہیں: فَتَكُونُونَ سَوَاءً سب برابر ہو جائیں۔ جس طرح  
وہ خود گمراہ ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی ان کی روش پر عمل نہیں۔ جس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ  
کی کتاب اور انبیاء علیہم السلام کا انکار کیا۔ اسی طرح مسلمان ان کو نہ مانیں۔ اہل کتاب کی دل  
خواہی یہی ہے۔

فرمایا اہل کتاب کی اس گندنی فرہیت کے نیچے ان کی ایک اور خباثت کا ذکر ہے  
یعنی حَذَّاقُنْ عِنْدَ أَنْفُسِهِمْ اِنَّ اُنْكَارَ اُنْہُمْ مِّنْ تَحِيُّبٍ اِلٰی سُلٰطٰنٍ اَوْ اٰمِلٍ  
کے خلاف ابھار رہا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ وہ ایسا کسی غلط فہمی یا لاطمی کی بنا پر نہیں  
کرتے۔ بَلْ هُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا كَانَتْ تِلْكَ الْحَقُّوْنَ فَيَسْبِقُوْهُمْ اَعْلٰنٌ مِّنْ بَعْدِ  
کہ سب سے ہیں۔ انہیں حق اور باطل میں تمیز ہو چکی ہے مگر خدا اس بات پر کرتے ہیں کہ نبی  
آخر الزمان نسل اللہ علیہ وسلم کو باغی کی بجائے بنی اسحاق میں کیوں نہیں آیا۔

حمد بہترین  
بیاری ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تہود و بدو کی بنا پر ہوتا ہے۔ اور لایہ کہ قدر نعمت غلال

کو کبروں ملی ہے اور پھر اس کے زوال کی تمنا کی جاتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ فداں نعمت اس کی بجائے لمحے طنی چاہیئے، ایسی خواہش کرنا حرام ہے، یہ اخلاقی بیماری ہے۔ ابن، جب شریف کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: **إِنَّ لِّلْحَسَدِ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا يَأْكُلُ النَّارُ الْخَطِيئَةَ** یعنی حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح خشک لکڑی کو آگ کھا جاتی ہے، حسد اتنی بڑی چیز ہے۔

امیر بن ابی صلت عرب کا عظیم شاعر اور حکیم تھا۔ خدا کو مانتا تھا، قیامت کا تصور ذہن میں موجود تھا، اسی لیے سنیہ مذہب کا متلاشی تھا، کبھی تو رات کا مطالعہ کرتا کبھی انجیل پڑھتا کبھی اہل کتاب سے گفتگو کرتا، تاکہ حق کو پاسکے، مثلاً جب اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا، تو یہ شخص حسد کی آگ میں جلنے لگا، یہ بات حق کہ وحی میں پناہ دی ہوئی، محض حسد کی وجہ سے دین خالص کا مخالف ہو گیا، اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی۔

حسد کو قطعاً حرام ہے۔ اہل غنہ یا شک جائز ہے، غنہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے پاس نعمت دیکھ کر تن کرے کہ اللہ تعالیٰ اُسے بھی ایسی نعمت سے سرفراز فرمائے حسد کا معنی تو یہ ہے کہ جس کو کوئی بستی ملی ہے وہ اس سے محروم ہو جائے، مگر غنہ میں کسی کے زوال کی تمنا نہیں ہوتی بلکہ اس کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔

بزرگان دین فرماتے ہیں **مَا خَلَقَ جَسَدًا عَنْ حَسَدٍ** عام طور پر کوئی جسم حسد سے خالی نہیں ہوتا، اسی لیے توہذ کی تعین کی گئی ہے: **وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ** اے اللہ میں عاصد کے حسد سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ہر حال حسد ایک بہت بڑی بیماری ہے اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

جیسا کہ عرض کیا، غیر مسلم اقوام میں مسلمانوں کے خلاف حسد کی آگ نزول قرآن کے زمانے سے لے کر آج تک برابر بھڑک رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ کی حیاتی طاقتیں اردوں مدپیہ اس مقصد کے لیے خرچ کر رہی ہیں

غیر مسلم  
عاصد اقوام

کو کسی طرح مسلمان قوم کا تعلق قرآن پاک سے منتزع کر دیا جائے۔ مستشرقین کا فتہ اسی مقصد کے لیے کام کر رہا ہے۔ امیر شکیب ارسلانؒ نے الحاضری العالم الاسلامی جو ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ یورپی عیسائیوں اور یہودیوں نے بغیر اصلی اللہ علیہ وسلم کی سیرطریقہ کو نسخہ کرنے سے قبل قرآن پاک کی تردید میں چھ لاکھ کی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں تاکہ مسلمان اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اگر عیسائیت یا بھی مستہول کریں تو کم از کم مسلمان کی حیثیت میں باقی نہ رہیں۔ مشنری سکول، ہسپتال وغیرہ سب اسی مقصد کے لیے چلے رہے ہیں۔ لوگوں کو ایچ دیو عیسائیت کی طرف مائل کیا جا رہا ہے۔ یہ اسی حسد کی بنا پر چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا تعلق اپنے نبی سے کٹ جائے۔ اور یہ قرآن پاک کی تعلیمات کو چھوڑ دیں۔

مہرجم  
پہلے اعتراض

مہرجم کا الگ بھی یہودیت کا شاخ نہ ہے۔ اس شخص کی خباثت کی داد دوس نے فیڈرل شریعت کورٹ میں دھونی ڈال کر کیا ہے۔ کہ مہرجم کی سزا کو کالعدم قرار دیا جائے۔ لیکن بقول اس کے یہ شرعی مد نہیں ہے۔ مقصد یہ کہ لوگ شوک و شبہات میں مبتلا ہو کر دین سے بیزار ہو جائیں۔ غارتیوں نے بھی یہی اعتراض کیا تھا۔ اور آج کے زمانے کے پرویزی اور چکراونی بھی اسی قماش سے ہیں۔ کہ قرآن پاک میں مہرجم کی سزا نہیں ہے۔ بمبئی ایسیج سنسٹ میں تو موجود ہے۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں مہرجم کے متعدد گیس ہوئے۔ صیہ کہ ام غم کے زمانے میں مہرجم کی سزا دی گئی۔ اگرچہ عام طور پر مہرجم کی سزا قرار مجرم پر ہی دی گئی۔ تاہم اکتے دسے ایسے واقعات بھی پیش آئے۔ جن میں گروہی کی بنیاد پر مہرجم کی سزا دی گئی۔ اس زمانے میں کسی کو مہرجم کی سزا ملی ہو یا نہ۔ یہ الگ بات ہے۔ مگر اس کے شرعی مد ہونے سے مجال انکار نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک کے  
خلاف سازش

مستشرقین جنہیں محقق اور ریسرچی سکالر کا نام دیا جاتا ہے۔ انہوں نے قرآن پاک اور مہرجم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ختم سچینی کی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے بدظن ہو جائیں۔ فیڈرل سنسٹون نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں بر ملا کہا تھا کہ محمد کی کتاب قرآن اور ان کی قوار انسانیّت کی دشمن میں (العیاذ باللہ) اس نے قرآن پاک ہاتھ میں لیکر کہا تھا۔ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے۔ یہ دنیا مذہب نہیں بن سکتی۔ لہذا

اس کی عزت و توقیر لوگوں کے دلوں سے مٹا نہ ہوگی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو فحاشی سے روکتی ہے۔ اور فحاشی اور عیاشی کے بغیر تہذیب نہیں آسکتی۔ ان کے نزدیک انسان مذہب نہیں کھلا سکتا۔ لہذا ان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ کسی طرح قرآن پاک کو دنیا سے محو کر دیا جائے۔

فرمایا بہت سے اہل کتاب یہ پسند کرتے ہیں کہ تمہیں کفر کی طرف پٹا دیں۔ ایمان کے بعد احمد کرتے ہوئے بعد اس کے کہ حق واضح ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو تعین کی جا رہی ہے کہ اہل کتاب کے خلاف کسی قسم کا انتقامی جذبہ ذہن میں نہیں رکھنا۔ بلکہ فَاَعْتَنُوا لِنَفْسِكُمْ اور وَاَصْحَابُ الْاٰيَاتِ اللہ بامسیرہ دے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم سے آئے۔ گویا مسلمانوں کو انتقامی کارروائی کی بجائے حکم الہی کا انتظار کرنے کو کہا گیا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا۔ اور مدینہ طیبہ بلکہ پورے عرب کو یہودیوں اور نصرانیوں سے پاک کر دیا گیا۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وقت آنے پر وہ ان بدعظمتوں سے مواخذہ کرے گا۔

نماز اور زکوٰۃ

اہل کتاب کی طرف سے جو کس بننے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے فرائض پر کلام بند بننے کی تلقین بھی فرمائی۔ وَارْقِئُوا الصَّلٰوةَ وَاتُوا الزَّكٰوةَ نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ تمہاری طاقت کا منبع یہی دو چیزیں ہیں۔ انہیں مضبوطی سے تھام لو۔ تمہاری تمام تر قوت کا دار و مدار تعلق باللہ پر ہے۔ اور نماز۔ زکوٰۃ اس کا منظر ہے نماز کسی حالت میں بھی عافیت نہیں۔ اسے وقت پر ادا کرتے رہو۔ اور اگر صاحب نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کرو۔ بخل جیسی قبیح بیماری کا یہ بہترین علاج ہے۔ اسے کبھی نظر انداز نہ کرو۔ غیر مسلم اقوام مادی ترقی میں پیش قدمی کر رہی ہیں۔ اس معاملہ میں وہ تمہیں اپنے برابر نہیں آنے دیں گی۔ اگر تم یہ ہدف قائم کرو کہ پچاس برس میں امریکہ کے برابر مادی ترقی حاصل کر لو گے۔ تو ممکن نہیں۔ کیونکہ اس وقت تک مہرہ تم سے پچاس سال مزید آگے نکل چکا ہوگا۔ لہذا تمہاری طاقت کا سرچشمہ مادی وسائل کی بجائے سُوْرَةُ الزَّكٰوةِ ہے۔ انہیں کے ذریعے اندر ایمان اور وضاحت پیدا ہوگی۔ تعلق باللہ قائم ہو۔ جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔

نیکی و برائی

فرمایا: یاد رکھو، وَمَا تَقْدِرُوا مِنْ خَيْرٍ سَجْدُوهُ عِنْدَ الْمَقْدَرِ  
 تم اپنے نفسوں کے لیے جو بھی بھلائی آگے بھیجو گے۔ کوئی نیکی، کوئی نیک عمل، صدقہ خیرات کر دو گے  
 نماز ادا کر دو گے، اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ اس کا واضح  
 اعلان ہے: مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ایک ذرے کے برابر کیا ہو عمل بھی ضائع نہیں  
 ہوگا۔ بلکہ انسان اپنا برا چھپایا برا عمل قیامت کے دن دیکھ لے گا۔ یہاں بھی فرمایا کہ جو کچھ تم  
 اعمال کے ذریعے آگے بھیجو گے سَجْدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ سُبْحَانَ اللَّهِ کے لڑاں پاؤ گے۔ ہر چیز  
 کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر فعل کو  
 دیکھ رہا ہے۔ کوئی چیز اس کی نظروں سے مخفی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم کوئی کام کس  
 نیت اور ارادے سے انجام دے رہے ہو۔

لَقَدْ

درس چل چلا

البقرة ۲

(آیت ۱۱۲ تا ۱۱۳)

وَقَالُوا لَوْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرَانًى تِلْكَ  
 آمَانَتُهُمْ قُلْ مَا تَوَابَعْنَاكُمْ أَن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝۱۱۱ بَلَىٰ  
 مَن أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَنَجْزِيَنَّهُ أَجْرَهُ عِندَ رَبِّهِ  
 وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝۱۱۲

ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ داخل برہم جنت میں مگر وہ جو یہودی ہو یا  
 نصرانی ہو۔ یہ ان کی خواہشات ہیں۔ بے پختہ کہہ دیجئے کہ اپنی دلیل اگر تم بچے ہو  
 ۱۱۱ کیوں نہیں۔ جس نے اپنی ذات کو اللہ کے سامنے جھکا دیا۔ اور وہ نیک کام  
 کرنے والا ہو۔ پس اس کے لیے اس کے رب کے ہاں بہت سے پورے لوگوں پر

نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۱۲

اہل کتاب کی خرابیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ انبیاء علیہم السلام سے فضول سوال کرتے  
 تھے۔ اور پھر ان سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو ان کی مدد سے  
 منع فرمایا۔ کہ تم یہودیوں والے کام نہ کرنا۔ اور ان کے بسکادے میں اگر دین میں شک نہ کرنا  
 لگنا۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ اہل ایمان پھر کفر کی طرف پلٹ آئیں۔ اہل کتاب حاسد ہیں۔ اسی بنا  
 پر وہ انبیاء علیہم السلام پر پتھر پھینکتے ہیں۔ اور قرآن پاک میں نقس نکالتے ہیں۔ تاکہ مسلمان  
 اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں۔ الغرض: بنی اسرائیل کی یہ خرابیاں یہی ہیں کہ اسنادِ آویس  
 اذکرُوا اِنْفِصَالِیَ الْکَتَبِ سے لے کر لکھے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ ان کی ملت  
 اور خانہ کعبہ کے ذکر تک چلی گئی ہیں۔ ساتھ ساتھ اہل ایمان کو ان خرابیوں سے بچنے کی تلقین کی  
 جا رہی ہے۔

یہودی نصرانی  
 اہل کتاب میں یہودی اور نصرانی دونوں فرقے پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں کی نسبت  
 حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراہ کی



ثروت منسوب کرتے ہیں۔ محض حقیقت یہ ہے کہ خدا ان کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کامل ایمان ہے اور نہ تورات کو اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کتاب اللہ میں تجرین کر کے اس کا علیحدہ بگاڑ دیا۔ اس بات کا تذکرہ گذشتہ دروس میں آچکا ہے۔ آج کل یہودیوں کو صیہون بھی کہا جاتا ہے۔ صیہون ایک پہاڑ کا نام ہے۔ جو بیت المقدس کے قریب واقع ہے۔ ان نسبت سے انہیں صیہونی کہتے ہیں۔

نصاری اپنی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی طرف کرتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی بستی کا نام ناصروت ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ نصاریٰ کہلاتے ہیں۔ تاہم مسلمان مغربین کو مدعیہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک موقع پر کہا تھا مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ يَعْنِي اللَّهُ كَيْ رَاسْتِي فِي مِيرِي كُون مَدْرُكْتِي تَحَا۔ تو حواریوں نے کہا تھا تَخْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ بِمِ اللَّهِ كَيْ دِين كِي مَدْرُكْتِي دَلْتِي هِي۔ اس لحاظ سے انہیں نصاریٰ کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نصاریٰ نہ تو اللہ کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں۔ اور نہ انجیل پر ایمان ہے انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو عبد اللہ (اللہ کا بندہ) کہنے کی بجائے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہا۔ بعض تین خداؤں میں انہیں تیسرا کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں عیاں کر گیا تھا۔ سورۃ مائدہ میں دلائل صحت موجود ہے "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ" یعنی وہ لوگ کافر ہو گئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہی مسیح ہے جو تینوں میں تیسرا ہے۔ دو قطعی طور پر ملعون ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہنے والے بھی کفر ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اولاد سے پاک ہے "سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ" اللہ تعالیٰ ایسی تمام شرکیہ چیزوں سے منزہ ہے۔ نصاریوں نے انجیل کو بھی قرین کے ذریعے بگاڑ دیا ہے اب ایک کی بجائے ایک سو بیس انجیلیں بن چکی ہیں۔ عام مشورہ چار انجیلیں جنی یوحنا، متی، روم اور مرقس تو بائبل کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے علاوہ ایک پانچویں انجیل برنباس بھی ہر جگہ دستیاب ہے

اصلاً تجلی سرایانِ زبان میں نال ہوئی تھی۔ مگر نصراؤں نے اس کے تراجم کر کے اصل متن کو بالکل ضائع کر دیا ہے۔ اس کے مخالفین اپنی حالت پر قائم نہیں ہے۔

نجات کا دار و مدار

الغرض! یہ دو نصراؤں کی دونوں نفروں کا یہ عقیدہ وہ دعویٰ تھا کہ وَقَدْ لَوَّاهُ الْيَتِيمَ الْجَنَّةَ الْأَمِينِ كَأَنَّهُ هُوَ اور نصیری یعنی صرف زودی اور نصراؤں ہی جنت میں جائیں گے باقی سب کے لیے جنت کے دروازے بند ہیں۔ وہاں کوئی نہیں جاسکتا۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ہر دو فرقے آپس میں بھی متفق نہیں تھے۔ بلکہ یہودی کہتے تھے کہ جو یہودی ہو گا وہ جنتی ہے۔ اور نصراؤں کہتے تھے جو نصراؤں یا رانی کا ممبر ہے۔ صرف وہی جنتی ہے۔ اس کے علاوہ جنت بر اور کسی کا حق نہیں ہے۔ اسی دعوے کے جواب میں اللہ جل شانہ نے فرمایا۔ بَلْكَ أَمَّا يَتِيمٌ أَنَّهُ ان کی جس نزاشت میں۔ مگر نہ اس دعوے کی حقیقت کچھ بھی نہیں گویا انہوں نے اپنی نزاشت کو عقیدے کا درجہ دے دیا۔ پہلے کسی درس میں بیان ہو چکا ہے کہ جب امت کا علم عمل کا رشتہ پیغمبر سے کٹ جاتا ہے۔ تو امت کی خواہشات عقیدہ بن جاتی ہیں۔ اس سے پہلے یہودیوں کے ایک اور باطل عقیدے کا بھی ذکر آچکا ہے کہ کوئی اسرائیلی دوزخ میں نہیں جائے گا۔ اگر بالفرض چھوٹی جنت میں گیا تو صرف اتنے ایام کے لیے جائے گا۔ بتنے دنوں ان کے آباد آباد نہ بکھڑے کی پوجا کی تھی۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل عقیدے کو اسخ کیا تھا۔ اور پوچھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس نبی پر وحی کی تھی۔ کہ اسرائیلی جو پاپ ہیں کرتے پھریں۔ دو چند ان سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے وہی بات دہرائی ہے۔ نبی علیہ السلام کو ارشاد ہوتا ہے قُلْ أَپَ ان کے دعوے کے جواب میں فَمَا يَسْبِيهِ هَٰؤُلَاءِ هَٰؤُلَاءِ كُفْرًا كُفْرًا مَسِدَقَيْنِ اگر تم اس دعوے میں پکے ہو تو کوئی دلیل دو۔ برہان دلیل یا سند کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع براہین آتی ہے۔ اور دلیل بھی ایسی ہونی چاہیے۔ جسے سمجھ العقل آدمی تسلیم کرے۔ دعویٰ کسی جی قسم کا ہو۔ جب تک اس کے پیچھے دلیل نہیں ہوگی۔ وہ باطل سمجھا جائے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کے متعلق کہنا يَتَّبِعُونَ مَا كُفَرُوا بِهٖ فَاَتَمَّ كُفْرُہُمْ

عِشَّة رَیْبُہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ پس اس کا حساب ان کے رب کے پاس  
جا کر ہی ہو گا۔ ایسے لوگوں کے پاس نہ کوئی نقلی دلیل ہوتی ہے اور نہ عقلی دلیل۔ یہ وہ سے  
زیادہ یہ لوگ رواج کو بطور دلیل پیش کر بات کہتے ہیں۔ یاد دہانیوں کرتے ہیں۔ ہمارے  
قوم کا یہ رواج تھا۔ ہمارے حلقے واسطے اس بات کو پھانتے تھے۔ برخلاف اس کے تو میرے  
ہزاروں کرداروں دلائل آپ کے مشابہت کے یہ موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کا دعویٰ کائنات غلط ہے۔ یہ شخص مخصوص فرقہ  
کی بنیاد پر جنت میں نہیں جاسکے۔ نجات کا یہ قانون ہرگز نہیں ہے۔

فرمایا جسکی تکلیف نہیں یہ ثابت ایک باب ہے۔ اور یہ اپنے سے پہلی بات کی نفی کرتا ہے۔ اتباعِ خداوندی  
پہلے دعویٰ تھا۔ یہود و نصاریٰ کے سوا کس میں کوئی نہیں داخل ہوگا۔ فرمایا کیوں نہیں ہوگا۔  
بلکہ جنت میں داخل ہوگا۔ مگر وہ مَن اسْلَمَ وَجْہُکَ لِلّٰہِ جس نے اپنے چہرے کو  
اللہ تعالیٰ کے تابع کر دیا۔ ذکرِ چہرے کا ہے مگر مراد اس سے ذات ہے۔ کہ جس شخص نے  
اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طاعت میں دے دیا۔ وہ جنت میں غرور داخل ہوگا۔ وَجْہُکَ  
کا یہ معنی دوسرے مقام پر صحت ہے جیسے کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْہُکَ ہر چیز فانی  
ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ذاتِ خداوندی۔ حقیقی۔ قیوم۔ قائم۔ دائم۔ انہی  
اور ابہی ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز بے فعل فانی ہے فنا ہو چکی ہے۔ یا آئندہ فنا ہو جائے گی۔  
قائم اور دائم ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

مَن اسْلَمَ جس نے تابع کر دیا۔ اسلام کا معنی منقاد ہو جانا یا تابع ہو جانا۔ آگے  
آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کو فرمایا اسْلِمُوا  
یعنی طمع ہو جاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام نے لَمَّا اسْلَمْتُ لِلرَّبِّ الْعَلِیْمِ میں ظاہر  
باطن طریقے سے اللہ رب العالمین کا فرما ہوا ہوں۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے  
لیے سر لکھتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے وعدے کو سچ کر دکھایا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔  
میں نے تیرے حکم کے فلسفے میں باز آپ نے تعمیل کی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا۔ غارِ کعبہ  
تعمیر کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل کیا۔ حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ یحییٰ یحییٰ کو دین

چھوڑ دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی کیا۔ گویا انہوں نے "أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ" میں نے جو اقرار کیا تھا اسے صرف بکرت پورا کر دکھایا۔

نیک نیتی

فرمایا جنت میں جانے کا معیار یہ ہے۔ "مَنْ سَلَّمَ بِعَيْنِ جِوَالِدِ تَعَالَى كَمَا مِطْعَ بَرِئِ بِمَقْصَدِ" یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل میں کمر بستہ ہو جائے۔ اس کا اعتقاد درست ہو جائے۔ اس کی فکر پاک ہو جائے۔ اس کا ایمان مکمل ہو جائے جس کا مطلق نیت اور وحدت سے ہے۔ ایمان کا تعلق چوتھ باطن سے ہے۔ اس سے سب سے پہلے انسان کی باطنی عظمت کی مدد درست ہے اس کے قلب و روح میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سرایت کر جائے۔ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے۔ اور نہ اس کی صفات میں کوئی شریک ہے۔ اگر دل کے کسی گوشے میں شرک کا معمولی سا شاہ جی ہو تو دست تو ایسا شخص مرنہ نہیں ہو سکتا۔ وہ شرک ہے یا منافق ہے یا شک کرنے والا ہے۔ بخاری و ابوداؤد شریفین کی حدیث ہے: "مَنْ سَلَّمَ بِعَيْنِ جِوَالِدِ تَعَالَى كَمَا مِطْعَ بَرِئِ بِمَقْصَدِ" لَا تُنْظَرُ إِلَى مَوَدِّكُمْ وَلَا تَوَانِسِكُمْ وَلَكِنْ يُنْظَرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ" یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری مشغولیاں اور رنگوں کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمہاری دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے کسی شخص کے غماں کا دروازہ اس کی نیت پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ" اللہ کو پورا۔ نہ اس کی نیت کی اطاعت کرنے والے ہی جاؤ۔ حدیث شریف میں ہے۔ "إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" اللہ اپنے باطن کو درست کر دو۔ جنت میں داخلے کے لیے یہ اولین شرط ہے۔

امام رزمیؒ نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک ایماندار آدمی بھوک میں مبتلا تھا۔ سفر پر جا رہا تھا۔ راستے میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے نظر آئے۔ اُس نے کہا، کاش میرے پاس ریت کے ان ٹیلوں کے برابر نان ہو تا۔ تو میں سب بھوکوں میں تقسیم کر دیتا۔ چونکہ خوب اس وقت بھوکا تھا۔ اُسے بھوک کا تعریف محسوس ہوئی تو اس نے دست بھوکوں کو خیال میں لاتے ہوئے یہ بات کہی کہ اللہ تعالیٰ کو کئی بات پسند

آئی۔ چنانچہ اس وقت کے نبی پر اتنی بھیجی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے تیری اس خاص نیت کو قبول کر کے تجھے ریت کے ٹیلوں کے برابر تقسیم کرنے کا ثواب عطا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیرا یہ صدقہ قبول کر لیا ہے۔ جیسی تمہاری اچھی نیت تھی۔ ہم نے ویسا ہی اچھا اجر عطا کیا ہے جنت میں داخلے کا جو رسول اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا۔ اس کا پہلا جزیرہ تھا کہ داخلے کا خواہشمند شخص اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اس کا دوسرا جزیرہ یہ فَإِنَّهُ يُرَىٰ اور وہ نیکی کرنے والا ہو۔ مقتصد یہ کہ جنت میں داخل کسی فرقہ یا جماعت کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ کہ وہ یہودی ہو یا عیسائی کہلاتا ہو۔ بلکہ نجات کا قانون اس مقام پر یہ فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہو۔ اسکی نیت اور ارادہ درست ہو۔ اور اس کا عقیدہ صحیح ہو۔ اور پھر دوسرا جزیرہ وہ اعمال صالحہ کرنے والا ہو۔ ایسا شخص یقیناً جنت کا حقدار ہوگا۔ اور اس کو نجات حاصل ہو جائے گی۔

اعمال صالحہ

فرقہ بندی  
وہ نجات نہیں

حضرت مولانا شاہ اشرف علی قانونی فرماتے ہیں کہ یاد رکھو نجات کا دار و مدار اکابر پر ہے۔ نہ کہ انبیا پر۔ نسب کے لحاظ سے کوئی کہتے ہیں اور آپ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہو یا کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کا باطنی طور پر ایمان اور عقیدہ درست نہ ہو۔ اور ظاہری طور پر اعمال صالحہ نہ انجام دیتا ہو۔ ہمارے ہاں بھی بہت سی فرقہ بندیوں پائی جاتی ہیں۔ بعض جابل یا کم فہم لوگ کسی خاص فرقے یا گروہ کو ہی نجات یافتہ تصور کرتے ہیں کہ فلاں مسلک والے جنت میں جائیں گے۔ دوسرے نہیں جائیں گے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی ان میں کہتے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کی بات نہ تعصب رکھتے ہیں۔ بعض حنفی، خاں کے ساتھ یا شافعی، بیکوں کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ صرف ہم ہی جنت کے وارث ہیں۔ دوسرے اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سلوک اور تصوف کے سلسلے ہیں۔ جیسے چشتی، قادری، سرور دینی، نقشبندی وغیرہ۔ ان میں سے بھی بعض ایک دوسرے کے خلاف عداوت رکھتے ہیں اور جنت کو صرف اپنی وارثت سمجھتے ہیں باقی سب لوگوں کو تنہی خیال کرتے ہیں۔ یہ تو محض فردی اختلافات ہیں بنیادوں طور پر چاروں مسالک یا سلسلے اپنے تصوف میں کوئی اختلاف نہیں۔

شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں: کہ یہ چیزیں فروعات دین میں سے ہیں۔ دین میں ان کی گنجائش موجود ہے۔ مگر اس کی بنا پر دوستی فرقہ یا گروہ کو جنسی قرار دینا جاہلست محض ہے۔ دین میں جتنے مسک اور بیٹھے سرک ہیں سب کا مقصد واحد ہے۔ اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی۔ کوئی حنفی بڑا شافعی، یا کسی بڑا حنبلی چشتی بڑا قادری، منزلی مقصد تو سب کی ایک ہی ہے۔ راستے مختلف ہیں۔ طریقہ تعلیم مختلف ہے۔ مگر مقصد تو مختلف نہیں۔ لہذا اپنے آپ کو جنسی اور دوستی کو جنسی کہنا بات خود گمراہی کی علامت ہے اس میں اور یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں کیا فرق رہ گیا ہے۔ اس غلط فرقہ بندی نے مسلمانوں کو تباہ کیا ہے۔ فروعات میں اختلاف رائے عین فطری امر ہے۔ اور اس کی گنجائش ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ دو ڈاکٹر یا حکیم ایک ہی قسم کے مریض کے لیے مختلف دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ مگر کوئی نہیں کہتا کہ فلاں ڈاکٹر بزدل ہے۔ اور فلاں حکیم درست ہے۔ انہیں سب درست ہی مانتے ہیں۔ کیونکہ مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ یعنی مریض کی صحت یا بی مقصود ہے۔ دو کوئی بھی تجویز کی جاسکتی ہے۔ جو اس کے مناسب حال ہو۔ لہذا دین کے معاملہ میں ایسا تعصب کیوں اختیار کیا جائے۔ کہ فلاں فرقہ ایسا ہے یا فلاں اہم ایسا ہے۔ بجائے یہ سب ایک ہی اللہ تعالیٰ کو روکنے والے تو ہیں۔ ان کے متعلق کسی گروہ میں تعصب نہیں ہونا چاہیے۔

اب دیکھئے ملک میں فوجداری قانون رائج ہے۔ کسی ملزم کو ایک جج، سزائے موت دیتا ہے۔ تو دوسرا اسی قانون کے مطابق اُسے بری کر دیتا ہے۔ مگر کبھی کسی نے کسی جج کو غلط نہیں کہا۔ کیونکہ قانون میں مختلف فیصلہ جات کی گنجائش موجود ہے۔ اسی طرح دین کے قانون کو مننے والے سائے ہی ہیں۔ خواہ کوئی حنفی بڑا شافعی۔ لہذا ان کے پیروکاروں میں بھی تعصب نہیں آنا چاہیے۔ یہ کہنا کہ فلاں فرقے والے اس طرح نماز پڑھتے ہیں۔ ان کی نماز نہیں برقی یا وہ جہنمی ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اور من حیث القوم مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہے۔ یہ زودیت اور نفرت ہے۔ قرآن پاک نے اس کی مذمت بیان



فرمانی ہے۔

اعز من! فرمایا قانونِ نجات یہ ہے۔ کہ جو شخص مَنَ اسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰہِ وَهُوَ حَسَنٌ قَازِنِ نجات جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنالیا۔ اور وہ نیک کام کرنے والا ہے۔ مجتہد و محبت فرماتے ہیں۔ کہ جب اَمْسُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کا ذکر آتا ہے تو اس سے مراد بڑی بڑی چار عبادتیں ہیں۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، صوم۔ اس کے بعد پانچویں درجے میں جہاد آتا ہے۔ علاوہ ان کے ساتھ دوسری نیکیاں بھی ہیں۔ اس کو یوں بیان فرمایا: فَمَنْ يَفْعَلْ مِنْ الصَّالِحَاتِ سَوْ كُنْ تَعْمَلُ نَبِیْ كَامٍ كَرَّمَہَا: وَهُوَ مُؤْمِنٌ بِشَرَطِ كَدِّهِ مَوْسٰی۔ اس کا معنی یہ صحیح ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے کسی عمل کی ناکامی نہیں فرمائیں گے۔ اپنے ہر کام کا بدلہ وہ پائے گا۔ ہاں! اگر ایمان ہی مغفود ہے۔ معنی صحیح نہیں ہے۔ تو پانچوں میں بڑی بڑی نیکیاں بھی گرد و غبار کی طرح اڑ جائیں گی۔ قیامت کے روز کچھ کام نہ آئیں گی: لَا یَقْدِرُونَ مَعَا كَسْبُوا۔ ان کی کھائی میں سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ ان کی نیکیاں گرد و غبار کی طرح اڑ جائیں گی۔ مگر یا کہ وہ راکھ کے ذرات تھے۔ جو آدمی کے آگے بالکل نہ ٹھہرے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے: عَاصِلَةٌ نَّاصِبَةٌ بڑے بڑے عامل، ریاستیں اور تختیں کرنے والے، کام کر کے تھک جانے والے ہوں گے۔ مگر قیامت کے روز: فَكُلِي نَارَ حَامِيَةٍ۔ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ ایمان کی دردت سے محروم تھے۔ سب نیکیاں انہاں جائیں گی۔ ہر حال قانونِ نجات فرقہ بندی نہیں بلکہ اتباعِ خداوندی اور اعمالِ صالحہ ہیں۔

فرمایا جس نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے تابع کر لیا۔ اور پھر وہ نبی کریمؐ کو الّا بن گیا فَلَنَدَّ اجْرُهُ عِنْدَ رَبِّہٖ۔ پس ایسے شخص کے لئے اپنے رب کے ہاں اجر ہے۔ نیکی کا بدلہ اس کو ضرور ملے گا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ، اے اللہ تعالیٰ مقبل میں کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ نہ ان پر کوئی ڈر ہوگا۔ روزہ و نماز میں ہوں گے نہ پریشانی کہ دنیا میں ان پر ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ کم از کم موت کا ڈر تو ہے ہر وقت ہوتا ہے۔ گویا موت ہر وقت اس کے پیش نظر ہے۔ پھر دولت و صحت کا خوف مسلط رہتا ہے۔ پنا

نہیں بیہوش ہائے پاس سبے گی یا نہیں۔ پتا نہیں کل کو صحت بھی برقرار رہ سکے گی یا نہیں۔ تو اس قسم کے خوف انسان کے ہمیشہ دامن گیر رہتے ہیں۔ مگر جن کا عقیدہ صحیح ہوگا۔ جو اعمال اچھے کرنے والے ہوں گے۔ وہ ان تمام پریشانیوں سے محفوظ رہیں گے۔ انہیں نہ پینے مانی پر افسوس ہوگا اور نہ انہیں مستقبل کا کوئی خدشہ ہوگا۔ برخلاف اس کے جنہوں نے کوئی کمائی نہیں کی۔ زندگی کی پونجی کو ضائع کر دیا۔ وہ افسوس کریں گے۔ کہ ہم نے کتنی کوتاہی کی۔ اللہ تعالیٰ نے مصلحت دی تھی۔ مگر ہم نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ نہ عقیدہ درست کیا اور نہ نیکی کا کوئی کام کیا۔ ایمان سے محروم ہے۔ ایسے لوگ خوف اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے۔ اور پینے کے پر ہمیشہ افسوس کرتے رہیں گے۔

---

الْمَآءِ

سجل پنجم ۴۵

البقرة ۲

(آیت ۱۱۳ تا ۱۱۵)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ  
 عَلَىٰ شَيْءٍ قُلْ مَن يَمْلِكُ لِيُكَلِّمَ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ  
 مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِيمَا  
 كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾ وَمَن أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَن  
 يُذَكَّرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ  
 أَن يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ لَهُمْ فِي الذُّبِّ خِزْيٌ وَلَهُمْ  
 فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١٤﴾ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ  
 فَأَيْنَمَا تَوَلَّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَظِيمٌ ﴿١١٥﴾

توجہ دے۔ یہودیوں نے کہا نصاریٰ کسی چیز پر نہیں ہیں۔ اور نصاریٰ نے کہا کہ  
 یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں (یعنی ان کا دین صحیح نہیں ہے) حالانکہ یہ کتاب پڑھتے ہیں  
 اسی طریقے سے اہل لوگوں کی جو جنتیں نہیں (جابل ہیں) ان جیسی بات پس انداز  
 ان کے درمیان قیمت کے دن فیصلہ کر گیا۔ ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف  
 کرتے ہیں ﴿۱۱۳﴾ اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو اللہ کی سجدوں  
 سے منع کرتا ہے۔ کہ ان میں اللہ کا ذکر کیا جائے۔ اور ان کی بربادی میں کوشش  
 کرتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ کہ نہیں ہے ان کے لیے کہ داخل ہوں۔ ان  
 محرموں میں مگر ڈرتے ہوئے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے۔ اور ان  
 کے لیے آخرت میں عذاب عظیم ہے ﴿۱۱۴﴾ اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق اور مغرب  
 ہیں ہر جہاں تم منہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ وسعت والا  
 ہے سب کچھ جانتے والا ہے۔ ﴿۱۱۵﴾

یہودی و نصاریٰ  
 اپنے مذمت

یہودیوں اور نصاریٰ کی سجدہ خرابیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک گروہ

دوسرے کو باطل قرار دیتا ہے اور اپنے آپ کو راہِ راست پر سمجھتا ہے۔ تیسرا گروہ مشرکین کا ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کو باطل کہہ کر اپنے آپ کو صحیح العقیدہ سمجھتا ہے۔ تو گویا یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کا ابطال کرتے ہیں۔ ان آیات میں اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے: وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ اور نصرائی کہتے ہیں کہ نصرائی کسی چیز پر نہیں ہیں وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ اور نصرائی کہتے ہیں کہ یہودی کسی چیز پر نہیں ہیں۔ یعنی ان کا دین سچا نہیں ہے۔ اس طرح جب یہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ تو آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں۔ یہودیوں کا اعتراض یہ ہے کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہہ کر کفر کیا۔ اور عیسائیوں کا نظریہ یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو یہودیوں نے نہ صرف ان کا انکار کیا۔ بلکہ انجیل کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ لہذا یہ ٹھہرا ہوئے۔ فرمایا یہ دونوں فرقے ایک دوسرے پر الزام تراشی کرتے ہیں۔ وَهُمْ يَشْتَلُونَ الْكِتَابَ عِلَالًا یہ دونوں گروہ ہی اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی توراۃ اور انجیل کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔

کتاب ساویہ  
برحق ہیں

حقیقت یہ ہے کہ توراۃ، انجیل، زبور، قرآن پاک اور دیگر صحائف سب کے سب برحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اصل دین اپنی کتب کے ذریعے نازل فرمایا۔ مگر ان بہنجتوں نے تحریف کر کے دین کو مسخ کر دیا تاہم اصل دین ان کی کتابوں میں اب بھی موجود ہے۔ یہ پڑھتے ہیں۔ لہذا کسی کتاب کا باطل انکار کر دینا کہ اس میں کچھ بھی نہیں۔ الفساف کے خلاف ہے۔ اور اہل کتاب کی مٹ دھرمی کی دلیل ہے۔ ہاں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں کا اصل دین تو ٹھیک تھا۔ مگر انہوں نے خرابیاں پیدا کر دیں۔ یا نصرائی کا دین اور کتاب برحق ہے۔ مگر ان کی تحریفات نے اسے کچھ اور بنا دیا ہے۔ ایک دوسرے مذہب کو بالکل ہی باطل قرار دینا درست نہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام  
پر الزام تراشی

جب قرآن پاک نازل ہوا تو اس نے توراۃ اور انجیل کی تصدیق کی کہ یہ دونوں آسمانی کتابیں ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اس کے علاوہ تمام صحیفہ تاریخی بھی تصدیق کی۔ البتہ قرآن پاک نے ان مقامات کی ضرورت نہ تھی۔ جہاں جہاں سے یہ لوگ جھٹکے ہیں

اور جہاں جہاں انہوں نے کتب میں تحریر کی ہے۔ پہلے گزرا چکا ہے کہ یہودیوں نے حضرت  
 سیمان علیہ السلام کی طرف کفر کا کلمہ منسوب کیا۔ اور کہا کہ اُن کی سعنت مکر پر قائم تھی۔ لہذا ہم بھی  
 ان کی سنت پر عمل کرتے ہوئے مکر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دعوے کی تردید کرتے ہوئے  
 فرمایا: **وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ** یعنی سلیمان علیہ السلام نے جادو اور کفر کے کلمہ کا ارتکاب نہیں کیا۔ بلکہ انہوں  
 نے خود کفر کا ارتکاب کیا۔ حضرت سیمان علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے صاحب شریعت رسول تھے  
 اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثال حکومت عطا کی تھی۔ اُن سے مکر کی توقع نہ رہا بعد از قیاس ہے۔ انہوں  
 نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی **رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِرَجُلٍ مِّنْ بَعْدِي**  
 یا اللہ مجھے ایسی عظمت عطا کر جو میرے بعد کسی کو عطا نہ ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو  
 شرف قبولیت بخشا اور آپ کے لیے ہوا اور جنات کو مکر کر دیا۔ مگر ان ظالموں نے سمجھا کہ یہ جادو  
 کا اثر ہے۔ العیاذ باللہ۔

مشرکین کا نظریہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اُو مشرکین کا حال بھی یہود و نصاریٰ سے کم نہیں۔ **كَذَلِكَ**  
**قَالَ الْكَافِرُونَ لَا يَأْتِيهِمْ مِّثْلُ نَوْفِ اللَّهِ إِذَا هُم يَدْعُونَ**  
 کرتے ہیں۔ جو اہل کتاب نے کی۔ یہ کہتے ہیں کہ نہ یہود و نصاریٰ حق پر ہیں اور نہ مسلمان۔  
 حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ تو جابلو علق میں۔ نہ ان کے پاس  
 کوئی کتاب ہے جس سے یہ رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اور نہ ہی دو ہزار سال کے عرصہ میں ان  
 کے پاس کوئی نبی آیا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جہاں تہ یثرب ہزار سال تک عرب  
 فتح کیا۔ ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے دین یہ قائم ہے۔ اس کے بعد ان میں بگاڑ  
 پیدا ہونا شروع ہوا۔ اور پھر اہل وقت بھی آیا کہ سب کے سب شرک کی طرف مائل ہو گئے۔  
 بنی آدم میں سے کوئی کا دکا ہی مودہ دتا تھا۔ ورنہ سب دین سے بہت چلے تھے۔

آخوند خاں

مدت النبی من ہر کہ

الغرض! یہود و نصاریٰ اور مشرکین تینوں گروہوں نے ایک دوسرے کی تکذیب کی۔  
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ جو کچھ چاہتے تھے ورنہ رہیں۔ **فَاللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ**  
**يَوْمَ الْقِيَمَةِ** قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اور ان کو  
 پہنچے گا۔ اور کون اصل دین سے چرچا ہے۔ ان کا فیصلہ ہر اس معاملہ میں ہو جائے گا۔

فِيهِ كَاثُرًا فِيهِ يُخْتَلَفُونَ جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں فرمایا ان کے درمیان قطعی فیصلہ  
 قیامت کو ہوگا۔ تاہم جہاں تک ہدایت اور گمراہی کا تعلق ہے۔ تو اس کے متعلق اسی سورۃ میں  
 آئے آیت: قَدْ تَبَيَّنَ الشُّكُّ مِنَ الْغَيِّ ہدایت اور گمراہی بالکل واضح ہو چکی ہیں۔  
 دنیا میں حق کے متلاشی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بے شمار ذرائع پیدا فرمائیے ہیں۔ وہ حق و صداقت  
 کی پہچان کر سکتا ہے۔ سورۃ انفال میں ہے: وَيُخَيِّطُ مَنْ حَسَىٰ عَنْ بَيِّنَاتٍ جَوَاطِكَ ہوا  
 وہ بھی واضح دلیل کے ساتھ جو زندہ رہنے والی واضح دلیل کے ساتھ زندہ رہنے حق و باطل کی تفریق ہوگی جسے شک کے معتزلین  
 یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے پاس واضح دلیل نہیں آئی تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے  
 پاس اللہ تعالیٰ کا نبی آیا۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب آئی۔ مگر انہوں نے انکار کر کے مقابل کیا اور ہٹا کر ہٹا کر  
 مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں باعتبار دلیل و عقل، دستور اور قانون ہدایت اور گمراہی  
 کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اب کسی کا کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ ہم قحطی اور اہل فیصلہ اللہ تعالیٰ  
 کی عدالت میں ہوگا۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہ سے مروی ہے: رَأَيْتُ أَقْلَ مَنْ يَخْتَوِ  
 بَيْنَ يَدَيِ الرَّحْمَنِ كَيْتَ ہیں کہ قیامت کے دن میں گھٹنے ٹیک کر رحمن کے سامنے  
 بیٹھوں گا اور درخواست کروں گا کہ اے پروردگار! آپ ان بددلوں سے بچھیں کہ یہ  
 ہم سے کیوں لڑے تھے گویا اس دن حق و باطل کے تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کے دربار میں  
 ہوں گے۔ اسی طرح ایک دوسرے کو باطل فرقہ کہنے والوں کا فیصلہ بھی اُسی روز ہوگا۔  
 اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کی تفریق کے لیے تمام محنت پوری کر دی ہے  
 اہم بیضاوی: هُدَيْنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ نے  
 انسان کو عقل و خرد عطا کی۔ انبیاء علیہم السلام معجزات فرمائے۔ کتابیں نازل فرمائی اب کون سا  
 عذر باقی رہ گیا ہے۔ قیامت کو کون کہے گا: مَا حَآءُ نَا مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ  
 کہ ہمارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ اب تو بشیر و نذیر آپ کے۔ لہذا قیامت  
 کے دن کوئی عذر قابلِ تسلیم نہیں ہوگا۔ حضرت زبیرؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا تھا۔



اَتَشْكُرُ عَلَيْكَ الْخُصُومَةَ مُحَضَّرَةً! قیامت کو ہمارا اور ان کا جھگڑا دوبارہ قیامت میں  
فرمایا جائے گا! جن تنازعات کا فیصلہ دنیا میں نہیں ہوا۔ ان کا فیصلہ رب العزت کی بارگاہ میں  
مقرر ہو گا۔

حضور علیہ السلام نے فرمایا: یہ تینوں فرقے یعنی یہودی، نصاریٰ اور مشرک جو ایک دوسرے  
کو گمراہ کہتے ہیں۔ یہ خود سائے کے سائے گمراہ ہیں۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مارنے  
سے نہ صرف انکار کیا بلکہ انہیں دجال کہا۔ اور جب قریب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام  
دوبارہ دنیا میں نزول فرمائیں گے۔ تو اصفہان کے ستر ہزار یہودی جن میں ان کے بڑے بڑے  
علماء بھی ہوں گے۔ اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مارنے کی بجائے دجال کے پیچھے لگیں گے۔ اور اس  
کو مسیح سمجھیں گے۔ یہی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو دایاذا باللہ! دجال سمجھ کر انہیں سولی پر  
لٹکانے کیلئے گئے۔ ان کم مختوں کا یہ حال ہے۔

جب حضور علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ تو سولہ یا ستر ماہ تک بیت المقدس  
کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ مقصد یہودیوں کی دُجوئی تھی۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے قریب ہوں  
اور دین کی طرف راغب ہو سکیں۔ تحویل قبلہ کی آیات قرآن پاک کے دو سر پارہ کی ابتداء سے  
تشریع ہوتی ہیں۔ مگر اس معاملے میں بھی یہودیوں نے بہت دھرمی کا ثبوت دیا۔ اپنے تعصب  
میں مبتلا تھے۔ اور مسلمانوں کے قریب نہ آئے۔ چونکہ حضور علیہ السلام کی ولی خواہش یہی تھی۔ کہ  
مسلمانوں کے لیے بیت اللہ قبلہ قرار ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں تحویل قبلہ کا حکم  
دے دیا۔ کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں۔ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں۔ اسی  
طرح یہودی اپنی ضد اور عناد کی وجہ سے اسلام سے اور دور ہو گئے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے ان برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ اس قدر  
عنادی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو عبادت کرنے سے بھی روکتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔  
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذَكَّرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسُغِيَ فِي  
خُفْرٍ بَهِكًا اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے۔ جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا  
نام لینے سے روکتا ہے اور ان کی بربادی کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت مولانا شیخ الحداد

فرمے ہیں کہ اس آیت کے مصداق نصاریٰ ہیں جنہوں نے یسوعا کا مقابلہ کر کے توراۃ کو جلا  
تھا۔ اور بیت المقدس کو دیران کیا تھا۔ یہ آیت مشرکین کو بھی صادق آتی ہے۔ جنہوں نے  
میں مسلمانوں کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا تھا۔ اور حرم پاک میں عمرہ ادا نہیں کرنے دیا تھا۔ حالانکہ  
مسلمان محض عمرے کی ادائیگی کے لیے آئے تھے۔ ان کا لڑائی کر نیکا ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو اس وقت  
کے واقعات ہیں۔ یہ آیت آج بھی اسی طرح نافذ ہے۔ جس طرح یہ اپنے نزول کے وقت  
آج بھی جو کوئی اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اس کا نام پڑنے سے روکتا ہے۔ مسجد کی بربادی کا باعث  
بنتا ہے۔ وہ اس آیت کی رو سے بہت بڑا ظالم ہے۔

یسوی اور نصرانی ہمیشہ ایک دوسرے کو مسجد میں جا کر عبادت کرنے سے روکتے رہے  
ہیں۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ جب بھی یسوعا کو موقع ملا انہوں نے نصاریٰ کے ساتھ ہی سوک کیا۔  
اور جب نصاریٰ کو غلبہ حاصل ہوا تو ان ظالموں نے بیت المقدس کو اکھاڑ دیا۔ گداز کو تہ آتش  
کیا۔ اور عبادت خانوں کو برباد کیا۔ مشرکین کو نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی سوک کیا۔ مکی  
ذبح گاہ میں حضور علیہ السلام خانہ کعبہ میں نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مشرکین مسلمانوں کو سخت اذیتیں  
دیتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی پٹائی کا ذکر بخاری شریف میں موجود ہے۔ ابوہل کی حرکات  
کا ذکر خود قرآن پاک نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: **اِنَّ رُوَيْتَ الْذِي يَنْهٰی ۝۱ عِبْدًا  
اِذَا هَكَمٰ ۝۲** کیا تم نے اس بد بخت شخص کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ کے بندے کو نماز پڑھنے  
سے روکتا ہے۔

دوسرے مقام پر جھوٹے دعویٰ نبوت کو بڑا ظلم کہا گیا ہے۔ کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہو  
سکتا ہے۔ جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ اُس سے بڑا کون ظالم ہے جس کے  
پاس خدا تعالیٰ کا نبی آئے۔ ہدایت کی بات پیش کرے اور وہ اس سے انکار کر دے۔  
تاہم اس مقام پر خدا کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے گھر میں اس کی مسجد میں عبادت  
کرنے سے، غاص پر مبنی سے روکتا ہے۔ یہ تو ظاہری رکاوٹ ہے۔ کہ کسی کو عبادت کرنے

سے روک دیا جائے۔ یہ عبادت خانے کی ببادوں کے مصداق ہے۔ اس کے علاوہ ایک  
 باطنی بربادی بھی ہے۔ کہ وہاں پر غیر اللہ کی پرستش کی جائے۔ بہ عات کو زور دیا۔ ایسا کرنے  
 سے نظامِ توحید عبادت خانہ آباد ہو گا۔ مگر باطنی طور پر مذہب سے خالی ہو گا اور باطنی تہذیبی ہے۔  
 سورتہ ج میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عبادت خانہ برباد ہو جائے گا۔ یا کسی اور کا۔ اسے  
 گرانے کا حکم نہیں۔ مسلمانوں کی مساجد کا بھی یہی حکم ہے۔ ان کو گرانے یا ان کی بے حرمتی کرنے  
 کی اجازت نہیں دی گئی۔ مگر دیکھ لیجئے ۱۸۴۷ء میں تقسیم ہند کے وقت کیا کچھ نواب مشرقی پنجاب  
 میں پچاس ہزار مساجد کی بھرتی ہوئی۔ ہندوؤں اور سکھوں سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ دوسری پنجاب  
 میں بھی یہی کچھ ہوا۔ کتنے نہ۔ تھے جنہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ دونوں فریقوں نے غلط کام کیا۔  
 عبادت خانے خواہ کسی سے متعلق ہوں۔ ان کی بھرتی نہیں ہونی چاہیے۔

ظہور اسلام کے وقت جو بے قابل شرک سے تائب ہو ایمان کی دولت کے ذرا  
 ہوئے۔ انہوں نے اپنے منہ اور بت خالص گرا دیے تھے۔ اور وہاں پر سب سے تیر کی عیسائی ہیں  
 تہہ تو رست ہے۔ کہ ان لوگوں نے اپنے ہی تہہ برباد و معابد کی جگہ مسجدیں تعمیر کر لیں۔ عبادت خانے  
 کی جگہ عبادت خانہ ہی تعمیر ہوا۔ تاہم مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں بھی غیر مسلم اقدام کی  
 عبادت گاہوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ محمد بن قاسم جب نہ چڑھتا تو انہوں نے بعض  
 مندروں کو نقصان پہنچا تھا۔ مسلمانوں نے خود اس نقصان کی تلافی کی۔ اور نقصان زدہ مندروں کو  
 دوبارہ تعمیر کروایا۔ کیونکہ کسی کے عبادت خانے کو گرانے کا حکم ہرگز نہیں ہے۔

البتہ سلطان محمود غزنوی نے سونات کے مندر کو مڑا فونی جیہ کا نہیں کیا تھا۔ وقتی طور  
 پر وہاں مسجد بھی بنادی۔ مگر وہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کے بعد ہندوؤں نے پھر وہاں  
 پر مندر تعمیر کیا۔ راجہ پرشاد نے سوالا کھ روپے کے عوض کابل سے مندر کا گیسٹ بھی واپس لے لیا کہ  
 اسی جگہ نصب کیا۔ جہاں سے اکیڑا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ غلط کام کا نتیجہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔  
 ترکوں نے بھی اپنے دور میں ابا صوفیہ کا مندر باگرا کر وہاں مسجد تعمیر کر لی۔ جب اخیر

کو وہاں غلبہ حاصل ہوا۔ تو وہاں پُر کر دیا۔ اب چیتختے ہیں کہ ہماری مسجد حق ہے۔ بہت بڑی لائبریری  
 حق ہے۔ جو عنایت ہو گئی مگر جس طرح مہ نے کیا۔ اسی طرح کا جواب انہوں نے دیا۔ اب چیتختے  
 چلانے کا کیا مطلب۔ وہاں اگر عیسائی خود عثمان ہو کر اپنے گرجا کو مسجد میں تبدیل کر دیں۔ تو وہ  
 جائز ہے۔ مگر کسی کے عبادت خانے کو زبردستی کرنا بالکل نامناسب ہے۔

مسجد کے نواب

جس طرح مسجد کا ظاہری طور پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح مسجد کو باطنی خرابی  
 سے محفوظ رکھنا بھی اہل اسلام کی ذمہ داری ہے۔ ————— باطنی خرابی یہ ہے کہ مسجد کو اس  
 کے اصل مقصد کے علاوہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ مسجد عبادت خانہ ہے اس لیے  
 نماز، تلاوت، ذکر و اذکار ہونا چاہیے۔ نہ کہ دنیا کے دوسرے کاروبار۔ اسی لیے حضور علیہ السلام  
 نے مسجد میں حد قائم کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مسجد میں کسی مقصد کے کا فیصلہ تو ہو سکتا ہے۔ مگر لازم  
 کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ کہ اس سے مسجد کی بھرتی ہوتی ہے۔ مسجد میں لڑائی جھگڑا کرنا، فحش کلامی،  
 گالی گلوچ کرنا، گندگی پھینکنا، تجارت یا لین دین کرنا۔ یہ سب مسجد کے آداب کے خلاف ہے  
 حضور علیہ السلام نے گندہ چیز کا مسجد میں اعلان کرنے سے منع فرمایا۔ بلکہ فرمایا کہ جو شخص مسجد میں  
 گندہ کی اعلان کرے۔ اس کے حق میں یوں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھے واپس لوٹائے  
 تو نے آداب مسجد کا خیال نہیں رکھا۔ اسی طرح فرمایا کہ مسجد میں تجھت کرنے والے کے حق  
 میں کہو کہ اللہ تعالیٰ تجھے اس تجارت میں نفع نہ دے۔

مسجد میں شعر گوئی سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ہاں اب یہ اگر کوئی اچھی بات کہتا ہے اللہ تعالیٰ  
 اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتا ہے۔ تو جائز ہے۔ ایسی شعر گوئی حضور صلی اللہ  
 علیہ وسلم کے صحابی حضرت حسان بن ثابت سے منقول ہے۔ مگر وہ زمانے کی طرح مسجد  
 میں ہر قسم کی شعر گوئی کی اجازت نہیں۔ جن میں عسفیہ غزلیں گائی جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے تاشد الاشعار سے منع فرمایا۔

۱۔ ابو داؤد ص ۲۹۱ ۲۔ ترمذی ص ۴۴ ۳۔ مسلم ص ۲۱۱

۴۔ ترمذی ص ۲۲۰ ۵۔ ترمذی ص ۴۴ ۶۔

مسجد کی بے ادبی کے بعض دوست ذریعہ سے بھی نسخ کیا گیا ہے۔ مثلاً ابن ماجہ شریف کی روایت کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ چھوٹے بچوں یا کسی پاگل کو مسجد میں نہ آنے دو۔ وہ مسجد کی بیکمرستی کا باعث بن سکتے ہیں۔ چھوٹے بچے پر شابہ پانچہ وغیرہ کرٹے گا۔ وہ ابھی ٹوڑ نہیں رکھتا ہوں جب بچہ پانچ سات سال کا ہو جائے تو مسجد میں آ سکتا ہے۔

الغرض! فرمایا اس شخص سے زیارہ: کون ظالم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے منع کرتا ہے۔ اور مسجدوں کی بربادی کے لیے کوشش کرتا ہے۔ فَاَبَاؤُاَ لِهٰذَا مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ يَّكُذَّخْلُوْهَا اِلَّا خَافِعِيْنَ ان لوگوں کا اصل میں حق ہی نہیں ہے کہ وہ مسجدوں میں داخل ہوں مگر خوف کہتے ہیں۔ یعنی کفار اس لائق ہی نہیں کہ مسجدوں میں داخل ہوں۔ سوائے اس کے کہ وہ خوفزدہ ہوں۔

**الْاَخَاِيعِيْنَ** کا مطلب یہ بھی ہے کہ مسجد میں خشوع و خضوع کے علاوہ کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ آؤ ذکر بندہ کز اقیامت کی نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے۔ مسجد میں جہنم پیکار اور ایسی ایسی دنیوی باتیں کرنے کی ممانعت ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے اِذَا مَسَرَّكَوْا بِرِیْاحِ الْجَنَّةِ فَارْتَعَوْا حَبِ تَمْرٍ حَبَّتْ کے باغوں میں جاؤ، تو وہاں چڑچگ یا کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! اس سے کیا مراد ہے۔ فرمایا جب تم مسجد میں جاؤ تو وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو۔ اس کی تفسیر و تفسیل بیان کرو۔ تلاوت کرو۔ درود پاک کا ورد کرو۔ معتکف ہو کر خاموشی سے بیٹھو۔ اگر اعتکاف کی نیت کر کے بالکل خاموش بھی بیٹھو گا۔ تو باہر کی باتوں اور کئی گناہوں سے بچے گا۔ اور اللہ تعالیٰ سے اجر بھی پائے گا۔ مگر لوگ اکثر ایسا نہیں کرتے۔ مسجد میں فضول کہیں مانتے ہیں۔ خشوع و خضوع سے محروم ہوتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا۔ جب خشوع و خضوع اٹھ جائے گا۔ آپ ایک بڑی مسجد میں داخل ہوں گے۔ وہاں پانچو آدمی موجود ہوں گے۔ مگر ان میں ایک

بھی ایسا نہیں ہوگا۔ جس کے چہرے پر خشوع و عاجزی کے آثار نظر آتے ہوں۔ سب فضول  
حرکات میں مصروف ہوں گے۔

فرمایا جو شخص مساجد میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے روکتا ہے۔ اور مسجد کی بربادی چاہتا ہے  
لَهُمْ فِي السَّانِيَا خِزْيٌ لِّیْلَی لِرُؤُوسِکَ لَیْلَی دُنْیَا مِیْنِ مِی رِیوَانِی ہِیْ ذَلِکَ لَکُمُ  
فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ اور ان کے لیے آخرت میں بھی سخت عذاب ہوگا۔  
اہل ایمان کو کدھچھوڑنے کا بڑا دکھ تھا۔ پھر وہ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز  
پڑھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِیْقُ وَالْمَغْرِبُ مَشْرِیْقُ  
اَوْ مَغْرِبُ سَبِّ کَیْجِ الشَّرِیْ کَیْجِ۔ فَاِیْسَمَا کُوْنُوْا اَمَّ مَدِیْنِی رُیْخِ کَرُوْکَ فِیْ شَیْءِ  
وَجْهَ اللّٰہِ قَمَّ الشَّرِیْ کَیْجِ اَوْ مَدِیْنِی پادگے۔ لہٰذا تم کسی قسم کی گھبراہٹ محسوس نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ  
ہر وقت تمہارے ساتھ ہے۔

استقبال قبلہ

استقبال کعبہ کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ سفر کے دوران اگر صیری رات  
یا طوفان باد و باران میں اگر قبلہ کا رخ معلوم نہ ہوتا، تو ہر شخص جس طرف رُخ ہوتا اسی طرح  
نماز ادا کر لیتا۔ ترمذی شریف میں آتا ہے۔ کہ ایسا ہی کوئی واقعہ صحابہ کرام کو پیش آیا جب  
حضرت علیہ السلام کو پتا چلا کہ یہی آیت ممدوت فرمائی فَاِیْسَمَا کُوْنُوْا فِیْ شَیْءِ وَجْهَ اللّٰہِ یعنی  
تم نے جس طرف بھی رُخ کر کے نماز پڑھی ہے۔ سب کی نماز درست ہے۔ اللہ تعالیٰ  
کے ہاں مقبول ہے۔ اگر قبلہ کا رخ درست نہیں تھا تب بھی نماز لوٹنے کی ضرورت نہیں۔

جب کوئی آدمی سواری پر سفر کر رہا ہو۔ تو جس طرف بھی وہ جا رہا ہے اسی طرف فعلی نماز ادا کر سکتا ہے  
صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضور علیہ السلام سفر پر تھے۔ اگرچہ آپ کا رخ مبارک قبلہ کی طرف  
نہیں تھا۔ پھر بھی آپ فعلی نماز ادا کر لیتے تھے۔ تو ایسے ہی مواقع کے لیے فرمایا کہ تمہارا رُخ تب طرف  
بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ اُدھر ہی متوجہ ہے اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا  
اور سب کو جاننے والا ہے۔ وہ ہر شخص کو اس کے حالات کے مطابق بدلہ عطا فرمائے گا۔



السماء  
دریں چل و شرف

البقرة  
(آیت ۱۱۹-۱۱۷)

وَقَالُوا اخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَنَهُ بَلْ لَمْ يَكُنْ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ  
كُلٌّ لَّهُ قَانُونٌ ۝۱۱۶ بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا  
فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝۱۱۷ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا  
يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَنَزِّلُ عَلَيْنَا آيَةً ۖ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ  
مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّتَ الْأَوَّلُ لِقَوْمِهِ  
يَكُونُونَ ۝۱۱۸ إِنَّا أَرْسَلْنَا بِأَحْقَبَ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُنْصَلُ عَنْ  
أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ۝۱۱۹

ترجمہ: اور کہا ان لوگوں نے کہ شر نے بنا بنا دیا۔ پاک ہے اس کی ذات،  
بلکہ اُسی کے لیے سن۔ جو پنج آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اُسی کی اطاعت  
کرنے والے ہیں ۝۱۱۶ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اور جب وہ کسی چیز کا  
فیصلہ کرتا ہے۔ تو اُسے نازل کرتا ہے۔ ہر جا۔ پس وہ ہر جاتی ہے ۝۱۱۷ اور کہا  
ان لوگوں نے جو نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیوں نہیں کلام کرتا۔ یا  
ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح کہا ان سے پہلے لوگوں نے ان  
کی بات کی طرح۔ ان کے دل آپس میں جڑے جلتے ہیں۔ تحقیق ہم نے ان لوگوں  
کے لیے آیات بیان کر دی ہیں۔ جو نصیحتیں دیکھتے ہیں ۝۱۱۸ بے شک ہم نے  
آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔ اور آپ  
سے درشت دائروں کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا ۝۱۱۹

اللہ تعالیٰ والہ  
سے پاک ہے

اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث مسلسل چلی آرہی ہے۔ ان آیات میں  
ان کی ایک اور بے عینیتگی کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مینا بنایا ہے۔  
قَالُوا اخَذَ اللَّهُ وَلَدًا اس غلط عقیدے میں یہ تینوں گروہ شامل ہیں۔ یعنی

یہود، نصاریٰ اور مشرکین قَالُوا کی ضمیر ان تینوں کی طرف لٹتی ہے۔ سورۃ توبہ میں موجود ہے کہ یہودیوں کے ایک فرقہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنایا ہے؟ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ اگرچہ تمام یہود کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ تاہم ایک گروہ ایسا ہے جو اہل کتاب میں شامل ہے۔ مگر عقیدہ یہ رکھتا ہے۔ اسی طرح نصاریٰ کا عقیدہ تو واضح ہے۔ کہ یہ کھل کر کہتے ہیں الصَّبِيحُ بْنُ اللَّهِ یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ قرآن پاک نے یہ بات تصریح کے ساتھ بیان کی ہے۔ کسی مخلوق کو خدا کا بیٹا بنانا اتنا قبیح فعل ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے، اس کے حکم سے زمین و آسمان پھٹ جائے۔ اور خدا تعالیٰ کا قہر نازل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا بڑی بیوردہ بات ہے مشرکین عرب کے متعلق تصریح موجود ہے۔ کہ وہ فرشتوں کو خدا تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَنِ إِنَاثًا۔

اس باطل عقیدے کے رد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَجْنُونٌ الشک کی ذات پاک ہے مبرا اور منزہ ہے۔ بیٹے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا دو وجوہ سے محسوب ہے۔ اگر بیٹا غیر جنس کا ہو تو یہ انسان کے لیے عیب ہے۔ اور اگر ہم جنس ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے عیب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، فردانیت اور یگانگت کے خلاف ہے۔

مخلوق کے لیے اولاد کا ہونا اس لیے محسوب نہیں۔ کہ مخلوق عاجز ہے۔ اسے اولاد کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر انسان اولاد کے بڑے مشتاق ہوتا ہے اس لیے اولاد کی عدم موجودگی میں انہیں سلسلہ نسب منقطع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ آخری عمر میں خدمت کے محروم ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ زکوٰۃ ہے۔ اس کی صفت تو غنی ہے۔ وہ صمد ہے۔ وہ ہر ایسی چیز سے بے نیاز ہے۔ لہذا اس کی طرف اولاد کی نسبت کرنا بہت بڑی بات ہے۔

یہ حقیقت بھی قابل غور ہے۔ کہ اولاد کی پیدائش اس کے باپ کے مادہ سے ہوتی ہے جو اس کے جسم سے الگ ہو کر رحم اور میں منتقل ہوتا ہے۔ اور پھر وہ بچے کی صورت میں اس کے جسم سے علیحدہ ہوتا ہے۔ تو اس قسم کی تولید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا بہت

قیح حرکت ہے۔ کیونکہ اللہ جل شانہ ہر ایسی چیز سے منزہ ہے۔ سُبْحَانَہ سے یہ مراد ہے۔  
 جب انسان کے عقیدے میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں نقصان  
 آتا ہے۔ تو اس کے نتیجے میں یا تو تشبیہ آتی ہے۔ یا تہلیل یہ ہوتا ہے۔ تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ  
 مخلوق کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کی جائے۔ جیسے لفظ اللہ برا مخلوق کی صفت ہے اگر  
 یہی صفت اللہ تعالیٰ میں ثابت کی جائے تو یہ تشبیہ کا ارتعاب ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی صفت  
 مختصہ کو مخلوق میں ثابت کیا جائے۔ تو شرک ہو جائے۔ مثلاً قادر مطلق، علیم کل اللہ تعالیٰ کی  
 ذات ہے۔ اور اگر یہی صفت کسی مخلوق میں مانی جائے۔ تو شرک ہوگا۔ سُبْحَانَہ کا لفظ  
 اللہ تعالیٰ کی اسی پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے۔

صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السلام سے سُبْحَانَہ کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا:  
 تَنْزِيهِ اللَّهِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ بِرَقْمَةٍ كِي بَدَلِ وَجِبْ سَے پاکیزگی۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن  
 عباسؓ سے دریافت کیا کہ حضرت تائبؓ کا معنی تو ہم جانتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے  
 بڑا ہے۔ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کا مطلب ہیں سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اَلْحَمْدُ لِلَّهِ  
 کا معنی یہ ہے کہ سب حمد و ثنا اور تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ حضرت سُبْحَانَہ کا مطلب  
 آپ سمجھادیں۔ آپ نے جواب دیا۔ یہ کون سی شکل بات ہے۔ سُبْحَانَہ اللہ ایک ایسا کلمہ ہے۔  
 جو اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے منتخب فرمایا ہے اور فرشتوں کو بھی حکم دیا ہے۔ کہ اس کلمے  
 کے ساتھ میری تعریف کیا کرو۔ الغرض! یہ چاروں کلمات یعنی اللَّهُ أَكْبَرُ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ،  
 اَلْحَمْدُ لِلَّهِ اور سُبْحَانَہ اللہ خدا تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے مقرر فرماتے ہیں۔ مطلب یہ  
 ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ تمام تعریفیں اسی ذات کے لیے ہیں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بَلَّ لَكَ مَا فِي السَّمَوَاتِ  
 وَأَنْ مِّنْ مِّنْ آسْمَانِ وَزَمِينَ كِ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ یعنی یہ تمام چیزیں مملوک ہیں  
 اور اللہ جل شانہ ان کا مالک ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اور انسان میں باپ اور بیٹے کی نسبت نہیں

ہے۔ بلکہ ایک اور مملوک کی نسبت ہے۔ درجہ بائیں ہی۔ یہاں۔ جسے سر قلم ۲۱ انتہا۔ اصل سے اور  
 اس کے حکم کو کوئی ڈال نہیں۔ کَلَّا لَذَاقًا تَلَوْنَهَا۔ جب اس کی اطاعت کرنے والے میں۔ اس کے  
 توحیدی حکم کی خلاف ورزی کسی میں مبالغہ نہیں۔ وہ کسی کو یاد کرنے۔ یہ کہ تندرست کر دے۔ کسی  
 یہ موت طاری کر دے۔ اس کے حکم کو کوئی ڈال نہیں سکتا۔ کائنات کی ہر چیز کو اس کی فرمانبرداری ہوگی  
 ہاں شریعت کے احکام ایسے ہیں جسے ان ن ڈال سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے  
 فَاذْكُرْ مَا كُنْتُمْ عَلٰی۔ جہاں کرو۔ ان ان احکام پر عملدرآمد میں کوتاہی کر سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ  
 کے توحیدی حکم کے سامنے سب کو تسلیم ختم کرنا پڑے گا جب موت کے فرشتے آجائے میں۔ تو پھر  
 کون ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو ڈال سکے۔ خود مرنے والا اور اس کے سامنے حمایت دیکھتے رہ  
 جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا توحیدی حکم پورا ہو جاتا ہے۔ گویا یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا  
 ذکر ہوا۔ اول یہ کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اور دوسری یہ کہ وہ ہر چیز کا متصرف بھی ہے۔ جو چاہے  
 کرے اس کے راستے میں کوئی حادثہ نہیں آتی۔

صفتِ ابداع

اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی تیسری صفت ابداع کا ذکر بھی ہے۔ فَرِیْدًا بَدِیْعًا لِّلصَّوْتِ  
 وَالْاَلْوَانِ وَهَآسَاوُنَ اور زمین کا ایجاد کرنے والا ہے۔ ابداع اس تخلیق کو کہتے ہیں جس کا  
 پہلے نمونہ موجود نہ ہو۔ کہ جسے دیکھ کر کوئی چیز تیار کی جاسکے۔ اور پھر موجود بھی ایسا ہے کہ وَیَا ذَا  
 قَعْنٰی اَمْرًا جب کسی کام کے کرنے۔۔۔ کا فیصلہ کرتا ہے۔ فَرَاغًا یَقُولُ لَکُنْ  
 تَوَدَّ کہتا ہے ہو جائیے کون پس وہ ہو جاتی ہے۔ یہ کُنْ ایسا لفظ ہے۔ جس میں سرعت اور  
 تیزی کا حکم پایا جاتا ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کُنْ فرماتے ہیں۔ تو کسی چیز کے معرض وجود میں آنے  
 کے لیے نہ کسی۔ نہ کسی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ ڈیرین طلب ہوتا ہے۔ اور نہ کسی کاریگر یا مددگار  
 کی مدد کار ہوتی ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہوتے ہی کام ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ کُنْ کا لفظ  
 بھی محض تعبیر کے لیے ہے۔ ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرما  
 لیتے ہیں، کہ کون سی چیز کس سطح پر مطلوب ہے۔ تو وہ فرما ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی  
 طرف خلوت

اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنا سخت بے ادب اور گستاخی ہے۔ یہ بے محل  
 اور فضول بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اور منزہ ہے۔ اس کی چار صفات کا بیان بھی

موگیا۔ حدیث شریف میں آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کَذَّبَنِي ابْنُ اَدَمَ وَلَمْ  
يَكُنْ لَهٗ ذَلِكَ اِنْسَانٌ مُّجْرَمٌ كُتِبَتْ لَهٗ رِجْسٌ مِّنْ رَّبِّهِ . حالانکہ اس کے لیے یہ بات مناسب نہیں ۔ اور  
انسان مجرم کو گالی دینا ہے ۔ حالانکہ یہ بھی اس کے مناسب حال نہیں ۔ پھر فرمایا کہ فَامْتَكِ  
تَكْذِبُ يَدُكَ اَيُّهَا اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ لَنْ يُّعْطِيَكَ رِبِّيْ نِكْمًا بَدَا فِي الْاِنْسَانِ كِتَابًا  
کہ مجھے دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا ۔ جس طرح کہ پہلی مرتبہ کیا ۔ یعنی انسان قیامت کا منکر ہے  
یہ اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے کے مترادف ہے ۔ اور گالی اس لحاظ سے دینا ہے ۔ کہ وہ میری طرف  
اولاد کی نسبت کر رہا ہے ۔ حالانکہ میری بیوی ہے اور نہ اولاد ہے ۔ اور نہ ہی مجھے انکی  
ضرورت ہے ۔ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے ۔ تو وہ گویا نہ تو  
کو گالی دیتا ہے ۔ لَقَوْلُكَ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حقیقی بیٹا نہیں ہے ۔ اگر ایسا ہو ۔ تو وہ خدا کا بجز ہوگا  
اگر خدا تعالیٰ کا جزا جلتے گا ۔ تو خدا تعالیٰ خود ہی حادث ہوگا ۔ بیسٹ نہیں ہے گا ۔ اسی طرح  
مجازاً بھی کسی کو خدا کا بیٹا نہیں کہہ سکتے ۔ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا اس قدر قرب حاصل کرے  
کہ بیٹے کی طرح ہو جائے ۔ بیٹا چونکہ متصرف ہوتا ہے ۔ وہ باپ کی مرضی کے خلاف بھی کوئی کام  
کر سکتا ہے ۔ بعض اوقات باپ کو مجبوراً بیٹے کی بات ۔ ناپڑتی ہے ۔ مگر اللہ تعالیٰ کی صفت  
تو یہ ہے كُلُّ لَهٗ قَانِتُونَ سب کے سب اُس کے طیع ہیں ۔ اُس پر کوئی بھی تصرف نہیں  
کر سکتا ۔ لہذا یہ بات بھی غلط ہے ۔ کہ کسی کو مقرب الہی ہونے کی بناء پر خدا تعالیٰ کا بیٹا تسلیم کر لیا  
جائے ۔ جیسا کہ عیسائیوں میں یہ چیز پائی جاتی ہے ۔

ایک اور غلط بات جو بعض لوگ کرتے ہیں ۔ وہ یہ ہے ۔ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ  
عِلْمَ سَعٰدٰی . جابل لوگ کہتے ہیں لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اللّٰهُ تعالیٰ ہم سے براہِ راست  
کلام کیوں نہیں کرتا ۔ اَوْ قَاتِلُنَا اِنَّہٗ اِذَا يَمَاسُہٗ اِس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی ۔ جس کی بناء پر  
ہم اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کی کتاب کی تصدیق کر سکیں مفسرین کرم بیان کرتے ہیں کہ مشرکین میں

اللہ تعالیٰ سے  
کلام کی خواہش

سے ایک شخص راف بن حریذ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ تو آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے براہ راست کلام کرے۔ یا وہ کوئی خاص نشانی ہم سے پاس بھیجے جس سے دیکھ کر ہم تصدیق کریں۔ فرمایا یوقونی اور حماقت کا سوال ہے۔ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ اس طرح کی باتیں تو ان سے پہلے لوگوں نے بھی کی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ پُرانا ہی سہی وہ ہوا ہے۔ آج کے دور کے کافر، مشرک اور جاہل لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ فلاں نشانی ہونی چاہیے۔ یا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کلام کیوں نہیں کرتا۔ فرمایا تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ اس تماشے کے تمام اگلے پچھلے لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اور لایعنی سوال پیش کرتے ہیں۔

حضور علیہ السلام  
کے معجزات

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ لوگ کون سی نشانی طلب کرتے ہیں حالانکہ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ہم نے تو یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں یا معجزات دکھائیے ہیں۔ کسی ایک اور نشانی کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست مبارک پر تقریباً تین ہزار معجزات ظاہر فرمائے۔ اور یہ سارے ان لوگوں کے سامنے ہیں۔ کیا شوقِ فقر و محبہ کوئی دھکی چھپی بات ہے۔ کیا ان لوگوں نے کعبہ کے خشک تنے کو روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ کی انگلیوں سے پانی کی نریں بدی ہو جانا کس کے علم میں نہیں یہ سب کچھ ان لوگوں کے سامنے ہے۔ مگر یہ نشانیاں ان لوگوں کو نظر آتی ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں اور جن کے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے۔ وہ سمجھ چکے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور جن کے دل میں عناد ہے اس قسم کی بے معنی باتیں وہی کرتے ہیں۔ البتہ نبی کے دل میں تکلیف ہوگی۔ غم لاحق ہوگا۔ کہ اتنی واضح نشانیاں موجود ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے براہ راست باتیں کر کے فرشتوں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ یا بیشہ آپ کو انبیاء علیہم السلام کے برابر سمجھتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے۔ یہ سب ناجائز مطالبات ہیں

جب کوئی شخص تمام تر نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائے۔ تو یقیناً دل میں افسوس

حضور علیہ الصلوٰۃ  
والسلام کیسے تسلی



پیرا ہو گا۔ حضور علیہ السلام کے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلیت فرمائی:   
 رَأَىٰ سَلْمَانَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا قَدْ نَزَّيْنَاكَ بِغَيْرِ مَنٍّ لَّهِمْ نَصْرٌ لَّكَ وَمِنْهُ نَصْرٌ لَّكَ وَمِنْهُ نَصْرٌ لَّكَ   
 بنا کر بھیجا ہے۔ آپ اپنی امت کے لیے بشیر اور نذیر ہیں۔ یعنی آپ اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری   
 سناتے ہیں۔ اور مشرکین کو دوزخ کی وعید بھی سناتے ہیں۔ جو لوگ آپ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ لازماً   
 اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔ آپ ان کی حرکات پر غمگین نہ ہوں۔ اور نہ ہی ان کے   
 دوزخ میں جانے پر کوئی قلق محسوس کریں۔ کیونکہ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيهِمْ   
 آپ سے دوزخیوں کے متعلق روال نہیں کیا جائے گا۔ کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے۔ بلکہ اَلَا اِنَّ   
 سے سوال ہو گا: مَا سَأَلَكُمْ فِيْ سَعْدٍ اللہ تعالیٰ پہچھے گا۔ تمہاری جہنم رسید ہونے کی کیا وجہ   
 تھی۔ پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ سکیں سے ہم روزہ نہیں   
 کرتے تھے۔ فضولیات میں گئے رہتے تھے۔ اور روزِ قیامت کی تکذیب کرتے تھے۔ لہذا آپ   
 ان کی حرکات سے دل برداشتہ نہ ہوں اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلْغُ آپ کا کام صرف بھانا ہے   
 باقی ان سے ہم خود نپٹیں گے۔

الْبَقَرَةُ

دریں چل دہشت

البقرة ۲

آیت ۱۲۳

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَبِيعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ  
 إِنَّ هُدَى اللَّهِ هِيَ الْهُدَىٰ وَلَكِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَدَلًا  
 الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا وَصِيرٍ  
 ۱۲۰ ۝ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُرْسِلَ  
 يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمِنْ تَكْفُرٍ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَافُونَ ۝ ۱۲۱  
 يَا بَنِي إِسْرَءِيلَ ذَكِّرُوا لِمَقَاتِي الَّتِي أَقَمْتُ عَلَيْكُمْ  
 وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ۱۲۲ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ  
 عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ  
 وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝ ۱۲۳

ترجمہ: اور ہرگز رضی نہ ہوئے آپ سے یہودی اور نصرانی یہ کہ آپ ان کی  
 ملت کا اتباع کریں۔ آپ کہہ دیجئے بیشک ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور  
 آپ نے اگر ان کی خواہشات کا اتباع کیا۔ بعد اس کے کہ آپ کے پاس تم اچکا  
 ہے۔ تو نہیں ہوگا۔ آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کوئی حمایتی اور مددگار ۱۲۰  
 جن کو ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی قوت  
 کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو کوئی اس کے ساتھ کفر کرے گا  
 پس یہی لوگ نقصان اٹھائیولے ہیں ۱۲۱ ۝ اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں  
 یاد کرو جو میں نے تم پر کیں۔ اور یہ بات کہ بیشک میں نے تم کو جہان داروں پر  
 فضیلت بخشی ۱۲۲ ۝ اور ڈرو اس دن سے کہ نہ کام آئے گا کوئی نفس کسی کی  
 طرف سے ذرا بھی۔ اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے بدلہ۔ اور نہ اس کو سفارش فائدہ  
 دے گی۔ اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ۱۲۳

گزشتہ صفحہ پر

یہود و نصاریٰ کی ضربیاں مختلف انداز میں بیان ہوتی ہیں۔ اس سے پیشتر اس بات کا ذکر بھی آچشمہ کتاب پہلے میں کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جی پیسے دین یعنی یہودیت یا نصاریت کی طرف پلٹ آئیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ ان ایمان کھو جائیں۔ اگرچہ ان پر حق واضح ہو چکا ہے۔ تاہم وہ حسد کی بنا پر اپنی آخر الزماں یہ ایمان لائے گئے ہیں تیار نہیں ہوتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعض باتوں میں رافضیت میں رہے۔ یہ قصہ یہ بھی کہ شاید یہ لوگ ہمارے ہو کر ایمان لائے آئیں۔ چنانچہ مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ ماہ تک قبلہ بیت المقدس ہی رہا۔ مگر بعد میں یہی معلوم ہوا کہ مشرک تو نادانی کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اہل کتاب حسد اور عناد کی بنا پر ایمان کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشرک یا تو ختم ہو گئے یا ایمان قبول کر لیا۔ مگر یہود و نصاریٰ باطل پر لڑے رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان مقام پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو خبردار کیا ہے کہ اہل کتاب سے آپ کوئی امید نہ رکھیں۔ یہ دین و دانت حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔

ضمانی کے لیے  
اہل کتاب کی تہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَٰكِنْ سَرَحْنِي عَنْكَ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ يَهُودِيٌّ أَوْ نَصْرَانِيٌّ  
آپ پر ہرگز راضی نہیں ہوں گے حتیٰ تَبَيَّنَ مَلَّتُهُمْ جب تک کہ آپ ان کی ملت کا اتباع نہ کریں۔ ان کا مذہب اختیار نہ کریں۔ ان کا طریقہ نہ اپنائیں لفظ لَنْ تاکہ نفی کے لیے آتا ہے۔ یعنی ہرگز راضی نہیں ہوں گے اہل کتاب کو حق بات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ تو مسلمانوں کو اپنے دین سے غفلت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خود ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ اہل کتاب کی جملہ ضربیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آخری بات کی کہ آپ ان سے کوئی امید وابستہ نہ کریں کہ شاید یہ ایمان لائے آئیں گے۔ بلکہ یہ لوگ اہل کفر ہیں جو اپنے دین پر لانا چاہتے ہیں۔ جو کرنا ممکن ہے۔

ہدایت الہی  
اہل ہدایت ہے

فرمایا یہ لوگ جس ملت پر آپ کو لانا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی خود ساختہ بات ہے قَدْ  
آپ ان سے فرمادیں گے اِنَّ هٰذَا الَّذِي هُوَ الْهُدَىٰ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے  
اگر آپ ہدایت الہی کو چھوڑ کر ان کی ملت کا اتباع کریں گے تو یہ جواکی پیروی بن جائیگی۔  
جو کہ ہدایت کی ضد ہے۔ اور اگر حق واضح ہونے اور علم آ جانے کے بعد آپ ان کی خواہش

اتباع کرنے لگیں وَلَٰكِنْ أَتَّبَعْتُ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ  
 تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ قَوْلٍ وَلَا نَصِيرٍ اللہ کی طرف سے آپ کے کوئی  
 حمایتی ہو گا اور نہ مددگار۔ یعنی اُسے نبی علیہ السلام اور اہل ایمان اب تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی آخری  
 کتاب ہدایت آچکی ہے۔ اگر اس کو پھوڑ کر اہل کتاب کی خواہشات کے پیچھے چلنے لگے۔ تو پھر  
 اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آسکتی ہے۔ اگرچہ یہ آپ کے قطعاً ممکن نہیں کہ حق کو ترک کر دیں تاہم قانون  
 کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔ اسی  
 کی پیروی کرنا ہے۔ اور کسی دوسری چیز کے پیچھے نہیں چلنا۔ یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ اور اس سے  
 کوئی بھی بری الذمہ نہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا  
 لَٰكِنْ اَشْرَكَتَ لِيُخْبِتَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اگر آپ سے بھی شرک  
 سرزد ہو گیا۔ تو آپ کے بھی سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ اور آپ نقصان اٹھانے  
 والوں میں ہوں گے۔ یہ اصول صرف حضور علیہ السلام کے لیے ہی نہ تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام  
 انبیاء علیہم السلام پر یہی حق بھیجی۔ کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ لہذا آپ حق کی پیروی کرتے  
 رہیں اور اہل کتاب کی خواہشات کی طرف توجہ نہ دیں۔

یہود و نصاریٰ کا دین اسلئے تو کتاب الہی کے ذریعے ہی نازل ہوا تھا۔ اور وہ برحق تھا۔ مگر  
 اب ان کی ملت تحریف کی وجہ سے بگاڑ چکی تھی۔ لہذا اب وہ قابل اتباع نہیں رہی۔ بلکہ اب تو  
 آخری نبی کا دین غالب آئے گا۔ وہی قابل اتباع ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا اَلَّذِي اَرْسَلَ  
 رَسُوْلَهُ بِالْحَقِّ وَاِلٰی دِيْنٍ اَلْحَقِّ لِيُظْهِرَ عَلٰی الدِّيْنِ كُلِّهٖ اَلْعَالٰی وَہ ریم و کریم ذات ہے۔  
 جس نے اپنے آخری نبی کو سچا دین ملے کر بھیجا ہے۔ تاکہ اس دین کو باقی ادیان پر غالب کرے جب  
 مقصد رسالت دیگر ادیان پر غالب ہونے کا ہے۔ کیسے ممکن ہے۔ کہ علم اور حق کی آمد کے بعد اہل کتاب  
 کی خواہشات کی پیروی کی جائے جسو ر میں سراسر کفران ہے۔ کہ کسری کی جلالت کے بعد کوئی  
 دوسرا کسری پیدا نہیں ہو گا۔ اور قیصر کی جلالت کے بعد کوئی دوسرا قیصر نہیں ہو گا۔ مگر مدعی جیسا

نزولِ مسیح علیہ السلام تک باقی رہیں گے۔ اور ہم ان تمام سے بادرست و گریبان ہو گئے۔ کبھی ان کو غلبہ حاصل ہو گا۔ اور کبھی تم غالب آؤ گے۔ گویا یہ لوگ قربِ قیامت تک باطل پر ڈٹے رہیں گے۔ لہذا ان سے قبولِ حق کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔

اہل کتاب میں  
اہل ایمان

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے۔ کہ جب کسی قوم کی بڑائی بیان کی جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس قوم کے موصوفہ لوگ ایسے ہی ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ان کی اکثریت ان صفات کی حامل ہے۔ ان میں بعض اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔ یہاں پر یہی چیز بتائی جا رہی ہے۔ کہ اگرچہ اہل کتاب کی اکثریت ایسی ہے۔ جو اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹی ہوئی ہے۔ تاہم ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں۔ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ جنہیں ہم نے کتابِ عفا کہ ہے۔ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَةٍ جو اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کرنے کا حق ہے۔ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِالْآيَاتِ یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں توراۃ اور انجیل پر ایمان رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ جو لوگ سابقہ کتب کا دیر پر صحیح معنوں میں ایمان رکھیں گے۔ وہ ہی آخر الزمان کا انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ کیونکہ توراۃ و انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔ اور جو حضور علیہ السلام پر ایمان لائے گا۔ وہ قرآن پر بھی ایمان لائے گا۔ یہ ساری کی ساری کتابیں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں اور ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مثلاً تو قدامتِ کتب کا دیر پر بیان رکھتے ہیں۔ مگر یہ کم محنت قرآن پاک پر ایمان نہیں لاتے۔ بہر حال فرمایا کہ اہل کتاب سنت کے سائے سے ایمان نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بھی ایسے ہیں جو کتاب کو صحیح طور پر پڑھتے ہیں۔ لہذا ایسے لوگ ایمان دار ہیں۔

حقِ تلاوت

تلاوت کا حق ادا کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس کے احکام پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ جو شخص زبانی تلاوت تو کرے مگر اس کے احکام کی پروا نہ کرے یا اس کے احکام کو توڑ موڑ کر پیش کرے یا اس کی غلط تاویل کرے۔ جیسا کہ اہل کتاب کرتے تھے۔ تو ایسے شخص نے تلاوت کا حق ادا نہیں کیا۔ قرآن پاک کی تلاوت میں بھی یہی اصول کار فرما ہے۔ مندرک حاکم کی روایت میں آیا ہے۔

کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تلاوت یہ ہے کہ کتاب کی حلال کردہ چیز و حلال کردہ حرام کردہ چیز کو حرام سمجھے۔ ایک دوسری حدیث میں آتا ہے: اُس شخص کا کوئی ایمان نہیں کہ اسْتَحْلَلَ حَرَامًا جس نے قرآن پاک کی حرام کردہ چیز کو حلال سمجھ لیا۔ بِذَلِكَ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کی پوری پوری پاسداری کی جائے۔ یہودیوں کی عہد اس کے الفاظ اور کلمات میں تحریف نہ کی جائے۔ کتاب الہی کے محکم اور مشابہات تمام آیات پر ایمان ہونا چاہیئے۔ صحیحات میں ستمجات بھی آتی ہیں۔ ان پر بھی یقین ہونا چاہیئے۔ وہ عمل کرنا چاہیئے۔ یہ حق تلاوت ہے۔ ایمان لانے کے بعد احکام کا اتباع بھی ضروری ہے۔ اگر عمل نہیں کرتا تو اس نے حق تلاوت ادا نہیں کیا۔

منکرین کیلئے  
خدا

فرمایا وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ کفر کرے گا۔ یعنی اس کی تلاوت کا حق ادا نہیں کرے گا۔ اس کے حکام کو چھپانے گا۔ اس کی غلط باتیں کرے گا۔ جیسا کہ یہودی کرتے تھے فَاذْبَنَ هُمُ الْخَبْرُ پس یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں اس دنیا میں تو شاید نرا سے بچ جائیں گے۔ مگر ان کا انجام کار بڑا ہوگا۔ اور آخرت میں یہ لازماً خدا پانے والوں میں ہوں گے۔ اُس وقت انہیں معلوم ہوگا۔ کہ انہوں نے احکام میں تحریف کر کے اہل کفران حق کے ذریعہ کتنا نقصان دہ سودا کیا تھا۔

حق و باطل  
کی پہچان

اہل کتاب کے دو گروہوں کا ذکر ہوا۔ ایک گروہ وہ ہے جس کی برائیاں مسلسل بیان ہو رہی ہیں اور جو اپنی ضد و عناد کی وجہ سے ایمان سے محروم ہوا۔ دوسرا وہ گروہ ہے جو کتاب کو صحیح طریقے سے پڑھتا ہے۔ اور پھر اس میں تحریف کرنے کی بجائے اس کے احکام پر ایمان لاتا ہے۔ انہیں لوگوں میں تنزہت عبد اللہ بن سلام ہیں۔ یہودی عالم تھے۔ مگر منصف مزاج تھے۔ حضور علیہ السلام سے پہلی ملاقات میں ہی ایمان قبول کر لیا۔ یہ بار بار کہتے تھے کہ مجھے یقین ہے کہ آپ ہی اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ جن کی بشارت کتب سابقہ میں آچکی ہے۔ ان کی اکثریت متعصب حق جنوں نے یدان قبول نہیں کیا اور آج تک اُسی ڈگر پر چلتے آئے ہیں





وَلَقَدْ فَضَّلْنَاكَ عَلَى الْعَالَمِينَ اور میں نے تمہیں جہان والوں پر فضیلت دی۔ بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کی فضیلت کا تذکرہ ان دروس میں تفصیلاً چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک مرتبہ پھر یاد دہانی عرانی۔ مگر یہ ایسی ناشکر کفار قوم ہے کہ حسد کی آگ میں جل کر تمام نعمات فراموش کر گئی۔

قیامت کا  
نقشہ

فرمایا ہے بنی اسرائیل! تم نہ سمجھنا کہ ان تمام بڑائیوں کے باوجود تم آخرت میں کسی نہ کسی عریضے پر خود ہو جاؤ گے۔ وَالْعَوَاكِمُ مَا لَا تَحْزَنُ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا اس دن سے ذرا جس دن کوئی کسی کے کچھ کا نہ آئے گا۔ اُس دن انسان کے بچہ کے تمام ذرائع خواہ وہ قوت کے ذرائع ہوں یا گڑ و زاری کے سب ناکام ہو جائیں گے۔ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَذْلٌ اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے گا۔ دنیا میں تو مال یا جان یا کسی قدر کے ہرے کوئی جان چھڑائی جاسکتی ہے۔ مگر قیامت کے دن مجرم سے کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی۔ صرف اسکی اپنی جان ہی قابلِ مؤذہ ہوگی۔ فرمایا وَلَا تَنْفَعُكَ شَفَاعَةُ اس دن کسی کی سفارش بھی سود مند نہیں ہوگی۔ اس دن کوئی کسی بہ بخت کی سفارش بھی نہیں کرے گا۔ تمنا یہ غصہ، باطل ہے کہ سنت ابراہیم علیہ السلام تمہیں دوزخ میں گرنے سے بچالیں گے۔ سفارش تو ایسا مذاہر کی ہو سکتی ہے اور وہ صلی اللہ تعالیٰ کی اجازت سے جس سفارش کے زعم میں ہے بنی اسرائیل! تم جلد ہو اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے اب بھی کچھ جا رہا۔ ایمان قبول کر لو۔

فرمایا جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے گا تو پھر قَوْلًا هُمْ يُنصَرُونَ ان کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔ اللہ رب العزت کی عدالت میں ٹھیک ٹھیک فیصلے ہوں گے۔ ان فیصلوں کو بدل کر مجرمین کی مدد کرنے والی کوئی ہستی نہیں ہوگی۔ اگلی آیات میں قت ابراہیم کی تائیس سے شروع کر کے حضور علیہ السلام کی نبوت اور آپ کی صداقت کا بیان ہے۔

البقرة

(آیت ۱۲۳)

السماء

دریں جہاں دہشت

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ  
لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنْكَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴿۱۲۳﴾

میں جہد بہ اور اس وقت کو دھیان میں لاؤ، جب آزمایا ابراہیم (علیہ السلام) کو اس  
کے رب نے چند باتوں کے ساتھ۔ پس انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ  
نے، فرمایا میں تمہیں لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔ (ابراہیم علیہ السلام) نے  
کہا کہ میری اولاد میں سے بھی (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں

ہے ﴿۱۲۳﴾

گذشتہ دروس  
پر ایک نظر

سورۃ بقرہ کی ابتدا میں قرآن پاک کے کتاب ہدایت ہونے کا بیان تھا۔ اس کے بعد  
اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے تین گروہوں کا ذکر کیا۔ پہلا گروہ ہدایت کو قبول کرنے والوں کا دوسرا  
منکرین کا اور تیسرا منافقین کا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع سے اپنی توحید کا اقرار  
اور اپنی عبادت کے لیے کہا۔ پھر قرآن پاک کی صداقت اور حقانیت کو بیان فرمایا۔ اس کے ساتھ  
پیغمبر علیہ السلام کی نبوت و راسخ کی صداقت کا ذکر کیا۔ اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ نے آگے خلیفہ آدم  
علیہ السلام اور پھر ان کی خلافت رضی کا ذکر کیا۔ جو اللہ تعالیٰ کی حکمت میں بڑے بڑے چکا تھا۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ جو کہ اپنے زمانے میں ایک عظیم قوم تھی  
اُسے اُس وقت اقوام عالم پر فضیلت حاصل تھی۔ اس کے بعد ان خرابیوں کا تفصیل کے ساتھ  
ذکر آتا ہے۔ جو بنی اسرائیل میں پیدا ہو چکی تھیں۔ اگرچہ بنی اسرائیل کی خرابیاں لاتعداد ہیں مگر  
ان آیات میں ان کی چالیس کے قریب خرابیاں بیان ہوئی ہیں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے  
بنی اسرائیل کو خطاب کیا اور فرمایا اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو اور ان کی ناقصی نہ  
کرو۔ فرمایا: وَاهْتَوِا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ۚ اِسْ كُنَابٍ پر  
ایمان لاؤ جس کو میں نے سب سے آخر میں نازل کیا ہے اور وہ سابقہ کتب کی مُصَدِّق ہے۔



نمبر کیا۔ مگر جس وقت ہمیں رحتوں کے ساتھ آزمایا گیا ہم صبر نہ کر سکے گویا ابتلی کا معنی آزمائش ہے۔  
 یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آزمائش تو دو ہے۔ چننے کسی کی اہلیت یا کارکردگی کاظم :  
 ہو بخیر اللہ تعالیٰ تو عظیم کمال ہے۔ وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی جانتا تھا کہ  
 آپ کس حیثیت و درجہ و منزلت کے نبی ہوں گے۔ اور چننے جس قدر بھی آپ میں اوصاف پاسے  
 جاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کے عطا کردہ تھے۔ تو ان حالات میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام  
 کی آزمائش کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آزمائش کی غرض و غایت یہ بھی ہوتی ہے  
 کہ کسی کو آزمائش میں ڈال کر اس کی حیثیت کو دوسروں پر واضح کیا جائے۔ امتحان لینے والے کو  
 تو علم ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کیسے مگر دوسرے لوگ اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لہذا  
 امتحان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے امتحان کی یہی غرض  
 غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام دنیا والوں پر ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ جس ہستی کو میں نے اپنا فیصل  
 منتخب کیا ہے۔ اس میں کیا خوبیاں ہیں۔ جن کی بنا پر انہیں بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ الغرض  
 اللہ تعالیٰ ملک الملک ہے۔ وہ چاہے ترابیاں عظیم السلام کا امتحان لے لے۔ اور نہ چاہے تو  
 ایک گنہگار کو معاف کر دے۔ بہر حال یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائشوں کا ذکر ہے۔  
 حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے مقام پر پیدا ہوئے جو موجودہ بغداد سے ساڑھے ستر میل  
 کے فاصلے پر واقع ہے۔ اُس زمانے میں بابل آشوریوں کی سلطنت اور بڑا امجدن ملک تھا۔ یہ شہر  
 کلدانیوں کا پایہ تخت بھی رہا۔ مگر زمانے کی دستبرد کے آگے ٹھہر نہ سکا۔ اور تباہ و برباد ہو گیا  
 اب اس کے ٹھنڈات سے اس زمانے کی اشیائے سال نکال کر انہیں عجائب گھروں میں تبدیل  
 کر دیے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح کے ٹھنڈات ہیں جس طرح ہمارے ہاں ٹینڈا کے ٹھنڈات ہیں  
 اسی طرح کے بعض مقامات سنہ ۱۹۱۱ء میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں کے ٹھنڈات سے پرانی تہذیبوں  
 کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وطن بابل تھا۔ جس کے  
 اب ٹھنڈات ہی باقی رہ گئے ہیں۔ حریپنہ نامے میں یہ بہت بڑا شہر اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام  
 کا وطن بابل

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مختلف آزمائشوں کے لیے یہاں پر کلغت کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ جمع کا صیغہ ہے۔ تاہم مبہم ہے۔ مفسرین کرام بہت سی آزمائشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ آپ کی آزمائش کا پہلا مرحلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب آپ نے ہوش دواس سنبھالا اور ارد گرد کے ماحول مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں آپ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق سب سے پہلے آپ کی اپنے والد، قوم اور بادشاہ وقت کے ساتھ کشمکش پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہل عمریں ہی شد و ہایت سے نوازا تھا۔ دوسری جگہ آتا ہے: **وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرٰءِیْلَ رُشْدًا** ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کج عطا کی۔ چنانچہ آپ نے اپنے مشرک زادہ ماحول کا یہ اثر یا کر آپ شرک اور کفر سے متنفر ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے کفر و شرک کی مذمت بیان کرنا شروع کی۔ خاندان، قوم اور بادشاہ سب آپ کے دشمن ہو گئے۔ یہاں تو معمولی تنازعہ ہو جائے تو لوگ بھاگ جاتے ہیں مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اور آپ پچاس ساٹھ سال تک اپنے ماحول کے سامنے سینہ سپر رہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کے عبادت خانہ میں جا کر سارے بتوں کو توڑ دیا۔ تو آپ کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اولیٰ سے لے کر اعلیٰ تک مخالف تو پہلے ہی تھے اب انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے بتوں کی توہین ابراہیم علیہ السلام کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ بادشاہ قوم کے ساتھ تھا۔ **اِنَّهُ فِیْ صُلٰیہٖ ہُوَ خَیْرِ قُوَّةٍ وَّاَنْصُرُوْکَ الْاِلٰہَ تَکُوْمُ** یعنی ہمارے معبودوں کو جو نقصان پہنچا یا گیا۔ اس کی تلافی صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ جیسا کہ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ اس فیصلہ پر عمل درآمد کے لیے بہت بڑی مقدار میں ایندھن جمع کیا گیا اور پھر اسے ایک کھالی میں اچھی طرح جلا کر بجھانے کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں پھینک دیا۔ ان حالات میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام آزمائش میں پورے ترسے انہوں نے آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی کوئی بد بزم فزع نہیں کیا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر معافی کی کوئی درخواست نہیں کی۔ بلکہ نہایت خند و شادی سے آگ میں ڈالے جانے کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اَرَادُوْا بِہٖ کَیْدًا جَعَلْنٰہُمْ الْاٰخِیْرَیْنَ** وہ ایک دوا کھینا چاہتے تھے۔ کسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صوفی ہستی سے ناپید کر دیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ



نے فرمایا کہ ہم نے ان بھڑوں کو ہی گھاٹے والا بنایا۔ یعنی ان سب کو ہمارا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ  
 ثابت قدم رکھا۔ اور آپؐ اس امتحان میں کامیاب و کامران ہوئے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا  
 کہ تمہارے بڑے پیارے سردار کو بعض اقوام میں آزادی فَاَتَمَّهْنُ تُوَ اَپَہ ان آزمائشوں میں پورا کر دے۔  
 یہ آپؐ کی پہلی بڑی آزمائش تھی

دوسری آزمائش  
 وطن سے ہجرت

اتنی بڑی آزمائش دیکھنے کے باوجود حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قوم آپؐ پر ایمان نہ لائی۔ بلکہ  
 آپؐ کو ایک دوسرے امتحان سے گذرنا پڑا۔ آپؐ کا خاندان ایک یونانی حضرت سارہ اور خدیجہ حضرت  
 لوط علیہ السلام پر مشتمل تھا۔ لوط علیہ السلام بچپن ہی سے آپؐ کی تحویل میں تھے۔ اور آپؐ پر یقین ہی  
 رکھتے تھے۔ اتنی بڑی دشمنی و مصلحت میں کوئی دوسرا شخص ایمان نہیں لایا۔ اگرچہ قوم پہلے منصوبے  
 میں ناکام ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جان کے دشمن تھے۔ اور آپؐ  
 کے قتل کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ ان حالت میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہجرت کا حکم  
 دیا۔ یہ آپؐ کی دوسری آزمائش تھی۔ ہجرت کرنا یعنی وطن اور گھر بار چھوڑنا بڑا مشکل کام ہے۔ مگر جب  
 اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ کوئی اس کی تعمیل میں ذرا تاقل نہیں کرتا۔ بلکہ نبی کے ساتھ اگر اہل ایمان  
 کو بھی ہجرت کا حکم دیا جائے تو وہ اس کھٹن کھٹائی کو عبور کر لیتے ہیں۔ ہمارے نبیؐ نے الزمان علیہ السلام  
 اور صحابہؓ کی ہجرت ایک بہت ہی بڑی بات تھی۔ اسی لیے قرآن و التَّائِقُونَ اَلَا وَلَوْ كُنْ مِنْ  
 الْمُفْجِرِينَ کو بہرہ کر ان کی تعریف فرمائی۔

انور علی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے رشتے کے حکم پر بیک کتے ہوئے ہجرت کے لیے  
 تیار ہو گئے۔ اور فرمایا اِنِّیْ مَہْجَرٌ اِلٰی رَبِّیْ میں اللہ کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ چنانچہ  
 آپؐ نے یومیہ ہجرت کے بعد بابل اور عراق کو چھوڑا۔ آپؐ کو مصر کے راستے سے شام اور فلسطین  
 پہنچنے کا حکم تھا۔ راستے میں شرق اردن کے علاقے میں بحریت آگیا۔ اس کے کنارے پر  
 بڑے دشمنوں کے گروہ تھے۔ انہوں نے مل جل کر کھڑے ہو کر آپؐ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس موقع پر  
 حضرت لوط علیہ السلام کو نبوت عطا ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ تمہیں قیام کرو۔ اور ان لوگوں کو  
 دین حق کی دعوت دو۔ چنانچہ آپؐ وہیں قیام پذیر ہو گئے۔ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے یونانی  
 بچے کے گھر آگئے شام اور فلسطین اور ہجرت نہ تک چلے گئے۔ منہ میں آپؐ کو ایک اور آزمائش

سے دو چار ہونا پڑا۔ جب وہاں کے ظالم حاکم نے آپ کی بیوی حضرت سارہؓ کو قبضہ میں کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثابت قدم رکھا۔ اور اس جابر حاکم سے نجات دلائی۔

تیسری آزمائش  
بیوی بچے سے  
جہانی

مصر کے حاکم نے حضرت سارہؓ کو ایک لونڈی دی تھی۔ اگرچہ وہ لونڈی نہیں تھی مگر اس وقت وہ لونڈی کی حیثیت میں تھی۔ حضرت سارہؓ نے باجرو لونڈی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بخش دی۔ اور اس طرح وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بن گئی۔ شام و فلسطین کے قیام کے دوران حضرت باجرو ہٹسے پھر پیدہ ہوا۔ جس کا نام امی اسمعیل (علیہ السلام) رکھا گیا۔ حضرت اسمعیل علیہ السلام بھی شہ خوار کی عمر میں تھے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا کہ اے ابراہیم! اس بچے اور اس کی ماں کو عرب کے دور دراز بیابان وادی غیر ذی زرعہ میں چھوڑ آؤ۔ آپ نے حکم کی تعمیل میں بیوی اور بچے کو بھرا لیا۔ اور موجودہ مکہ مکرمہ والے مقام پر پہنچے۔ جو کہ اس وقت بے آب و گیاہ واری تھی۔ اس مختصر قافے کے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں تھا۔ ایک مشکیزے میں تھوڑا سا پانی اور کچھ کھجوریں تھیں۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے گھٹو اور بیوی کے پاس چھوڑ کر چلے آئے۔ یہ سارے واقعات آپ سنتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کبھی کبھی جاتے اور اپنے بیوی بچے کی خبر گیری کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس بیابان وادی میں زمزم جیسے بہترین پانی کا انتظام فرمادیا۔ پھر وہاں بوجہ ہم قید کے لوگ آباد ہو گئے۔ اور اس طرح وہ دریاں اور غیر آباد جگہ بستی میں تبدیل ہو گئی۔

چوتھی آزمائش  
بیٹے کی قربانی

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک اور بڑی آزمائش آئی۔ جب حضرت اسماعیلؑ بارہ تیرہ سال کے ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آگیا کہ اس بچے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دو۔ اس واقعہ کی تفصیل بھی قرآن پاک کے مختلف مقامات پر آئی ہے۔ آپ کو بار بار خواب آیا۔ آخر آپ نے اس کا ذکر بچے سے کیا۔ بچہ بڑا صابر تھا۔ اس نے جواب دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر دیں۔ چنانچہ آپ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ حتیٰ کہ بیٹے کی گردن پر پھری چلا دی۔ وہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی۔ کہ اس نے قربانی بھی قبول کر لی اور پھر بھی صحیح سلامت نکلا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جان مال اولاد ہر طریقے سے آزمایا۔ اور آپ اس آزمائش میں پسے اترے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس ثابت قدمی پر جو انعامات عطا کیے۔ ان کا ذکر بھی قرآن پاک میں آتا ہے۔

نام القرآن کے نام سے بہت سے بزرگوں نے کتابیں لکھی ہیں جن میں حلال و حرام سے متعلق قرآنی احکام کی تشریح کی گئی ہے۔ سب سے پہلی تفسیر امام ابو جبر بن جبر بن جبر نے کی ہے۔ یہ حنفی امام ہیں ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری ہے۔ ان کے بعد پانچویں صدی میں امام ابو جبر بن جبر بن جبر نے جوئے میں آپ کا تعلق بتا دیا ہے۔ اور آپ کا وطن مالوف اندلس تھا۔ آپ بھی بہت بڑے مفسر قرآن تھے حضرت امام شافعیؒ کی احکام القرآن موجود ہے۔ اگرچہ انہوں نے خود یہ کتاب نہیں لکھی۔ مگر امام بیہقیؒ نے ان کی کتابوں سے متعلقہ تفسیری آیات کو منتخب کر کے علیحدہ کتابی صورت دی ہے۔ آپ چوتھی صدی ہجری کے محدث اور امام ہیں۔ کشف و سرور کے بہت بڑے امام شیخ ابن عربیؒ ساتویں صدی میں جوئے میں ہیں۔ انہوں نے بھی احکام القرآن کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ انہوں نے حلال و حرام کے مسائل کی بجائے تصوف پر زیادہ مسائل جمع کیے ہیں۔ موجودہ دور میں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کو بھی احکام القرآن تالیف کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ آپ نے اپنے بعض شاگردوں اور مریدوں کو اس کام کی تحمیل کے لیے کہا۔ چنانچہ احکام القرآن کا ایک حصہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اور دوسرے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے تالیف کیا اور ایک حصہ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کے دو حصے انہی تھانوی ہیں جن کی تکمیل نہیں ہو سکی۔

الغرض امام ابو جبر بن جبر بن جبر نے اپنی کتاب احکام القرآن میں لکھا ہے کہ سورۃ نجم کی آیت **وَإِنْ مِنْكُمْ آلِي عَرْفَةَ** کا یہی مطلب ہے کیا تم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے پورا پورا کر دکھایا یعنی اللہ تعالیٰ کی عرفت سے جو بھی حکم آیا۔ انہوں نے پورا کیا۔ اور اس طرح ہر آزمائش پر پورے اترے۔ آپ نے اپنا سارا مال مہمانوں اور محتاجوں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ آپ اکیلے کھانا نہیں کھایا کرتے تھے۔ جب تک کوئی ہمارا نہ شامل ہو جاتا۔ آپ نے اپنے آپ کو آگ میں ڈالے جانے کے وقت بھی ذرا پس و پیش نہ کیا۔ اپنے قلب کو ہمیشہ دھماکے سے بھرا رکھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے وقف کر دیا اور آپ ہر سختی میں کلمہ بولتے

حضرت ابراہیم علیہ السلام  
امام ان سید

حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ مبارک ہستی ہیں کہ جب ان آنحضوروں میں کامیاب ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر انعام مرحمت فرمایا قَالَ اِلٰی جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں تم میں لوگوں کا امام یعنی پیشوا بنانے والا ہوں۔ امام وہ ہوتا ہے جسکی اقوال و افعال میں اقتداء کی جاسکے۔ اس لحاظ سے تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امت کے امام ہوتے ہیں وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اٰمَةً يُحَدِّثُوْنَ بِاٰمُرِنَا مَجْمُوْعًا سے حکم سے امت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تن کا ذکر خیر ہو رہا ہے، وہ ترقی حقیقیہ کے بہت بڑے امام ہیں۔ آپ کا لقب ابوالانبیاء ہے۔

آپ تمام بعد میں آنے والے انبیاء علیہم السلام کے باپ اور جد امجد ہیں، الغرض تمام آنستوں میں سے گننے کے بعد اللہ تعالیٰ نے شہداء کو لے کر ابراہیم! میں تجھے لوگوں کا امام یعنی پیشوا بناتا ہوں۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کا انعام پایا تو فوراً درخواست پیش کر دی۔ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ عَمْرِيْٓ كَيِّدًا اَكْرِيْمًا جس طرح تیرے مجھے منصب

ظالم محروم ہے

امت سے نوازا ہے۔ کیا یہ سلسلہ میری اولاد میں بھی جاری رہے گا۔ کیا میری اولاد بھی اس عمدہ جیل پر فائز ہوگی اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ منصب امت صرف اہل ایمان کے لیے ہے۔ قَالَ لَا يَنْكَالُ عَهْدِيْ الظَّالِمِيْنَ فَرَايِمًا یہ وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ ظالم اس قابل نہیں ہوتا کہ اُسے منصب امت عطا کیا جائے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے حصے میں آتا ہے۔ اور یہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو چیز عطا ہوئی، وہ نبوت ہے۔ فقہاء و محدثین حکامین وغیرہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے آنکھ میچنے کے وقت کی مقدار بھی کفر یا شرک کیا ہو تو وہ عمدہ نبوت کا مستحق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو اس قدر پاک رکھتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے علاوہ خلافت اور حکومت والے جو امام ہیں۔ ان میں سے بھی جو کوئی ظالم ہے اس آیت کی رو سے حکومت کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک امت کے قابل وہی لوگ ہیں جو عدل و انصاف کو سر بلند رکھنے والے ہیں۔ کوئی بھی ظالم پیشوائی کے لائق نہیں ہے۔

الْبَقَرَةُ  
دوسری جیل و ۲۹

البقرة  
آیت ۱۲۵ تا ۱۲۶

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَاَخَذْنَا مِنْ  
مَقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُمَكِّنًا وَعٰهَدْنَا اِلٰى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعٖلَ  
اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقٰئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۱۲۵  
وَإِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَاَرْزُقْ  
اَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ  
قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاَمِئْتُهُ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضَعْنٰهُ اِلَى عَذَابِ  
النَّارِ وَبَشِّرِ الْمَصِيْرَ ۝۱۲۶

تس جہرہ ۲۰ اور اس بات کو دسیان میں ۱۰۰۔ جب کہ ہم نے بیت اللہ  
شریف کو لوگوں کے لیے رجوع اور امن کی جگہ بنایا۔ اور ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑا  
ہونے کی جگہ کو معلوم جینی نماز کی جگہ بناوا۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسمعیل (علیہما السلام)  
کی طرف حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف دینے  
والوں اور رکن و سجد کرنے والوں کے لیے پاک و صاف رکھو ۝۱۲۵ اور اس  
بات کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا ہے رب! اس شہر کو امن والا بنا دے  
اور یہاں کے رہنے والوں کو بچوں سے روزی دے۔ جو کوئی ان میں سے ایمان  
لایا اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا اور جس شخص نے  
کفر یا میں اُسے عتور سے دن تک فائدہ پہنچاؤں گا۔ چہرے کٹاں کٹاں دوزخ  
کے عذاب کی طرف سے جائز کا۔ اور وہ لوٹ کر جانے کی بہت بڑی جگہ ہے ۝۱۲۶

گزشتہ  
چوتھے  
کے  
بنی اسرائیل کو خبر دیں گے مذکورہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم  
کی نبوت اور رسالت کا ذکر کیا ہے۔ قرآن پاک کی حقانیت بھی بیان ہوئی ہے۔ مگر اس سلسلہ  
کی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے شروع ہوئی۔ کیونکہ اگلی آیات میں اس دعا کا

ذکر ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضور خاتم البیتین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق کی تھی۔ مگر اس سائے سلسلہ کی بنیاد تو وہاں سے شروع ہوئی ہے۔ مگر پہلے قیصر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور پیشوائی کا ذکر فرمایا ہے آپ پر آنے والی آزمائش کا ذکر آیا۔ اور پھر ان تمام امتحانوں میں آپ کی کامیابی کا بیان بھی آیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو امامت عامہ بھی عطا فرمائی۔ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا اِس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے متعلق بھی دعا کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا یَتَلَّ عِبَادِیَ الظَّالِمِیْنَ فَمِنْ اَوْلَادِکَ اُولَیْکَ مِنْکَ مِنْکَ بَیِّنَہٗ کَا۔ وہ منصب امامت کے اہل نہیں ہوں گے معلوم ہوا کہ امامت میں سے جسے اس کو بٹ گا۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نیک اور صالح ہو گا۔ اور کفر و شرک کا مرتجب اس عہدہ سے محروم ہے گا۔

شیعہ امامیہ کا  
غلط استدلال

شیعہ امامیہ نے اس آیت سے بہت غلط استدلال کیا ہے۔ انہوں نے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ صاحبان دعوٰی باللہ امامت کے اہل نہیں تھے۔ کیونکہ زندگی کے پہلے حصہ میں وہ کفر و شرک کے مرتکب ہوئے تھے۔ اور ایمان بعد میں لائے۔ یہ خلافت اس کے حضرت علیؓ اور اہل علم سے ہی مومن تھے۔ لہذا خلافت کے اہل وہ تھے۔ شیعہ حضرات نے یہ غلط استدلال کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ ابتداء میں کفر میں شامل تھے۔ اسی طرح خالد بن ولیدؓ سیف بن مسیونؓ اللہ حضرت ابو عبیدہؓ حضرت عباسؓ حضرت حمزہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور حضرت خلیلؓ اور آپ کے دیگر چچا زاد وغیرہ سب کے سب ابتدائے نبوت کے زمانہ میں اسی سوسائٹی کا حصہ تھے۔ جو مشرکین مکہ کی سوسائٹی تھی۔ مگر جوں جوں اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ عطا کرتا رہا۔ یہ اصحاب ایمان کی دولت سے مشرف ہوتے رہے۔ اور اپنے کفر و شرک پر معنی ساجد سجاد سے تائب ہو گئے۔ اس ضمن میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلشَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ رَزَّ ذَنْبٌ لَّہٗ گناہ سے توبہ کرنے والا بائبل اسی طرح موبہ تائب ہے۔ گویا کہ اس نے کوئی گناہ



کیا ہی نہیں۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی ارشاد ہے۔ **اَلْاِسْلَامُ فَرَمَا كَانَ قَبْلَهُ نَدَ**  
لانے کے بعد مومن کے سابقہ تمام گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے تمام صبیحہ کرامؑ اسلام  
کی دولت سے اللہ مال ہو کر سابقہ تمام گناہوں سے پاک و صاف ہو گئے۔ لہذا اس کے باوجود ان  
پر کفر و شرک کا الزام لگانا قبیح حرکت ہے۔ اور مذکورہ آیت کریمہ سے غلط استدلال ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کا تذکرہ بیان  
فرمایا۔ **وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا** اس بات کو خیال میں رکھو جب  
ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے مٹا اور امن والا بنایا۔ بیت اللہ سے مراد خانہ کعبہ  
ہے۔ اور مٹا ہونے کے دو معنی آتے ہیں۔ پہلا معنی ٹوٹنے کی جگہ ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ یہاں بدکار  
آتے ہیں۔ لوگوں کا ذوق و شوق انیسویں دنیا کے کونے کونے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت و عبادت  
کے لیے کھینچ کھینچ کر لاتا ہے۔ وہاں پر ایک مرتبہ پہنچ جانے والا میرا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا  
ذوق و شوق اور بڑھ جاتا ہے۔ اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح وہ پھر وہیں پہنچ جائے۔  
**مَثَابَةً** کا یہی معنی ہے۔ اور اس ضمن میں تعلیم بھی یہی دی گئی ہے کہ حاجی طوافِ دراع کے وقت  
یہ دعا مانگے۔ اے اللہ! یہ میرا آخری عہدہ ہو جبکہ مجھے پھر بھی موقع ملے کہ میں تیرے گھر کی زیارت  
کروں۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کو **هُدًى لِّلْعَالَمِينَ** یعنی دنیا بھر کے لیے ہدایت  
کا مرکز بنایا ہے۔ سورۃ آل عمران میں اس کا تذکرہ مرقوم ہے۔

**مَثَابَةً** کا دوسرا معنی تو آب کی جگہ ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس مقدس مقام پر جس قدر  
ثواب حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسری جگہ پر نہیں ملتا۔ ابن ماجہ شریف کی روایت میں حضور نبی کریم  
صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مرقوم ہے۔ مسجدِ نبویؐ میں ایک نماز پڑھنے کا ثواب دوسری  
جگہ پر ایک لاکھ نماز کے ثواب کے برابر ہوتا ہے اور جو شخص بیت المقدس یا مسجد نبویؐ میں ایک  
نماز ادا کرتا ہے۔ پچاس ہزار نمازوں کا ثواب پاتا ہے۔ بہر حال یہاں پر مٹا ہونے کے دونوں  
معنی ہیں یعنی مرکزِ ہدایت اور ثواب کی جگہ۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جہنم نے بیت اللہ شریف کو امن دالی جگہ بنایا۔ ظاہر ہے۔ جو شخص ایمان کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔ اُسے آخرت کے عذاب سے امن مل جاتا ہے۔ اور ظاہری طور پر بھی جو کوئی احرام کی حالت میں وہاں جاتا ہے۔ اس کو پناہ حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا

جسے اہم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی مجرم حرم میں داخل ہو جائے۔ تو اس کے خلاف تعزیری کارروائی حرم میں بھی جائز ہے۔ اُسے حرم سے باہر نکالا جائے گا۔ اور پھر عد جاری کر دی جائے گی۔ بعض دوسرے ائمہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی قاتل جیسا بڑا مجرم بھی حرم میں داخل ہو جائے تو اُسے وہاں کچھ نہ کہو! اس کا دامن پانی بند کر دو۔ جب ثبوت ہو کہ خود ہی حدود حرم سے باہر آنے لگا تو اس پر عد جاری کر دی جائے۔ گویا یہ مقام ظاہری طور پر بھی گمراہ امن ہے۔

مقامِ ابراہیم

بیت اللہ شریف کے ضمن میں مقامِ ابراہیم کا ذکر فرماتے ہوئے فرمایا۔ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرٰہِیْمَ مُعَلِّیْنَ اور ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو — نماز کی جگہ بناؤ۔ مقامِ ابراہیم سے مراد کوئی کمرہ نہیں ہے۔ جہاں آپ نماز ادا فرمایا کرتے تھے بلکہ یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی تھی۔ آپ کے پاؤں مبارک کے نشانات اس پتھر پر اب بھی موجود ہیں۔ یہی وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر حج کا اعلان کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا: وَادْعُ إِلَىٰ الشَّامِ بِالْحَبِیجِ۔ اے ابراہیم! لوگوں میں اعلان کر دو کہ اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر ہو چکا ہے۔ اس کاج کرنے کے لیے آؤ۔ تعمیرِ مکہ میں آتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ پروردگار! میری آواز کون سنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا کَامِ اَعْلَانِ کرنا ہے۔ میں اس آواز کو تمام نسلِ انبی کی پشتوں میں پہنچی دوں گا۔ جن کی قسمت میں بیت اللہ کاج مقدر ہے۔ ان تک آپ کی آواز پہنچے گی۔ بہر حال مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس کے متعلق فرمایا کہ اس کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ۔

تہذیب علم کی نفیست کے باب میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ نے خود ہر نماز کی کھڑکی کو ہاتھوں پر نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت فرمائی: **وَتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ رَبِّكُمْ مَوْضِعًا**۔

مقام ابراہیم تقریباً چودہ اونچ مربع چھوٹا سا پتھر ہے۔ خود بہت اللہ شریف کے قریب ہی تعمیر کعبہ کے وقت سے پڑا ہے۔ اور یہ حضرت مسیح علیہ السلام سن ۵۱ دو ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے پتھر کو تسلی بنا کر اس کے اوپر تو نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ تاہم اس سے مراد یہ ہے کہ پتھر کے قرب و جوار میں نماز ادا کی جائے۔ چنانچہ ہر طواف کرنے والا طواف کے سات چکر پلٹے کرنے کے بعد دو رکعت مقام ابراہیم کے قریب ادا کرتا ہے۔ اگر اس کے بالکل قریب جگہ نہ ملے تو پیچھے کہیں بی دو رکعت واجب الطواف ادا کر لے جاتے ہیں۔

اہم عظیم اور صیغہ کے نزدیک عواف کے دو رکعت واجب ہیں۔ جب کہ دوسرے نماز کریم اُسے سنت کہتے ہیں۔ بہر حال اس مقام پر نماز پڑھنے کی بہت زیادہ نفیست ہے۔ پہلے یہ پتھر ایک چوڑے پر رکھی جاتی تھی۔

مگر موجودہ حکومت نے مقام ابراہیم کے چوڑے اور زمزم کے چوڑے کو بنا دیا ہے۔ اور اب مقام ابراہیم شیٹ کے ایک خوب بند کر دیا گیا ہے۔ اور اس کے اوپر پیل کی خوبصورت جال لگا دی گئی ہے۔ اور اس طرح بہتر کی دہری حفاظت کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ مگر اگر کسی وجہ سے ایک خول و نقصان پہنچے تو کم از کم در وقت مذہب۔ حکومت سعودیہ نے لاکھوں دیال کے خرچ سے حفاظت کا یہ انتظام کیا ہے۔ اب مقام ابراہیم دور سے تو نظر نہیں آتا۔

مگر جال کے قریب کھڑے ہو کر دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے۔ کہ اس پر حضرت

ابراہیم علیہ السلام پاؤں کے نشان موجود ہیں یہ پورے دس پتھر ایک سمت سے ٹھوٹے ٹھوٹے فاصلے پر طواف میں رکھا ہوا۔ عام ایام میں تو طرفین تمام ابراہیم اور بیت اللہ شریف کے درمیان ہی چلتے ہیں مگر ایہ حج میں جوں جوں رش بڑھتا ہے۔ ہر ابراہیم طواف کرنے والوں کے درمیان میں آ جاتا

ہے۔ اور لوگ اس کے دونوں طرف سے گزرتے بہتے ہیں

بیت شریفین  
کی صفائی

مقام ابراہیم کے تذکرے کے بعد پھر بیت اللہ شریفین کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَعَفَا نَا اِلٰی اٰبِرٰهٖمَ وَاسْمٰعِیْلَ ۝ اٰنْ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّٰہِیْنَ ۝ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں طواف کرنے والوں کے لیے وَالْكَافِیْنَ اور اعتکاف بیٹھنے والوں کے لیے وَالتَّكْوِیْنَ الشُّعْبُوۡدِ اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ پاک و صاف رکھنا دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ یعنی ظاہری پاکیزگی اور باطنی پاکیزگی۔ چونکہ حج و عمرہ کے لیے دروازہ سے لوگ وہاں پہنچتے ہیں۔ اس لیے ان کی سولت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس لحاظ سے ظاہری صفائی کا مطلب یہ ہے کہ حرم پاک کو ہر قسم کی نجاست بدبو وغیرہ سے پاک رکھا جائے۔ کیونکہ لوگ وہاں عبادت کے لیے آتے ہیں۔ وہاں اعتکاف بیٹھتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور دیگر وظائف میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ تم دونوں باپ بیٹا میرے مہازوں کی خاطر اس گھر کو ہمیشہ پاک صاف رکھو۔ جس طرح بیت اللہ شریفین کی پاکیزگی قائم رکھنے کا حکم ہے۔ اسی طرح مہم مہاجر کی ہر قسم کی آلودگی سے پاک و صاف رکھنا ضروری ہے۔ سورۃ نوح میں ارشاد ہے فِیْ یُّوْمَئِیْ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تَرْفَعَ وَیُذَكِّرَ فِیْہَا اٰنْمِیۡۃٌ اَنْ تَحْرُوۡنَ مِیۡنَہِیۡمِ اللّٰہِ تَعَالٰی عَنِ ذُنُوۡبِہِیۡ کُنَّہِ کَاٰحِکَمَ دِیۡاۡبَۃٍ۔ اور وہاں اس کا نام ذکر کرنے کو کہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے۔ قَطِّعُوْا اِگْرَ تَمَیۡنَہِیۡمِ گھر میں بھی کوئی جگہ نماز کے لیے مقرر نہ رکھی جائے۔ تراں کو بھی پاک صاف رکھو۔ ظاہر طور پر وہاں کوئی کوڑا کاٹا یا گندگی نہیں رہنی چاہیے۔

مساجد کی صفائی

مساجد کی باطنی صفائی کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہاں پر کوئی مشرکانہ حرکت نہ کی جائے اور نہ ہی وہاں پر بے نیازی باتیں کی جائیں۔ جس طرح بدن کی طہارت ضروری ہے۔ اسی طرح عقل اور دل کی طہارت بھی ضروری ہے۔ اگر دل کے کسی کونے میں شرک و نفاق کا کوئی شائبہ بھی ہو گا تو پورے کا پورا انسان ناپاک ہو گا۔ اسی لیے ارشاد درتالی ہے اِنَّکَ الْمُشْرِکُوۡنَ خٰجِرٌ

یعنی مشرکین میں۔ ان کے دلوں پر شرک کی نجاست ڈرنی نہ ہوتی تھی۔ لہذا ضروری ہے کہ دل و  
 دماغ کھل جائے۔ بدعت و دیگر خرافات سے پاں و زور نہ دے۔ قرآن پر صحیح طریقے سے ایمان ہو۔  
 حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی فرماتے ہیں کہ ملت کو پائین کی طرف دھکیلتے ہیں۔ ہماری قوت  
 زیادہ ہے۔ بدعت و بدعات کی جو کھنڈی سرایت کر چکی ہے۔ اس سے کچھ بچنا چاہیے۔ ضروری ہے کہ گناہ  
 عظام نہ کرنے پوری قوت کو ناپاک کر دیکھنا ہے۔ لہذا انفرادی طاقت کے ساتھ ساتھ اجتماعی پاکیزگی کی  
 بھی ضرورت ہے۔

سنت ابراہیم علیہ السلام  
 کی خصوصیات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ صحیح احادیث میں آیت ہے کہ آپ  
 سب سے پہلے شخص اول من اُختلن میں جنہوں نے غنم یا بکری روایتوں میں یہ ہی آیت ہے  
 کہ نبی ابراہیم علیہ السلام تختوان پید ہوئے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام ایسے نہیں ہوئے۔ انہیں اسی  
 سال کی عمر میں غنم کا حکم ہوا۔ چنانچہ تادم کے مقام پر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے سنتِ تطہیر ادا  
 کی۔ اب ہم یہ سب کہ جو شخص مسلمان ہو جائے اسے چاہیے کہ یہ سنت ادا کرے۔ خواہ عمر کے کسی  
 حصے میں ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے انسان ہیں جن کی  
 دہلیزی میں سفید بال نکلنے شروع ہوئے۔ آپ سے پہلے کسی انسان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ سب  
 کی دہلیزی سیاہ ہی رہا کرتی تھی۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام جوانی سے نکل کر بڑھاپے میں داخل  
 ہوئے۔ تو سفیدی دیکھ کر عرض کیا۔ مولا کریم! یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ وقار ہے۔ آپ نے  
 چہرہ صاف کیا۔ اے اللہ! زِدْ دُنِي رِقَارًا میری اس عزت کو بڑھا دے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اللہ کریم کی وحی آئی کہ اے ابراہیم! اَنْتَ اَكْرَمُ اَهْلُ  
 زَرْعٍ اِلَيَّ آپ میرے نزدیک روئے زمین کے تمام انسانوں سے بزرگتر ہیں۔ جب آپ  
 نماز ادا کرتے وقت جانبِ سجدہ میں ہوتے ہیں تو آپ کا سر نہیں کھنکھاتا۔ چنانچہ سب سے

۱۔ الام الرمان فی تفسیر القرآن ج ۱ ص ۲۶۵ ۲۔ تفسیر عزیزی ص ۲۲۹

۳۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱ ص ۲۶۵ ۴۔ تفسیر عزیزی فارسی ج ۱ ص ۲۲۹

پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یا بار پنا۔ اگرچہ تہجد پینا بھی درست ہے۔ تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یا بار بھی پینا کر دو۔ اور تہجد بھی باذکار کر دو۔ یہود تہجد نہ باذکار تھے تھے۔ آپ نے دونوں چیزوں کی بذاتِ فرمائی۔ آپ نے یا بار کی تعریف فرمائی ہے۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نہیں ملا۔ تاہم یا بار خیرہ نے کا ذکر آتا ہے۔

ابن ابی شیبہ کی روایت میں آتا ہے کہ معمر بن یحزب نے ہو کر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خطبہ دیا۔ اور دھیمی کی روایت میں ہے کہ مہالوں کی خاطر سب سے پہلے آپ نے نان شیر مال تیار کیا۔ یہ کھانا دودھ اور نان کے مرکب سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں برصغیر میں حیدر آباد دکن اور بکھنر والے بڑے شوق سے تیار کرتے ہیں۔ اور مہالوں کو بیض کرتے ہیں۔ بڑی لذیذ چیز ہے اسی طرح معانقے کا طریقہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاری ہوا۔ جب کوئی شخص باہر سے آتا تو آپ اس سے گلے ملنے۔

کہتے ہیں کہ بیت المقدس کے قریب حضرت ابراہیم علیہ السلام جانوروں کی چراگاہ کی دکانوں میں کسی پہاڑ کے اندر تک چلے گئے۔ انہوں نے ایک مقام پر نہایت غناک آواز سنی۔ کوئی شخص نہایت خشوع و خضوع سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔ آپ اُدھر متوجہ ہوئے۔ تو دیکھا کہ ایک ضعیف عمر شخص اپنے حال میں محو ہے۔ آپ نے اس بڑے شخص سے دریافت کیا کہ تم کس کو یاد کر رہے ہو۔ اُس نے کہا اللہ تعالیٰ کر۔ آپ نے پوچھا تمہارا اللہ کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا آسمان پر ہے۔ فرمایا میں یہ بھی وہی مذہب ہے۔ پھر آپ نے پوچھا تمہارا قبلہ کدھر ہے۔ تو بڑھے نے بیت اللہ شریف کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے پوچھا تمہارا ٹھکانا کہاں ہے۔ اُس نے جواب دیا نیچے اسی غار میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑھے کا ٹھکانا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تو بڑھے نے کہا کہ وہاں جانا محال ہے۔ کیونکہ راستے میں گہری ندی پڑتی ہے۔ جسے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کاتم کیسے پہنچ جاتے ہو۔ تو اُس نے جواب دیا خرقہ عادت

معانقے کا  
پس منظر





وہ آج ہی پیدا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ بیت اللہ شریف پر ہر روز ایک سو چوبیس رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں پر، چالیس دیگر عبادت کرنے والوں پر اور بیس اُن لوگوں پر نازل ہوتی ہیں۔ جو بیت اللہ شریف کی طرف دیکھتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: **النَّظَرُ إِلَى الْكَعْبَةِ عِبَادَةٌ** یعنی بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔ البتہ طواف کے دوران کعبہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ طواف سے فدا ہو کر نہایت ذوق و شوق اور محبت سے بیت اللہ شریف کی طرف دیکھنا چاہیے۔ صحیح روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حجر اسود جنت کے یا قوتوں میں سے ایک یا قوت ہے۔ یہ پتھر جنت سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے نور کو مٹا دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سورج کی طرح یہ مشرق و مغرب کو روشن کرتا۔

طواف کا  
مجدد ثواب

تاریخ ازرقی میں آتا ہے کہ طواف کی نیت سے گھر سے چلنے والا شخص ایسا ہے۔ جیسے کہ وہ دیہانے رحمت میں چھنا شروع کر دیتا ہے۔ جب طواف میں پہنچتا ہے۔ تو گویا رحمت کے دریا میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جب طواف شروع کرتا ہے۔ تو ہر قدم اٹھانے کے عوض اُسے پانچ سو نیکیاں مل جاتی ہیں۔ اور جب قدم نیچے لگاتا ہے۔ تو ہر قدم کے بدلے پانچ سو گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اور جب وہ غنم طواف سے فارغ ہو کر مقام ابوبیتم تک آتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے کہتے ہیں کہ اے بندے! تیرے سابقہ گناہ تو دھل گئے۔ اب آئندہ زندگی میں محتاط رہو! اعمال مساکر انجام دیتے رہو۔ اس لئے میرے اچھی زندگی کا آغاز کرو۔

حرم پاک

حرم پاک کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرمت والا خط بنایا ہے۔ کسی کے لیے اس میں لڑائی کرنا حلال نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ فتح مکہ کے دن تم کوڑی دیر کے لیے صرف میرے لیے حرم میں لڑائی طلال ہوتی تھی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد حرم شریف میں لڑائی قطعاً حرام ہے۔ یہ خط ہمیشہ محترم ہے اور امن والا شہر ہے۔ چنانچہ یہاں پر

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّهُمُ  
جِب اِبْرٰہِیْمُ عَلَیْہِ السَّلَامُ اِنِّیْ کَا رِبِّ اَجْعَلْ ہٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا اے مولا کریم! اس شہر  
 کو امن والا بنا دے۔ دوسرے مقام پر ہٰذَا الْبَلَدُ کا لفظ آتا ہے۔ گویا یہ ابھی کھلی بڑبڑ  
 شہر آباد نہیں ہوا، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کی سرمت کی دعا کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی  
 روایت میں آتا ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے بیت اللہ شریف دالی زمین کو  
 اللہ تعالیٰ نے تیار کیا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے فرشتے عبادت کرتے تھے۔ وہاں پر ایک  
 پردہ سا اٹھا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ کو پوری دنیا کا مرکز قرار دیا۔ اور پھر اسی جگہ سے تمام زمین  
 کو پھیلا دیا گیا۔ گویا یہ مقام ساری زمین کا وسط (وسط البلاد) ہے۔ یہ بخوری نے اپنی شرح شامل میں  
 لکھا ہے۔ جس شخص کو بخیر ہوئی ہو۔ اس کی پیشانی پر کچھ دیا جائے اَلْعُكَّةُ وَسَطُ الْبِلَادِ وَوَلَدَتْ  
رَدْفًا بِالْعَبَادِ تو اس کی غیرت نہ ہو جائے گی۔

فرمایا ہے اللہ اس شہر کو امن کا گوارہ بنائے۔ وَاٰزَقَ اَمْلَکَہُ مِنَ الثَّمَرَاتِ اس  
 کے بننے والوں کو پھلوں سے روزی دے۔ مَنْ اَمِنَ مِنْهُمْ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ جو  
 کئی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے قَالَ وَمَنْ کَفَرَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے کفر کیا فَاَمْتَعْنٰہُ  
فَلِیْدَہٗ اسے محوِ فائدہ پسندوں کا۔ ثُمَّ اَصْنَعْنَا ذٰلِیْ عَذَابِ النَّارِ پھر اسے کشاں  
 کشاں دوزخ کی طرف بجاؤں گا۔ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے مُحَوَّرًا  
 فائدہ سے محروم ہے۔ کہ دنیا کی زندگی میں تو ممکن ہے کہ کافر بھی آدم سے رہیں۔ لیکن اس کے  
 بعد انہیں بہر حال دوزخ میں جانا ہو گا۔ مگر اہل ایمان کو دوزخ چیزیں حاصل ہوں گی دنیا میں امن بھی  
 نصیب ہو گا۔ اور آخرت میں نجات بھی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا  
 کو قبول فرمایا۔ چنانچہ عرم پاک اور شہر مکہ کی خیر و برکات کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔

الْعَمَّ

البقرة ۲

درس پنجاہم

(آیت ۱۲۷ تا ۱۲۸)

وَذِيْقَعُ اٰبْرٰهِيْمَ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاسْمٰعِيْلُ وَنَبَا  
 ثَقَبِلَ مِنْكَ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ  
 لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ  
 عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ : اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام بیت اللہ  
 شریف کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اور دونوں کہتے تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے  
 قبول فرما بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ اے پروردگار! بنائے ہم  
 دونوں کو اپنی فرمانبرداری کرنے والے ماور بنائے ہمارے اولاد میں سے بھی ایک  
 اپنی فرمانبرداری امت۔ اور بتلا ہم کو ہمارے احکام۔ اور ہمارے اوپر رجوع فرما مہربانی کے  
 ساتھ۔ بے شک تو ہی رجوع فرمانے والا اور از حد مہربان ہے ﴿۱۲۸﴾

رہنمائی

اس آیت کا تعلق سابقہ درس کی آیت مبارکہ وَلَوْ دُجِّلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ  
 کے ساتھ ہے۔ وہاں پر تھا کہ اُس بات کو یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے  
 رجوع کی جگہ۔ مرکزِ ہدایت اور جائے امن بنایا۔ اس کے ساتھ مقامِ ابراہیم کا ذکر ہوا۔ بیت اللہ شریف  
 کو پاک و صاف رکھنے کا حکم ہوا۔ وہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر بھی تھا۔ جس میں ابا یوسف  
 شہر کہہ کے یہ پھلوں کی مدنی طلب کی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت بخشا  
 جسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

تذکرہ

آیت زیر درس میں بیت اللہ شریف کی تعمیر کا ذکر ہے۔ یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام  
 کے فضائل میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی تعمیر آپ کے ہاتھوں سے  
 کرائی چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ وَذِيْقَعُ اٰبْرٰهِيْمَ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ  
 وَاسْمٰعِيْلُ وَدُكْتُنِي مَبْرُكٌ لِّمَنْ جِئْتُمْ بِهِمْ وَاسْمٰعِيْلُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُ

مبارک ہاتھوں سے بیت شریف کی بنیادیں اٹھائے تھے۔ بعض دوسری احادیث میں آتا ہے کہ بیت اللہ شریف کی... ایتہ انی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ حضرت ابو ذر غفاریؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے دریافت کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ زمین پر اللہ تعالیٰ کے اولین گھر کی تعمیر کا ذکر آیت پال ان اول سینت وخرج لکاس لکذنی بککاء مبنی کا میں آیا ہے۔ اس آیت میں لفظ کتبہ استعمال ہوا ہے۔ مگر کتبہ اور کتبہ ہم معنی الفاظ ہیں۔ تورات میں کتبہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اے اُم القریٰ بھی کہتے ہیں۔ مگر دنیا میں اللہ تعالیٰ کا سب سے پہلے تعمیر ہونے والا گھر بیت اللہ شریف ہے۔

صحیحہ کرام نے عرض کیا حضور! اس کے بعد کون سا گھر تعمیر ہوا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا، بیت المقدس۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بیت اللہ اور بیت المقدس کی تعمیرات میں چالیس سال کا وقفہ ہے۔ یہاں پر یہ اشمال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں تو بہت زیادہ فرق ہے۔ پھر دونوں گھروں کی تعمیر میں صرف چالیس سال کے وقفہ کا کیا مطلب؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس تعمیر سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت داؤد علیہما السلام والی تعمیرات مراد نہیں بلکہ ان دونوں گھروں کی اولین تعمیرات مراد ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پائیں۔ اس کے بعد حضرت نون علیہ السلام کے زمانے کا طوفان آیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی سیلاب آئے۔ جن میں بیت اللہ شریف کی عمارت نہ گئی۔ اور وہاں پر صرف ایک ٹیلہ سا باقی رہ گیا، عمارت منہدم ہو گئی۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی دوبارہ تعمیر کا حکم دیا۔

قرآن پاک کے لفظ قَوَاعِد سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ اس عمارت کی اولین تعمیر نہیں تھی۔ بلکہ یہ عمارت اپنی اصل بنیادوں پر دوبارہ اٹھائی جا رہی تھی۔ چونکہ اس وقت عمارت کے کوئی نشانات باقی نہ تھے۔ صرف ایک ٹیلہ سا باقی تھا۔ کہ عمارت کی اصل بنیادوں کی نشاندہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادل کا ایک ٹکڑا بھیجا جس نے اس اصل جگہ پر سایہ کر کے اس کا تعین کر دیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کے کوہ بیت اللہ کے اصل مقام پر سب سے پہلے پتھر

آپ نے اسی جگہ پر دوبارہ تعمیر شروع کی۔ اُس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر مبارک چودہ سال کی تھی۔

خبر گیری کیلئے  
حضرت ابوہریرہؓ  
کی آمد و رفت

حضرت ابوہریرہؓ علیہ السلام اور حضرت سارہؓ شام و فلسطین میں تھے۔ جب کہ حضرت ابوہریرہؓ اور اسماعیل علیہ السلام حجاز میں تھے۔ آپ ایک سال دو سال میں ایک مرتبہ آکر بیوی بچے کی خبروں کو لے کر آتے۔ تاہم آپ کی بیوی سارہؓ کی یہ شرط تھی کہ آپ بیوی بچے کی خبر گیری کے لیے قیس وقت کے لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے پاس رات کو غصہ کرنے کی اجازت نہیں ہوئی۔ اس عصر میں حضرت ہاجرہؓ کا انتقال ہو گیا۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے قبیلہ بنو جمہم میں نکاح کر لیا۔ زیارت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ علیہ السلام بیٹے کی خبر گیری کے لیے آئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہ خبر ہوئی کہ انہوں نے ان کی بیوی سے دریافت کیا کہ اس نے بتایا کہ کہیں شکار کے لیے گئے ہوں۔ آپ نے گزراں اوقات کے بارہ میں پوچھا تو اس عورت نے کہا کہ: بیوی عاقل کوئی نہیں ہے۔ بڑی مثل سے گزراں اوقات ہو رہے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کوئی کام نہیں کرتے۔ اس لیے فاقے آتے ہیں۔ یہ شکایت سن کر حضرت ابوہریرہؓ علیہ السلام نے کہا کہ جب تیرا شوہر آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور ساتھ یہ پیغام بھی دینا کہ وہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام شکار سے واپس آئے تو انہیں باپ کی آمد کی خبر و بکت معلوم ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے بیوی کے بتانے سے پہلے خود ہی پوچھ لیا کہ میرے بعد کون آیا تھا۔ بیوی نے بتایا کہ ایک بوڑھا آدمی آیا تھا۔ اُس نے مال احوال پوچھا تو میں نے سب احوال بتائے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پھر دریافت کیا کہ وہ کوئی پیغام بھی لے گئے ہیں۔ تو بیوی نے کہا کہ ہاں۔ وہ کہہ گئے ہیں کہ اپنے گھر کی چوکھٹ تبدیل کر دو۔ آپ پیغام کا مطلب سمجھ گئے۔ چنانچہ بیوی کو انگ لکھ کر دیا۔ اور بتایا کہ اب میں تمہیں گھر میں نہیں رکھ سکتا۔

اس کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام نے درمیان سراج کیا۔ کسی سال بعد حضرت ابوہریرہؓ



دوبارہ تشریف لائے۔ اتفاق سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پھر گھر میں موجود نہیں تھے۔ ان کی بیوی موجود تھی۔ آپ نے اُس سے گھر کے حالات دریافت کئے۔ اُس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم سے گھر کے حالات بہت اچھے ہیں۔ میرا خاندان بھی بڑا اچھا آدمی ہے۔ نیک سیرت اور عبادت گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میں رزق بھی دفر دیا ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام شکار بھی کرتے ہیں گزراوقات بھی بڑی اچھی جو رہی ہے۔ اس عورت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سواری سے اترنے کی درخواست کی تاکہ آپ کی خاطر تواضع کر سکے۔ مگر آپ نے کہا کہ میں نے خطرنا نہیں ہے ہاں جب تمہارا خاندان آئے۔ تو اُسے میرا یہ پیغام دینا کہ تمہارے مکان کی تو کھٹ بہت اچھی ہے اُسے تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ یہ پیغام دے کر چلے گئے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر واپس آئے۔ تو بیوی نے پیغام دیا۔ آپ نے فریاد و میرے باپ تھے۔ اور یہ پیغام دے گئے ہیں کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔

تعمیر کعبہ

یہ واقعہ بھی تھیری دواہوں میں موجود ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تھیری مرتبہ مکہ معظمہ آنے کا ارادہ کیا۔ تو اپنی بیوی حضرت سارہ سے ملے کر آیا۔ کہ اس دفعہ میں کچھ عورتوں کا نمٹہ روں گا۔ چنانچہ یہ ان ایام کا ذکر ہے۔ کہ آپ کریمت اللہ شریف کی تعمیر کاٹم ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی اصل بنیادوں کی نشاندہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بادل کے ایک ٹکڑے کو، مور کیا۔ اور اس طرح باپ بیٹے نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر دیواریں بنیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کے لیے گناہ اور پتھر لاتے تھے۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد جب یہ عمارت طرفائی نوح کی نذر ہو گئی تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں دوبارہ تعمیر ہوئی۔ کہتے ہیں کہ یہ عمارت ذی قعدہ میں شروع ہو کر ذی الحجہ میں ختم ہوئی یا ایک ماہ میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

بیت اللہ شریف کی تعمیر مذکور کے بعد دوبارہ تعمیر قصی بن کلاب کے زمانے میں ہوئی جو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد تھے۔ حضور علیہ السلام نے اپنے زمانہ مبارک

تعمیر کے مختلف ادوار

میں بیت اللہ شریف کی عمارت پھر بوسیدہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ قریش مکہ نے چندہ جمع کر کے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پینیس برس تھی۔ گویا یہ تعمیر آپ کی بعثت کے پانچ برس قبل ہوئی۔ کہتے ہیں کہ رد ساطہ نے طے کر لیا تھا کہ اس مقدس تعمیر میں ناپاک اہل ستل نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ پاک و صاف اور سلال مال سے جو چندہ جمع ہوا وہ پورنی عمارت کی تعمیر کے لیے کافی تھا۔ لہذا عظیم والاسات ہاتھ کا حصہ چھوڑ کر باقی جگہ پر بیت اللہ تعمیر کر دیا گیا۔ اسی موقع پر مخبر سود کی تنسیب کا ججزہ اکھڑا ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ حضور علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں سے اس طرح کر دیا کہ ملتے لوگ خوش ہو گئے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ نبوت میں بیت اللہ شریف کی تجدید نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ تو سرمایہ کی کمی تھی۔ اور دوسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں اس کو دوبارہ تعمیر کر آؤں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرز پر کرتا۔ اور اس وقت عمارت میں تغیر و تبدل کرنا مناسب نہیں تھا۔ نیز یہ کی وفات کے بعد حجاز میں نوسال تک حکومت حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس رہی، حجاز مکہ، مدینہ اور طائف وغیرہ آپ ہی کے زیر نگرانی تھے۔ اُس زمانہ میں آپ نے بیت اللہ شریف کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اور آپ نے یہ عمارت ابراہیمی بنیادوں پر قائم کی یعنی حلیہ کو خانہ کعبہ میں داخل کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے حکم پر عمارت کی تجدید کی اور حلیہ کو پھر باہر نکال دیا۔

بارون الرشید نے اپنے زمانے میں حلیہ کو پھر شامل کر کے از سر نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت اہل مکہ نے اسے ایسا نہ کرنے کی درخواست کی۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے یہ مقدس گھر آئندہ سنے والوں کے لیے گھلونا بن جائے گا۔ چنانچہ بارون الرشید نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد ترکوں کے عہد میں سلطان مراد خان کے زمانے میں بیت شریف کی تعمیر کی تجدید ہوئی۔ یہ سترہ کا واقعہ ہے۔ مگر وہ عمارت وہی ترکوں کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اب تک بیت اللہ کی عمارت میں کوئی تجدید نہیں ہوا۔ البتہ موجودہ سعودی حکومت کو اللہ تعالیٰ نے ترفیق دی ہے۔ کہ انہوں نے بھاری رقم خرچ کر کے نہایت وسیع کر دیا ہے۔ اور زائرین کے آسودہ سہولت کے لیے بڑے

نہت۔۔۔ منصوبوں پر کام کیسے ہے۔

انفرض جیب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی دیوار میں اٹھا ہے تھے  
 تو ساتھ ساتھ نہایت مختصر انداز میں دعا بھی کہہ رہے تھے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اے ہمارے پروردگار!  
 ہم سے یہ خدمت مقبول فرما۔ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ بیشک کو سننے والا اور  
 جاننے والا ہے۔ تو دعا کو سننا بھی ہے۔ اور ہمارے خدا کو بھی جانتا ہے۔ لہذا ہمارے عمل کو قبول  
 فرما۔

ظاہر ہے کہ قبولیت کے بغیر ہر عمل بیکار محض ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام ہمیشہ  
 دعا کیا کرتے تھے کہ بھلا عمل قبول ہو جائے۔ ہر مومن کی بھی یہی قناعت ہوتی ہے کہ اس کی نیکی بارگاہِ  
 رب العزت میں مقبول ہو جائے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ اے مجھے علم ہو جائے  
 کہ میری دو رکعت نماز قبول ہوگئی ہے۔ مگر میں اس کے ہوتے میں دنیا و دنیا کی ہر چیز کو فراموش کر دوں۔  
 کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قبولیت کا جو حکم قرار فرمایا ہے۔ بہت جلد سے رَبَّنَا تَقَبَّلْ اللہ  
 مِنْ لَعْنَتَيْنِ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ متقیوں کے اعمال کو بھی قبول فرماتا ہے۔ نیکی اُسی کی مقبول  
 ہوگی جس کا دل تقویٰ سے معمور ہے۔ اگر تقویٰ سے خالی ہے۔ دل میں کفر، شرک، فتنہ اور پاکہیزی  
 پھری ہوئی ہے۔ تو کوئی عمل بھی قبول نہیں ہوگا۔ قبولیت کا معیار خلوص اور تقویٰ ہے۔

اس وقت فہم نہ تھے اسماعیل علیہ السلام اگرچہ چھ دو سال کے نیک تھے مگر اللہ تعالیٰ نے نیکی اور  
 تقویٰ کی دولت ابتداء سے زندہ کی ہے۔ یہی روایت کر دی تھی۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں باپ بڑا  
 کے محل کو شرف قبولیت بخشا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بڑے بزرگ رسول نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ  
 نے مختلف سرداروں میں آپ کی تعریف کی ہے۔ آپ صاحب شریعت، رسول ہوئے ہیں۔ تاریخی  
 روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی متعدد بیویاں اور بارہ بیٹے تھے۔ اور  
 حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ایک بیٹے کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے  
 بڑے بڑے خاندان پیدا کیے۔ آپ کا سب سے بڑا بیٹا نابت تھا۔ اور سب سے چھوٹا قیدار تھا۔ کہ

بعد بیت اللہ شریف کی قرابت آپ کے بٹے بیٹے آیت کو ہی ملی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں پر  
بیٹے کو اتنی فضیلت بخش۔

قبولیت  
کی شرائط

ترمذی شریف کی حدیث میں بنی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے ——— وَتَقْبَلُ صَلَوةُ  
بَنِي إِسْرَٰءِیْلَ بِمَنْزِلَةِ صَلَوةِ مُؤْمِنٍ یعنی اللہ تعالیٰ طہارت کے بغیر کسی نماز کو قبول نہیں ———

فرماتے۔ گویا نماز کی قبولیت کے لیے طہارت بمنزلہ شرط کے ہے۔ پاکیزگی کے بغیر کتنی نمازیں پڑھو  
قیام کرو۔ رکوع و سجود کرو۔ کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح دیگر نیکیوں کی شرط بھی ایمان اور اخلاص ہے۔  
اس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ اسی طرح بعض برائیاں ایسی ہیں جن کے ارتکاب سے نیکیاں مردود  
ہو جاتی ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ایک مرتبہ شراب نوشی کرنے والے کی چالیس دن تک  
نماز قبول نہیں ہوتی۔ اگر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں۔ ورنہ قانون یہی ہے۔ فرمایا  
جو غلام اپنے مالک کی مرضی کے خلاف بھاگ جائے۔ وہ جب تک واپس نہ آئے۔ اس کی کوئی  
نماز قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس نے مالک کو بھوکا دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیت ہے کہ منہ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَخْلَصُ فِي  
دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلًا مِنَ الْعَمَلِ دین میں اخلاص پیا کر لو تو کچھ تبارہتو عمل بھی  
کفایت کر جائے گا۔ اسی واسطے قرآن پاک میں آتا ہے مُخْلِصِينَ لَهُمُ الْعَمَلُ اللہ ص کے  
ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اور اخلاص ایک ایسی نعمت ہے۔ جو توحید کے بغیر حاصل نہیں ہو  
سکتی۔ اہم ابوہریرہؓ جہاں فرماتے ہیں۔ اگر ان میں خلوص موجود ہے۔ اس کا عقیدہ توحید پر ہے۔ فخر  
درست ہے۔ تو پھر اس کے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی  
فرمانبرداری

بیت اللہ شریف کی تعمیر کے تذکرہ کے بعد اہمیت مسجد کی اساس اور پھر بنی آغاز ازمان علی اللہ صیر و ص  
کی بعثت کی دعا ہے۔ یہی مرکزی محور ہے۔ جو اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے  
اپنی دعا میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ صیر و ص کی بعثت کی درخواست پیش کی۔ گویا نبی علیہ السلام کے ظہور

۱۔ ترمذی ص ۱۱۱ ۲۔ ترمذی ص ۱۱۱

۱۔ جامع سنن ترمذی ص ۱۱۱ ۲۔ احکام القرآن ص ۱۱۱

سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ کے لیے دعا کی۔ اور دعائے پت سے  
 میں عرض کیا رَبَّنَا اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ يَوْمَ دُعَاءِ بِلْہِم دُورِہِم کو اپنا فرمانبردار  
 بنائے۔ کہ ہم دونوں ہر حالت میں تیری اطاعت کرتے رہیں۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کی ہمیشہ  
 یہی دعا رہی تُوَفِّقْنِي مُسْلِمًا وَآخِیْقُنِي بِالْمُسْلِمِیْنَ اے اللہ ہماری موت فرمانبرداری  
 کی حالت میں آئے۔ درجہ وصیت کرتے ہیں تو فرماتے ہیں فَلَا تَقْعُزُنَا اَلَا وَانْتَعُوْا قَبْلُہِم  
 کو سنسٹ کر دیکھائی کہ تمہارا خاتمہ سووم اور فرمانبرداری کی حالت میں ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام  
 اور اسمعیل علیہ السلام نے جی بن دعا کی۔ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اے اللہ ہم دونوں  
 کو نیک فرمانبردار بنا۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہے۔ دوسری جگہ موجود ہے اللہ تعالیٰ  
 سے فرمایا ہے۔ تَعِیْمًا اَسْلَبُوْا فَرَّہِم دُورِہِم آپ نے جواب دیا تَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ  
 میں رب العالمین تم ہیے دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بعض مکانات کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو ذات  
 عطا کی۔

امت مسلمہ کی  
 تاسیس

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پت پتے لیے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی دعا کی۔ اور  
 پھر اپنی اولاد کے متعلق دعا کی وَہِم دُورِہِم اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اے اللہ ہماری اولاد  
 میں سے ایک فرمانبردار قوم بنادے۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس وقت یہ دعا کی گئی،  
 اس وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام جی توڑ دتھے۔ لہذا امت مسلمہ کی دعا حضرت  
 اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے حق میں جاتی ہے۔ کیونکہ حضرت حق علیہ السلام تو اس وقت تک بھی  
 پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ اسی مقام پر یزید و نصاریٰ و عیسائی تھے ہیں۔ اور حضور علیہ السلام کی ولادت  
 کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ دعا حضرت حق علیہ السلام کے حق میں ہے۔ اور  
 امت مسلمہ نھی آپ ہی کی قوم ہے۔ حالانکہ تاریخ ثواب سے واضح ہو رہا ہے کہ امت مسلمہ  
 کا تعلق حضرت اسمعیل کی اولاد سے ہے۔ جو اس وقت موجود تھے۔ اور دعائیں شامل تھے چنانچہ  
 یہ قبولیت دعا کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نبی بنی حضرت اسمعیل علیہ السلام کی اولاد سے  
 مبعوث فرمایا۔

من ملک  
 کی تعمیر

دعا کے درست ہوتے میں باپ بیٹے نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی وَادِّعَا مَنَّا سَکَنَ

لے پروردگار! ہم کو ہمارے مناسک حج بھی بتائے۔ مناسک مناسک کی جمع ہے جس کا لفظ معنی  
 دہرنا ہے۔ اسی لیے عربی واسطے کپڑا دھوئے کر نسك الثوب بولتے ہیں۔ نسك قربانی کو بھی کہتے  
 ہیں۔ اسی مناسبت سے عبادت و ریاضت کو نسك کہتے ہیں۔ اور عبادہ کو مناسک اور عبادت کو  
 قربانی کی جگہ مناسک کہتے ہیں۔ گویا معنی یہ نکلتا ہے کہ جس طرح دھونے سے کپڑا میل کیل سے  
 پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قربانی اور عبادت سے انسان کے گناہ دھل جاتے ہیں۔

جب خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ ترجیاً کہ گذشتہ درس میں ذکر آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ  
 نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اعلان حج کا حکم صادر فرمایا۔ توفیق دینی تھا کہ جس حج کا حکم دیا جا  
 رہا ہے۔ اس کا طریقہ اور احکام بھی معلوم ہونے چاہئیں۔ اسی لیے باپ اور بیٹا دعا کرتے  
 ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ارکان حج بھی سکھلا دے تاکہ جو لوگ اس ارادے  
 سے تئیں وہ تیرے احکام کے مطابق اس فریضہ کو ادا کر سکیں۔

جگہ اوداع کے موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات کے میدان میں اونٹ  
 کی سواری پر خطبہ ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا النَّاسُ خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ  
 اے لوگو! مجھ سے احکام حج اچھی طرح سیکھ لو لَعَلَّكُمْ بَعْدَ عَامِي هَذَا  
 شاید اس سال کے بعد تمہارے ساتھ طاقت نہ ہو سکے۔ اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ آپ  
 اس حج کے بعد دوبارہ مکہ مکرمہ نہ آ سکے۔ اور تین ماہ بعد خاتمی حجتی سے جلدے بغرض مناسک  
 سے حج کا طریقہ اور اس کے احکام مراد ہیں۔ جن کے مطابق قیامت تک آنے والے لوگ  
 حج کرتے رہیں گے۔

لفظ اَرْتَأَوْا دیت یا رائی سے ہے۔ اس کا مصدر رائی بھی آتا ہے۔ اگر رویت مصدر  
 یا جئے تو اس کا معنی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اے اللہ! ہمیں مناسک حج دکھا دے اور رائی  
 مصدر ہو تو اس کا معنی بڑے سے جان بولنا: اَلَمْ تَسْأَلِ الْكَذَّابُ رُویتِ قَبْلُ مَرَّةٍ  
 تو یہاں بھی ارفنا کا معنی یہ بولنا کہ میں مناسک حج کا علم عطا فرماؤ۔ وَتُبَّ عَلَيْهِمْ اور ہمارے



توبہ قبول فرما، مہربانی کے ساتھ ہم پر جو غم فرما، اِنَّكَ اَنْتَ لِتَوَكِّبُ الرَّجِيسَ بِشَكِّ  
 توبہ قبول کرنے والا ہے۔ یعنی مہربانی کے ساتھ رجوع کرنے والا ہے۔ تو از حد مہربان ہے۔  
 باپ اور بیٹے کی دعا کے دو حصے مکمل ہوتے، تیسرے حصے میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی بعثت کی درخواست کی گئی ہے۔ جو اگلے درس میں آئے گی۔

اَللّٰہُ  
درس پنجاہ ویکٹ

انبیاء  
آیت ۱۲۹

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ  
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ  
الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ان کے اندر انیس میں سے ایک رسول بھیج،  
جو ان پر تیری آیتیں تلاوت کرے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے، اور ان کو پاک  
کرسے۔ بیشک تو نہ ہر دست اور حکمت والا ہے ﴿۱۲۹﴾

جس وقت حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام خانہ کعبہ کی دیواریں خرابے تھے، تو ساتھ  
ساتھ دعا بھی مانگ رہے تھے، دعائے بعض حصے گزشتہ درس میں بیان ہو چکے ہیں، سب سے پہلے انہوں  
نے عرض کیا رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اے بہتے پروردگار! ہم سے یہ عمل قبول فرمائے: اِنَّكَ  
اَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ تو سنتا بھی ہے اور ہر شخص کی نیت اور ارادے کو بھی جانتا ہے دونوں  
ہاں بیٹھنے اپنی عاجزی کا اظہار کیا، اور عرض کیا کہ ہمارے اس عمل کا مقصد محض تیری رضا ہے، اور تو ہم  
سے یہ عمل قبول کرے۔

دعائے دوسرے حصے میں عرض کیا رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اے ہمارے پروردگار!  
ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنالے، وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اے ہمارے پروردگار!  
میں سے ایک ایسی نسل بن جو تیری فرمانبردار ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی دعا کو شرف  
قبولیت بخشا، اور حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی اولاد میں امت مسلمہ پیدا کی، بنیادی طور تو  
اس امت مسلمہ میں عرب ہی شامل ہوئے، جو کہ اسماعیلی نسل کے قریش تھے، اس کے بعد انصاریہ  
نہیں شامل ہوئے، اور پھر جو لوگ بھی ان کے ساتھ ملتے جلتے ہیں، وہ سب اس امت میں شامل  
ہیں، اس دعائے ابراہیمی کا نتیجہ کہی ہزار سال بعد نکلا جب اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ  
علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

دعا کے قیامت عصر میں غرض کیا "وَإِذَا قَامَتَ السَّكَنَاتُ" اور ہمیں مناسک حج بھی سکھائے تاکہ ہمارے بعد آنے والے بھی اسی طریقے کے مطابق بیت اللہ شریف کا حج کر کے رہیں۔ نیز یہ دعا کی "وَتَبَّ عَلَيْنَا مَا لَنَا بِاللَّهِ" ہمارے قیامتوں فراموش کیونکہ اِنَّكَ أَنْتَ الثَّوَابُ الرَّحِيمُ تو توبہ قبول کرنے والا اور ہم پر ان سے نہرت براہیم علیہ السلام یہ دعا کرتے تھے "وَصَلِّ جَزَاءً" حضرت اسماعیل علیہ السلام آئیں کہ کروا میں شامل تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعا چوتھا جز یہ تھا۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ لَّيْسَ بِنَبِيِّهِمْ بِمَا هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهُ وَلَئِنْ رَأَوْهُ إِلَّا طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَكْفُرُونَ۔ ان کے اندیشوں میں سے ایک رسول بعوث فرما دیا یہ سوال بید ہوتا ہے کہ حضرت براہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کی درخواست پہلے اور رسول کی بعثت کی دعا بعد میں کیوں کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت براہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کی درخواست اپنی اولاد میں سے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ قریش عرب حضرت براہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہی ہیں جنہوں نے امت مسلمہ کی داغ بیل ڈالی۔ پھر ان کے ساتھ انصار مدینہ شامل ہوئے۔ اور پھر باقی اقوام عالم کو امت مسلمہ کی رکینیت حاصل ہوئی۔ چونکہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کی بعثت امت مسلمہ میں سے مطلوب تھی اس لیے امت کا ذکر پہلے کیا اور بعثت نبوی کا بعد میں کیا۔ سورۃ جمعہ میں اسی قسم کا ذکر ملتا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے احسان جتلاتے ہوئے فرمایا "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِ رَسُولًا مِّنْهُمْ" اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس نے عرب کے ناخوندہ لوگوں میں اپنا رسول بھیجا۔ ظاہر ہے کہ وہ بے اکثر لوگ کھٹنے پڑنے سے عاری تھے۔ کہانی اناؤ کا آدمی ہی نوشت و خواند سے واقف تھا۔ لہذا اس مقام پر ان کا ذکر کیا۔ پھر مخاطب وہی قریش ہیں۔ جو کہ حضرت براہیم علیہ السلام کی نسل میں سے تھے۔

لفظ رَسُولٌ اسم نکرہ ہے۔ اور اس سے عظمت کا اظہار ہوتا ہے لہذا اس کا معنی صرف رسول نہیں بلکہ عظیم الشان رسول ہوتا ہے۔ دوسری آیت میں بھی یہ لفظ نکرہ کے طور پر ہی استعمال ہوا ہے۔ جیسے بَعَثَ فِي الْأُمَمِ رَسُولًا مِّنْهُمْ اس میں مِنْهُمْ کی قید سے بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ میں سے ایک عظیم الشان رسول بعوث فرمایا ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بعثت پہلے

عظیم الشان رسول

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد میں سے اُمت مسد بنائی۔ اور پھر ان میں سے الرَّسُولُ نہیں بلکہ رَسُوْلٌ یعنی نہایت عظمت والا رسول مبعوث فرمایا۔ یہ ایک عام سنت اللہ بھی ہے۔ کہ ہر نبی اپنی قوم میں سے مبعوث ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق ایسا ہی مذکور ہے۔ مثلاً عاد، ثمود، صالح علیہ السلام کی قوم قوم ابراہیم، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی قومیں، غنیمتہ ہر نبی اپنی ہی قوم میں ہوا ہے کہیں باہر سے نہیں آیا۔ چنانچہ نبی آخر الزمان علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنی ہی قوم قریش میں سے مبعوث فرمایا۔ ایسا ہونا منطقی طور پر ضروری بھی ہے۔ کیونکہ اپنی ہی قوم میں سے ہونے کی وجہ سے نبی کے اخلاق و اطوار کو ہر شخص جانتا اور پہچانتا ہے۔ اور اس کے اخلاص کی بنا پر نبوت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کی بعثت کی سعادت بھی آپ کی اپنی قوم کو حاصل ہوئی۔ چونکہ نبی اپنی ہی قوم میں سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اُسی جنس میں سے یعنی انسان ہوتا ہے کہ انسانوں کی طرف مبعوث ہونے والا نبی انسان ہی ہوگا۔ کسی غیر نسل سے نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو، تو امت کو نبی کے اتباع میں سخت دشواری پیش آ سکتی ہے۔ یا بعض معاملات میں اتباع ناممکن بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی فرشتہ یا جن کرانوں کی طرف نبی مبعوث کیا جائے۔ تو یہ نسل ہی مختلف ہوگی۔ نبی اور امت کے درمیان تخیل میں فرق ہوگا۔ ان کی بود و باش اور عادات و خصائل میں فرق ہوگا۔ ان کی ضروریات مختلف ہوں گی۔ لہذا نبی کا اتباع کیسے ممکن ہوگا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ نبی کا اپنی قوم کی جنس سے ہونا کوئی عار کی بات بھی نہیں ہے۔ ظہر عظام و اسے نبی کی تعریف یہ رکھتے ہیں الرَّسُولُ اِنْسَانٌ بَعَثَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اِلٰی الْخَلْقِ لِتُبْلِغَ الْاَحْکَامَ یعنی نبی وہ انسان ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی طرف احکام شرعیہ پہنچانے پر مقرر کرتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے جس انسان کو منتخب فرماتے ہیں۔ اس پر وحی نازل فرماتے ہیں اور اس کی شان کو بلند فرماتے ہیں۔ لوگوں نے خواہ مخواہ باطل عقائد وضع کر لیے ہیں کہ نبی کو انسان کہنے سے اس کی نفوذ باللہ توہین ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں بلکہ نبی کا انسان ہونا تو نہایت

نبی انسان  
ہی ہوتا ہے

کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو کہ رَاقِيَ خَالِقًا بَشَرًا مِّنْ طِينٍ میں  
بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ اس میں تحقیر کی کون سی بات ہے۔ نہ معلوم لوگوں نے یہ  
کیسے سمجھ لیا ہے کہ بنی کو بشر کہنے سے بنی کی توہین ہو جائے گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بنی ایک  
عام انسان کی طرح نہیں ہوتا۔ جس میں برتیک وہ شامل ہوتا ہے۔ مگر بنی کو تمام امت پر فضیلت  
مائل ہوتی ہے۔ اور وہ محصور ہوتا ہے۔ البتہ جہاں تک انسانیت یا بشریت کا تعلق ہے۔  
قرآن پاک نے بار بار اس کی تصدیق کی ہے قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اللَّهُ تَعَالٰی  
خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان بشریت کرا رہا ہے۔ دوسری جگہ آپ ہی کی زبان سے کھلایا  
”مَلِكُ كُنْتُ لَا بَشَرًا مِّثْلُكُمْ“ آپ فرمائیے کہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک انسان  
ہوں اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ نہ میں عالم الغیب ہوں۔ نہ مختار کل ہوں۔ نہ میرے قبضے میں  
خزانے ہیں۔ نہ تمہاری فرمائش پوری کرنا میرے بس میں ہے۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا رسول اور  
انسان ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام بھی یہی کہتے رہے ہیں کہ میں بھی  
تمہاری طرح انسان اور بشر ہوں۔ جس طرح تم کسی کی اولاد ہو اسی طرح میرے بھی۔ ہاں! آپ ہیں  
جس طرح تمہاری نسل سے تمہاری اولاد ہے۔ اسی طرح میری بھی ہے۔ تمہاری بھی ضرورت  
زندگی میں اور میری بھی ہیں۔ باقی انسانوں پر پیش آنے والی واردت بیماری، صحت وغیرہ  
انبیاء علیہم السلام پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ تمام طبعی امور حتیٰ کہ موت و حیات بھی سب پر جاری  
ہوتی ہے۔ البتہ فرمایا کہ بنی کو امت پر فضیلت ہے: يُؤْتِيهِ الْإِلَٰهَ مِمَّا يَؤْتِي نَاسًا مِّنْ لَّدُنْهُ ۚ  
اور یہ بہت بڑی عزت و اکرام والی چیز ہے۔ جو اسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ اس کام  
کے لیے منتخب کرے۔ اس سے زیادہ فضیلت وہاں وہ کوئی چیز نہیں غرضیکہ انبیاء کرام علیہم السلام  
بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ مگر انسانیت میں ان کا وہ جہت بلند ہے۔ انسان کہنے میں ان کی  
توہین نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان تو وہ ہی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر فضیلت بخشی۔  
اسی لیے تو فرمایا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ ۖ وَبَعَثْنَا فِيهِمُ الرَّسُولَ ۖ وَجَعَلْنَا فِيهِمُ الْإِيمَانَ ۚ





اللہ تعالیٰ کی آیات جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔ وہ وحی کے ذریعے حضور علیہ السلام کی ذات و لامعات پر نازل ہوئی تھیں۔ جب آپ یہ وحی نازل ہوتی تو آپ گھوسے باہر تشریف لاتے اور کاتبان وحی میں سے جو بھی قریب ہوتا اسے طلب فرماتے اور حکم کرتے کہ اس آیت یا سورہ کو فلاں مقام پر رکھو تو وہ رکھ دیتے۔ بعض اوقات آپ ماہ مجلس میں تشریف لاتے اور اعلان فرماتے کہ ابھی بھی اللہ تعالیٰ کا یہ فرین نازل ہوا ہے بعض اوقات یہاں ہوتا کہ مجمع عام میں تشریف فرما ہوتے اور آپ پر وحی کی کیفیات طاری ہو جاتیں۔ آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور پھر محوِ رُوحی رہے بعد آپ ارشاد فرماتے کہ یہ وحی نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ حضرت زیدؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ یا جو بھی کاتب مل جاتا اسے تحریر کر دیتے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ عظیم الشان رسول تیری آیات کی تلاوت کرے گا۔ اب دوسری بات یہ بتائی کہ وَ يَهْدِيكُمْ إِلَى الْكِتَابِ کہ وہ رسول امت کو کتاب کی تعلیم دے گا۔ کسی کتاب کو صرف پڑھ کر سنا دینا اور چیز ہے۔ اور اس کی تعلیم دینا دوسری بات ہے۔ یہاں پر کتاب کی تعلیم کا ذکر ہے۔ اور علم محنت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ امام بخاری فرماتے ہیں اَلْمَا لِيَعْلَمُ بِالشَّعْرِ عِلْمٌ خَوْفٌ خَوْفٌ حَاصِلٌ نِيَسْ بُوْتَا۔ بلکہ سیکھنے سے آتا ہے۔ اور جو لوگ خود بخود سیکھتے ہیں۔ استاد کی مدد حاصل نہیں کرتے۔ صرف کتابیں پڑھ کر عالم بنا چکے ہیں۔ وہ علم میں کچے سہتے ہیں اور ان میں اکثر غمراہ ہوتے ہیں۔ ان میں کما حقہ علم کی نکتہ نہیں آتی۔ علم حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت و درکار ہوتی ہے۔ سلف صالحین نے حصول علم میں جس قدر محنت کی ہے اس کا آج تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ میں سولہ سال تک اس حالت میں رہا کہ رات کو ریاس منگتی تھی تو رات بھر ایک پیالہ پانی بھی نہیں پیتا تھا۔ کہیں مطالعہ میں غفلت نہ آجائے۔ اگر غلو دگی طاری ہو گئی تو مطالعہ اور صلاہ رو جائے گا۔ چالیس چالیس سال تک لوگوں نے اتنی بڑی بڑی محنت کی ہے۔ تب جا کر علم حاصل ہوا ہے۔

بہر حال تعلیم ایک اہم چیز ہے۔ اس کے بغیر انسان میں کمال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ

استاد کی مدد سے سیکھنا پڑتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ دنیا کا کوئی آدمی اسے ادنیٰ یا اعلیٰ سے اعلیٰ پیشہ ہو جب تک کوئی استاد کے سامنے زانوئے تلمذتہ نہیں کرے گا علم و فن حاصل نہیں کر سکتا۔ توبہ ہو یا درازی، ڈاکٹر ہو یا پختہ گھر سے، اہل فن کی صحبت حاصل کرنا ہوگی۔ اس کے بغیر وہ اپنے فن میں کامل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ تعلیم جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے بھیجی ہے، سب سے زیادہ دقیق ہے۔ یہ بغیر استاد کے کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسی کوشش کرنے والے منزل مقصود تک نہ پہنچ سکیں گے بلکہ گمراہ ہو جائیں گے۔ لہذا وحی کی تعلیم کے لیے پیغمبر کی ضرورت ہے۔ اور اس لحاظ سے آپ کی ایک صفت معلم بھی ہے۔

ایک دفعہ یاد کر لیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے، وہاں یہ دو گروہ اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ ایک گروہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کا تھا۔ جو ذکر میں مشغول تھا۔ اور دوسرا گروہ تعلیم و تعلم کا کام کر رہا تھا۔ حضور علیہ السلام اس دوسرے گروہ میں تشریف فرما ہوئے در فرقان انما بعثت معلما یعنی مجھے اللہ تعالیٰ نے معلم بنا کر بھیجا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی تھی وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ بِأَمْرِ رَبِّهِمْ اُن میں ایسا نبی بھیج، جو انہیں کتاب کی تعلیم دے۔

تعلیم کتاب کے سلسلے میں بعض اوقات الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ صحابہ کرام صاحبان تھے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اس کے باوجود بعض امور کے سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی۔ اس سورۃ بقرہ میں خیط اسود اور خیط ابیض کا ذکر آتا ہے۔ عدی بن حاتم اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ حالانکہ خالص عرب اور پھر شاعر بھی تھے۔ زبان پر عبور حاصل ہونے کے باوجود وہ ان الفاظ کے معنوں تک نہ پہنچ سکے۔ آپ خیط ابیض اور خیط اسود کو سفید و سیاہ دسی سمجھتے رہے۔ حالانکہ اس سے مراد رین اور رات ہے۔ اسی طرح ظلم کا معنی سمجھنے میں صحابہ کرام کو غلطی ہوئی اور پریشانی ہو گئی۔ حضور علیہ السلام نے وضاحت فرمائی کہ یہاں پر ظلم سے مراد شرک ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے خود قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ غرض!

اس قسم کے نجات تعلیم کے ذریعے حل ہوتے ہیں۔ کیس کی حکم کو خاص کرنا ہوتا ہے کسی کی عمریت بیان کرنی ہوتی ہے۔ جو کہ استاد کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی حکمت میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بعض چیزیں جینات کے قبیلے سے ہوتی ہیں۔ انسان ذرا اسی توجہ کرے، تو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ اور بعض ایسی ہوتی ہیں۔ جن کو آسانی سے سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔

جیسے فرمایا: **هُوَ الَّذِي رَسَدَ رَسُولَهُ بِالنُّجَى وَدِينِ الْحَقِّ** وہ ذات خداوندی جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔ یہاں پر ہدایت اور دین حق کو سمجھنے کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ایسی معمولی چیز نہیں ہے جو ادنیٰ توجہ سے معلوم ہو جائے۔ اس لیے فرمایا کہ اے اللہ! انہیں میں سے رسول بھیج جو انہیں کتاب کی تعلیم دے۔

حکمت کی تعلیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قسری دعائے محی و یصلیٰ **وَيُحْلِمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** ایسا رسول مبعوث فرمایا جو کتاب کے علاوہ انہیں حکمت کی تعلیم بھی دے۔ حکمت کی تشریح میں مفسرین کرام کے بہت سے اقوال ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ حکمت سے مراد انوارِ قلوب یا باطنی باتوں کا جانتا ہے۔ بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ حکمت عقل کی دلیل اور دل کی بصیرت کا نام ہے۔ حضرت ام المکث فرماتے ہیں: **مَعْرِفَةُ الَّذِينَ وَالْفَقْهُ فِيهِ وَالتَّوْبَعُ لَكَ** یعنی حکمت نام ہے دین کی معرفت، اس کی نگہ اور اس کے اتباع کا۔ عام طور پر حکیم کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے۔ **مِنْ أَنْفَعِ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ حِكْمٌ** وہ ہے جس نے علم اور عمل میں نفع کی حالت میں ڈاکٹر کا معنی ماہر فی الفن ہے۔ خواہ وہ بے عمل ہو۔ مگر حکیم وہ ہوگا جو علم اور عمل میں مادی ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں کہ شریعت الہیہ میں جتنی صلیحتیں اور دین کے جتنے احکام ہیں ان کو پہچاننے کا نام حکمت ہے۔ حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنا بھی حکمت کہلاتا ہے۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کو بھی حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بعض کہتے

ہیں کہ تمام چیزوں کو ان کی حقیقت کے ساتھ جاننے کا نام حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے  
 اللَّهُمَّ ارِنَا الْحَقَّ حَقًّا سَعَى اللہ! ہمیں حق کو سمجھنے کی توفیق عطا کر۔ ایسا نہ ہو کہ ہم باطل کو حق  
 سمجھنے لگیں۔ بزرگان دین کی دعا میں آتا ہے کہ ہمیں چیزیں اس طرح دکھا جس طرح وہ واقعہ  
 میں ہیں۔ بسا اوقات آدمی کسی چیز کو سمجھتا کچھ ہے، مگر حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے۔ امام ابن ربیعؒ  
 جو کہ لغت کے اہم ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو تمہارے لیے نصیحت کا باعث بنے یا نہیں  
 بُرائی پر زجر کرے یا کسی قبیح کام سے روکے یا کسی بزرگی کے کام کی طرف دعوت دے وہ سب  
 حکمت ہے۔ اہم راغب جو لغت اور تفسیر کے اہم ہیں فرماتے ہیں الْحِكْمَةُ إِصَابَةُ  
 الْحَقِّ بِالْعِلْمِ وَالْعَقْدُ حَقٌّ كَوَاعِلُ الْعَمَلِ كَمَا لَمْ يَلْعَلْ بِهَا حِكْمَةٌ بَعْضُ فَرَاتِ  
 ہیں کہ قول اور عمل میں برابری کا نام حکمت ہے۔

اہم بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ ایسی چیز جس کے ذریعے انسان کے  
 نفس کی تکمیل ہو تو ہر حکمت ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے زَاوِ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ  
 اللہ یعنی حکمت کی بڑ اور نیا اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ جس انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا  
 ہو جائے۔ سمجھ لو کہ اس میں حکمت کی بنیاد قائم ہو گئی ہے۔ حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے مَنْ  
 خَلَصَ لِلَّهِ رُبْعَيْنِ يَوْمًا جَسَدُهَا يَسْتَعِينُ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَاعَةً مِنْ عَمَلِهِ  
 کی جبروتِ مَنَابِغِ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهِ عَلَى لِسَانِهِ حکمت کی باتیں اس کے دل  
 کی طرف سے اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گی۔

بعض محققین کہتے ہیں حکمت نام ہے معرفۃً اَفْضَلُ الْأَشْيَاءِ بِأَفْضَلِ  
 الْعُلُومِ اَفْضَلُ حِزِّهِ اَفْضَلُ عِلْمٍ كَمَا تَمَّ بَابُهَا كَمَا تَمَّ حِكْمَتُهَا۔ ظاہر ہے کہ سب سے افضل  
 چیز اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات ہیں۔ اور سب سے افضل وہ علم ہے جس سے انسان کو  
 حضور قلب حاصل ہو جائے۔ اگر اس کے دل میں ایسی کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ ذات تعالیٰ کی

ذات اور اس کی صفات کو پہچان سے کا اور سمجھ جائے گا کہ یہ شخص حکیم ہے۔ ترجمہ عام فہم معنی میں حکمت، شور و گجہ اور پستے کی باتوں کو کہتے ہیں ایسی باتیں احکام ہوتے ہیں۔ ان کی مصلحتیں اور ان کے سزا بھی ہوتے ہیں۔ ان کے خواہمض ہوتے ہیں۔ اس میں سنت بھی شامل ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمام باتیں کھانی میں اس سے فرمایا وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وہ رسول جو لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

دعا کا چوتھا جزو تھا وَيُزَكِّيهِمْ اور ان کو پاک کرے۔ یہ لفظ بڑے دور رس معانی تزکیہ نفس کا حامل ہے۔ پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ ان سے تمام رذائل دور ہو جائیں۔ اور تمام فضائل ان میں پیدا ہو جائیں۔ رذائل میں خاق، بد اخلاق، گندگی، معاصی، بد بختی، اور دیگر تمام شریر چیزیں آتی ہیں جن میں سب سے پاکیزگی مطلوب و مقصود ہے۔ تزکیہ اسی کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام۔ اس موقع پر یہ بات سمجھائی کہ کسی قوم میں فوز و فلاح اور سعادت تزکیہ کے بغیر نہیں آسکتی۔ لہذا انہوں نے امت مسلمہ کے لیے تزکیہ کی دعا کی۔ اور پھر آپ کی دعا کا اثر بھی دیکھئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخا طبین کی جہالت مثالی تھی۔ ان کی خباثت، جہالت اور ہٹ دھرمی سب کچھ عیاں ہے۔ مگر اس تزکیہ کی بدولت کیسے کیسے جلیل القدر لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے تن من و عن ہر چیز دین پر قربان کر دی۔ ایک درس کے مقام پر تزکیہ کو یوں بیان فرمایا تُخَذُ مِنْهُمْ مَوَالِيہُمْ صَدَقَاتُہُمْ ان کے لوگوں میں سے زکوٰۃ وصول کر لیں تُطَهَّرُہُمْ و تُزَكِّيہُمْ وہ ظاہری اور باطنی برودہیلوؤں سے پاک ہو جائیں گے۔ غرضیکہ تزکیہ سے مراد ظاہری پاکیزگی بھی ہے۔ اور باطن کی پاکیزگی بھی ہے۔ اسی لیے فرمایا۔ سے اللہ! ان میں ایسا رسول بھیج جو تیری آیات پر مدد کرے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا آخری حصہ تزکیہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی لیے

اس کو دعائے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔ بزرگان دین کی بیعت حصول تزکیہ کا ایک ذریعہ ہے جو کہ حضرت علیؑ سے چلا آ رہا ہے۔ بزرگان دین مرید کو وظیفہ بتاتے ہیں۔ عبادت و ریاضت کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ اور ضروری پرہیز بھی بتاتے ہیں۔ تاکہ مرید ہر باتوں سے پاک ہو جائے اور اس میں خویاں ابا ز ہو جائیں۔ مگر آج پیری مریدی ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بیعت ایک

بیعت اور  
تزکیہ





ہیں وہاں کوئی تھان جو جس کی پوجا ہوتی ہو۔ کوئی بزرگ کسی رخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اور رخت کی پوجا ہونے لگی۔ آپ نے اس قدر احتیاط فرمائی۔

اختیار  
الغرض! حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمعیل علیہ السلام نے دعا کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی تعریف فرمائی۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ سوائے مولا کریم! تو ہی کمال قدرت کا مالک ہے۔ عزیز کا معنی غالب ہے۔ یعنی ہر چیز پر تیرا ہی غلبہ ہے۔ اور حکیم سے مراد۔ کمال حکمت کا مالک بھی تو ہی ہے۔ تیرے سب امور حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ہماری دعا کو قبول فرما اور امت مسلمہ قائم کر اور پھر ان میں عایشان رسول بھیج جو تیری آیات پڑھے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

وَمَنْ يَرْغَبْ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدْ  
 صُطِفِيَ فِي الذِّنْبَانِ وَدَانَهُ فِي الْآخِرَةِ لِمَنِ الصَّالِحِينَ ⑬  
 إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسَلِمْتَ قَالَ أَسَلِمْتُ لِلَّهِ الْعَالَمِينَ ⑭  
 وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمَ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَبْنِي إِنَّ اللَّهَ  
 اصْطَفَى لَكُمْ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ⑮  
 أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ  
 لِبَنِيهِ مَا آتَيْتُكُمْ مِنْ بَعْدِي قَالُوا نَحْنُ الْفِتْنَةُ الْهَكَ  
 وَاللَّهُ أَبَاطَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهُ وَاحِدًا  
 وَخَنَ لَهُ مُسْلِمُونَ ⑯ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَبِتْ  
 وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تَمُوتُنَّ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ⑰

ترجمہ: اور نبی عرض کرتا: ابراہیم (علیہ السلام) کی امت سے مگر وہ شخص جس  
 نے اپنے نفس کو یقوت بنایا۔ اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنے فرما دیا میں  
 بندہ آخرت میں البتہ نیکو کاروں میں شمار ہوگا ⑬ جب اُس کے رب نے فرما دیا  
 ہو جاؤ۔ تو اُس نے کہا میں فرما ہزار ہو چکا ہوں رب العالمین کے لیے ⑭ اور ابراہیم  
 (علیہ السلام) نے اپنے بیٹوں کو اس امت پر قائم بننے کی وصیت کی۔ اور یعقوب (علیہ السلام)  
 نے بھی۔ اور کہلے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی کو چن لیا ہے پس  
 تم نہ مرد، مگر اس حالت میں کہ تم فرما ہزار کی کرنے والے ہو ⑮ کیا تم حاضر  
 تھے جب یعقوب (علیہ السلام) کو موت آئی تھی جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے  
 کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ ہم عبادت کریں گے  
 تیرے معبود کی اور تیرے آباؤ اجداد، ابراہیم، اسماعیل، اور اسحاق (علیہم السلام)

کے معبود کی۔ وہی ایک معبود ہے اور ہم اس کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں (۱۳۲) یہ ایک عجائبات ہے جو گزرتی ہے۔ اس کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے کیا۔ اور تمہارے لیے وہی کچھ ہوگا۔ جو تمہارے لیے۔ اور تمہارے لیے باتوں کے متعلق نہیں رہتا۔ جیسے کہ جو کچھ وہ کرتے تھے (۱۳۳)

اللہ تعالیٰ نے پہلے بیت اللہ شریف کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر کا ذکر فرمایا۔ اور پھر اسی زمین میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا ذکر کیا۔ دعا میں سب کے پہلے عمل کی قبولیت اور اور پھر اطاعت اور فرمانبرداری کی توفیق طلب کی گئی تھی۔ اس کے بعد دونوں باپ بیٹے کی اولاد میں سے اُمتِ مسلمہ کے قیام اور پھر ان میں سے ایک عظیم الشان رسول کی بعثت کی دعا تھی۔ اور پھر ان فراموش کا ذکر تھا جو آخری رسول انجام دے گا۔

یہاں یہ مرکزی نکتہ ہے کہ فاتح البیتین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہی ہے کیونکہ اہل کتاب آپ کی رسالت کا انکار کرتے تھے۔ یہ مرکزی مسنون آگے دہرایا جائے گا۔ ابتدا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے۔ اور پھر اس دعا کے مصداق کا بیان ہے۔ تو یہ دعا کہ دعائے اسماعیل سے ظاہر ہے کہ وہ ذات والا صفات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ہو سکتی ہے آپ ہی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کا خاندان قریش کی نسل سے ہی پھیلا رہا تھا۔ انہیں میں اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کا قیام فرمایا۔ اور دعائے مطابق انہیں میں بنی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو بعثت فرمایا۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کی بعثت کے بارے

آپ کی بعثت کے متعلق سننا۔ میں آتا ہوں کہ کسی نے پوچھا۔ حضور! آپ کی ابتداء کیسے ہوئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اَنَا دَعَوْتُ إِلَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ وَرَعَايَا قَوْمِي وَبَشَرَةُ عِيسَىٰ عِزِّي مَعْنَىٰ فِي حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا۔ اپنی ماں کے خواب اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق ہوں۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی دعا کا ذکر ہے۔ جو کہ شہد دس میں گزرتی ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ مَعْنَىٰ اللہ! ان میں انہیں میں سے ایک رسول بعث فرما۔

حضور علیہ السلام کی والدہ ماجدہ نے آپ کو یہ انش سے پہلے خواب دیکھا تھا۔ کہ ان کے پہلو

سے ایک ایسی روشنی نکلے گی جس سے شام اور بصری کے محلات روشن ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اونٹوں کی گردنیں نظر آرہی ہیں۔ اس حدیث کی ترجمانی مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی طویل نظم مرد جزر اسلام میں خوب کی ہے۔

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہو یا دعائے خلیل و نوح

جہاں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا تعلق ہے۔ قرآن پاک نے اس کو بھی واضح کر دیا ہے۔ آپ نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں تمہاری طرف رسول مبعوث ہوا ہوں۔ میں اپنے سے پہلی کتاب توراة کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ "وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ" اور اپنے بعد آنے والے رسول کی بشارت دینے والا ہوں۔ جن کا نام نامی اور اسم گرامی احمد ہو گا۔ عبرانی اور سریانی زبان میں احمد کو فار قلیط کہا گیا ہے جس کا معنی دنیا بھر کا تعریف کیا ہوا۔

شاعری میں مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی غالب کے شاگرد تھے اور علوم دینیہ میں حضرت مولانا شاہ اسماعیل صاحب کے تلامذہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ زیرِ تعلیم تھے جو اس جنگ کے وجہ سے اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ آپ کا شمار قومی شاعروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اسلام کے عروج و زوال کی داستان نہایت مؤثر انداز میں نظم کی صورت میں پیش کی ہے۔ آج کل لوگ میلادِ خواتی کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کی مدح کے نام پر کھڑیہ اور شرکیہ کلمات کہہ جاتے ہیں۔ ایسی تمام لغتوں کے مقابلے میں مولانا حالی کا یہ ایک ہی شعر کافی ہے۔ حدیث کے مخزن کو ایک شعر میں کمال طریقے سے سمجھ کر حضور علیہ السلام کی تعریف کی ہے۔

تفسیر معالم التنزیل میں شانِ نزول اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہودی علماء میں سے حضرت عبد اللہ بن سلامؓ کو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ آپ کے بھائی کے دو بیٹے بھی صاحبِ علم تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ توراة میں یہ بیان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں بنی اسرائیل اور بنی اسمعیل میں ایک نبی مبعوث کروں گا۔

ہدایت کا شان  
نزول









کا ارشاد گرامی ہے۔ مَنْ مَاتَ عَلَى شَيْءٍ ابْتَغَى اللَّهُ عَلَيْهِ جَوْشَخْشَ جِسْمِ عَقِيدَةٍ پُورے گا۔ اُمّی پر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ لہذا امتیازی موت دین حق پر آنی چاہیے۔ تاکہ روزِ محشر یہی دین سے کراٹھو۔

یہودیوں کے لٹریچر میں اس وصیت کے ضمن میں حضرت اسحق علیہ السلام کا بھی ذکر ہے۔ کہ انہوں نے بھی اپنی اولاد کو ایسی ہی وصیت کی تھی۔ جب ان کا وقتِ موعود آ پہنچا، تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ میں تم کو اس خدا کا واسطہ دیتا ہوں، جس کی صفات یہ عظیم، قیوم اور عزیز ہے۔ اور جو آسمان و زمین کے درمیان ہر چیز کا خالق ہے۔ تم اُمّی خدا کا خوف رکھنا اور اُسی کی عبادت کرنا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی وقتِ آخر اپنے بیٹوں کو پاس بلا کر کہا۔ مجھے خدا شہ ہے۔ کہ تم میں سے کوئی بت پرستی اور شرک کی طرف میلان رکھتا ہے۔ تو بیٹوں نے جواب دیا۔ سن لے اسرائیل! لے ہمارے باپ! ہمارا خدا وہی ہے جو سُبُوحِ سَبَّح ہے۔ اور جس طرح ایک خدا تعالیٰ پر تیرا ایمان ہے۔ اُسی طرح ایک خدا پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ ہر حال یہ حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کی وصیت کا ذکر تھا۔ جو اس آیت میں بیان ہوا۔

اگلی آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا بطور خاص ذکر فرمایا۔ یہود و نصاریٰ کو یاد دہانی کرائی جا رہی ہے۔ کہ تمہارا یہ دعویٰ باطل ہے۔ کہ تم ابراہیم، اسمعیل، اسحق اور یعقوب علیہم السلام کو ماننے والے ہو۔ انہوں نے یہودیت یا نصرانیت کی تعلیم نہیں دی تھی۔ ان کی تعلیم تو واضح طور پر توحید پر مبنی تھی۔ فرمایا اس واقعہ کو یاد کرو وَاٰخِرُ كُنْتُمْ شَعْبًا وَاحِدًا۔ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ كَمَا تَمَّ اس وقت موجود تھے۔ جب یعقوب علیہ السلام کے پاس موت آئی۔ اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيۤ جِبۡلَ اٰنۡہُوۡنَ نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے یہودیوں کی رہایت میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا مجھے شہ ہے کہ تم میں کوئی شرک کی طرف میلان

نہکتے ہو تو میٹوں نے بیک آواز جواب دیا قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ ہم تیرے معبود کی عبادت کریں گے وَاللَّهُ أَبَاحُكَ اور تمہارے آباؤ اجداد انیسلمو وَأَسْمَعِيذَ وَاسْمُحُو ابراہیم، اسمعیل اور اسحق علیہم السلام کے معبود کی عبادت کریں گے۔ إِنهَذَا وَاحِدٌ یہ جو ایک ہی معبود ہے۔ ہم صرف اسی کی عبادت کریں گے۔ وَنَحْنُ نَذْهَبُ لِمُؤَدٍّ اور ہم صرف اسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ یہ سب باتیں حضرت یعقوب علیہ السلام کے دم واپسین کے وقت کی ہیں۔ جو اپنی اولاد کو دین توحید اور ملت ابراہیمی پر کار بند ہونے کی تلقین فرماتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان تمام واقعات کے پیش نظر یہود و نصاریٰ کے لیے ملت ابراہیمی سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ان میں ذرا بھی انصاف کا مادہ موجود ہو۔ اور وہ تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں تو انہیں حضور علیہ السلام پر ایمان لانا ہو گا۔ کیونکہ آپ ہی ملت ابراہیمی کے پیچھے پیرو کار اور پیچھے جانیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے اس دعوے کی تردید فرمائی ہے کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں۔ آگے سورۃ آل عمران میں آئے گا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تمہارا دعوایہ یہ ہے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر ہو۔ تو بنی آخرا زمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا پڑے گا۔ آپ کے بغیر سب ادیان باطل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تمہاری محبوبی نسبت کچھ مفید نہ ہوگی۔

ہر امت اپنے  
افعال کی ذمہ دار  
ہے

ان جلیل القدر مخبروں حضرت ابراہیم، اسمعیل، اسحق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی توحید پر مکتبی کے بعد فرمایا۔ يَذْهَبُ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، وہ دین توحید پر قائم رہی لَهَا مَا كَسَبَتْ انہیں کے لیے ہے جو کچھ انہوں نے کیا۔ یعنی ان کے عقیدہ اور اعمال و افعال کا اجر ان کو ملے گا وَلِكُلِّ أُمَّةٍ اور تمہارے لیے وہ ہر گاہ جو تم کا دے گا۔ اگر تم بھی ان کے طریقے پر چلتے ہوئے دین اسلام اور ملت ابراہیمی کا دامن تمام لوگے۔ تو مراد کو پہنچو گے۔ اور اگر بنی ضد اور عناد پر قائم رہے۔ تو ملت ابراہیمی سے خالی خولی نسبت کچھ کام نہ آئے گی اور تمہارے عقیدے اور اعمال کے مطابق ہی تمہیں بدل دیا جائے گا۔ امام غزالیؒ نے بڑی عمدہ مثال دی ہے کہ اگر بیٹا بھوکا یا پیاسا ہو اور باپ کھاپی ہے۔ تو بیٹے کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس کی بھوک اور پیاس رفع نہیں ہوگی۔

جب تک وہ خود نہیں کھائے پئے گا۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ کے آباد اجداد کا دین اسلام پر قائم ہونا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ جب تک یہ خود ہیٹ دھرمی چھوڑ کر ملتِ ہرابی کی نہ اپنائیں۔ فرمایا وَلَآ تَسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباد اجداد کا دین کیا تھا۔ وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہیں خود ان کی صحیح معنوں میں پیروی کرنا ہوگی۔ تمہارے اعمال کی باز پرس تمہیں سے ہوگی۔

---

وَقَالُوا لَوْلَا نُفُوذُ هَؤُلَاءِ اَوْ تَعَالَىٰ تَهْتَدُونَ ۚ قُلْ بَلْ مِلَّةَ رَبِّكُمْ  
 حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٥﴾ قُلُوا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا  
 اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ اِلَىٰ رِابِّهِمْ ۚ وَاسْمِعُوا لَوْ رَٰسِحَقُ وَاِ  
 يَغْفِرُ ذَنْبَكُمْ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اَوَّلَىٰ مُوسٰى وَرِيعِي ۚ وَمَا اَوَّلَىٰ النَّبِيُّوْنَ  
 مِنْ زَيْبٍ سَعْدٌ لَا تُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ ۚ وَخُذْ لَهُ مُسَلِّمُونَ  
 ﴿١٢٦﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اٰمَنَّا بِمَا  
 وَرَآءَ مَا كُنْتُمْ بِهٖ ۚ فَاِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْهُمْ اللّٰهُ وَهُوَ  
 السَّمِيعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٢٧﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنْ اللّٰهِ صِبْغًا  
 ۚ وَخُذْ لَهُ عِبَدٌ نُّذَرٌ ﴿١٢٨﴾

ترجمہ : اور ایسا کہ رسولوں سے ہیں یہ یہودی یا نصرانی جو جاذب ہدایت پابان کے لئے

پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ہرگز نہیں بلکہ ہم وقتِ ابراہیمی کی پیروی کریں گے جو ایک صراط

راستہ تھی۔ اے اللہ! جو ہمت اور شکر کرنے والوں میں نہیں تھے ﴿۱۲۵﴾ (اے ایمان والو)

اے ہم ایمان والے! میں اشد ہے اور اس چیز پر جو ہمارے طرف اشارہ کی گئی ہے۔ اور جو

ابراہیم، اسماعیل، اسحق یعقوب و علیہم السلام انسان کی اولاد پر اتار دی گئی ہے اور

ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر جو کوئی جیسی دھیس دھلاہ اور درست دھیسوں کو

ان کے رب کی طرف سے دیکھی ہے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق

نہیں کرتے۔ اور ہم اسی پروردگار کی پیروی کرنے والے ہیں ﴿۱۲۶﴾ پس اگر یہ

لوگ ایمان لائے آئیں جیسا کہ ایمان لائے تھے تو ان میں سے ہر ایک پابان نے اور انہوں نے

پروردگار کی پس پشت ہمت میں ہیں۔ پس حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بت کر کے گائب

کے لئے ان سے۔ اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۱۲۷﴾ (ہم نے)

اسے کا بہم اختیار کیا ہے۔ اور کون زیادہ بہتر ہے اللہ سے بہتیار ملک کے

اور ہم اسی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے ہیں (۳۸)

گزشتہ سیرت

یہود و نصاریٰ اور شرکین تینوں کے وہ وقت برابر بھی کے مختلف تھے۔ خصوصاً اہل کتاب  
یعنی یہود و نصاریٰ اپنی یہودیت و نصاریت کو کسی وقت برابر بھی خیال کرتے تھے۔ اور وہ دونوں کو بھی  
یہی چیز اختیار کرنی دعوت دیتے تھے۔ مزین طریقہ کے اطراف میں سننے والے یہودیوں میں ایک بڑا عالم  
عبد اللہ بن مسعود یا مشور زما تھا۔ اس نے خود انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دی کہ آپ یہودیت  
اختیار کر لیں۔ ہدایت پابا میں گئے۔ دلیل اسی بھی یہی تھی کہ وہی اصل ابراہیمی طریقے پر قائم ہیں۔ عارضہ  
ان کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیت تورات کی بجائی ہوئی شکل ہے۔ اور نصاریت  
انجیل کی نسخہ نہ صورت۔ انہوں نے آسمانی کتابوں میں شرک کی اکبریتوں کے پس منظر میں  
کو باطل کر لیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف خالی نسبت پر ہی اتارتے رہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ  
نے ان کے باطل عقائد کو رد فرمایا ہے۔

یہودیت

اہل کتاب کا باطل کی طرف دعوت کا طریقہ یہ تھا کہ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارًا  
فَنُتَدُوا۔ وہ کہتے تھے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ۔ ہدایت پابا رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ  
نے ان کی دعوت کو رد فرماتے ہوئے نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ اہل کتاب کی دعوت کے جواب  
میں قُلْ بَلَّ مَلَكًا بَلَّ۔ حَنِيفًا۔ آپ ان کو کہہ دیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا  
کہ ہم تمہارا باطل مذہب اختیار کر لیں۔ اور اگر اس میں بگاڑ نہ بھی پیدا ہو تو بھی تورات اور انجیل تو مفسور  
ہو چکی ہے۔ آپ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ جو کہ پہلی کتابوں کی نسخہ ہے لہذا  
اب تورات اور انجیل پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔ یہودیت کا باطل طریقہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایجاد ہوا تو وہ  
یہودیت ہے۔ ہرگز ان کا طریقہ نہیں مجھے اختیار کیا جاسکے۔ اسی طرح موجودہ نصاریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام  
کے دو سو سال بعد ایجاد ہوئی ہے۔ موجودہ نصاریت کا پیش کردہ عقیدہ تثلیث ہرگز حضرت عیسیٰ علیہ السلام  
کی تعلیم نہیں ہے۔ لہذا یہ دونوں مذہب کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہیں۔

الخبر۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہر طریقہ ابراہیمی نہیں ہے۔ بَلَّ مَلَكًا بَلَّ  
حَنِيفًا۔ ہم تو اصل ملت ابراہیمی کی پیروی کریں گے۔ اس حقیقی ملت کو اختیار کر سکتے ہیں۔



ہیں گے۔ پہلی آیتوں میں گنہ گار ہے کہ صحیح قسٹ براہمی ہی قسٹ اسلامیت ہے۔ وہ نہایت  
 عَنْ صَلَٰةٍ بِرُحْمَةٍ لَا مَنَ سَفَرٌ۔ لَفَضْلُهُ۔ اور اس قسٹ سے انحراف نہ  
 کوئی بیوقوف ہی کر سکتا ہے۔ اور ان کا طریقہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ ہے۔ اور اس  
 آخری دور میں تہذیبیت محمدیہ ہی قسٹ براہمی کی اصل بنشیں ہیں۔ اور اس قسٹ کا اتباع کریں  
 گے جو حضرت ابراہیم خلیفہ علیہ السلام کی قسٹ ہے۔ اور یہ اب شریعت محمدی کی شکل میں بہتے  
 پاس موجود ہے۔

لفظ ضعیف  
 کا معنی

ضعیف عربی زبان میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے پاؤں میں کمی ہو۔ اور وہ چلتے وقت  
 ایک طرف کو ہل جاتا ہو۔ اس کو احف بھی کہتے ہیں لفظ ضعیف اسی دھڑے سے ہے۔ اور  
 اس کا معنی ہے ہر طرف سے کٹ کر ایک طرف نکلنے والا یعنی یکسو۔ اور عطا کا ضعیف اس شخص  
 کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے کٹ کر حضرت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ لَقَدْ عَهِدْنَا لِلْإِنسَانِ إِذْ خَلَقْنَاهُ  
لَلْغَنَةِ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے متعلق بھی یہی آیا ہے۔ وَمَا  
 كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ آپ متحرک کرنے والوں میں نہ تھے بلکہ جس یودیت اور نہایت  
 کی دعوت تم سے ہے سو وہ تو شرک سے آلودہ ہے۔ تم کو حدیث الودیت کے قائل ہو  
 نہیں تعبیر پائی جاتی ہے۔ لہذا تم تمنا دینا کہ دین قبول نہیں کر سکتے بلکہ تم تو قسٹ براہمی کا اتباع  
 کریں گے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ضعیف تھے اور شرک سے پاک تھے۔

شاہ راز اللہ مکث و بطون اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ضعیف کو شخص ہو  
 گا جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو۔ حج کرنے والا ہو۔ نماز میں بیت اللہ شریف کی طرف رخ  
 کرنے والا ہو۔ ختنہ کرنے والا ہو۔ اور محرمات نکاح کو حرام سمجھتا ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی  
 مسیر میں منہ براہمی کی چالیس خصوصیات بیان کی ہیں جو اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں پر بت کرے  
 دے سے ماریا شخص سے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کرنا ہو۔ بہ حال حضرت ابراہیم علیہ السلام  
 ضعیف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے استاد فرمایا کہ آپ فرمادیں کہ تم تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قسٹ

لے قسٹ انسان سے پہلے باقی امور بہرہ۔ اور یہ پیشہ مشائخ۔ معادلہ الیہ

لے خیرہ۔ یہ وہی ہے

کہ تباہ کریں گے۔ تمہاری خود ساختہ یودیت و نصرانیت کو قبول کرنے کے لیے تیار  
ہیں ہیں۔

ان بات

فرمایا کہ آپ ان کو اہل قسب ابراہیمی کی تشبیح بھی کر دیں۔ فَقُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ  
یعنی یوں کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر یعنی ہماری بہ فیاد ہی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔ ہم اس  
کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مٹھاتے۔ نہ ذات میں نہ صفات میں نہ عدل و حرام میں کسی چیز میں اس  
کا شریک نہیں بناتے۔ بر خلاف اس کے بنی اسرائیل نے عدل و حرام کا نہ سب پادریوں کے پر و  
کر رکھا ہے۔ جسے پادری عدل کرے وہ عدل ہے۔ اور جس چیز کو پادری حرام قرار دے گا۔  
وہ حرام ہو جاتی ہے۔ حالانکہ تحلیل و تحریم تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہ منسوب  
اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ اہل جب بنی کسی چیز کی حالت  
و حرمت کا فتویٰ دیتا ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے عدل و حرام کردہ حکم کے مطابق ایسا کرتا ہے  
خود اپنی مرضی سے کسی چیز کو عدل و حرام قرار نہیں دیتا۔ یہودی چونکہ عدل و حرام کا اختیار اپنے اجار  
اور جہان کو سنبھالتے ہیں۔ اس لیے وہ تحلیل و تحریم میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔

قرآن  
میں

اہل ایمان کو خطاب سورہ بقرہ کہ ایمان باللہ کے بعد تمام کتب کا دیہ پر ایمان لائے  
کا بھی اعلان کر دو وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ إِلَّا بِإِذْنِ رَبِّكَ اس کتاب پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف  
نازل کی گئی یعنی قرآن پاک وَمَا أُنْزِلَ إِلَّا بِإِذْنِ رَبِّكَ وسمعنا وسمعنا وسمعنا  
وَأَنبَأَ نَسَبًا اور جو کچھ نازل کیا گیا ابراہیم، اسمعیل، اسحق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر  
مکمل آسمانی کتابیں تو یہ ہیں۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام پر چھوٹے چھوٹے پیغمبر  
بھی نازل فرمائے۔ چنانچہ قرآن میں مذکور ہے ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کا ذکر آتا ہے۔ اس  
پر اسی صحائف کا ذکر ہے کہ نبی بنانے والے کتب کا دیہ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی طرح  
نبی و آسمانی کتاب کا بھی ذکر ہے۔ یہاں بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں نہایت  
بہرہ مند انداز میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہم السلام کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ  
کے بعد سے اور ان کے بعد جو نبی نازل ہوئے ان کا ذکر کیا۔ اور ان کے بعد سے جو نبی نازل ہوئے ان کا ذکر کیا۔  
ابن ابی ایمنہ کا مشیور ہے۔

فرمایا ہمارا ان کتابوں پر بھی ایمان ہے وَمَا أَوْثَقَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ جُورُؤُیْ اور عیسیٰ علیہما السلام کو عطا کی گئیں۔ یعنی توراۃ اور انجیل وَمَا أَوْثَقَ النَّبِيُّونَ مِنْ دِينِهِمْ اور اس چیز پر بھی ایمان لائے جو دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ بغیریکہ یہ ایک قاعدہ کلیہ آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے نوح انسان پر جس وقت اور جو کچھ اپنے پیغمبروں کے ذریعے بھیجا ہے۔ سب پر ایمان فلاحی ہے۔

ابن ابی حاتم کی روایت میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہاں تک ایمان لانے کا تعلق ہے۔ تم زبور۔ توراۃ اور انجیل پر ایمان رکھو مگر وَلْيَسَعُكُمْ الْقُرْآنُ عمل کرنے کے لیے تمہارے لیے قرآن پاک کافی ہے۔ یعنی سابقہ کتب پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک نے سابقہ کتب کے احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔ اب قابل عمل احکام صرف قرآن کریم کے ہیں۔

اہم شافعی کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ ان میں چار نور عظیم کتابیں ہیں۔ یعنی زبور۔ توراۃ۔ انجیل اور قرآن کریم اور سو چھوٹی کتابیں صحیفے ہیں۔ جو حضرت آدم۔ نوح۔ ابراہیم علیہم السلام اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے۔ ایسے ہی صحیفوں کا ذکر حضرت یونس۔ حضرت ایوب۔ حضرت سلیمان علیہم السلام اور دیگر کئی انبیاء کرام کے ساتھ بھی آتا ہے۔ موجودہ مجموعہ کتب معراجہ بائبل کہتے ہیں۔ اس میں ۲۹ صحائف شامل ہیں۔ ان کتابوں اور صحائف میں اگرچہ بہت کچھ تحریریں و نسخ ہو چکے ہیں۔ تاہم یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں اور ہمارا ان سب پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بذریعہ وحی انبیاء کرام پر نازل فرمائے۔

آگے اس بات کا اقرار ہے لَا تَفْتَرُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ دِينًا ہمارا ان تمام رسولوں پر بھی مکمل ایمان ہے۔ جن پر کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے۔ بلکہ ان انبیاء کرام پر بھی ایمان ہے جن پر کوئی باقاعدہ کتاب نازل نہیں ہوئی۔ اور ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان مکمل انہی صورت میں ہوتا ہے۔ جب تمام انبیاء علیہم السلام پر بلا تفریق ایمان ہو

کسی پر ایمان لانا اور کسی پر نہ لانا۔ یہ تو کفر کے مترادف ہے۔ بنی اسرائیل اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ وہ عیسیٰ ابنیاء کرام علیہ السلام پر تو ایمان لائے مگر بنی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا۔ دیکھو! اہل اسلام تمام سابقہ نبیاء کرام پر یعنی حضرت موسیٰ عیسیٰ علیہما السلام و دیگر سب پر ایمان رکھنے کے ساتھ بنی آخر الزمان علیہ السلام پر بھی ایمان لائے ہیں۔ مگر یہ دو دو ٹوٹا ہوا آخر بنی کے معنی ہیں۔ اس لیے یہ کافر ٹھہرے ہیں۔ لَا تَفْتَرِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ كَمَا مَطْلَبُ یہ ہے کہ ساری تمام انبیاء کرام پر یکساں ایمان ہے۔ ہم کسی میں بھی تفریق نہیں رکھتے۔ جو انبیاء کرام ہیں تو ہم کی طرف اور جس زمانے میں بھی مبعوث ہوئے۔ اگرچہ ہم انہیں جانتے نہیں مگر ان کی بعثت کے یکساں طور پر قائل ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اہل ایمان! تمہارے برحق ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور اس کی تمام کتابوں کو برحق مانتے ہو۔ اور ان میں کوئی تفریق نہ کرنا۔ وَتَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ اور ہم اسی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں جس نے تمام انبیاء اور کتابیں نازل فرمائیں۔ اور یہی قہرِ ابراہیمی کا اصول ہے۔

مصدق

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو معیارِ حق قرار دیا۔ اور فرمایا فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُ بِهِ بِدَارِ الْآخِرَةِ كَفَرُوا مَثَلِينَ اور یہود و نصاریٰ بھی اُسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو فَقَدْ اهْتَدَوْا تَوْبَةً مِّنْ مَّا كُنْتُمْ يَافِكُونَ گویا نزولِ قرآن کے زمانہ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت صحابہ کرام کو معیار قرار پائے۔ مگر بعد میں آئے لوگوں کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ بھی انہیں کا طریقہ اختیار کریں۔ وہ بھی اُسی معیار پر چلنے جائیں گے۔ چونکہ اُس زمانے کے یہود و نصاریٰ صحابہ کرام کے معیار پر پورے نہ اُترے۔ وہ اس طرح تمہارا انکار کر رہے ہیں اور تمام کتابوں پر ایمان نہ لائے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ایمان لائے تھے۔ لہذا وہ مگرد ہوئے۔ آج بھی جو کوئی صحابہ کرام کے طریقے کے خلاف کرے گا۔ گمراہ ہوگا۔ اسی لیے تو حضور علیہ السلام نے نامی کر وہ کے متعلق فرمایا مَا أَنَا عَلَيْهِمْ وَأَصْحَابِي

یعنی نجات یافتہ وہی لوگ ہوں جو میرے عقائد کے طریقے پر ہوں گے۔ باقی سب گمراہ ہوں گے۔ صحابہ میں سے آپ نے خلفائے راشدین کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔  
 کیونکہ ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے تمام خطہ زمین پر دین کو مستحکم بنایا۔ واقعہ یہ ہے کہ  
 ہم کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو مسلمانوں سے ٹکڑے سکے۔ سب مغلوب ہو چکے تھے۔ نہ صرف  
 دین سے بلکہ سیاسی طور پر اسلام غالب آچکا تھا۔ یہ تو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے اہل بیت  
 کی وجہ سے حالات نے پٹا کھنسا۔ ورنہ پچاس سال تک اسلام بہترین حالت میں رہتا۔

الغرض! یہ دو نصائح کو فرمایا کہ تمہارا دین اور تمہارا ایمان درست نہیں ہے بلکہ  
 جھل کر نئے کے لیے ضروری ہے کہ تم بھی دین حق پر اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح اہل  
 ایمان لاتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں کرو گے۔ اپنی عند اور بہت دھرمی پر اڑے رہو گے تو ہدایت نہیں  
 پاؤ گے۔

اہل ایمان  
 کی کامیابی

فرمایا اگر یہ مکمل ایمان لانے کی بجائے وَإِنْ تَوَلَّوْا اگر یہ رد و رانی کریں گے فَإِنَّمَا  
هُمْ فِي شِقَاقٍ تو یہ محض خدا اور اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ نہ تو منصف مزاج ہیں  
 اور نہ ہی حقیقت کے طلبکار ہیں۔ آپ اپنا کام کرتے ہیں۔ ان کی پروا نہ کریں فَيَكْفِيكُمْ  
اللَّهُ ان کی طرف سے ہر شرف و رکے جواب میں اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت کرے گا۔ آپ کو  
 ان کی شرارتوں اور جیل ساز یوں سے محفوظ رکھے گا۔ اور جو لوگ آپ کے متبع ہیں۔ وہ بھی ہر حال  
 میں إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ آپ کے دشمن ہی ذلیل و خوار ہوں گے۔ آپ اور آپ کے  
 سامعین بالآخر کامیاب و کامران ہوں گے۔ چنانچہ اہل کتاب نے دیکھ لیا کہ عورتوں سے ہی عرصہ میں  
 اسلام لوٹے عرب اور پھر آدمی دنیا تک پھیل گیا۔ وہی اہل کتاب جو آپ کے خلاف طر ح طر ح  
 سازشیں کرتے تھے۔ انہیں مدینہ طیبہ اور دیگر قلعوں سے نکلنا پڑا۔

ملوکیت کی  
 خسریاں

مسیح کرامت نے جو معیار قائم کیا تھا وہ بڑے اونچے درجے کا معیار تھا۔ اور اس پر کار بند  
 رہنا بھی آسان نہیں تھا۔ چنانچہ بعد میں آنے والے لوگ اس معیار کو قائم نہ رکھ سکے اور خلافت کی بجائے

طو کیت کا راستہ اختیار کر لیا۔ خلافت راشدہ کے طریقے کو پس پشت ڈال دیا اور عیاشی و فحاشی والا طریقہ اختیار کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بنی اسرائیل کی طرح یہ بھی ذلیل ہوئے۔ یہ درست ہے کہ بعد میں کچھ اچھے لوگ بھی آئے اور اسلام کو وقتی طور پر تقویت بھی حاصل ہوئی۔ مگر بحیثیت مجموعی بگاڑ پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور طو کیت اور ڈکٹیٹر شپ آگئی اور ہر صاحبِ اقتدار اپنی من مانی کر کے لگا۔ چوبہ کی افضل حق ہماری قوم کے بڑے مدبر انسان ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں بڑے ذکھ کے ساتھ ایک جملہ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب بنی امیہ کا دور آیا تو انہوں نے خلافت راشدہ کے نفیس فرش کی جگہ شناسائیت کا ناٹ بچھا دیا۔ واقعہ یہی ہے کہ جو میاں جی صاحب نے قائم کیا تھا اس میں زوال آگیا۔ اور امت میں اتفاق و اتحاد کا دامن مارا ہو گیا۔ جنگ اُمد میں اگرچہ شکست کا رمن کرنا پڑا مگر صیبر کرام نے **وَأَهْلُهُمْ شِيزَى بَيْنَهُمْ تَوَارِثُ** کر کے نہ صرف اس شکست کو برداشت کیا، بلکہ اپنے اتحاد کو اور مضبوط کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔ بلکہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسلام عرب سے نکل کر دور دور تک پھیل گیا۔

اہم ابوجہس صاحب فرماتے ہیں کہ جس معاملہ میں وحی کے ذریعے رہنمائی نہ کی گئی ہو، اُس معاملے میں نبی کے لیے بھی واجب ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرے۔ مگر طو کیت کے راستے پر چل نکلنے والے صاحبِ اقتدار لوگوں کو اپنی من مانی کرنے کا کہاں حق پہنچتا ہے۔ ایسے لوگ تو ابیس کے راستے پر چلنے والے ہیں۔ کابل، مصر اور بخارا وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں وہاں کے لوگ نے کس قدر ظلم کیے۔ اسلام کے صحیح طریقے کو چھوڑ کر باطل طریقے پر چل نکلے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر صدیوں سے زوال چھایا ہوا ہے۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو فرمایا کہ اگر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ اپنی ضد پر اڑے رہیں تو آپ گھبرائیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو گا۔ ان کے مقابلے میں وہ تمہارے لیے کفایت کرے گا۔ **وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ** وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ ہر ایک کی دُعا کو سنتا اور ہر چیز کو جانتا ہے۔ اُس سے کچھ مخفی نہیں۔



مبغوثہ

فرمایا یہ آپ کو یہودیت اور نصرا نیت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ آپ انہیں فرمایا جگہ  
کہ صَفَّ اللَّهُ بِمَنْ تَرَىٰ اللَّهُ تَعَالٰی كَارِئِكْ اختیار کر لیا ہے۔ تمہارے باطل یہودیت اور  
نصرا نیت سے بھار کیا تعلق۔ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے مراد کوئی۔ انہی رنگ از قسم شہر  
نیا پایا نہیں بلکہ توحید اور اخلاص کا رنگ ہے۔ یہ وہ رنگ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت  
کرنے سے انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتا ہے۔ یہ رنگ ان کے اقوال و افعال و اعمال بگڑا  
کی وجہ سے اور چمکتا ہے۔ ہم نے یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ یہودیت اور نصرا نیت والا رنگ  
نہیں جو کہ کپڑوں اور جسم پر لگا کر عیسائیت میں تختی کا اظہار کرتے ہیں

فرمایا: وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صَفَّ اللَّهُ تَعَالٰی اور اللہ کے رنگ سے اچھا کون سا رنگ  
ہوگا۔ جو کہ توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ ہے۔ یہ وقت ہر بھی کا رنگ  
ہے جو صرف اہل ایمان کو حاصل ہے۔ جو اس وقت پر صحیح معنوں میں کار بند ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ  
کے سحر کداریں۔ جس نے ہمیں اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ وَنَحْنُ لَهُ عِبْدٌ اُس سے  
ہم اُسی اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ ہم کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہیں کرتے۔

الْم

درس پنجم چار

البقرة -

(آیت ۱۳۹ تا ۱۴۱)

قُلْ أَتَحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَكِنَّا أَعْمَالُنَا  
وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ  
إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا  
هُودًا أَوْ نَصَارَى قُلْ أَنْتُمْ أَهْلُ اللَّهِ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ  
مِمَّنْ كَتَبَ شَهَادَةً عِنْدَ اللَّهِ مِنَ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا  
تَعْمَلُونَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ  
مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

ع

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے (اہل کتاب سے) کیا تم ہم سے اللہ کے  
بارے میں جھگڑا کرتے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی ہے۔ اور ہمارے  
لیے ہمارے اعمال ہیں۔ اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ اور ہم اُسی کے لیے اخلاص  
کرنے والے ہیں ﴿۱۳۹﴾ کیا تم یوں کہتے ہو کہ (حضرت) ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور  
یَعْقُوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے، آپ فرما دیجئے کیا زیادہ  
جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ۔ اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔ جو اس کو اپنی کوتاہیاں ہے۔  
جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس ہے۔ اور اللہ ان کاموں سے غافل نہیں ہے  
جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۰﴾ یہ ایک مباحثہ ہے جو گنہگاروں کی ہے۔ اس کے لیے وہی کچھ بہت  
جرائم نے کیا۔ اور تمہارے لیے وہ کچھ بہت جو تم نے کیا۔ اور تم سے ان کاموں  
کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ جو وہ کرتے تھے ﴿۱۴۱﴾

گزشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو اپنے اہل مذہب کی عزت  
و محبت دیتے تھے کہ یہودی نصرانی موجد و توحیدیت پہنچاؤ گے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ  
نے اہل ایمان سے کہلایا کہ ہم تو طاعتِ ابراہیمی کے پیروکار ہیں اور اسی پر کار بند رہیں گے۔

مکمل ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے۔ اور شرک کرنے والوں میں نہیں تھے۔ اس کے بعد ملت اسلام اور ملت ابراہیم کا اہم اصول اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری بیان کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے فرمایا کہ تم ایمان کر دو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی تائید اور اس کی کتاب کو ماننے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف نازل کی ہے۔ اور ان صحائف کو بھی مانتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی طرف نازل فرمائے۔ ہمارا اس شریعت اور دین پر بھی ایمان ہے۔ جو حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو جو چیز بھی سلا کی گئی۔ ہمارا اس پر ایمان ہے۔ اور ہم تفریق بین الرسل نہیں کرتے کہ کسی کو مان لیا اور کسی کو نہ مانا، بلکہ سب کو یکساں طور پر اللہ تعالیٰ کے رسول تسلیم کرتے ہیں۔ اور تمام کتب سماویہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ عمل کے لیے صرف قرآن پاک کو کافی پاتے ہیں۔

حضرت علیہ السلام کے صحابہ کرام بھی اسی اصول پر عمل درآمد کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ دو نساء نہ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں۔ جس طرح صحبہ ایمان لائے ہیں، تو وہ بھی ہدایت پا جائیں گے۔ اگر مخالفت کریں تو یہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو قتل و دی کو اہل کتاب کے شر سے خائف نہ ہوں۔ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کفایت کرے گا۔ پھر فرمایا کہ یہودیت یا نصرانیت کا رنگ پکڑنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرو۔ اور وہ دین توحید اور ملت ابراہیمی والا رنگ ہے۔ آخر میں اہل ایمان سے کہلویا کہ ہم اس اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں۔ جسکی وحدت کا اقرار کر چکے ہیں۔

اہل کتاب کے ساتھ جو کلام

آیت زیر در میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے ساتھ معاملہ کی بنیاد رکھی ہے۔ کیونکہ ان کے ساتھ صلح و صفا کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ پیغمبر علیہ السلام سے خطاب کیا۔ قُلْ اٰپ ان اہل کتاب سے کہہ دوں۔ تَحٰاجُّوْنَہٗ فِی اللّٰہِ کہ تم اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہم سے جو کلام کرتے ہو کیا بنانے کی محاسمت نہ کی دانہ نیست اس کا دین یا اس کی عبادت ہے۔ بلکہ جھگڑے کی بنیاد یہ ہے۔ کہ اہل کتاب اس زعم میں مبتلا تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ ان پر بڑا مہربان ہے۔ اس کی تمام تر نوازشیں انہیں کے لیے ہیں۔ لہذا آخری نبی بھی بنواحق ہیں سے ہی آنا چاہیے۔ تاکہ ان کے خاندان کی برتری قائم رہے۔ اسی لیے وہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت





آگے اہل کتاب کی ایک اور زیادتی کو بیان فرمایا۔ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَبَ شَهَادَةً  
عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ اسْ تُخْفِسُ عَنْ بُزْءِ كُفْرَانِ ظَالِمٍ مُّوْكَلاَ. جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے  
گواہی موجود ہو۔ اور وہ اسے چھپائے۔ یہ گواہی کون کی تھی۔ جسے بنی اسرائیل چھپاتے تھے۔  
گواہی حضور علیہ السلام کی بعثت۔ قرآن پاک کی حقانیت اور آخری امت کے ہائے میں حق۔ آگے  
آئے گا کہ بنی اسرائیل ایسا جان بوجھ کر کر رہے تھے۔ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ  
یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پہچانتے تھے۔ جس طرح اپنے بیٹوں کو۔  
مگر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ  
کے متعلق واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں۔ مگر یہ لوگ عناد اور حسد کی وجہ سے آپ کو آخری نبی تسلیم  
نہیں کرتے تھے۔ گویا توراۃ نے جو گواہی پیش کی تھی اور جو خود ان کے پاس موجود تھی۔ اسے  
چھپاتے تھے۔ انہیں کے متعلق فرمایا کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے۔ جو اپنے پاس  
موجود شہادت کو چھپا جائے۔

شہادت کا چھپانا دیکھ ہی گناہ ہے۔ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَاَنَّهُ اِنَّهُ قَلْبُ  
شہادت کو چھپانے والے کا دل گناہ کا ہے۔ بلکہ صحیح گواہی دینا تو ضروری ہو جاتا ہے۔ یمن  
بحسب کہ وہ دین کے متعلق ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَاقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ  
اللہ تعالیٰ کے لیے شہادت کو قائم کرو۔ اس کو چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ ظالموں میں  
شمار ہو گے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی طرف سے کتاب شہادت کو سورۃ اخلاف میں یوں بیان  
فرمایا۔ يَجْزِيكَ فِئَتٌ مِّنْهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ اللَّهِ لَأَعْلَىٰ عَلَىٰ اللَّهِ  
پیش گوئیاں اور حال توراۃ اور انجیل میں ان کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر یہ حق بات کو  
چھپا لیتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی قبیح حرکات کا علم نہیں بلکہ وہ تو  
ہر چیز کو جانتا ہے۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ وہ غافل نہیں ہے تمہارے  
تمام کاروائی کو جانتا ہے۔ اور مناسب وقت پر تم سے مواخذہ کرے گا

یہ آیت گذشتہ سے پوچھتا ہے۔ دریں میں آپ کی سے۔ یہاں اس کو دو بار بار ہے



تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ يَوْمَ اَمْتِ قَوْمِ  
 جو گذر چکی۔ اس کے لیے وہی کچھ سے جو اس اُمت نے کیا اور تمہارے لیے وہ سب جو تم نے  
 کیا، وَلَا تَسْأَلُوْنَ عَمَّا كَانَتْ اَيْمُنُ لَكُمْ فَمِنْ اَمْتِ اَنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جائیگا۔  
 کہ وہ کیا کرتے تھے۔ بلکہ تم اپنے کردار کے ذمہ دار ہو۔ وہ اپنے اعمال کے ذمہ دار ہیں۔ مطلب یہ کہ اُسے  
 نہ کتاب اگرچہ تم اسی نسبت انبیاء علیہم السلام کی طرف کرتے ہو مگر تم ان سے حنفیہ سے پر قائم  
 نہیں ہو سکتے۔ لہذا تمہاری یہ معمولی نسبت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ ان کے عقیدے اور اعمال جیکے  
 درست تھے لیکن وہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتے تمہیں اپنے اعمال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی۔  
 قِسْمٌ اَبْرَئِیْمٰی کَاٰیۃٍ اٰمَرْتُمُوْا اَصْحٰبَ الدِّیۡنِ اَنْ یَّجۡتَنِبُوْا مَا نَجَّیۡنَا اِبْرٰہِیۡمَؑ وَیَسٰۤءَۃَؑ اِیۡمٰنُہُمۡۚ وَیَسٰۤءَۃَؑ اِیۡمٰنُہُمۡۚ  
 کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمان مبارک شیعہ سے لایجتنی علیکم  
 وَلَا تَجْنِیْ عَلَیۡہِؑ باپ اور بیٹے کے متعلق فرمایا کہ باپ کا گناہ بیٹے کی گردن پر نہیں ہوگا۔ اور  
 نہ بیٹے کی زیادتی پر باپ کو چڑھا جائے گا۔ ہر کوئی اپنے کام کا ذمہ دار ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ  
 اِنۡبِیَآءِ عَلَیۡہِمُ السَّلَامُ کُلٌّ مِّنۡ مَّحْضِ نَسَبٍ کَرِیۡمٍ کَیۡفَ یَاۡدُرُہٗ نَہِیۡسُ مَآءٌ جَبَّ اُنۡہُمۡۚ اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہُمۡۚ  
 نہیں کی جائے گی

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آیت تِلْكَ اُمَّةٌ کا دہرایا جان خاص مقصد کی بنا پر ہے  
 صرف اہل کتاب کے لیے تو یہ آیت ایک دفعہ ہی کافی تھی۔ اب جو دوسری دفعہ اس کا تکرار کیا گیا ہے  
 تو اس سے مراد اہل اسلام کی تفسیر ہے کہ اہل کتاب کی طرح وہ بنی خالی نسبت پر تکیہ نہ  
 دینے میں۔ بلکہ وہ اپنے عقائد اور اعمال کو پاک کریں۔ اللہ تعالیٰ اور نبی علیہ السلام کے احکام کی پابندی  
 کریں۔ تو ان کے لیے بھی راہ نجات کھل سکتی ہے۔ اپنے اعمال کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ آج کل  
 کے پڑھوں، امیر زادوں، کہی نشینوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو محابہ کریں۔  
 آباد اجداد کی خالی نسبت کسی کام نہیں آئیگی۔ باپ نیک و صالح تھا تو اس کا عمل اس کے ساتھ ہے  
 بیٹے کو اپنی جوابدہی خود کرنا ہوگی۔ نسبت کرجب مفید ہوگی تب بزرگوں کے خصائص صحت و بھروسہ

اماموں کے ساتھ نسبت کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہی مالِ شائع طریقت کا ہے اپنی نسبتِ بندہ خاندانوں کی طرف کرتے ہیں۔ مگر ان کی ایک خوبی بھی نہیں پائی جاتی۔ آج ہشتیہ اور قادر یہ سلسلہ کی طرف نسبت کرنے والے کتنی لغزات میں غوث ہیں۔ یکیشیخ عبدالقادر جیلانی کا یہی طریقہ تھا۔ ان کی کتابیں موجود ہیں۔ ان کے مواظظ اور دیگر تصنیفات ہیں۔ ایک ایک نقطہ سے ایمان اور حقیقت نیک رہی ہے۔ کفر اور شرک سے بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے مگر ان کی طرف نسبت کرنے والے کفر و شرک اور بدعت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے عرس منائے جاتے ہیں۔ ان کی قبروں پر چڑھاٹے چڑھائے جاتے ہیں۔ رسومات باطلہ کا دور دورہ ہے۔ مگر نسبت ان کی طرف ہے۔ ایسی نسبت کیا فائدہ ملے گی۔

ہشتی پانے آپ کو خواجہ معین الدین ہشتی سے منسوب کرتے ہیں۔ اس ملک میں خواجہ معین الدین ہشتی، خواجہ فرید الدین گنج، خواجہ نظام الدین لویا، جیسے مشائخ کے ذریعے اسلام کی آبیاری ہوئی۔ ان کے ذریعے برصغیر کے کتنے لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ کتنے لوگوں کا حلقہ قائم ہوا۔ ایسے بزرگوں کا اس خطہ ارضی پر کتنا احسان ہے۔ مگر تاج انہیں کے پرکار۔ ہشتیہ خاندان کی طرف نسبت کرنے والے راگ، رنگ اور گانے بھگنے میں مشغول ہیں۔ قرالی کا نام دے کر کتنی ہی رسوم باطلہ کو اپنایا جا رہا ہے۔ مگر جیسا کہ بیان ہو چکا۔ یہ خالی نسبت کام نہیں آئی گی جب تک ان بزرگوں کے نقش قدم پر نہ چلیں گے۔ اسی چیز کو یودیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اہل ایمان کو سمجھایا گیا ہے۔ کہ وہ بھی یودیوں کے راستے پر نہ چل نکلیں۔ بلکہ اپنے اندر حقیقی ایمان بیدار کریں۔

ہم سے ہاں امام ابوحنیفہ کی طرف نسبت کر کے حنفی کہلانے والے لوگوں کی اکثریت سے مگر ان میں سے کتنے ہیں جو صحیح مثنوی میں امام صاحب کے طریق پر چلے جاتے ہیں۔ محض حنفی کہلانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا جب تک آپ کا اتباع نہ ہوگا، اسی طرح امام شافعی کی طرف نسبت کرنے والے ہیں۔ وہ بھی اپنے طریقہ پر قائم نہیں ہیں۔ دل میں تعصب بھرا ہوا ہے۔ لاکھ شافعی کہلا رہے ہیں۔ کچھ فائدہ نہیں۔ اس قسم کی خالی نسبت تو وہی یودیوں والی نسبت ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خیر دار کیا ہے۔ کہ ایمان لانے کے باوجود یودیت کا راستہ

انتخاب نہ کریں۔ اور صحیح معنوں میں ملت ابراہیمی اور شریعت محمدی پر قائم رہیں۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان والوں کا نام سے لے کر فرمایا: اے بنی ہاشم، اے بنی عبد المطلب خبردار! ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن لوگ اعمال لے کر آئیں۔ اور تم محض خاندانی تعلق اور رشتہ داری سے لے کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں تمہیں نہیں بچاؤں گا۔ آج اپنی فکر کرو۔ اَنْفِذُوا اَنْفُسَكُمْ مِنَ الشَّارِ اپنی جانوں کو دروغ سے بچاؤ۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ایمان کو درست کرو۔ اعمال صالحہ کی دولت حاصل کرو۔ اس طرح تم کو آخرت میں درجات نصیب ہوں گے

فرمایا یہ امت سبے جو گنہگار ہیں۔ جو کچھ اس امت نے کیا وہ اس کے لیے ہے اور جو تم نے کیا وہ تمہارے لیے ہے۔ تم سے ان کے اعمال کے تعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ کہ وہ کب کرتے تھے۔ بلکہ تمہاری باز پرس تمہارے اعمال کی وجہ سے ہوگی۔ تم سے سوال ہوگا۔ کہ تم نیکی اور توحید پر کار بند تھے یا نہیں۔ تم شرک، بدعات اور رسومات باطلہ سے بچ سکے یا نہیں۔ تم توحید کی دعوت دیتے تھے یا شرک و افعال کی طرف بھرتے تھے۔ تم نیکی اختیار کرتے تھے یا لڑائی بھگڑتے ہیں صرف وہ سب آج اپنا محاسبہ کر لو۔ قیامت کے دن تمہارے کاموں کے متعلق تم سے پوچھا جائیگا۔

منارِ مسنون

## تأليف

حضرت مولانا صوفی عند الحمید صاحب سواتی

دَامَتْ بَرَكَاتُهُمْ

حضرت الامام حسینی علیہ السلام کا عظیم الشان  
 دامت برکاتہم  
 نماز مسنونہ کے بعد نماز مسنونہ کا ایک ایسا مفید اور نادر کتبہ ہے جس میں  
 امام کاظم علیہ السلام کی ہر ایک بات پر قوی دلائل اور کتابتِ ثبوت اور حدیثِ صحیحہ سے تفسیر و تہلیل  
 فرمائی گئی ہے۔ جس میں ہر ایک مسئلہ پر امام کاظم علیہ السلام کی رائے اور اجتہاد بیان کیا گیا ہے۔ جس سے  
 مسندتِ کبریٰ میں ہے۔ ارکان، واجبات و سنن کی پوری حکمت اور ضرورتیں مباحث  
 و مسائل میں۔ جمعہ و عیدین، نماز جنازہ اور نوافل وغیرہ کے جملہ اہم مباحث اور اس کے  
 ساتھ ذکرِ دعوت اور خطبات کا ایک بہترین نصاب درج ہے۔  
 امام قاسم کے علاوہ علماء کرام، اساتذہ عظام اور مشائخ عظام دین کے بڑے ایک نعمت  
 غیر مترقبہ ہیں جس کا انداز بیان اور زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔  
 جلد کاغذ، بہترین کتابت و طباعت، سعیدی جلد بندی و قیمت ۱۶۰/- روپے

علماء کرام، طلباء عظام اور عوام الناس کے لیے گرانقدر علمی تحفہ

## شمائل ترمذی

مع اردو ترجمہ و شرح

افادات

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی مدظلہ

مرتب

الحاج لعل دین ایم اے علوم اسلامیہ

مقدمہ، اضافہ، حاشیہ

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

یہ کتاب حضور مہدیہ کے شمائل و خصائل کے شعبہ میں امام ترمذیؒ کی مشہور زمانہ تصنیف ہے جو کہ مدارس میں درس نظامی کے انصاب میں بھی داخل ہے اس کتاب کے کل چھپن ابواب ہیں جن میں سے ابتدائی پچیس ابواب کی شرح نہایت دلنشین اور اچھوتے انداز میں منظر عام پر آگئی ہے۔ کتاب کی احادیث پر اغراب، سلیس اردو ترجمہ، عمدہ تشریح اور حواشی میں روایات کے اسماء و کنی، القاب، من موالید و وفیات کے علاوہ بہت سے علمی، تحقیقی مواد پر مشتمل و محفوی ہے۔ عمدہ کتابت، نفیس طباعت اور معیاری جلد بندی کے ساتھ ۵۰۸ صفحات پر مشتمل جلد اول کی قیمت صرف ۱۳۰ روپے ہے باقی ابواب کی شرح انشاء اللہ العزیز جلد دوم میں شائع ہوگی۔

ناشر: مکتبہ دروس القرآن، فاروق گنج گوجرانوالہ پاکستان



# معالم العرفان - ذرورس القرآن

المفاتيح

مفتی محمد صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بیال احمد نائی صاحب

مترجم

الحق الحق دین صاحب (پیشہ ۱۰۰۰۰۰ روپے)

زیر انتظام

انجمن مجاہدان اشاعت قرآن

صدر انجمن

شیخ محمد یعقوب عاجز

منزل سیکرٹری

بابو خاں حمید رضا صاحب

فرائض

محمود انور بیٹ ایڈووکیٹ

ماہم مکتبہ اشاعت

محمد منیر صاحب Ph: 221943

مکتبہ ذرورس القرآن گوجرانوالہ